

قال تعالى لقد كان لكم فى رسول الله اسوة حسنة (الآية)

فكيف وودى ماحييت ونصرتى لآل رسول الله زين المحافل

(حسان ابن ثابت فى مدح ام المؤمنين عائشة صديقة)

زين المحافل

شرح الشمائل للترمذى

افادات

شيخ الحديث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ

استاذ الحديث ومهتم جامعہ دارالعلوم حقانیہ

جلد اول

نظر ثانی وحاشیہ

مولانا مفتی مختار اللہ حقانی

ضبط وترتیب

مولانا اصلاح الدین حقانی

ناشر: مؤتمرا لمصنفین جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

جملہ حقوق بحق مؤتمرا لمصنفین جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک محفوظ ہیں

نام کتاب	:	زین المحافل شرح الشمائل للامام الترمذی
افادات	:	شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ استاد الحدیث و مہتمم جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
ضبط و ترتیب	:	مولانا اصلاح الدین حقانی استاد الحدیث جامعہ اسلامیہ لکی مروت
نظر ثانی و حاشیہ	:	مولانا مفتی مختار اللہ حقانی مفتی و استاد شعبہ تخصص فی الفقہ والاقتداء جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
کمپوزنگ	:	محمد اکمل، بابر حنیف جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
صفحات	:	جلد اول: 532 جلد دوم: 526
طبع اول	:	اپریل ۲۰۰۷ء
ناشر	:	مؤتمرا لمصنفین جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
طابع	:	المطبعة العربیہ، لیک روڈ ہدانی انارکلی لاہور

مطبوعات مؤتمرا مصنفین جامعہ حقانیہ

نمبر شمار	نام کتاب	تصنیف	افادات	صفحات
۱	حقائق السنن شرح جامع السنن	حضرت مولانا سمیع الحق	شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق	۵۳۶
۲	دعوات حق (کمل دو جلد)	" " "	" " " "	۱۱۹۲
۳	قومی اسبلی میں اسلام کا معرکہ	" " "	" " " "	۴۰۰
۴	عبادات و عیدیت	" " "	" " " "	۸۸
۵	مسئلہ خلافت و شہادت	" " "	" " " "	۱۰۴
۶	صحیحے با اہل حق (مجلد)	مولانا عبد القیوم حقانی	" " " "	۴۰۸
۷	اسلام اور عصر حاضر (مجلد)	حضرت مولانا سمیع الحق	حضرت مولانا سمیع الحق	۴۶۰
۸	قرآن حکیم اور تعمیر اخلاق	" " "	" " " "	۹۶
۹	کاروان آخرت (مجلد)	" " "	" " " "	۴۴۶
۱۰	شیخ الحدیث مولانا عبدالحق خصوصی نمبر	مولانا عبد القیوم حقانی	" " " "	۱۲۰۰
۱۱	قادیانیت اور ملت اسلامیہ کا موقف	حضرت مولانا سمیع الحق	" " " "	۴۰۸
۱۲	قادیان سے اسرائیل تک	" " "	" " " "	۲۲۴
۱۳	قومی اور ملی مسائل پر جمعیت کا موقف	" " "	" " " "	
۱۴	میری علمی اور مطالعاتی زندگی (مجلد)	" " "	" " " "	۵۶۰
۱۵	روسی الحاد	" " "	" " " "	۴۲۰
۱۶	فتاویٰ حقانیہ (چھ جلد)	مولانا مفتی مختار اللہ	حضرات شیخ الحدیث و مفتیان حقانیہ	۳۶۰۰
۱۷	خطبات حق	" " "	حضرت مولانا سمیع الحق	۴۵۰
۱۸	اسلام کا نظام اکل و شرب و قلعہ حلال و حرام	" " "	" " " "	۴۵۰
۱۹	صلیبی دہشت گردی اور عالم اسلام	مولانا عبد القیوم حقانی	" " " "	۵۰۰
۲۰	زین المحافل (شرح شمائل ترمذی) (۲ جلد)	مولانا اصلاح الدین حقانی	" " " "	زیر طبع
۲۱	مروجہ کرنسی کیلئے معیار نصاب سونا یا چاندی	مولانا مفتی مختار اللہ	مولانا مفتی مختار اللہ	۱۰۰

نمبر شمار	نام کتاب	تصنیف	افادات	صفحات
	انوار الحق (جلد اول)	حافظ سلمان الحق حقانی	حضرت مولانا انوار الحق حقانی	۲۶۰
	شریعت بل کا معرکہ	حضرت مولانا سمیع الحق		
	مکتوبات مشاہیر بنام شیخ الحدیث مولانا عبدالحق	" " "		زیر طبع
	مکتوبات مشاہیر بنام مولانا سمیع الحق مدظلہ	" " "		زیر طبع
	اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ باتیں	حضرت مولانا سمیع الحق		
	ماہنامہ الحق کا مولانا عبدالحق نمبر	مولانا عبد القیوم حقانی		
	حیات صدر المدرسین	مولانا محمد ابراہیم قانی		
	افادات حلیم	" " "	شیخ الحدیث مولانا عبدالحلیم زرہوی	
	حیات شیخ القرآن	" " "		
	دروس الکافیہ	مولوی محمد سلیم سواتی حقانی	مولانا محمد ابراہیم قانی	
	العیون والصابیہ	مولوی مولاداد و ہمدرد حقانی	" " "	
	داغباے فراق	مولانا محمد ابراہیم قانی	" " "	
	جماعۃ النساء کی شرعی حیثیت	مولانا مفتی مختار اللہ حقانی	مولانا مفتی مختار اللہ حقانی	
	سادات اور بنو ہاشم کیلئے زکوٰۃ دینے کی شرعی حیثیت	" " "	" " "	
	صفۃ الاقوال فی استحباب صوم سہ من شوال	" " "	" " "	زیر طبع
	دارالعلوم سے جامعہ ازہر تک	مولانا مفتی غلام الرحمن		
	تبلیغ مستورات سے ازالہ شبہات	مولانا حافظ شوکت علی		
	اعمال روحانی	" " "	شیخ الحدیث مولانا عبدالحق	
	تنویر الباعث شرح ملا جامی (پشتو)	" " "	مولانا حافظ شوکت علی	
	مسئلہ رویت ہلال اور اختلاف مطالع	مولانا مفتی مختار اللہ حقانی	مولانا مفتی مختار اللہ حقانی	زیر طبع
	سفر کے مسائل	مولانا مفتی غلام قادر نعمانی		

مستتر المصنفین "جامعہ دارالعلوم حقانیہ" اکوڑہ خشک ضلع نوشہرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
31	امرواؤدہم: مشتعلین فی الحدیث کی اقسام	3	دیباچہ: شیخ الحدیث مولانا سمیع الحق مدظلہ
31	امریزودہم: حجیت حدیث	17	مقدمہ: مولانا اصلاح الدین حقانی
32	امرچہاردہم: شرف علم حدیث	17	امراول: علم حدیث کیا ہے؟
33	شمائل ترمذی	19	امردوم: حدیث کی وجہ تسمیہ
42	وجہ ضبط وترتیب	19	امرسوم: علم حدیث کی تعریف
46	پیش لفظ: مولانا مفتی عطاء اللہ حقانی	20	امرچہارم: حدیث، اثر، خبر اور سنت
46	رسول اللہ ﷺ کی امتیازی شان	21	امر پنجم: موضوع علم حدیث اور غرض و غلیۃ
47	آنحضرت ﷺ غیر مسلموں کی نظر میں	21	امر ششم: مرتبہ علم حدیث
48	سنت کی تعریف	21	امر ہفتم: تدوین علم حدیث
48	سنت کے اقسام	23	امر ہشتم: کتب حدیث
49	ایک غلط فہمی کا ازالہ	24	امر نهم: حکم شرعی
49	آپ ﷺ کی اتباع مطلوب ہے	24	امردہم: تقسیمات حدیث
51	رسول اللہ ﷺ نعمت عظمیٰ	24	تقسیم اول: باعتبار انتہائے حدیث
52	بعض سنتیں ترک کرنا موجب ملامتی ہیں	25	تقسیم دوم: باعتبار تعداد رواۃ
52	ضعیف حدیث	25	تقسیم سوم: باعتبار سقوط رواۃ اور عدم سقوط
53	حدیث ضعیف سے استدلال	26	تقسیم چہارم: باعتبار احوال رواۃ
54	ضعیف حدیث سے استنباط کی مثالیں	28	تقسیم پنجم: باعتبار صنف ادا
55	شمائل ترمذی	29	تقسیم ششم: حدیث مقبول میں
56	شمائل ترمذی اکابرین امت کی نظر میں	29	امریاؤدہم: مراتب رواۃ اور صحاح کی
57	شمائل ترمذی کے شروع		درجہ بندی

91	حمید الطویل کون تھے؟	58	کچھ شرح ہذا کے بارے میں
92	قد کا بیان	60	مختصر سوانحی خاکہ شیخ الحدیث مولانا سمیع الحق مدظلہ
92	لون اسمر کی توجیہ	74	مختصر تذکرہ مولانا اصلاح الدین حقانی
92	باوقار چال کی کیفیت	77	اجزاء کی تشریح اور ظرف کا متعلق
93	راوی حضرت براء بن عازبؓ	78	حمد کا مطلب
93	کان رسول اللہ ﷺ رجلاً مربوعاً	78	لفظ سلام کی تشریح
94	سینہ اور کولہوں کی چوڑائی	78	کیا صلوٰۃ و سلام بیک وقت لازمی ہیں
94	زلف مبارک	81	خطبہ میں تشہد
94	سرخ جوڑے کا استعمال	81	شیخ و حافظ کی اصطلاحات
95	حسن بے مثال	81	ابو عیسیٰ محمد بن سورۃ الترمذیؒ
96	سفیان ثوری یا ابن عیینہ	82	ابو عیسیٰ کنیت کا حکم
97	کیفیات لمۃ یمرۃ، و فرۃ میں تطبیق	83	﴿باب ما جاء فی خلق رسول اللہ ﷺ﴾
98	موٹھوں کے درمیان وسعت	83	لفظ باب کا اعراب
99	سند کو خلاف عادت عن سے شروع کرنے کی وجہ	83	خلق اور خلق کا فرق
99	علی بن ابی طالب	83	آپ ﷺ کے کمالات باطنی اور محاسن ظاہری
99	حضرت علیؓ کا اعزاز	85	حد ثا اور اخبار نامیں فرق
100	تشریح حدیث	86	حضرت انسؓ
100	تہلیلوں کی سختی اور نرمی	86	نبی کریم ﷺ کی قد و قامت
101	اشکال و ازالہ	87	چہرہ مبارک کا رنگ
102	سر مبارک	88	بال کھلے مگر قد رے گھٹ کر پالے تھے
102	سینہ کے بال	88	بعثت کے وقت عمر
102	انداز رفتار	89	مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا قیام
103	اشکال و ازالہ	89	حضور اقدس ﷺ کی عمر مبارک
103	مشکلہ اور نحوہ	90	تأخیات حسن زلف کی بقاء

124	جسم نہایت معتدل تھا	105	حضرت علیؑ کی روایت اور امام اہمعی کی لغوی تشریحات
125	جسم مبارک کی رنگت	107	حدیث کی سند کی بحث
125	سینہ کے بال	107	ولد کی بحث
126	ہاتھ پاؤں اور اطراف کا ذکر	107	تناسب قد و قامت
127	قدم مبارک کی ساخت	108	چہرے کی ساخت
128	سبک رقاری	109	رنگ کا بیان
128	دنیا سے صرف نظر	109	چشم مبارک کی ساخت
129	تطبیق بین الاحادیث	110	جلیل المشاش
133	تشبیہ میں بھی انتہائے ادب تھا	110	التفات نام
134	سیف نہیں چاند سے تشبیہ کے وجوہات	111	فراخ دلی
135	ہارون الرشید کے بیٹوں کا واقعہ	112	آپ ﷺ کی صدق گفتاری اور نرم مزاجی
136	حضرت ابو ہریرہؓ	112	خاندانی شرافت اور معاشرتی کرامت
138	جامد بن عبداللہؓ	116	حدیث کے بعض روایان کا تذکرہ
138	غرض انبیاء کرام علیہم السلام	116	أعلا علینا من کتابہ
138	حضرت موسیٰؑ کا علیہ	116	ابو صلیہ کون تھے؟
139	عروہ بن مسعودؓ	117	ایک اشکال اور اس کا جواب
140	حضرت امیر اہم سے مشابہت	121	رسول اللہ ﷺ کا قدرتی مانگ
141	دجیہ کلبی	122	حوا جب کے تین صفات
142	ابو الطفیل	122	حوا جب کو جمع ذکر کرنے کی وجہ
143	حضرت خضرؑ کی حیات و موت	123	عرق و اعصاب میں فرق
145	حضرت عبداللہ بن عباسؓ	123	داڑھی کی مقدار
146	﴿باب ما جاء فی خاتم النبوة﴾	123	سحل الخدین
146	لفظ خاتم اور اس کا معنی	123	کشادہ دہن
147	سائب بن یزیدؓ	124	گردن اور دانتوں کی خوبصورتی

175	حد یہ میں دوسروں کو شریک کرنا	148	نبی کریم ﷺ کی میحائی شان
176	حضرت سلمان کا خاتم کا مشاہدہ	150	ماء مستعمل کا حکم
176	حضرت سلمان کی آزادی کے لئے شرائط	151	حضرت سائب کا طفلانہ تجسس
177	سلمان کی آزادی اور یہود کی ساہوکاری	151	مہر نبوت کا محل
178	ابوسعید خدری کا مقام اور فضیلت	152	ظہور مہر نبوت کا زمانہ
180	عبداللہ بن سرجس	152	وفات کے بعد مہر ختم ہوا
181	نبی کریم ﷺ کے لئے دعائے مغفرت کیوں	153	زرا نجلہ
182	عصمت انبیاء	154	مہر نبوت کا رنگ
183	نبی کریم ﷺ کی دعائے استغفار کرنے پر صحابہ کو رشک	155	مہر نبوت کا حجم
184	معراج میں مکالمہ کا کلمات تشہد میں اعادہ	156	المایشون اور رمیہ
186	﴿باب ماجاء فی شعر رسول اللہ ﷺ﴾	157	سعد بن معاذ اور احقر از عرش الرحمن
186	بالوں کی مقدار میں اختلاف	157	مہر نبوت کی خوشبو
188	حضرت عائشہ	159	حضرت براء کے بارے میں غلط فہمی اور اس کا ازالہ
189	ایک برتن سے غسل	160	غیر ذوی العقول کا ادراک
189	ضرورت اور حیا کی پاسداری	163	صحابی کو مسح ظہر کا حکم
190	اکٹھے اور یکے بعد دیگرے نہانے کا حکم	166	سلمان فارسی کی فضیلت اور قبول اسلام
190	جمہ اور وفرہ کا معنی	169	ماندۃ اور چنے گئے اشیاء
193	حضرت اتم ہاشمی	170	علم الغیب اور نبی کریم ﷺ
194	غدا تر اور اس کا حکم	170	صدقہ اور ہدیہ میں فرق
196	بالوں کے سدل اور فرق میں نبی کریم ﷺ کا رجحان	171	حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق اور صدقات سے معاملہ
196	تکبیر بالغیر کا حکم	172	حضور اقدس ﷺ کا صدقات سے استعزاز
199	﴿باب ماجاء فی تزیل رسول اللہ ﷺ﴾	172	بنو ہاشم اور صدقات
199	بالوں کی حفاظت سنت ہے	174	اشراف نفس اور حاجی امداد اللہ مہاجر کی کا استغناء
200	حالت حیض میں بیوی سے تعلق	174	بسط اور نشاط

232	﴿باب ماجاء فی کل رسول اللہ ﷺ﴾	200	میاں بیوی کے باہمی حقوق
232	سرمہ کا حکم اور فوائد	201	حقوق نسواں کے نام پر توہین نسواں
233	اشم کیا ہے	201	دیت کس کی آدمی
234	زعم کی حقیقت اور مراد	202	نصف دیت کی حکمت
235	سرمہ کے استعمال کا طریقہ	203	بالوں میں تیل اور کنگھی کا استعمال
236	تحویل کی حقیقت اور اس مقام پر اس کی ضرورت	204	تیا من اور تیا سر کے اصول
238	تصحیح نیت	205	اجتار سلت کا اہتمام
239	سرمہ اور جدید سائنس	206	بالوں کے بناؤ سنگھار میں اعتدال
240	﴿باب ماجاء فی لباس رسول اللہ ﷺ﴾	208	کنگھی اور جدید سائنس
240	لباس کا حکم	209	﴿باب ماجاء فی شیب رسول اللہ ﷺ﴾
241	لباس میں نبی کریم ﷺ کا معمول	210	حضرت ابو بکر صدیقؓ کا خضاب
241	حضرت ام سلمہؓ	212	خضاب کا حکم
242	قمیس کی پسندیدگی کی وجہ	214	بالوں میں موجود سفید بالوں کا تخمینہ
243	قال ابو عبس	215	حضرت عبداللہ بن عمرؓ
244	حضرت اسماء بنت یزیدؓ	216	احساس ذمہ داری کی انتہاء
244	استیوں کی لہائی اور اختلاف کی توجیہات	217	سورہ ہود میں استقامت کا حکم
246	رھط	219	تیم الر باب
246	مرد اور عورت کے گریبان میں فرق	220	بالوں میں سرخی کیوں تھی؟
248	یحییٰ بن معینؒ اور حرص طلب علم	222	﴿باب ماجاء فی خضاب رسول اللہ ﷺ﴾
249	اسلاف اور وقت کی قدر و قیمت کی چند مثالیں	222	خضاب کا معنی
250	ایک مستشرق پروفیسر کا جذبہ حصول علم	222	نبی کریم ﷺ نے خضاب لگایا نہیں
251	امام مالکؒ اور یحییٰ مصمودی	225	ایک کے بدلے دوسرے کا مواخذہ رسم جاہلیت
251	حقوق الاوقات کی تلاقی ممکن نہیں	229	حضرت جہذ مہ رضی اللہ عنہا
252	تسمیہ لباس کے مختلف احتمالات	230	تہمکات نبوی سے عشق

275	موزہ پہننے کے آداب	254	زیادہ محبوب قمیص یا حمرہ
276	شاہ حبشہ، نجاشی اور اس کی حکومت	255	سرخ لباس استعمال کرنے کی توجیہات
277	غائبانہ نماز جنازہ پڑھانے کی شرعی حیثیت	256	فقہاء کی آراء
281	مجازین حضرات کے دلائل اور ان کے جوابات	258	نبی کریم ﷺ کی چادریں
286	خدمت اسلام کا ثمرہ	258	امراء بنی عباس و بنو امیہ کے پاس حضور کی چادریں
286	غیر مسلموں کے ہدایا سے سلوک	259	قبیلہ اور وصیت و علیہ کا تعارف
289	﴿باب ماجاء فی نعل رسول اللہ ﷺ﴾	260	ملاء کا مطلب
289	جوتی مبارک کا ذکر	260	زعفرانی لباس
291	پیشہ باعث عار نہیں	261	لباس قاخرہ کا استعمال
292	حمرک بانار الصالحین کا مسئلہ	262	لباس اور اکابر کا طرز عمل
294	سوال کاغشاء	262	نبی کریم ﷺ کی ہیئت
295	عمرو بن حریث	264	سفید لباس کی افضلیت کی وجہ
295	جوتوں میں نماز	265	سیاہ لباس
297	نبی کاراز	265	صفیہ بنت خبیہ
299	دائیں سے ابتداء کیوں؟	266	حضرت مغیرہ بن شعبہ
301	انداز پاوشی بدلنے کی وجہ	266	جبہ رومی یا شامی
302	﴿باب ماجاء فی ذکر حاتم رسول اللہ ﷺ﴾	266	کفار کی مصنوعات کا استعمال
302	مہر کے لئے انگلی	268	﴿باب ماجاء فی عیش النبی ﷺ﴾
302	مشاہیر امت کے انگلیوں پر نقش کلمات	268	تکرار باب عیش کی وجہ
304	چاندی کی انگلی	270	مشق
305	پہننے یا نہ پہننے کی تفصیل	270	ابو ہریرہؓ اور سرخ کپڑے کا استعمال
306	اہل عجم کے نام مکاتیب کے لئے مہر	271	رخنخ
307	کلمات نقش کی ترتیب	272	صحابہ اور حضور اقدس ﷺ کی فاقہ کشی
308	انگلی پر لفظ اللہ کا حکم	275	﴿باب ماجاء فی خف رسول اللہ ﷺ﴾

333	قربانی کا صلہ	308	کسریٰ، قیصر اور نجاشی
333	حضرت طلحہؓ	310	بے ادبی سے احتراز
335	﴿باب ماجاء فی صفۃ مقرر رسول اللہ ﷺ﴾	311	بیرار نیس کا واقعہ
336	فاتحین کے لئے درس	312	آثار سلف صالحین کے برکات
336	مکہ مکرمہ پر حملے کا حکم	314	﴿باب ماجاء فی ان النبی ﷺ کان یتختم فی یمینہ﴾
337	حضور اقدس ﷺ کی دریا دلی	314	انگوٹھی کس ہاتھ میں
337	اشاعت اسلام کا اصل سبب	316	احناف کا مسلک
338	ابن حطل اور اس کا جرم	317	حضرت عبداللہ بن جعفرؓ
338	قاتل کون تھا؟	320	نگینہ اوپر یا نیچے
339	حرم میں حدود و قصاص کا حکم	320	نقش کی نقل کی ممنوعیت
340	حرم شریف میں داخلہ اور شرط	321	حضرت معقیبؓ
341	﴿باب ماجاء فی علامۃ النبی ﷺ﴾	321	سند حدیث اور ترجمۃ الباب سے مطابقت
341	عمامہ کی تعریف اور فضیلت	323	امام ترمذیؒ کی کمال دیانت
342	ایک تعارض اور اس کا جواب	324	سونے کی انگوٹھی ترک کرنے کی وجہ
343	کیا ذوالحال اور حال کا ایک زمانہ ضروری ہے	325	﴿باب ماجاء فی ذکر سیف رسول اللہ ﷺ﴾
343	سیاہ پگڑی کا ثبوت	325	نبی کریم ﷺ کی تلوار
344	رسول اللہ ﷺ کی مختلف الوان کی پگڑیاں	326	حضرت سعید بن ابی الحسنؓ
345	سیاہ پگڑی کے فوائد	327	کیا تلوار پر سونا لگانا جائز ہے؟
350	﴿باب ماجاء فی صفۃ ازار النبی ﷺ﴾	329	لطیفہ
350	نبی کریم ﷺ کا تہہ بند اور اس کی مقدار	330	﴿باب ماجاء فی صفۃ درع النبی ﷺ﴾
350	شلوار کا حکم	330	فولادی صنعت کی اہمیت
351	زہد نبوی ﷺ یا دوہانی	330	حضور اقدس ﷺ کی زربیں
355	حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کا تذکرہ	331	حضرت زبیر بن العوامؓ
355	شلوار کا ٹخنوں سے نیچے ہونا	332	دفاعی صلاحیت کا حصول ضروری ہے

382	حضرت کعب بن مالکؓ کا ذکر	358	﴿باب ماجاء فی مشیۃ رسول اللہ ﷺ﴾
383	تین انگلیاں یا تین بار	359	معجزہ طین الارض
383	انگلیوں سے کھانا انسان کا اعزاز	359	حاجی امداد اللہ مہاجر کی کرامت
384	نکرم بنی آدم کی ایک صورت	362	﴿باب ماجاء فی تنقیح رسول اللہ ﷺ﴾
384	تین انگلیوں کے ساتھ کھانے کی حکمت	362	تقاع کیا ہے؟
385	استخفاف سنت ایک جرم	363	خصوصی لباس کا فائدہ
387	دانا را اشارہ کافی است	364	﴿باب ماجاء فی جلسۃ رسول اللہ ﷺ﴾
388	تین انگلیوں سے کھانا سنت ہے	365	قر فضاء کی تفسیر
390	﴿باب ماجاء فی صفۃ خیر النبی ﷺ﴾	365	عبداللہ بن زیدؓ
390	کھانا پینا مقصد حیات نہیں	366	دو اشکال اور ان کا جواب
390	اسیر مالک مولانا عزیز گل کی حکیمانہ حبیہ	367	مسجد میں سونے کا حکم
391	حضور و اہل بیت کی فاقہ کشی	368	احتباء کسے کہتے ہیں؟
391	حدیث کی ترجمۃ الباب سے مطابقت	370	﴿باب ماجاء فی تکاۃ رسول اللہ ﷺ﴾
392	ازواج مطہرات کا نذر	370	تکاۃ کا معنی
393	ضیاع رزق سے احتراز	371	حضرت ابو بکرؓ
393	حضرت ابوالامہؓ	372	کبیرۃ کیا ہے؟
393	اشکال اور اس کا جواب	373	والدین کی نافرمانی گناہ کبیرہ ہے
395	چھانے بغیر روٹی	374	شہادۃ زور اور جھوٹ پر زیادہ اہتمام کیوں
396	اہل بن سعدؓ	374	حضور اقدس ﷺ کا اصرار اور صحابہ کی شفقت
397	میز نما خوانوں اور ہر تکلف برتنوں سے پرہیز	375	اشکال اور جواب
398	جھوٹی موٹی روٹی	379	﴿باب ماجاء فی استکاء رسول اللہ ﷺ﴾
399	حضرت عائشہؓ کا ضبط سے بندھن ٹوٹ جانا	379	استکاء کا معنی
402	﴿باب ماجاء فی اداۃ رسول اللہ ﷺ﴾	381	حضرت فضل بن عباسؓ
402	ادام کے مفہوم کی تحقیق	382	﴿باب ماجاء فی صفۃ اکل رسول اللہ ﷺ﴾

429	قص شوارب میں توجیہات	403	سرکہ اچھایا سب سے اچھا
430	ایک اشکال اور اس کا جواب	405	حضرت نعمان بن بشیرؓ
430	مونچیں کترانا چاہئے یا مونڈھنا	407	حضرت ابو موسیٰ اور زحدمؓ
432	دانتوں سے گوشت کاٹ کر کھانا	409	حضرت سفینہؓ
433	حضرت عبداللہ بن مسعودؓ	409	لحم حباری
433	زہر دینے والا کون؟	412	زینون کے فضائل
434	معنوی شہادت	413	حضرت عمر فاروق اعظمؓ کی شان
435	سوائے درماء کے قاتل کو غزو کا کسی کو اختیار نہیں	415	کدو کی محبوبیت
435	قتل عدا اور آلہ جارحہ	416	محبوب کی ہر اداء سے محبت
436	حضرت ابو عبیدہؓ	416	کدو کی تحقیر کی سزا
437	نبی کریم ﷺ کے حکم کے مقابلے میں عقل پرستی	417	آزادی عدلیہ کی ایک مثال
437	چوں دجرا کرنا بدکات سے محرومی کا سبب بنتا ہے	418	حضرت حکیم بن جابرؓ
438	توجہ تام کے حصول کے لئے انقیاد تام	419	غریبوں اور پیشہ وروں کی عزت
439	ذراع کے گوشت سے محبت کا سبب	420	ایک اشکال اور جواب
440	گوشت خوری فطرۃ انسانی	421	صحۃ
443	تطبیق روایات لحم ذراع و لحم ظہر	421	حضور اقدس ﷺ کی میٹھی چیز سے محبت
444	غل (سرکہ)	421	حلوا سے کیا مراد ہے؟
445	حضرت ام ہانیؓ	423	فطرت انسانی اور گوشت خوری
445	بے تکلفی سوال نہیں ہے	423	وضو معامست النار
447	فضیلت ام المؤمنین حضرت عائشہؓ	424	حضرت عبداللہ بن الحارثؓ
448	وجہ ترجیح فضیلت عائشہؓ	424	مسجد میں کھانے کا مسئلہ
450	وضو معامست النار کا فقہی مسئلہ	426	گوشت چھری سے کاٹ کر کھانے کا مسئلہ روایات میں تطبیق
451	ام المؤمنین حضرت صفیہؓ اور اس کا ولیمہ	428	حضرت بلال حبشہؓ
453	حضور اقدس ﷺ کے ساتھ کھانے کا عملی نمونہ	429	بلال کی دعوت نماز پر ناراضگی کے توجیہات

481	رسول اللہ ﷺ کے گھر کے برتن تکلفات سے پاک تھے	453	حضرت سلمیٰ
481	﴿باب ماجاء فی قدح رسول اللہ ﷺ﴾	455	معجزہ بکثیر طعام
482	رسول اللہ ﷺ کا پیالہ	458	ام المندر
482	رسول اللہ ﷺ کے پیالہ پر پٹیاں	458	کھانے پینے میں حالت صحت و مرض کا خیال
485	﴿باب ماجاء فی صفۃ فاکھہ رسول اللہ ﷺ﴾	460	حضرت عائشہ بنت طلحہ
485	فاکھہ کے مفہوم میں اختلاف	460	نفل روزہ کے افطار کا مسئلہ
487	طبی مرکبات سے علاج کا نبوی اصول	461	حضرت یوسف بن عبد اللہ
488	لطیف سندی نکتہ	462	حضرت عبد اللہ بن سلام
489	خربوزہ یا تربوزہ	462	تعریف ادا م نہیں بلکہ قتلہ
491	پہلا پھل حضور اقدس ﷺ کی نذر	465	﴿باب ماجاء فی صفۃ وضو رسول اللہ ﷺ﴾
492	خلۃ ابراہیم علیہ السلام	466	وضو لغوی نہ کہ اصطلاحی
493	ثمرات کل شیء کا مطلب	467	کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھ دھونے کی برکت
495	حضرت ربیع	469	﴿باب ماجاء فی قول رسول اللہ ﷺ قبل الطعام ارح﴾
495	حضرت معاذ و معوذ رضی اللہ عنہما	469	بسم اللہ نہ پڑھنے کی بے برکتی
499	﴿باب ماجاء فی صفۃ شراب رسول اللہ ﷺ﴾	470	حضرت ابوالیوب انصاری
499	پانی کی دو مرغوب صفتیں	471	بسم اللہ ہر فرد پڑھے گا یا ایک کا کافی ہوگا
502	معاشرتی آداب کی حکیمانہ تعلیم	471	اکل شیطان کی نوعیت
503	نا قابل ایثار نعمت	473	بسم اللہ پڑھنا سنت ہے یا مستحب
504	دودھ اعلیٰ ترین نعمت ہے	473	حضرت عمر بن ابی سلمہ
504	مسند اور مرسل کی سندی بحث	474	دائیں ہاتھ سے کھانا و جوہ کا قول
505	ام المؤمنین میمونہ	474	اپنے سامنے کھانے کا حکم
507	﴿باب ماجاء فی صفۃ شرب رسول اللہ ﷺ﴾	475	نعمت ایمان
507	زمرم کیا ہے؟	476	نعمت طعام پر حمد
507	زمرم کی برکات	476	حمد حضور اقدس ﷺ اور امت کی خاص پہچان

525	خوشبو روزہ کریں	509	پانی پینے کا طریقہ
527	مردانہ اور زنانہ خوشبو میں فرق	509	کھڑے ہو کر پینے کی ممانعت و اباحت کا بحث
528	ابو عثمان النخعیؒ	511	سند عمرو بن شعیب عن ایبہ عن جدہ کی تحقیق
529	نعمتوں اور خوشبوؤں کا سرچشمہ جنت	512	حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ
530	حضرت جریر بن عبداللہؓ	515	پانی کتنے سانسوں سے پینا چاہئے
531	حضرت عمرؓ کا فوجی معائنہ پر یہ	519	حضرت ام سلیمؓ
532	باب سے مناسبت	520	حضرت سعد بن ابی الوقاصؓ
532	خلاصہ باب	523	﴿باب ماجاء فی تطہر رسول اللہ ﷺ﴾
		523	حضور اقدس ﷺ کی ذاتی جسمانی خوشبو

قال تعالى لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة (الآية)

فكيف وودى ماحيت ونصرتي لآل رسول الله زين المحافل

(حسان ابن ثابت في مدح ام المؤمنين عائشة صديقة)

زين المحافل شرح السمائل للترمذی

جلد دوم

افادات

شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ

استاذ الحدیث و مہتمم جامعہ دارالعلوم حقانیہ

نظر ثانی و حاشیہ

مولانا مفتی مختار اللہ حقانی

ضبط و ترتیب

مولانا اصلاح الدین حقانی

ناشر: مؤتمرا لمصنفین جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

مقدمہ

(از مولانا اصلاح الدین حقانی مرتب کتاب)

کسی بھی علم میں ابتداء علی وجہ البصیرت کرنے کیلئے کچھ امور کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔ ان امور کے مجموعے کو مقدمۃ العلم کہتے ہیں۔ کتاب کی شرح شروع کرنے سے پہلے ہم علم حدیث کے متعلق ایسے چند امور کا بیان کریں گے۔

امراول: علم حدیث کیا ہے؟ ”علم الحدیث“ ایک مرکب لفظ ہے جس کے دو جزو ہیں۔ مضاف یعنی علم اور مضاف الیہ یعنی ”الحدیث“ علم چار معانی میں مستعمل ہے۔

(۱) علم کا لغوی معنی دانستن یعنی جانتا ہے۔ یہ ایک مصدری مفہوم ہے جو اختیاری اور کبھی غیر اختیاری ہوتا ہے۔

(۲) علم کا عرفی معنی ہے مابہ الانکشاف یعنی وہ چیز جس کے ذریعے کسی مفہوم کا ادراک اور انکشاف ہوتا ہے۔ اس معنی میں علم کا مصداق عقلاء کے نزدیک ہر زمانہ میں متنازع فیہ رہا ہے۔ چنانچہ بعض لوگ اسے کیفیت قلبی بتاتے ہیں۔ بعض حصول الصورة کے بعد حال سے تعبیر کرتے ہیں کچھ لوگ اسے صورتہ حاصلہ اور بعض دیگر افراد حصول الصورة کو اس کا مصداق گردانتے ہیں۔ اور کچھ لوگ اس کو عین عالم بھی سمجھتے ہیں۔ بہر حال اس کے مصداق میں قول فیصل ناپید ہے۔

(۳) علم کا تیسرا معنی شرعی ہے۔ وہ ہے ”نور فی المؤمن مقتبس من مشکوٰۃ مصابیح النبوة“ یعنی وحی اور نبوة کی وہ روشنی جو کسی مومن کے قلب کو منور کرے۔ شرعی معنی میں علم کہلاتا ہے۔

(۴) علم کا چوتھا استعمال ”علم مدون“ کے معنی میں ہے یعنی واضحین و مدونین کا ترتیب دیا ہوا فن۔ جیسے ”علم فقہ“ ”علم بلاغت“ وغیرہ۔

اجمالی طور پر اس کے بھی تین مصداق علماء کے نزدیک مذکور ہیں۔

(۱) نفس مسائل (۲) تصدیقات بالمسائل (۳) تصدیقات سے حاصل شدہ ملکہ

دوسرا جزء ”الحدیث“ ہے یہ تین معانی میں مستعمل ہے

(۱) لغوی لحاظ سے یہ فعل کا وزن ہے جو فاعل کے معنی میں ہے۔ یعنی حدیث حادث (نو پیدا) کے معنی میں ہے۔ جو قدیم کا متضاد ہے۔

(۲) عرفاً حدیث خبر (جو انشاء کی ضد ہے) کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اردو میں اس کا معنی ”نئی بات“ سے کرنا مناسب ہے۔ لغوی معنی اور عرفی معنی میں مناسبت واضح ہے۔ حضرت علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں ”وأما الحديث فاصله ضد القديم وقد استعمل في قليل الخبر وكثيره“ ”لأنه يحدث شيئاً فشيئاً“ (۱)۔

(۳) حدیث کا شرعی معنی ہے ”ما يضاف إلى النبي ﷺ في قول أو فعل أو تقرير“ (۲) ”چونکہ آئندہ اسی معنی میں حدیث زیر بحث رہے گا۔ اس لئے اس تعریف کی کچھ تشریح کرنا مناسب ہے۔ یہاں تین چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ قول نبی ﷺ، فعل نبی ﷺ اور تقریر نبی ﷺ۔

قول نبی ﷺ: وہ الفاظ اور ارشادات لسانیہ ہیں جو وقتاً فوقتاً نبی کریم ﷺ سے صادر ہو چکے ہیں۔ مثلاً نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے انما الاعمال بالنیات۔

فعل نبی ﷺ: اس سے مراد وہ کام اور اعمال ہیں جو نبی کریم ﷺ سے صادر ہو چکے ہیں۔ مثلاً مسح النبی ﷺ علی الخفين یعنی نبی کریم ﷺ نے موزوں پر مسح کیا۔

تقریر نبی ﷺ: تقریر یہاں تثبیت کے معنی میں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کسی صحابی کو کوئی قول یا فعل کرنا ہوا دیکھیں اور آپ ﷺ اس پر سکوت فرمائیں اور انکار نہ فرمائیں۔ یہ کم از کم اس فعل کے جائز ہونے کی دلیل بن جاتی ہے۔ مثلاً صحابہ کرام صرف ازار (لنگی) باندھ کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ اور نبی کریم ﷺ خاموشی سے ان کو دیکھتے تھے۔ یہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے صحابہ کرام کے اس فعل کی تقریر ہے۔

امردوم: حدیث کی وجہ تسمیہ: حدیث کی وجہ تسمیہ کے بارے میں علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی رائے پہلے ذکر ہو چکی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ”لأنه يحدث شيئاً فشيئاً“ یعنی چونکہ نبی اکرم ﷺ کے اقوال و افعال اور تقریرات حادث ہیں۔ اس لئے اسے حدیث کہتے ہیں۔

علامہ ابن حجرؒ نے اس کی کچھ مزید وضاحت کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ شریعت کے دو مدار ہیں۔ کتاب اللہ اور رسول اللہ۔ حدیث مؤخر الذکر کے ساتھ مختص ہوتا ہے اور چونکہ کتاب اللہ قدیم ہے اور مؤخر الذکر حادث ہے لہذا کتاب اللہ کے تقابیل کی وجہ سے اسے حدیث کہا گیا ہے ”وكانه أريد به مقابلة القرآن لأنه قديم“ (۱)۔

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے مقدمہ فتح الملہم میں ایک اور وجہ تسمیہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ کہتے ہیں کہ حدیث کا لفظ ”قرآنی آیت“ ”وَمَا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ“ (۲) سے متخمس یعنی ماخوذ ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ سورۃ النبیؑ میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر تین انعامات کا ذکر کیا ہے۔ (۱) ایواء (ٹھکانہ دینا) (۲) ہدایت (۳) اغناء۔ پھر ہر نعمت کے مقابلہ میں ایک مطالبہ کیا گیا ہے۔ دوسری نعمت یعنی ہدایت دینے کے مقابلہ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس نعمت کا اظہار و بیان کر دو۔ اس حکم کو آیت مذکورہ میں ”فحدِّثْ“ سے بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ کے بیان کو حدیث اور بیان شدہ امور کو ”حدیث“ کہا گیا۔

امرسوم: علم الحدیث کی تعریف: مضاف اور مضاف الیہ کی تشریح کے بعد مرکب لفظ ”علم الحدیث“ کی تشریح کا مرتبہ آتا ہے۔ واضح رہے کہ علم کے معنی میں سب سے آخری معنی اور حدیث کے معانی میں بھی سب سے آخری معنی لے کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ”علم الحدیث“ وہ علم مدون ہے جس میں نبی کریم ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریرات سے بحث کی جاتی ہے۔ واضح رہے کہ علم الحدیث کی تعریف میں متقدمین اور متاخرین کا اختلاف نقل کیا جاتا ہے۔

(۱) تدریب الراوی جلد ۱ ص ۴۲

(۲) سورۃ النبیؑ

متقدمین کہتے ہیں ”ہو علم يعرف بہ اقوال النبی ﷺ و أفعاله و أحواله“ (۱) اس تعریف کی رو سے علم الحدیث روایۃ الحدیث کے ساتھ مختص ہوگا۔ یعنی سند حدیث سے صرف نظر کر کے متن الحدیث میں جو کچھ مقصود بالروایۃ ہوتا ہے اسی کی معرفت علم الحدیث کہلائے گا۔

ان کے نزدیک علم الحدیث کا موضوع ذات النبی ﷺ من حیث أنه نبی و مبلغ ہے۔ اور اس کا غایہ قریہ معروفۃ متون الاحادیث ہے۔ یعنی راویوں نے جو مضامین روایت کی ہیں ان کو جاننا مقصود ہوتا ہے۔

متاخرین نے علم الحدیث کی تعریف یوں کی ہے ”ہو علم يعرف بہا احوال السند والمتن“ یعنی علم حدیث وہ علم ہے جس میں روایۃ الحدیث کی حقیقت، شروط، انواع و احکام کے ساتھ ساتھ احوال رواۃ، اصناف مرویات اور دیگر متعلقات روایت بیک وقت زیر بحث ہوتے ہیں۔ اس کو روایۃ الحدیث بھی کہتے ہیں۔ اس فن کا موضوع متن و سند دونوں اور غایہ مقبول و مردود احادیث میں تمیز کرنا ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں ۔

علم الحديث فوقوانين تحدد يدرى بها احوال متن وسند

لذلك الموضوع والمقصود ان يعرف المقبول والمردود (۲)

متاخرین میں سے بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اول الذکر مطلق علم الحدیث کی تعریف ہے اور مؤخر الذکر علم اصول حدیث کی تعریف ہے لیکن سلف میں سے بعض نے مؤخر الذکر کو بھی مطلق علم الحدیث کی تعریف قرار دیا ہے۔

امر چہارم: حدیث، اثر، خبر اور سنت: بعض حضرات کے نزدیک یہ چاروں الفاظ مترادف ہیں۔ جب کہ بعض لوگوں نے ان میں فرق کیا ہے۔ چنانچہ حدیث ”مانسب إلی النبی ﷺ من قول أو فعل أو تقریر“ کو کہا جاتا ہے۔ اور اثر ”مانسب إلی الصحابی“ کو کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ قول و فعل جو کسی صحابی

(۱) انکرمائی ج ۱ ص ۱۲، یعنی جلد نمبر ۱ ص ۱۱

(۲) او جز المسائل جلد ۱ ص ۵

کی طرف منسوب ہو۔ جبکہ خبر کا لفظ عام ہے۔ احوال نبی ﷺ اور احوال سلاطین ماضیہ دونوں کو کہا جاتا ہے۔
البتہ سنت کا لفظ اصطلاحاً عام ہے۔ نبی کریم ﷺ، صحابہؓ اور تابعین کے ہاں پسندیدہ طور طریقوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

متنبیہ: واضح رہے کہ سند طریق حدیث یعنی رجال کے اس مجموعہ کا نام ہے جنہوں نے حدیث کی روایت کی ہے اور کبھی اسناد بھی اسی معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ جبکہ متن ان کلمات اور احکام کا نام ہے جو مقصود بالبیان ہو یا الفاظ دیگر ”ما یساق له السند“ یعنی وہ حکم جس کیلئے سند بیان کی گئی ہو۔

امر پنجم: موضوع علم حدیث اور غرض و غایہ: ان دونوں امور کا ذکر علم الحدیث کی تعریف کے ضمن میں ہو گیا ہے۔

امر ششم: مرتبہ علم حدیث: فضیلت کے اعتبار سے تفسیر کے بعد دوسرا مرتبہ علم حدیث کا ہے۔ کیونکہ قرآن مجید اور اس کی تفسیر کو مطلقاً شرف حاصل ہے۔ جبکہ تعلیم کے اعتبار سے علم حدیث کا مرتبہ سب سے آخر میں ہوتا ہے کیونکہ تمام علوم آلیہ تو حدیث کے فہم میں معاون بلکہ اس کیلئے موقوف علیہ کے درجہ میں ہیں۔ کیونکہ بغیر دیگر علوم کے غلطی اور حدیث بیان کرتے ہوئے کذب علی النبی ﷺ کا خوف ہوتا ہے جو بہت خطرناک بات ہے۔ اس لئے تعلیم کے وقت دیگر فنون کو اس پر مقدم کرنا ضروری ہے۔ تاکہ روایت میں خطا سے بچا جاسکے۔

امر ہفتم: تدوین حدیث: احادیث کی نسبت تو آنحضرت ﷺ کی طرف ہوتی ہے۔ اور اس کی کتابت کا سلسلہ بھی نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ زمانہ نبوت میں احادیث کی کتابت کرتے تھے۔ اس طرح حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگرد ان سے سنی ہوئی احادیث کی کتابت کیا کرتے تھے۔ جن میں حسن بن عمروؓ، بشر بن نصیکؓ، حمام بن مجہؓ اور وہب بن منبہؓ کے امالی اور صحیفے قابل ذکر ہیں (۱)۔ لیکن اس کو فن کا درجہ اور مستقل علم کی حیثیت کس نے دی ہے۔ اس سلسلے میں دو نام قابل ذکر ہیں۔

(۱) سنن دارمی جلد نمبر ۱ ص ۱۳۸ اور مسند احمد جلد ۲ ص ۳۱۸ تا ۳۱۹

اول: امام محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن شہاب الزہریؒ (م ۱۲۵ھ) ہیں۔ جد امجد شہاب کی طرف ان کی نسبت ہوتی ہے۔ علامہ ابن حجرؒ نے ان کو "اَوَّلُ مَنْ دَوَّنَ الْحَدِيثَ" کا مصداق ٹھہرایا ہے (۱)۔

اسی طرح امام مالکؒ نے بھی انہی کو مدوّن اَوَّل قرار (۲) دیا ہے۔

دوم: ابوبکر بن حزمؒ (م ۱۲۰ھ) ہیں جو عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں مدینہ کے گورنر تھے۔ انہوں نے بھی اپنے زمانہ میں احادیث کو جمع کیا تھا۔

دراصل حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے خلافت کے زمانہ میں علماء اور امراء جنود (جرنیلوں) کو حکم دیا تھا کہ وہ احادیث کو جمع کر کے محفوظ کر لیں کیونکہ ان کے ضائع ہونے کا خدشہ تھا۔ اس سلسلے میں امام زہریؒ، ابوبکر بن حزمؒ اور سعد بن ابراہیمؒ کو خصوصی طور پر جمع حدیث کا حکم ملا تھا۔ چنانچہ امام زہریؒ نے تعمیل حکم میں احادیث کا مجموعہ تیار کر کے عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس بھیجا تھا۔ انہوں نے اس کی نقلیں کروا کر اطراف مملکت میں بھیج دیں۔ جب کہ ابن حزمؒ کا مجموعہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس نہیں پہنچ سکا۔ اسی وجہ سے امام مالکؒ وغیرہ نے امام زہریؒ کو مدوّن اَوَّل کا درجہ دیا۔ اور یہی رائج معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ امام زہریؒ تدوین حدیث کے طبقہ اولیٰ کے سرخیل ہیں۔ اس کے بعد دوسرے طبقہ میں ربیع ابن صبیحؒ (م ۱۶۰ھ) اور سعید بن ابی عروبہؒ (م ۱۵۶ھ) وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ جنہوں نے تہذیب کے ساتھ ترویج اور ترتیب کا لحاظ بھی رکھا۔

تیسرا دور ۱۵۰ھ سے ۲۲۰ھ تک کا ہے جس میں ابن جریجؒ (م ۱۵۰ھ)، معمر بن راشدؒ (م ۱۵۴ھ) امام اوزاعیؒ (م ۱۵۷ھ) امام ثوریؒ (م ۱۶۱ھ) امام مالکؒ اور عبد اللہ ابن المبارکؒ کے نام قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے بھی احادیث اور آثار صحابہ کو جمع کر کے متعدد ابواب کے مجموعے تیار کئے اور مستقل کتب تالیف کیں۔

(۱) فتح الباری ج ۱ ص ۲۰۸

(۲) حلیۃ الاولیاء ج ۳ ص ۳۶۲

چوتھا دور ۲۰۰ھ سے ۲۲۵ھ تک کا ہے جس میں عبید اللہ بن موسیٰ (م ۲۱۳ھ) نعیم ابن حماد (م ۲۱۸)، عثمان بن ابی شیبہ (م ۲۳۹) اور امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱) وغیرہ شامل ہیں ان حضرات نے مرفوع احادیث کے مجموعے لکھے۔ جن میں آثار صحابہ کو کم ذکر کیا گیا لیکن ان مجموعوں میں حسن اور ضعیف احادیث بھی موجود تھیں۔

پانچواں طبقہ کتب صحاح و حسان کے مصنفین کا ہے۔ جن کا دور ۲۲۵ھ سے شروع ہوتا ہے۔ ان کے سرخیل امام بخاری اور امام مسلم ہیں۔ جن کی تقلید میں امام نسائی، امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام ابن ماجہ نے بھی تالیفات کیں۔ انہوں نے صحاح کی تجرید کی یعنی غیر صحیح احادیث سے ان کو الگ کر دیا۔
امرہ ششم: کتب حدیث: کتب حدیث کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن ان میں سات بڑی قسموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) جوامع: جامع کی جمع ہے۔ جامع اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں ان آٹھ فنون کی احادیث کو جمع کیا گیا ہو جن کو اس شعر میں ذکر کیا گیا ہے۔

سیر و آداب و تفسیر و عقائد فتن، احکام و اشراف و مناقب

صحیح بخاری اور سنن ترمذی بالاتفاق جوامع میں سے ہیں۔ جبکہ صحیح مسلم شریف میں تفسیر کی قلت کی وجہ سے اختلاف ہے کہ جامع ہے یا نہیں۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ مسلم میں بھی تفسیر کے بارے میں اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ اگرچہ وہ متفرق ہے اس لئے صاحب کشف الظنون اور صاحب قاموس نے اسے بھی جوامع میں سے شمار کیا ہے۔

(۲) سنن: فقہی ترتیب کے موافق ترتیب دی ہوئی حدیث کی کتاب کو سنن کہا جاتا ہے جیسے سنن ترمذی اور سنن ابی داؤد وغیرہ۔

(۳) مسانید: مسند حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں صحابہ کرام کی مروی احادیث کو صحابہ کرام کی ترتیب کے مطابق لایا جائے۔ یہ ترتیب یا تو اسماء صحابہ کے حروف تہجی کو ملحوظ رکھتے ہوئے دی جاتی ہے یا پھر ان کے مراتب کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ جیسے مسند امام احمد

(۴) معاجم: معجم اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں مصنف نے اپنے مشائخ کی ترتیب کا لحاظ

کیا ہو۔ پھر مشائخ کی ترتیب میں بھی ان کی وفیات کو اور کبھی ان کے علم و فضل کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر یہاں بھی ان کے اسماء کے حروف تہجی کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ جیسے امام طبرانی کی معجم کبیر، معجم اوسط اور معجم صغیر وغیرہ۔

(۵) متدرکات: متدرک احادیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں کسی مؤلف کتاب کے شروط کے مطابق اس سے متروک احادیث کو جمع کیا جائے جیسے ”متدرک حاکم“ یہ کتاب ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ الحاکم (م ۴۰۵ھ) نے لکھی ہے۔ اور بخاری و مسلم کے شروط کے مطابق ان سے چھوٹی ہوئی احادیث کو جمع کیا۔

(۶) مستخرجات: مستخرجات مستخرج کی جمع ہے۔ مستخرج اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں مصنف کسی دوسرے مصنف کی روایات کو اپنی سند کے ساتھ روایت کرے۔ یوں کہ مصنف سابق کا واسطہ درمیان میں نہ آئے۔ جیسے محمد بن عبد المالک کی ”مستخرج علی سنن ابی داؤد“ وغیرہ۔

(۷) اجزاء و رسائل: جزء احادیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں کسی ایک مسئلہ کے متعلق احادیث کو جمع کیا جاتا ہے۔ مثلاً جزء القراءة خلف الامام للبخاری۔ اسے متاخرین کی اصطلاح میں رسالہ بھی کہا جاتا ہے۔ امام ترمذی کی کتاب شمائل ترمذی کو بھی اسی صنف کے تحت شمار کیا جانا چاہئے۔

مذکورہ مشہور اقسام کے علاوہ کچھ دیگر اصناف بھی ہیں۔ مثلاً کتاب الافراد والغرائب، کتاب العلل، اطراف، مسلسلات اور اربعینات وغیرہ

امر نہم: حکم شرعی: علم حدیث کا حصول فرض کفایہ ہے حتیٰ کہ جہاں پر مسلمان موجود ہوں اور کوئی بھی اس علم کا عالم نہ ہو تو تمام مسلمان ترک فریضہ کے گنہگار ہو گئے۔

امر دہم: تقسیمات حدیث: حدیث میں مختلف جہات سے متعدد تقسیمات ہیں۔

تقسیم اول باعتبار انتہائے حدیث: اس اعتبار سے حدیث تین قسم پر ہے۔

(۱) مرفوع (۲) موقوف (۳) مقطوع

مرفوع: مرفوع وہ حدیث ہے جس میں کسی قول، فعل یا تقریر کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف کی گئی ہو۔

موقوف: وہ حدیث ہے جس میں نسبت صحابی کی طرف کی گئی ہو۔

مقطوع: مقطوع وہ حدیث ہے جس میں نسبت کسی تابعی کی طرف ہو۔

تقسیم دوم باعتبار تعداد رواۃ: اس لحاظ سے حدیث کی چار بڑی قسمیں ہیں۔

(۱) متواتر: اگر کسی روایت کو ہر زمانے میں راویوں کی اتنی تعداد روایت کرے کہ کثرت کی بناء پر ان کے جھوٹ پر اتفاق کو عقل سلیم عادتاً محال سمجھے تو حدیث متواتر کہلاتی ہے۔ بعض لوگوں نے یہاں مخصوص عدد کا اعتبار کیا ہے لیکن حق یہ ہے کہ تواتر میں راویوں کی کسی خاص عدد کا اعتبار نہیں ہوتا۔ بلکہ جب بھی کوئی تعداد یقین اور جزم کا مفید ہو تو وہ تواتر کا فائدہ دے گا۔

(۲) غریب: اگر کسی زمانہ میں کسی روایت کو روایت کرنے والا ایک ہو تو اسے غریب کہتے ہیں۔

(۳) عزیز: اگر سند کے کسی طبقہ میں رواۃ کی تعداد دو سے کم نہ ہو مگر تمام طبقات میں تین تک نہ پہنچتی ہو تو اسے عزیز کہتے ہیں۔

(۴) مشہور (۱): جب تمام مراتب سند میں رواۃ کی تعداد دو سے زیادہ ہو اور حدیث متواتر کے درجہ کو بھی نہ پہنچی ہو تو وہ حدیث مشہور یا مستفیض کہلاتی ہے۔

تنبیہ: علامہ عثمانی رحمہ اللہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ مشہور یہ ہے کہ حدیث مشہور اور حدیث عزیز میں طبقہ اولیٰ یعنی صحابہ کے زمانے میں تعداد شرط نہیں ہے گویا ایک صحابی کی روایت بھی عزیز یا مشہور ہو سکتی ہے۔

تقسیم سوم باعتبار سقوط رواۃ اور عدم سقوط: اس اعتبار سے حدیث کی دو بڑی قسمیں ہیں۔

(۱) متصل: اگر حدیث کی سند میں کہیں بھی کوئی راوی گرا ہوا نہ ہو تو اس کو حدیث متصل کہتے ہیں۔ متصل مرفوع بھی ہو سکتا ہے اور موقوف یا مقطوع بھی۔ البتہ مسند کا اطلاق کبھی تو صرف مرفوع متصل روایت پر ہوتا ہے اور کبھی یہ صرف متصل کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔

(۲) منقطع: اگر رواۃ میں کسی جگہ کوئی ایک یا زیادہ راوی ساقط ہو چکے ہوں تو اس کو حدیث منقطع (بالمعنی الاعم) کہتے ہیں۔ پھر منقطع بالمعنی الاعم کی کئی قسمیں ہیں۔

(۱) خمساء احاف کے ہاں حدیث کی بنیادی تین قسمیں ہیں (۱) متواتر (۲) مشہور (۳) آحاد جبکہ جمہور کے ہاں حدیث کی بنیادی دو قسمیں (۱) متواتر (۲) آحاد۔ خمساء احاف میں بھی بعض خمساء جیسے امام جصاص وہ اس تقسیم میں جمہور کا ساتھ دیتے ہیں۔ مگر فرق اتنا ہے کہ بعض خمساء احاف مشہور کو متواتر کا قسم اور جمہور مشہور کو خبر واحد میں داخل کرتے ہیں۔

- (۱) مرسل: وہ حدیث جس کی سند کے آخر میں صحابی ساقط ہو چکا ہو۔
- (۲) مطلق: وہ حدیث جس کی سند کی ابتداء میں ایک یا متعدد راوی ساقط ہوں۔
- (۳) منقطع بالمعنی الاخص: وہ حدیث جس کی سند کے وسط میں ایک یا متعدد لیکن غیر متالی (یعنی بغیر لگاتار کے) راوی ساقط ہوں۔
- (۴) معضل: وہ حدیث جس کی سند کے درمیان میں متعدد راوی متالی یعنی لگاتار ساقط ہو۔
- (۵) مدلس: وہ حدیث ہے جس میں راوی اپنا شیخ ترک کر کے شیخ الشیخ سے اس طرح روایت کرے کہ وہ شیخ الشیخ سے موہم سماع ہو۔ یعنی مخاطب یہ سمجھے کہ جس شیخ الشیخ کا وہ نام لے رہا ہے۔ اس سے وہ بلا واسطہ روایت کن چکا ہے۔
- تقسیم راجح: باعتبار احوال رواۃ: راویوں کی صفات اور احوال کے لحاظ سے حدیث کی ابتدائی پانچ قسمیں ہیں۔ جن کی تفصیل سے قبل راویوں میں طعون اور عیوب کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ راویوں میں دو قسم کے عیوب کا احتمال ہے۔ ایک وہ جو راوی کی عدالت کو مجروح کرتے ہیں۔ اور وہ پانچ ہیں۔ کذب، تہمت کذب، فسق، بدعت اور جہالت یعنی مجہول ہونا۔ دوم وہ جو راوی کے ضبط کو مجروح کرتے ہیں۔ وہ بھی پانچ ہیں۔ کثرت غفلت، کثرت غلط، کثرت وہم، سوء حفظ، اور دوسرے ثقہ راویوں کی مخالفت۔
- اس تفصیل کے بعد راویوں کی صفات کے اعتبار سے پانچ قسموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔
- اول: صحیح لذاتہ: وہ متصل حدیث جس کو کامل العدل اور کامل الضبط راوی روایت کریں۔ اور وہ علت و شذوذ وغیرہ صفات سے محفوظ ہو۔ صحیح لذاتہ کہلاتا ہے۔ گویا صحیح لذاتہ میں تین وجودی صفات (کمال عدالت، کمال ضبط اور اتصال) نیز وہ سلبی صفات یعنی علت سے خالی ہونا۔ اور شذوذ سے خالی ہونا معتبر ہے (۱)۔

(۱) محدثین نے صحیح کی ایک اور تعریف بھی کی ہے اذا تلقاه الناس بالقبول وإن لم يكن له إسناده صحيح قال ابن عبد البر في الاذكار لما حكى عن الترمذی أن البخاری صحح حديث البحر هو الطهور ماءه واهل الحديث لا يصتحون مثل اسناده لكن الحديث عندي صحيح لأن العلماء تلقوه بالقبول (مقدمة اعلاء السنن قواعد الحديث ۱۹/۶۰) (مختار)

دوم: صحیح لغیرہ: وہ متصل حدیث جس کی راویوں میں کمال عدل یا کمال ضبط نہ ہو لیکن یہ روایت متعدد طرق (طریقہ کی جمع) سے مروی ہو اور علت و شذوذ سے سالم ہو صحیح لغیرہ کہلاتا ہے۔ گویا اس کی سند میں نقصان کا جبیرہ تعدد اسانید کی وجہ سے ہوتا ہے۔

سوم: حسن لذاتہ: وہ متصل حدیث جس کو کامل العدل لیکن غیر کامل الضبط راوی روایت کرے اور طرق متعدد نہ ہوں لیکن علت و شذوذ سے سالم ہو۔

چہارم: حسن لغیرہ: وہ متصل حدیث جس کے راویوں میں کمال عدل نہ ہو یا کمال عدل اور کمال ضبط دونوں مفقود ہوں۔ لیکن وہ طرق متعددہ سے مروی ہو۔ اور علت و شذوذ سے بھی خالی ہو۔ حسن لغیرہ کہلاتا ہے۔

پنجم: ضعیف: وہ حدیث جسے ناقص العدل اور ناقص الضبط راوی روایت کریں۔ اور اس کے طرق بھی متعدد نہ ہوں یا اس میں علت و شذوذ وغیرہ میں عیوب پائے جائیں ضعیف کہلاتا ہے۔

حدیث ضعیف کی اقسام: حدیث ضعیف کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جن میں مشہور اقسام کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) موضوع: وہ حدیث جس کا راوی روایت حدیث میں کذب سے متہم ہو۔ یہ کذب خود اس کے اقرار یا دیگر قرائن سے ثابت ہو چکا ہو۔ موضوع کہلاتا ہے۔ ایسی حدیث قطعی طور پر غیر مقبول ہوتی ہے۔

(۲) متروک: وہ حدیث جس کا راوی غیر باب الروایت میں جھوٹ سے مطعون ہو یا یہ روایت دین کے معلوم و معروف قواعد کے خلاف مروی ہو۔

(۳) شاذ: وہ روایت جس کو ثقہ راوی روایت کرے لیکن وہ اپنے سے اوثق راوی یا ثقہ راویوں کی جماعت سے مخالف ہو شاذ کی مخالف روایت محفوظ کہلاتی ہے۔

(۴) منکر: وہ روایت جس کا راوی ضعیف ہونے کے باوجود ثقہ راویوں کی مخالفت کرے اس کی مخالف روایت معروف کہلاتی ہے۔

(۵) معلل: وہ حدیث جس میں کوئی علت خفیہ موجود ہو، جس کی وجہ سے حدیث میں ضعف ہو۔ اس

علمہ خفیہ کو صرف ماہرین فن معلوم کر سکتے ہیں۔

(۶) مضطرب: وہ حدیث جس کی سند یا متن میں کمی بیشی یا تقدیم و تاخیر وغیرہ کے لحاظ سے اختلاف ہو۔ اور اس اختلاف کو رفع کرنے کیلئے تطبیق یا ترجیح بھی ممکن نہ ہو مضطرب کہلاتی ہے۔

(۷) مصحف: وہ حدیث ہے جس میں نقطوں یا حرکت و سکون کے تغیر کی وجہ سے غلطی واقع ہوئی جب کہ عبارت کی صورت خطی باقی رہے۔ مثلاً ابی کی جگہ ابی پڑھا جائے۔ جیسے کہ عوام ابن المراحم کی جگہ عوام بن المراحم پڑھا گیا ہے۔ اس طرح ”من صام رمضان و اتبع سنأ من شوال فکأنما صام الدهر کلہ“ کی جگہ ”و اتبع شیئاً من شوال“ پڑھا گیا ہے۔ کبھی کبھی اس کو محرف بھی کہتے ہیں۔

(۸) مقلوب: وہ حدیث جس کی سند یا متن میں تقدیم و تاخیر کی گئی ہو مقدم کی جگہ مؤخر اور مؤخر کی جگہ مقدم ذکر کیا گیا ہو۔ یا کسی راوی کی جگہ دوسرا راوی ذکر کیا جائے۔ یا کسی متن کی سند کو دوسرے متن کی سند سے بدل دیا جائے۔

(۹) مدرج: وہ حدیث جس میں راوی اپنا کلام حدیث میں بغرض تفسیر داخل کر دے لیکن ادوات تفسیر ذکر نہ کرے۔

(۱۰) منقلب: وہ حدیث جس میں راوی تفسیر کی غرض سے نہیں بلکہ صرف مناسبت کی وجہ سے اپنا کلام داخل کر دے جیسے ”لاتحامدوا ولا تباغضوا ولا تدابروا..“ کے ساتھ ”ولاتنافسوا“ کا اضافہ بھی روایت کیا جائے۔

(۱۱) مدلس: وہ روایت جس میں راوی شیخ کو ترک کر کے شیخ الشیخ سے روایت کرے یوں کہ شیخ الشیخ سے حدیث سننے کا ایہام بھی ہو۔ یہ بھی ضعیف کی ایک قسم ہے۔

(۱۲) غریب: غریب اور فرد حدیث بھی کبھی کبھی غرابت کی وجہ سے ضعیف ٹھہرائی جاتی ہے۔ ضعیف کی دیگر قسموں میں وہ روایات ہیں جس کا راوی مجہول، مبتدع اور سنی الحفظ ہو۔

تقسیم خامس باعتبار صیغ ادا: ادائے حدیث کے صیغوں کے اعتبار سے حدیث کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) حدیث مسلسل: وہ حدیث جس میں روایت مقبول صیغوں سے ادا کی جائے۔ جیسے حدثنا فلان،

أخبرنا فلان، أنبأنا فلان، قال لنا، روى لنا، سمعته يقول، ذكرني فلان وغيره
(۲) حدیث مصحح: وہ حدیث ہے جسے عن ان یا ان صیغوں سے روایت کیا جائے جو راوی کے سماع پر
دلالت نہ کریں۔ جیسے عن فلان، ان فلاناً قال، روى فلاناً، قال فلان، ذکر فلان، کتب فلان
وغیرہ۔ اس کو حدیث مؤئن بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ ان اور ان سے بھی روایت ہوتا ہے۔
تنبیہ: حدیث مصحح کی قبولیت اور قبولیت کی شرائط میں وسیع اختلاف ہے۔ جسے اختصاراً ترک
کیا جاتا ہے۔

تقسیم سادس حدیث مقبول میں: عمل کے اعتبار سے حدیث مقبول دو قسم پر ہے۔

(۱) محکم سالم عن المعارضة (۲) مختلف الحدیث

محکم حدیث جس کا کوئی معارض موجود نہ ہو۔ مطلقاً معمول پہ ہوتا ہے۔ جبکہ مختلف الحدیث یعنی
وہ حدیث جس کا دوسرے حدیث سے تعارض ہو تفصیل طلب ہے۔ چنانچہ اگر دو حدیث متعارض ملیں تو
سب سے پہلے ان میں تطبیق تلاش کی جائے گی۔ اگر دونوں کے الگ الگ محل مل جائیں تو دونوں حدیثوں
پر عمل کیا جائے گا۔ تطبیق ممکن نہ ہو تو دونوں حدیثوں کی تاریخ کو دیکھا جائے گا۔ اگر ان میں سے کوئی حدیث
مؤخر ہو تو وہ معمول یہ ہوگا اور مقدم منسوخ ہوگا۔ اگر تاریخ معلوم نہ ہو سکے تو پھر اسباب التریج کی طرف
رجوع کیا جائے گا۔ اگر ایک کو رائج ثابت کر لیا گیا تو دوسری معمول یہ اور دوسرا متروک ہوگا۔ اور اگر یہ بھی ممکن
نہ ہو سکے تو پھر دونوں پر عمل نہیں ہوگا اور توقف اختیار کیا جائے گا۔

امریا زدہم: مراتب رواۃ اور صحاح کی درجہ بندی: قوت وضعف کے لحاظ سے راویوں کے
پانچ مرتبے ہیں۔

(۱) قوی الضبط کثیر الملازمہ: یہ وہ راوی ہے جو حدیث کے اخذ کے وقت غفلت اور ادا کے
وقت کثرت خطا سے محفوظ ہو نیز اپنے استاد سے استفادہ کا التزام رکھے۔

(۲) قوی الضبط قليل الملازمہ: وہ راوی جو غفلت اور خطا کی کثرت سے تو محفوظ ہو لیکن شیخ سے
اس کا استفادہ قلیل ہو۔

(۳) قلیل الضبط کثیر الملازمہ: وہ راوی جو دوسری قسم کا عکس ہو۔

(۴) قلیل الضبط قلیل الملازمہ سالم من العیوب: وہ راوی جس کا ضبط اور شیخ کے ساتھ

ملازمہ تو ناقص ہو لیکن اس کی عدالت میں نقص نہ ہو اور کذب فسق اور بدعت یا جہالت سے متصف نہ ہو۔

(۵) قلیل الضبط قلیل الملازمہ مطعون: جو راوی ضبط و ملازمہ میں ناقص ہونے کے ساتھ

ساتھ مذکورہ عیوب میں سے کچھ عیوب سے مطعون بھی ہو۔ ان کو ضعیفاء اور مجہولین بھی کہا جاتا ہے۔

ان مراتب کو ملحوظ رکھ کر صحاح ستہ کی درجہ بندی یوں کی جاتی ہے کہ امام بخاریؒ طبقہ اولیٰ سے

بالاستیعاب روایت کرتے ہیں۔ اور دوسرے طبقہ کے راویوں سے انتخاب فرماتے ہیں۔ اس لئے ان کی

کتاب صحت کے اعلیٰ مقام پر ہے۔

امام مسلمؒ کی کتاب دوسرے نمبر پر ہے۔ اس لئے کہ وہ اول دو طبقوں سے بالاستیعاب روایت

کرتے ہیں۔ جب کہ تیسرے طبقہ کے مشاہیر سے روایت کرتے ہیں۔

امام ابوداؤد اور امام نسائیؒ اول الذکر تین طبقوں سے بالاستیعاب روایت کرتے ہیں۔ جب کہ

چوتھے طبقہ کے راویوں سے انتخاب فرماتے ہیں۔ لیکن امام نسائیؒ کی کتاب کو امام ابوداؤد کی سنن پر سبقت

درجہ ذیل وجہ سے حاصل ہے۔

(۱) امام نسائیؒ کمزور احادیث کی کمزوری بیان کر لیتے ہیں۔ جبکہ امام ابوداؤد ایسا کم کرتے ہیں۔

(۲) طبقہ رابعہ سے امام نسائیؒ کی روایت کم ہوتی ہے۔ جب کہ امام ابوداؤد نسبتاً زیادہ روایت کرتے ہیں

(۳) امام نسائیؒ شخصی لحاظ سے امام ابوداؤد کی نسبت احفظ ہیں۔ بلکہ علامہ سبکیؒ اور علامہ ذہبیؒ نے تو ان کو

مسلمؒ سے بھی زیادہ احفظ کہا ہے۔

امام ترمذیؒ پہلے چار طبقوں سے روایت کرتے ہیں اور پانچویں طبقہ کے مشاہیر سے بھی۔ لیکن

انہوں نے بھی اکثر مقامات پر عقیدہ کا اہتمام کیا ہے۔ لہذا وہ پانچویں نمبر پر ہے۔

اور آخر میں ابن ماجہؒ کی سنن کا درجہ آتا ہے۔ جو مذکورہ تمام طبقات سے روایت کرتے ہیں۔

امردواز دہم: مشتعلین فی الحدیث کی اقسام:

(۱) طالب: وہ شخص جو طلب حدیث اور اخذ روایت کی ابتداء کرتا ہے۔

(۲) محدث یا شیخ الحدیث: وہ شخص جو روایات کے حصول کے بعد اس کو نقل کرتا ہو علم حدیث کے ساتھ ایسا تعلق ہو کہ نسخ و منسوخ، احوال رواۃ، علل احادیث کے اصول سے واقف ہو۔ اور علم حدیث میں مشغول رہے۔ بعض لوگوں نے ایک ہزار روایات یاد ہونے کی بھی شرط لگائی ہے۔ لیکن مولانا عزاز علیؒ نے یہ تعریف لکھی ہے کہ ”من یعتنی بروایتہ ویکتفی بحدیثہ“ یعنی اس کی روایت معتبر اور شرح احادیث قابل اعتماد ہو۔

(۳) حافظ: وہ محدث جسے ایک لاکھ احادیث اسماء الرجال اور نسخ و منسوخ کی معرفت کے ساتھ یاد ہوں۔

(۴) حشیہ: وہ شخص جس کو تین لاکھ احادیث مذکورہ حیثیت کے ساتھ یاد ہوں۔

(۵) حاکم: وہ شخص جس کو تمام روایات اور بعض حضرات کے بقول دس لاکھ احادیث متناً و سنداً جرحاً و تعدیلاً یاد ہوں۔

حافظ، حشیہ اور حاکم کی مذکورہ تعریفیں ملا علی قاریؒ نے فرمائی ہیں۔ لیکن بعض حضرات کا خیال ہے کہ متقدمین کی کتابوں میں مذکورہ القاب کی مینہ تعریفات نہیں ملتیں۔

امر سیز دہم: حجیت حدیث: دیگر فتنوں کی طرح دور حاضر میں انکار حدیث کا فتنہ بھی زوروں پر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس دور کے علماء کو جزائے خیر عطا فرمائے جنہوں نے مستقل کتابیں لکھ کر اس فتنے کا سد باب کیا۔ اس لئے ہم اس بحث کو زیادہ تو نہیں چھیڑنا چاہتے۔ بطور خلاصہ صرف اتنا کہیں گے کہ قرآن مجید خود حدیث کی حجیت پر ناطق ہے۔ اور احادیث سے انکار قرآن سے انکار کے مترادف ہے۔ قرآن خود کہتا ہے۔

(۱) اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول (الآیۃ)

اگر صرف قرآن ہی دلیل و حجت ہے تو اطیعوا الرسول کیلئے کیا رہ جاتا ہے۔

(۲) قل ان كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله. (الآية)

اتباع رسول کا امر حدیث پر عمل کی صورت ہی میں ممکن ہے۔

(۳) من يطع الرسول فقد اطاع الله (الآية)

شرط اور جواب شرط میں مغائرت کے اصول کے مطابق اطاعت رسول، قرآن پر عمل کرنے کے

بعد ایک اور مامور بہ ہے۔

(۴) ولكم في رسول الله أسوة حسنة. (الآية)

اس اسوہ حسنہ کو احادیث کے سوا ہم کہاں ڈھونڈ کے لائیں۔

(۵) وما اتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوه. (الآية)

کلمہ ما کا عموم اس کا متقاضی ہے کہ قرآن کی طرح حدیث بھی واجب العمل ہے۔ کیونکہ وہ بھی

”ما اتاكم اور مانهكم“ کا مصداق ہے۔

امر چہار دہم: شرف علم حدیث: قرآن مجید کے علم کے بعد بالاجماع علم حدیث کا مقام آتا ہے۔

بلکہ امام ابو حنیفہؒ سے مروی ہے۔ لولا السنة لعافهم القرآن۔ ظاہر ہے کہ قرآن فہمی کے لئے احادیث کا

علم ضروری اور موقوف علیہ ہے۔ کیونکہ قرآنی احکام کے اجمال کی تفصیل نبی اکرم ﷺ کے قول و فعل ہی

میں موجود ہے۔

علاوہ ازیں علم حدیث کا موضوع ذات النہی من حیث ہونہی ہے۔ اور ذات النہی تمام

مخلوقات سے افضل ہے۔ اس لئے اس سے بحث کرنے والا علم بھی افضل العلوم ہوگا۔

دوسری طرف علم حدیث کی اشاعت کرنے والوں کے لئے نبی اکرم ﷺ کی خصوصی دعائیں،

اس علم کی افضلیت کی کافی دلیل ہیں۔ بہر حال علم حدیث کا علوم میں ایک بڑا عظیم مرتبہ ہے۔ اس وجہ سے

علماء کا فیصلہ ہے کہ ”علم حدیث کا حصول فرض کفایہ ہے“

شمائل ترمذی

علم حدیث سے متعلق ضروری مباحث ذکر کرنے کے بعد کتاب کے بارے میں چند ضروری مباحث کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اسراول: مؤلف کتاب: امام ترمذی رحمہ اللہ

امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن النخاک السلمی الضریری البوغی الترمذی کا شمار چوٹی کے ان محدثین میں ہوتا ہے جن کی خدمت حدیث کا اعتراف پورے عالم میں اور ہر زمانہ میں یکساں کیا جاتا ہے۔ آپؑ کی کنیت ابو عیسیٰ تھی۔ مصنف ابن ابی شیبہؒ کی ایک حدیث میں ابو عیسیٰ کنیت رکھنے سے منع بھی مروی ہے۔ اس کے باوجود آپ کی کنیت ابو عیسیٰ مشہور ہے۔ اور خود کتاب میں اپنے آپ کیلئے یہی کنیت استعمال کرتے ہیں۔

آپؑ کی اس روش کے لئے شراح حدیث متعدد وجہات کرتے ہیں مثلاً

(۱) مصنف ابن ابی شیبہؒ کی حدیث منسوخ ہے۔

(۲) اس حدیث میں نہی تنزیہی ہے کیونکہ حضرت مغیرہ ابن شعبہؒ نے جب نبی کریم ﷺ سے ابو عیسیٰ کنیت رکھنے کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے اجازت دے دی۔ یعنی یہ دلیل ہے کہ یہ نہی تحریمی نہیں تھی۔

(۳) مصنف ابن ابی شیبہؒ کی حدیث امام ترمذیؒ تک نہیں پہنچی۔

(۴) مصنف ابن ابی شیبہؒ کی حدیث میں نہی صرف اس صورت پر محمول ہے۔ جس میں حضرت عیسیٰؑ کے لئے والد ثابت ہونے کا ابہام ہو۔ مطلقاً یہ کنیت استعمال کرنا ممنوع نہیں ہے۔ اس پر قرینہ یہ ہے کہ خود مصنفؒ کی روایت میں نہی مرفوع نہیں ہے۔ بلکہ واقعہ یوں ہے کہ ایک صحابی نے کنیت ابو عیسیٰ رکھ لی تھی۔ جب نبی کریم ﷺ کے علم میں یہ بات آئی تو فرمایا اِنَّ عِيسٰی لَا اَبَ لَہ۔

(۵) بعض حضرات نے نبی کریم ﷺ کے کلام کو ملاحظت اور مزاح پر بھی محمول کیا ہے۔ کہ مقصود نہی نہیں بلکہ توہم فاسدہ کی طرف اشارہ ہے۔ البتہ حضرت عمرؓ سے اس پر واضح نکیر مروی ہے۔ کہ انہوں

نے اپنے ایک بیٹے کو اس پر سزا بھی دی تھی جس کی کنیت ابو عیسیٰ تھی۔ اور مغیرہ بن شعبہ کی کنیت تبدیل کر کے ابو عبد اللہ رکھ دی تھی۔

بہر حال روایات پر نظر غائر کرنے کے بعد اس کنیت کے استعمال کی ممانعت کی دلیل غیر مضبوط نظر آتی ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے امام ترمذیؒ نے اس کنیت کو استعمال فرمایا ہے۔

آپؐ کی نسبتیں: بنی سلم قبیلہ کی طرف نسبت کی وجہ سے آپؐ کو سلمیٰ کہا جاتا ہے۔ ضریر آپؐ کو اس لئے کہتے ہیں کہ بعض مؤرخین کے نزدیک آپؐ مادر زاد اعمہ تھے۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔

صحیح یہ ہے کہ غلبہ خوف الہی کی وجہ سے آپؐ اکثر رویا کرتے تھے جس کی وجہ سے آپؐ کی بیٹائی جاتی رہی۔ جیسا کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ بستان المحمدین میں لکھتے ہیں کہ ”بخوف الہی بسیار گریہ وزاری کرد و نایبنا شد“ یہی بات علامہ ابن کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں بھی لکھی ہے اور امام حاکمؒ سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔

بوغی: بوغ کی طرف نسبت ہے۔ جو ترمذ سے ۱۸ میل کے فاصلے پر ایک قصبہ ہے۔ جب کہ ترمذ دریائے آمو کے کنارے ایک شہر اور بوغ کیلئے مرکز ہے۔ اس لئے ترمذ کی طرف بھی آپؐ کی نسبت کی جاتی ہے۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ ترمذی کے حوالے سے تین محدثین مشہور ہیں۔

(۱) ابوالحسن احمد بن الحسن الترمذیؒ جو ترمذی کبیر کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ابو عیسیٰ ترمذی اور امام بخاری کے شیوخ میں سے ہیں اور امام محمدؒ اور امام احمدؒ کے شاگرد ہیں۔ فقہ حنابل اور رجال کے بہت ماہر ہیں۔ ۲۲۹ھ کے بعد وفات پائی ہے۔

(۲) ابو عبد اللہ محمد بن علی بن الحسن الترمذیؒ الزاہدی حکیم الترمذی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ اپنی کتاب نوادر الاصول سے مشہور ہوئے ہیں۔ یہ سلوک اور طریقت میں زیادہ مجتہد تھے۔ حتیٰ کہ بعض تفردات کی وجہ سے ترمذ سے جلا وطن کئے گئے تھے۔ ۲۸۵ھ تک زندہ تھے۔

(۳) محمد بن عیسیٰ ابو عیسیٰ الترمذیؒ یعنی ہمارے امام ترمذیؒ یہ عمر میں سب سے چھوٹے ہیں۔ ۲۹۰ھ

میں یوغ میں ان کی ولادت ہوئی۔ اور سوموار ۳ رجب ۲۷۹ھ میں وفات پائی۔
علامہ کاشمیری فرماتے ہیں۔

الترمذی محمد فوزین عطر وفات عمره فی عین

تحصیل علم: آپؑ نے تحصیل علم میں بہت سے علاقوں کے سفر کئے۔ خراساں، عراق اور حجاز کے متعدد شہروں میں سینکڑوں شیوخ سے استفادہ کیا۔ بخاری کے شاگرد ہیں۔ جامع ترمذی میں اسماء رجال اور نقد حدیث میں ان سے اپنے استفادے کو بار بار بیان کرنے کے علاوہ ان سے دو روایتیں بھی نقل کی ہیں۔ امام مسلمؑ سے بھی ایک روایت جامع ترمذی میں روایت کی ہے۔ نیز بہت سے اساتذہ میں وہ امام بخاریؑ اور امام مسلمؑ کے شریک بھی ہیں۔

مسلك: علامہ شاہ انور شاہ کاشمیریؒ نے فیض الباری ج ۱ ص ۵۸ میں امام ترمذی کو شافعی المسلك قرار دیا ہے۔ اسی طرح عرف شذی میں بھی آپ کا یہ قول منقول ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ان کو مجتہد منسوب الی احمد و اسحق بتایا ہے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ امام ترمذی کسی بھی امام کے مقلد محض نہیں ہیں۔ اگرچہ اکثر و بیشتر وہ امام شافعی کے مسلك کے موافق ہوئے ہیں۔

علامہ ابن تیمیہؒ نے ان کو اہل حدیث میں سے شمار کیا ہے۔ یعنی نہ تو وہ مجتہد مطلق ہیں نہ مقلد محض (۱)۔

مناقب: امام ترمذیؒ حدیث کے بڑے امام ہیں۔ لیکن ابن حزم اندلسیؒ نے ایک عجیب بات لکھی ہے۔ وہ یہ کہ ”محمد بن عیسیٰ ترمذی مجہول ہیں“ ابن حزمؒ کے اس قول کے بارے میں بعض لوگوں نے توجیہات کی ہیں۔ چنانچہ علامہ ذہبیؒ میزان الاعتدال میں فرماتے ہیں۔ کہ ابن حزمؒ نے اپنی کتاب میں ترمذی کو اس لئے مجہول کہا ہے کہ ان کو ترمذی کی جامع اور کتاب العلل نہیں پہنچی (۲)۔

اسی طرح میر الخلاءؒ میں ابن حزمؒ کچھ مناقب اور کچھ عیوب بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

(۱) راجع توجیہ النظر الی اصول الاثر ص ۱۸۵

(۲) میزان ج ۲ ص ۲۸۹

(۳) سیر النبلاء جلد ۱ ص ۲۰۱

”ما ذکر سنن ابن ماجہ ولا جامع ابی عیسیٰ الترمذی فانہ مارء اہما ولا ادخلا الی الاندلس الا بعد موتہ (۳)“

لیکن ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ یہ بات کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ ابن حزمؒ نے شاید امام ترمذی کو نہیں پہچانا تھا۔ اور ان کے حافظہ اور تصانیف کا ان کو علم نہیں تھا۔ یہ اس لئے کہ ابن حزم نے یہ عبارت دوسرے مشہور ثقہ حفاظ کے بارے میں بھی لکھی ہے۔ مثلاً ابی القاسم بغویؒ، اسماعیل ابن محمد صفارؒ اور ابوالعباس الاصمؒ وغیرہ کو بھی مجہول کہا ہے۔ خصوصاً جب حافظہ فرضی نے ترمذیؒ کا ذکر اپنی کتاب الموطلف والمختلف میں قدرومنزلت کے ساتھ کیا ہے تو کیسے ابن حزمؒ امام ترمذیؒ کو نہ پہچان سکا (۱)۔

حق یہ ہے کہ ابن حزمؒ رجال کے سلسلے میں انتہائی قشدد ہیں۔ مشہور ہے کہ قلم ابن حزم کسیف حجاج یعنی حجاج کی تلوار کی طرح ان کے قلم سے بھی کوئی نہ بچ سکا۔

بہر حال امام ترمذیؒ جلیل القدر امام ہیں۔ عمر بن علک کا بیان ہے کہ بخاری نے مرتے مرتے سارے خراسان میں ترمذی جیسا شخص علم و ورع اور زہد میں نہیں چھوڑا۔

حافظہ: ان کا حافظہ ضرب المثل تھا۔ احمد بن عبد اللہ بن داؤدؒ خود امام ترمذیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے ایک شیخ کی حدیثوں کے دو جزء (رسالے) لکھے تھے۔ ایک دفعہ مکہ جاتے ہوئے اس شیخ سے ملاقات کا موقع ملا۔ میں نے ان کے بارے میں لوگوں سے پوچھا۔ بتایا گیا کہ وہی شیخ ہیں۔ میں وہی دو جزء سننے کے لئے ان کے پاس حاضر ہوا۔ میرا خیال تھا کہ لکھے ہوئے جزء میں اپنے ساتھ اٹھالایا ہوں۔ لیکن غلطی سے میں ان جزءوں کے مشابہ دوسرے سفید جزء کو ساتھ لایا تھا۔ ملنے کے بعد میں نے وہ دو جزء سنانے کی درخواست کی۔ تو وہ اپنے حافظہ سے وہی احادیث سنانے لگے۔ اور میں خالی صفحے سامنے رکھ کر سنتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا تو سفید کاغذ پر نظر پڑھتے ہی غصہ ہو کر بولا کہ تمہیں مجھ سے شرم نہیں آتی؟۔۔۔ میں نے سارا واقعہ سنا دیا۔ اور کہا کہ آپ کی ساری احادیث میں یاد کر چکا ہوں۔ وہ بولے کہ پڑھو اور میں نے احادیث سنا دیں۔ اس نے کہا کہ میرے پاس آنے سے پہلے تو یہ احادیث تجھ کو یاد نہ تھیں۔ میں نے کہا

نہیں۔ پھر اس نے کہا کہ چلو تم کو اور احادیثِ سنادوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے نادر و غریب احادیث میں سے چالیس احادیثِ سنادیں۔ جب بعد میں میں نے اسی طرح دھرادیں۔ تو وہ بولے عارِ ایتِ مشک (۱)۔

امام ترمذیؒ خود نقل کرتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے مجھ سے کہا ”میں نے تجھ سے جتنا نفع حاصل کیا اتنا تم نے مجھ سے حاصل نہیں کیا“

علامہ کاشمیریؒ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ایک کامل استاد کو ایک کامل شاگرد کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ وہ اس کے علوم و فیوض کی اشاعت کرے۔ یہی امام بخاریؒ کا اس مقام پر مقصد تھا۔

کتب: آپؒ کی عظمت کا اندازہ آپؒ کی تصنیفات سے بخوبی ہوتا ہے۔ جو آپؒ کے کثرتِ علم، تاریخِ دانی، اسماءِ رجال اور علل الاحادیث کی معرفت، فقہی مہارت اور طلبِ حدیث میں جہاں نور دی کی واضح دلیل ہیں۔ سب سے زیادہ جامع اور مفید ترین کتاب ”جامع ترمذی“ ہے۔ اس طرح کتاب ”العلل الکبیر“ اور ”کتاب العلل الصغیر“ کی افادیت بیان سے مستغنی ہے۔ شمائل ترمذی میں آپؒ نے جس نچ سے سیرت و صورتِ نبوی ﷺ کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ اپنی مثال آپؒ ہے۔ اصحابِ صحاح ستہ میں علوسند کے لحاظ سے امام ترمذیؒ کا بڑا مقام ہے۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے کل بائیس ثلاثی احادیث ذکر کی ہیں۔ جبکہ امام ترمذیؒ نے جامع کی کتاب الفتن میں ایک ثلاثی حدیث روایت کی ہے۔ البتہ ابن ماجہؒ کی کتاب میں صحیح بخاریؒ سے بھی زیادہ ثلاثی احادیث موجود ہیں۔

لیکن صحت کے لحاظ سے امام ابن ماجہؒ کی کتاب آخری مرتبہ میں ہے۔ جبکہ صحیح مسلم، سنن ابی داؤد اور سنن نسائی ثلاثیات سے خالی ہیں۔

امردوم: کتاب شمائل ترمذیؒ: امام ترمذیؒ نے کتاب شمائل ترمذی لکھی ہے۔ جو اپنے طرز پر مضمون کے لحاظ سے بے مثال کتاب ہے۔ اگرچہ آپؒ کی تقلید میں دیگر محدثین نے بھی اس موضوع کو ایک مستقل موضوع کی حیثیت دیکر تالیفات کیں۔ لیکن ”الفضل للمتقدم“ کے تحت اس موضوع پر پہلی تالیف آپؒ کی ہے یہ ایک واضح اور مسلمہ حقیقت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ سراپا نور و ہدایت ہے۔

دوست، دشمن، مؤمن، کافر آپ کے کردار کی عظمت اور لاثانی دیانت و امانت کے قائل رہے۔ نبوت سے پہلے کی زندگی اتنی بے داغ رہی کہ رب ذوالجلال نے اسے نبوت کی دلیل کے طور پر پیش کیا۔ فرمایا

لقد لبثت فيكم عمراً من قبله أفلا تعقلون (سورۃ یونس)

یعنی دعویٰ نبوت سے پہلے تمہارے درمیان میں نے چالیس برس گزارے۔ تم ہی لوگوں نے مجھے صادق و امین مانا۔ تم ہی نے مجھے دیانت، عبادت، اخلاق عالیہ، عصمت کاملہ کا مرقع گردانا۔ انسانیت کے سب سے بلند مقام پر ہوتے ہوئے کیا یہ ممکن ہے کہ اچانک چالیس سال بعد خداوند کریم پر جھوٹ بولنے کا عظیم ترین جرم سرزد ہو جائے۔ کردار کی یہ بلندی آج بھی اطاعت کی متقاضی ہے۔

ایک غیر مسلم بادشاہ ہرقل نے بھی ابوسفیانؓ سے انٹرویو کے دوران یہی سوال کیا تھا کہ فہل کنتم تہمونہ بالکذب قبل ان يقول ما قال، نبوت کے دعویٰ سے قبل کیا تم لوگ اس نبی پر کبھی جھوٹ بولنے کی تہمت لگانے کے روادار ہوئے؟

ابوسفیان نے جواب دیا نہیں۔ ہرقل رومی نے بالآخر فیصلہ سناتے ہوئے یہی کہا۔ کہ فقد اعرف انه لم يكن ليلذر الكذب على الناس و يكذب على الله۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ شخص لوگوں میں تو جھوٹ بولنے سے بچتا رہے اور جا کر خدا پر جھوٹ باندھنے لگے (۱)۔

اخلاق و دیانت کی عظمت کے ساتھ ساتھ نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس حسن و جمال اور مادی و صوری کمالات کا بھی مرقع تھی۔ جس کا کھل تذکرہ کتاب میں آئیگا۔

حسن صورت بھی مقبولیت اور تقلید و اطاعت کا فطری سبب ہے۔ اسی وجہ سے عقل و خرد اور علم و دانش کے ساتھ ساتھ سفارت کیلئے ایسے لوگوں کا عادی انتخاب کیا جاتا ہے جو ظاہری تقدس، وقار اور محاسن کا حامل ہو۔ جس کا مشاہدہ روزمرہ کی زندگی میں کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ نبی اکرم ﷺ کے ظاہری و باطنی محاسن کو اجاگر کرنا اشاعت دین اور ہدایت عالم کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اور گویا امام ترمذیؒ نے اس موضوع پر مستقل کتاب لکھنے میں سبقت حاصل

کرتے ہوئے مضمون اور طرز کے لحاظ سے بے نظیر کتاب شمائل ترمذی تالیف فرمائی ہے۔ پھر اگر امام ترمذی نے اپنی جامع ترمذی کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا تھا کہ من کان فی بیتہ هذا الكتاب فکانما فی بیتہ نبی یتکلم

جس کے گھر میں جامع ترمذی ہو تو گویا اس کے گھر میں بولتا ہوا نبی موجود ہے۔ تو یہ کہنا بھی بالکل بے جا نہ ہوگا۔ کہ جس کے پاس شمائل ترمذی موجود ہو تو گویا اس کے سامنے نور افشاں عنبر موجود ہے۔

اهل الحدیث ہم اهل النبى وان لم یصحبوا نفسہ انفاہ صحبوا ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں:

ومن احسن ما صنف فی شمائلہ وأخلاقہ رحمۃ اللہ علیہ کتاب الترمذی المختصر الجامع فی سیرہ علی الوجه الاتم بحیث ان مطالعة هذا الكتاب كأنه یطالع طلعة ذالک الجناب ویرى محاسنه الشریفة فی کل باب (۱)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و شمائل میں امام ترمذیؒ کی مختصر مگر سیرت طیبہ میں جامع و کامل کتاب سب سے اچھی کتاب ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والا گویا جناب عالی کا خود مطالعہ کرتا ہے اور ہر باب میں محاسن شریفہ خود دیکھ رہا ہے۔

صاحب تحفۃ الاحوذی لکھتے ہیں:

ومنها شمائل النبى صلی اللہ علیہ وسلم وهو احسن الكتب المؤلفة فی هذا الباب کثیر الیمن والبرکات وقال الشیخ عبد الحق فی اشعة الملمعات ”وخوانم آں برائے مہمات مجرب اکابر است (۲)۔“

امام ترمذیؒ کی تصانیف میں سے شمائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ جو اس باب میں سب سے اچھی کتاب ہے۔ اور بہت سے برکات کا حامل ہے۔ شیخ عبد الحقؒ اشعة الملمعات میں لکھتے ہیں کہ اس کتاب کا پڑھنا اکابر کے ہاں اہم حوائج میں مجرب ہے۔

عشاق ایسی کتاب پا کر بقول گئے یہ کہ کربھی تسکین خاطر کر لیتے ہیں ۔

یا عین ان بعد الحبيب و داره وفات مرابعه و شط مزاره

فلقد ظفرت من الحبيب بظائل ان لم تريه فهذه آثاره

یعنی اے میری آنکھ! اگر محبوب دور ہے، اس کا گھر دور ہے، مسکن دور ہے، ملاقات محذّر ہے۔

پھر بھی محبوب سے استفادے تک تجھے رسائی حاصل ہے۔ اگر تو اس کو نہیں دیکھ سکتا تو یہ اس کے نشانات ہیں (اس سے تسکین حاصل کر لے)

انہی جذبات کے تحت بندہ کو بھی یہ خیال آیا کہ حسن دو عالم کا ذکر بھی تو ایک لذت ہے۔ کم از کم

میرے ان نقوش کو بھی اس حسن کی وجہ سے استحسان کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

ما ان مدحت محمداً بمقالتي ولكن مدحت مقالتي بمحمد

اس مقصد کیلئے شیخنا حضرت مولانا سمیع الحق صاحب دامت برکاتہم کے درس کا انتخاب کیا۔ اور

اس کو حتی الوسع اپنی تعبیر کا رنگ دے کر قارئین کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ میں اس خدمت میں کس حد تک

کامیاب ہوا ہوں یہ فیصلہ قارئین پر چھوڑ رہا ہوں۔ میں اپنی جہالت اور وفور معاصی پر نظر کر کے کبھی بھی یہ

نہیں کہہ سکتا کہ میرے علاوہ کوئی بھی اس کام کو مجھ سے بہتر نہیں کر سکتا۔ بلکہ یہ ضرور کہتا ہوں کہ اگر میرے

احباب میری کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے مجھے تنبیہ کر لیں۔ تو منت شناسی اور امتنان و تشکر میں بندہ کو کسی سے

کم نہیں پائیں گے۔

امر سوم: شرح کیلئے نام کا انتخاب: صحیح بخاری کے درس کے لئے فتح الباری کا مطالعہ کر رہا تھا کہ

حمید حبیب اللہ سیدۃ عائشہ کے بارے میں حضرت حسان بن ثابتؓ کی زبان سے نکلا ہوا الہامی قصیدہ

سامنے آیا۔ جس میں انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے۔

کرام المساعي مجدهم غیر زائل

عقيلة حی من لؤی بن غالب

وطهرها من كل سوء وباطل

مهذبة قد طيب الله خيمها

فلارفعت سوطی الی انامل

لان كنت قد قلت الذی زعموا لکم

فکیف وودى ماحییت ونصرتی لآل رسول اللہ زین المحافل (۱)

اچانک اس وقت یہ سوچ آئی کہ اصل ”زین المحافل“ تو نبی کریم ﷺ ہیں۔ انہی کی وجہ سے آل رسول ﷺ کی مجلسیں حسین ہونے لگی تھیں۔ اور ساتھ ہی زیر تہییب شرح کا بھی دھیان آیا۔ نام پسند آگیا۔ بعد میں حضرت الشیخ مظلّم نے فون پر نام کے بارے میں دریافت فرمایا تو بندہ نے تجویز سامنے رکھ دی۔ اور ان کو بھی پسند آگئی۔

امر چہارم: التزامات: اس شرح کی تکمیل میں بندہ نے جن امور کو بالخصوص م نظر رکھا وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) اس شرح کی اساس چونکہ حضرت شیخ مظلّم کی درس تھی۔ لہذا اصل مضمون میں تہر بہت ہی کم کرنا پڑا۔

(۲) شرح کی زبان کو عامیانه رکھنے کی بجائے تعلیمی زبان اور تدریسی اصطلاحات کو ترجیح دی گئی ہے۔ اس لئے کہ یہ صورت علماء اور طلباء کے لئے خصوصی افادیت کی حامل ہے۔ پھر بھی اہم مقامات پر مناسب تفصیل کے ذریعے عوامی استفادے کو ممکن بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۳) لغوی اور فنی تشریحات میں مبتدئین کی بجائے مفتی طلبہ کی رعایت کی گئی ہے۔ اس لئے طول سے بچنے کی خاطر عام، صرفی، نحوی اور لغوی تحقیقات کو محدود کر دیا گیا ہے۔

(۴) شرح میں بیان کی گئی بعض احادیث اور آیات کی حتی الوسع تخریج کر دی گئی ہے۔

(۵) متداول شروح اور اکابر کی تحقیقات سے مراجعت کے بعد بعض مقامات میں مفید اضافے کرنے پڑے جو اگرچہ کم ہیں لیکن انتہائی ضروری تھے۔ اہل علم کو پتہ ہے کہ کوئی بھی شرح اس عمل سے مستغنی نہیں ہے۔

(۶) تقریباً ہر باب کے خاتمے پر خلاصہ باب کے عنوان سے ایک خلاصہ تحریر کیا گیا ہے۔ تاکہ باب کا اندازہ لگ سکے۔ میرا خیال ہے کہ کسی باب کو پڑھنے سے پہلے خلاصہ باب کو پڑھا جائے تو سارے باب کے سمجھنے میں بہت معاون ہوگا۔

(۷) ہر حدیث کے راوی کے حالات کو بقدر ضرورت تحریر کیا گیا ہے۔ لیکن تکرار سے بچنے کی خاطر صرف اس حدیث کے ضمن یہ حالات تحریر کئے گئے ہیں جو شمائل ترمذی میں اس کی پہلی حدیث ہو۔ سہولت کے لئے مذکورہ راویوں کے ناموں کی فہرست حروف تہجی کے لحاظ سے آخر میں شامل کی گئی ہے تاکہ جس راوی کے حالات معلوم کرنے ہوں ان سے مروی پہلی حدیث کی نشاندہی ہو جائے۔

(۸) ابتداء میں علم حدیث اور کتاب کے تعارف کے طور پر ایک مفید مقدمہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

(۹) کسی حدیث میں اشکال کی توجیہ میں مختلف آراء کو وسط کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ توجیہات میں ترجیح بھی بعض مقامات پر ظاہر کی گئی ہے۔

(۱۰) نسخوں میں اختلاف کے وقت جامع ترمذی شریف کے ساتھ مطبوعہ نسخے کا خیال رکھا گیا ہے۔ کیونکہ طلبہ کو عموماً یہی نسخہ میسر ہوتا ہے۔ البتہ بعض مقامات پر دوسرے نسخوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

وجہ ضبط و ترتیب: یہ شوال ۱۴۰۰ھ مطابق اگست 1980ء کی بات ہے۔ جب راقم الحروف پہلے پہلے دارالعلوم حقانیہ میں ایک معلم کی حیثیت سے داخل ہوا۔ تمام اساتذہ محاسن و کمالات کے خزانے تھے۔ بندہ حسب عادت اساتذہ کے قرب کو درس پر بھی مقدم سمجھتا تھا۔ البتہ حضرت الشیخ مولانا سمیع الحق صاحب سے ذرا بعد تھا۔ خیال تھا کہ عام صاحبزادوں کی طرح ان میں بھی نزاکت یا تعلیٰ قسم کی کوئی خوبی ہوگی اور ایسے شخص کے ساتھ تا دیر نبھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر ان کے ساتھ پہلے سال تعلیم کا رشتہ بھی نہیں تھا۔

جلد ہی مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب کے ساتھ تعلقات استوار ہو گئے۔ جو خود مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے۔ ان دنوں موصوف حضرت مولانا سمیع الحق کے قائم کردہ ادارہ مؤتمراً لمصنفین میں ان کے زیر نگرانی مراحل تحریر و تصنیف طے کرنے میں منہمک تھے۔ ان کی شہہ پر راقم الحروف نے بھی کچھ مضامین لکھے۔ جن میں سے ایک کو ”الحق“ میں بھی جگہ دی گئی۔ اور وہیں سے حضرت الاستاذ کی نظر التفات کو راہ ملی۔ چنانچہ ان کے حکم کے مطابق ان کے دفتر میں گاہے گاہے حاضری ہوتی تھی۔ دل موہ لینے والی شفقت و محبت ملتی۔ اور جلد ہی حضرت کے بارے میں سوء الظن کا فور ہو گیا۔ بلکہ اپنی طرف سے خود ساختہ تکلف کو بے تکلفی میں بدلنا پڑا۔ اور پھر ان کے تلمذ کا انتظار کرتا گیا۔ یہاں تک کہ دورہ حدیث کے سال یہ

تمنا پوری ہوگئی۔ حضرت کے پاس شمائل ترمذی کے علاوہ بخاری ج ۲ اور ترمذی ج ۲ کے بعض اجزاء تھے۔ راقم الحروف کی ایک عادت تھی کہ مشکل کتابوں میں ہر استاد کے درس کے دوران ان کے فرمودات تحریری طور پر ضبط کرتا تھا۔ اس عمل سے اساتذہ کے ارشادات کی حفاظت کے علاوہ میں نے ایک بڑا فائدہ یہ بھی پایا تھا۔ کہ دھیان درس پر مرکوز رہتا تھا۔ اور دوران درس ادھر ادھر التفات سے محفوظ رہتا تھا۔ نیز بعد میں دوران تکرار طلبہ کے استفسارات کے لئے بھی راقم الحروف کے پاس مرجع موجود ہوتا تھا۔ چنانچہ تعلیم کے آخری چھ سالوں میں بندہ نے اس کا التزام کیا۔ دورۂ حدیث میں بھی بندہ اساتذہ کے اقادات تحریر کرتا رہا۔

مولانا نے جب میرے شغف کو دیکھا تو حکم دیا کہ لکھنے کی بجائے میرے درس کو ٹیپ کے ذریعے محفوظ کرنا اور پھر کمرے میں جا کر آرام سے لکھنا چونکہ پہلے سے حضرت اقدس شیخ الحدیث کے درس کو ریکارڈ کرنے کی ذمہ داری بھی مولانا نے بندہ پر ڈال دی تھی۔ اس لئے مولانا نے حکم دیا کہ درس میں لکھنے کے بجائے ریکارڈنگ کرتے رہنا۔ مجھے فکر ہوئی کہ اتنے کیسٹ کہاں سے لاؤں۔ لیکن دوسرے روز حضرت نے نئے کیسٹوں کا پورا پیکٹ بھجوادیا۔ درس کی ریکارڈنگ تو ہوگئی مگر اسے کاغذ پر منتقل کرنے کی فرصت نہ مل سکی۔

فراغت کے بعد تدریسی مشاغل کی وجہ سے اس کام پر توجہ نہ دے سکا۔ تا آنکہ فراغت کے پانچ سال بعد احباب نے فرمائش کی کہ شمائل ترمذی کو نقل کر دوں۔ چنانچہ عاریتاً ٹیپ ریکارڈر حاصل کر کے اسے کاغذ پر منتقل کر دیا۔ اور جب مولانا کی خدمت میں پیش کیا۔ تو انہوں نے مولانا عبدالقیوم حقانی کو تمیض کی ذمہ داری سپرد کی۔ مگر ان کے دیگر مصروفیات کی وجہ سے کام میں تاخیر ہوئی۔ اور حضرت نے کچھ عرصہ بعد مسودہ بھیج کر بندہ کو ہی تمیض کا حکم دیا۔

راقم میں ان دنوں اتنی خود اعتمادی نہ تھی۔ لہذا دو ڈھائی باب کرنے کے بعد ہمت جواب دے گئی۔ اور آٹھ سال تک یہ سلسلہ ٹھپ ہو کر رہا گیا۔ غالباً ۱۴۱۸ھ یعنی ۱۹۹۸ء کی بات ہے۔ ایک ملاقات میں مولانا نے اس کام کے بارہ میں دریافت کیا۔ چونکہ ان دنوں خود بندہ پر شمائل ترمذی، مسلم شریف اور ترمذی ج ۲ پڑھانے کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی۔ لہذا پھر ایک داعیہ پیدا ہو گیا۔ اور تقریباً تین چوتھائی مسودہ

صاف کر دیا۔ دیگر شروح سے تطبیق، اجمال کی ضروری تفصیل اور غیر ضروری تفصیل کی قدرے اجمال کے بعد حضرت کی خدمت میں پیش کر دیا۔ تاکہ وہ نظر ثانی فرمائیں۔ تب تک میں باقی حصہ کی تمییز کر لوں۔

شوی قسمت سے ملکی اور جماعتی، سیاست اور سینٹ میں ان کے پیش کردہ شریعت بل کا معرکہ اتنا گرم ہوا کہ مولانا کی مصروفیات ان دنوں اتنی بڑھیں کہ مسودہ ویسے کا ویسے پڑا رہا۔ ادھر مجھے خیال آیا کہ حضرت کو میرا کیا ہوا کام پسند نہیں آیا۔ اس لئے مزید کا تقاضا نہیں کر رہے۔ چنانچہ جذبہ ماند پڑ گیا۔ مگر ۱۳۲۵ھ کے اوائل میں حضرت نے حکم دیا کہ بقیہ حصہ بھی مکمل کر لوں۔ اور معاون خاص جناب مولانا مفتی مختار اللہ حقانی کو حکم دیا کہ اصلاح الدین سے یہ کام مکمل کروانا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ انہوں نے بار بار یاد دہانی کروائی اور اس پچھد ان نے اپنے شکستہ الفاظ میں حضرت کی خواہش کی تکمیل کی۔

اہل فن جانتے ہیں کہ کسی دوسرے شخص کی ترجمانی کا حق ادا کرنا مشکل کام ہے۔ اور پھر ایسے شخص کی ترجمانی جو خود جوامع الکلم کی ترجمانی کر رہا ہو، مشکل تر ہو جاتا ہے۔ اور اگرچہ ایک استاد اور شاگرد کے درمیان جو نسبت ہوتی ہے وہ شاگرد کیلئے کافی حد تک استاد کے مافی الضمیر تک رسائی میں معاون ہوتی ہے۔ اور مطالب کے ادراک کو آسان بنا دیتی ہے۔ مگر اس میں شاگرد کے استعداد کو کلیدی مقام حاصل ہے۔ اور راقم الحروف کو اعتراف ہے کہ اساتذہ کے حسن ظن اور ان کی بے انتہاء شفقت کے باوصف ان سے علمی اکتساب کے بجائے ان کے ساتھ عقیدت و محبت کے تعلق کیلئے زیادہ کوشاں رہتا تھا۔ اس لئے کام کی عظمت اور اپنی بے مائیگی کو دیکھ کر یہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ حضرت الشیخ کے مطالب کی ترجمانی میں قصور ضرور ہوگا۔ بلکہ بندہ کی تحریر شمائل ترمذی اور پھر حضرت الشیخ کی تشریحات کی اشاعت کے عظیم کام کو داغدار بنانے کے مترادف ہے۔ لیکن حضرت کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا بھی قرین قیاس نہیں تھا۔

لہذا ان کے حکم کے بعد یہ جرأت کرنی پڑی۔ اگر میری اس کوشش کو اللہ رب العزت، حضرت الاستاد عظیم اور دیگر علماء و طلباء کے ہاں قبولیت ملی۔ تو یہ میرے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ اور اللہ تعالیٰ کا خصوصی احسان ہوگا۔ اور اگر اسے قابل التفات نہ سمجھا گیا تو اس کی ساری ذمہ داری بندہ پر ہوگی۔ اور اس عظیم کام کو ضائع کرنے پر اللہ تعالیٰ سے، حضرت الشیخ سے اور پھر علماء و طلباء سے معافی کا خواستگار ہوں۔

اگر حضرت شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق کی خصوصی دعاؤں اور حضرت الاستاذ مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہم کی بھرپور توجہات کے طفیل اللہ تعالیٰ نے اس کاوش کو قبولیت عطا فرمائی۔ تب بھی اہل قلم کے تجربات کے مطابق اس کام میں کوتاہیاں اور غلطیاں دیکھنے کو ملیں گی۔ ایسے میں اہل علم سے التماس ہے کہ دوران مطالعہ میری جس بھول چوک پر مطلع ہوں تو حتی الوسع بندہ کو اطلاع دینے کی سعی فرمائیں تاکہ آئندہ اس کی اصلاح کی جاسکے۔ شاید آپ کی ادنیٰ توجہ ایک تباہ حال عاصی کو تباہی سے بچا سکے۔

خادم الطلبة والعلماء

اصلاح الدین حقانی

خادم الحدیث دارالعلوم اسلامیہ لکی مروت

۱۲ اشوال المکرم ۱۴۲۷ھ

از مولانا مفتی عیسیٰ راہ اللہ تعالیٰ
مفتی و اساتذہ شعبہ تخصص فی الفقہ والاقتاء

پیش لفظ

الحمد لله وكفى والصلوة والسلام على خير الخلق والانبياء، أما بعد

جب سے بنی نوع انسان کا سلسلہ شروع ہوا ہے اسی روز سے اللہ تعالیٰ نے بے راہ انسانوں کی ہدایت اور ان کو راہ راست پر لانے کیلئے انبیاء کرام کی بعثت کا سلسلہ شروع کیا۔ اور اس کی آخری کڑی نبی آخر الزمان سرور دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی امتیازی شان: اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ایک امتیازی شان کیساتھ مبعوث فرمایا اور آپ ﷺ کی ذات اقدس میں تمام انبیاء کرام کے مکارم اخلاق و دیعت رکھا گیا۔ اور عملی نمونہ آنحضرت ﷺ نے امت کے سامنے پیش کیا۔

کسی نے حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کہ آپ ﷺ کے اخلاق کیا تھے تو آپؐ نے فرمایا کہ کیا آپ نے قرآن نہیں پڑھا؟ تو سائل نے عرض کیا ہاں پڑھا ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا کان خلقہ القرآن یعنی آپ ﷺ کے اخلاق قرآن پاک کی عملی تصویر تھے۔ اس لئے قرآن کریم نے آپ ﷺ کے اس عملی نمونہ اور حسن کردار اور عمدہ اخلاق کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے **وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ** (القلم) بیشک آپ عظیم اخلاق کے حامل ہیں۔ اور اسی کو تمام انسانیت کے لئے بلا امتیاز رنگ و نسل اسوۂ حسنہ قرار دیا۔ **لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ** (الاحزاب) یقیناً تمہارے لئے آپ ﷺ کی ذات اقدس میں عمدہ نمونہ موجود ہے۔ اور یہی رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد ہے **إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأَتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ** (مشکوٰۃ) کہ بیشک میں اسلئے بھیجا گیا ہوں تاکہ دنیا میں عمدہ اخلاق کی تکمیل کروں۔ پھر ساری عمر اسی صفت کے ساتھ دنیا میں رہے اور اسی سیرت طیبہ کیساتھ اپنی ذمہ داری پوری فرماتے رہے۔ آنحضرت ﷺ کے اس حسن کردار اور اعلیٰ اخلاق و عادات کی تعریف نہ صرف قرآن کریم اور انہوں نے کی بلکہ غیروں کی زبانی بھی ستائش و تحسین کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری رہا ہے۔

آنحضرت ﷺ غیر مسلموں کی نظر میں: چنانچہ جیوا یونیورسٹی کے پروفیسر مسٹر ایڈورڈ موٹ لکھتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کو اصلاح اخلاق اور سوسائٹی کے متعلق جو کامیابی ہوئی اس کے اعتبار سے آپ ﷺ کو انسانیت کا عظم یقین کرنا پڑتا ہے۔ (مقدمات تاریخ ہند ۲۰۲/۳۴)

پیشوائے اعظم بدھ مذہب: مانگ نوگ نے کہا ہے کہ: حضرت محمد ﷺ کا ظہور بنی نوع انسان پر خدا کی ایک رحمت تھی لوگ کتنا ہی انکار کریں مگر آپ ﷺ کی اصلاحات عظیمہ سے چشم پوشی ممکن نہیں۔ ہم بدھی لوگ حضرت محمد ﷺ سے محبت کرتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں۔

(معجزات اسلام ۶۶، بحوالہ نقوش نمبر ۳۶۲/۴)

ماسٹر تاراسگہ پریڈیٹنٹ سکھ لیگ: جب کوئی مجھ سے یہ کہتا ہے کہ محمد ﷺ نے تلوار کے زور سے اپنا مذہب پھیلایا تھا تو مجھے اس شخص کی کم فہمی پر ہنسی آتی ہے۔

(اخبار، الامان، دہلی ۱۷ جولائی ۱۹۳۲ء بحوالہ نقوش نمبر ۳۶۲/۴)

لالہ رام لال ورما ایڈیٹر اخبار تیج: جمہوریت، اخوت، مساوات یہ عطیات ہیں جو حضرت محمد ﷺ نے بنی نوع انسان کو عطاء کئے۔ (نقوش نمبر ۳۶۱/۴)

ڈاکٹر جے کارام برہما: حضرت محمد ﷺ نے اخلاق عالیہ کی تلقین ہی نہیں کی بلکہ ان اصولوں پر عمل بھی فرمایا ان کی زندگی ایسا روبربانی کی زندگی تھی۔ (نقوش نمبر ۳۵۹/۴)

گاندھی جی: وہ (رسول اللہ ﷺ) روحانی پیشوائ تھے بلکہ ان کی تعلیمات کو سب سے بہترین سمجھتا ہوں کسی روحانی پیشوائ نے خدا کی بادشاہت کا پیغام ایسا جامع اور مانع نہیں سنایا جیسا کہ پیغمبر اسلام نے۔

(رسالہ ایمان پٹی ضلع لاہور اگست ۱۹۳۶ء بحوالہ نقوش نمبر ۳۵۷/۴)

ڈاکٹر لین بول: اگر محمد ﷺ نبی نہ تھے تو کوئی نبی دنیا میں برحق آیا ہی نہیں۔ (بحوالہ نقوش نمبر ۳۴۹/۴)

ڈاکٹر ایڈیٹر منظم: مجھ کو کسی وقت یہ خیال بھی نہ ہوا کہ اسلام کی ترقی تلوار کی مرہون منت ہے بلکہ اسلام کی کامیابی رسول اللہ ﷺ کی سادہ، بے لوث، ایفائے وعدہ، اصحاب و پیروں کی غیر معمولی حمایت، توکل بخدا اور ذاتی جرات و استقلال سے وابستہ ہے۔ (بحوالہ نقوش نمبر ۳۴۹/۴)

ڈاکٹر ڈی رائٹ: محمد ﷺ اپنی ذات اور قوم کیلئے نہیں بلکہ دنیائے ارضی کیلئے ابر رحمت تھے۔ تاریخ میں کسی ایسے شخص کی مثال موجود نہیں جس نے احکام خداوندی کو اس مستحسن طریقہ سے انجام دیا ہو۔

(اسلامک ریویو اینڈ مسلم انڈیا فروری ۱۹۲۰ء بحوالہ نقوش نمبر ۴/۳۷)

مسٹر ایڈورڈ موئے: آپ ﷺ نے سوسائٹی کے تزکیہ اور اعمال کی تطہیر کیلئے جو اسوۂ حسنہ پیش کیا ہے وہ آپ ﷺ کو محسن انسانیت کا محسن اول قرار دیتا ہے۔ (نقوش نمبر ۴/۳۷) اور اسی طرح بے شمار غیر مسلموں نے آنحضرت ﷺ کی حسن سیرت کا اعتراف کیا ہے۔ ادارہ فروغ اردو لاہور نے نقوش رسول نمبر میں کئی غیر مسلم اہل علم اور سکالروں، سیاسی و غیر سیاسی شخصیات کے تعریفی اقوال کا ذکر کیا ہے یہ کتاب کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ کئی غیر مسلموں نے رسول اللہ ﷺ کے حسن کردار پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اس اسوۂ حسنہ کو اصطلاح میں سنت کہا جاتا ہے۔

سنت کی تعریف: اس لئے کہ علماء امت نے سنت کی جو تعریف کی ہے وہ اس پر صادق ہے۔ علامہ عبدالحی فرنگی محلیؒ سنت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں اِنَّ السَّنةَ تَطْلُقُ عَلَى قَوْلِ الرَّسُولِ وَفَعْلِهِ وَمُسْكُونَتِهِ وَطَرِيقَةِ الصَّحَابَةِ (ظفر الامانی فی مختصر الجرجانی) بیشک سنت کا اطلاق آنحضرت ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریرات پر ہوتا ہے حتیٰ کہ صحابہ کرام کے طریقے کو بھی سنت کہا جاتا ہے۔

سنت کی اقسام: البتہ سنت کی دو قسمیں ہیں (۱) سنت مؤکدہ جسے سنت حدی بھی کہا جاتا ہے۔ (۲) سنت زوائد جسے سنت غیر مؤکدہ بھی کہا جاتا ہے۔

صاحب شرح الوتایہ علامہ صدر الشریعہ عبید اللہ بن مسعودؓ ان دونوں اقسام سنت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں قُلْتُ السَّنةَ مَا وَظَبَ النَّبِيُّ ﷺ عَلَيْهِ مَعَ التَّرَكِّ اَحْيَانًا فَاِنْ كَانَتْ الْمَوَاطِبَةُ الْمَذْكُورَةُ عَلَى سَبِيلِ الْعِبَادَةِ فَسُنَنُ الْهُدَى وَانْ كَانَتْ عَلَى سَبِيلِ الْعَادَةِ فَسُنَنُ الزَّوَائِدِ۔ كَلْبَسَ الثِّيَابَ وَالْاَكْلَ بِالْيَمِينِ وَتَقْدِيمَ الرَّجُلِ الْيَمْنَى فِي الدَّخُولِ وَنَحْوَ ذَلِكَ (شرح الوقایہ علی صدر السعایہ ۱/۱۷۵ تا ۱۷۵) میں کہتا ہوں سنت وہ ہے جس

پر آنحضرت ﷺ نے مواظبت فرمائی ہو لیکن کبھی ترک بھی کیا ہو۔ اب اگر یہ مواظبت عبادت کے طریق پر ہو تو سنن احمد علی (سنت مؤکدہ) اور اگر مواظبت علی سبیل العادة ہو تو سنت زوائد جیسے کپڑے پہننا، دائیں ہاتھ سے کھانا، دایاں پاؤں جوڑے میں داخل کرنا وغیرہ۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ: مگر سنت زوائد ہونے کی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہئے کہ سنت کے مطابق کھانے، پینے، اٹھنے، بیٹھنے، گفتگو کرنے وغیرہ کو اگر چہ فی ذات عبادت نہیں کہا جائے گا لیکن ان امور پر عمل کرنا عبادت ضرور ہے۔ قاضی عیاض مالکیؒ نے شفاء میں لکھا ہے اصول مذهبنا ثلاثة الاقتداء بالنبی ﷺ فی الاخلاق والافعال والاكل من الحلال واخلاص النية فی جميع الاعمال ہمارے مذہب کی تین بنیادیں ہیں (۱) اخلاق و اعمال میں نبی پاک ﷺ کی اقتداء کرنا (۲) حلال کھانا (۳) اور تمام اعمال میں اخلاص نیت۔ اس عبارت کی شرح میں لکھتے ہیں ہیں ای فی جميع اقواله وافعاله واحواله (بحوالہ شمائل کبریٰ ۱/ ۳۷۷) یعنی آنحضرت ﷺ کے جمیع اقوال، افعال اور احوال میں اقتداء کرنا۔

اور علامہ بدر عالم میرٹھیؒ لکھتے ہیں حالانکہ آپ ﷺ کا ہر قول اور آپ ﷺ کا ہر عمل سب حدیث کا جزو ہے اسی طرح اسوۂ حسنہ صرف عمل کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ آپ ﷺ کا قول و فعل جو کچھ بھی ہے وہ سب امت کیلئے نمونہ ہے۔ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ہی پر موقوف نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کی ذات جس طرح اس بارے میں اسوۂ حسنہ ہے اسی طرح فصل خصومات، امت کے نظم و نسق اور دیگر ضروریات میں بھی اسوۂ حسنہ ہے حتیٰ کہ خوش طبعی، ہنسی اور مسکراہٹ کے طور و انداز میں بھی، قرآن کریم نے کسی ادنیٰ تفصیل کے بغیر تمام امور میں آپ ﷺ کی ذات کو اسوۂ حسنہ کہا ہے اور کوئی معمولی سا معمولی اشارہ بھی اس طرح نہیں کیا کہ نماز و روزہ یا عبادات کی تشریح کے سوا بقیہ امور میں آپ کی ذات اسوۂ حسنہ نہیں ہے (ترجمان السنۃ ۱/ ۱۶۴)

آپ ﷺ کی اتباع مطلوب ہے: یہی وجہ ہے کہ سنت کی یہ دونوں قسمیں شرعاً مطلوب ہیں۔ اور سنت پر عمل ہی اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ من يطع الرسول لقد اطاع الله (النساء) جو شخص آپ ﷺ کی فرمانبرداری کرے گا تو بے شک اس نے اللہ کی فرمانبرداری کی۔ اور دوسرے مقام پر

آپ ﷺ کی پیروی کو اللہ کی طرف سے محبت اور بخشش کی توفیق قرار دیا گیا۔ قل ان كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله ويغفر لكم ذنوبكم (آل عمران) اے پیغمبر ﷺ آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا بھی تم سے محبت رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ حدیث پاک میں سنت سے محبت کو جنت میں رسول اللہ ﷺ کی معیت کا سبب کہا گیا ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا من احب بسنتي فقد احبني ومن احبني كان معي في الجنة (مشکوٰۃ المصابیح ۳۰) جس نے میری سنت سے محبت کی (اس پر عمل کیا) تو اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ رہے گا۔ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا من تمسک بسنتي عند فساد امتي فله اجر مائة شهيد (مشکوٰۃ ۳۰) جس نے میری سنت کو فساد امت کے وقت زمرہ کیا تو اسے ۱۰۰ شہیدوں کا ثواب ملے گا۔

گویا دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی و کامرانی کا راز رسول اللہ ﷺ کی سنتوں کی اتباع میں مضمر ہے۔ اسلئے امام مالکؒ نے فرمایا ہے ان السنة مثل سفينة نوح من ركبها نجي ومن تخلف عنها غرق الخ سنت کی مثال حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی ہے جو اس میں سوار ہوا تو کامیاب ہوا اور جو اس سے پیچھے رہا وہ غرق ہوا۔

اور ولی کامل عارف باللہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا ہے اساس الخیر متابعة النبی ﷺ فی قوله وفعله کہ تمام خیر اور خوبیوں کی جڑ رسول اللہ ﷺ کے قول و عمل کی اتباع میں ہے۔

اور امام غزالیؒ نے فرمایا ہے اعلم ان مفتاح السعادة اتباع السنة والافتداء برسول الله ﷺ فی جميع مصادره وموارده وحركاته وسكناته حتى فی هیئة اكله وقيامه و نومه وكلامه لست اقول ذلك فی آدابہ فی العبادات فقط لاجه لاهماله السنن الواردة فيها بل ذلك فی جميع امور العادات فبذلك يحصل الاتباع المطلق (اربعین ۵۸) جان لو کہ تمام امور میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع سعادت ہے۔ آنحضرت ﷺ سے صادر

ہونے والے تمام حرکات، سکناات یہاں تک کہ کھانے، پینے، اٹھنے، سونے، باتیں کرنے میں بھی آنحضرت ﷺ کے عادات طیبہ کے چھوڑنے کی کوئی وجہ نہیں اسی لئے میں اسوۂ حسنہ کو صرف عبادت میں منحصر نہیں کرتا بلکہ تمام عادات، احوال میں بھی کمال اتباع اسی سے حاصل ہوگی۔ اور مزید لکھتے ہیں

فعلیک ان تلبس السراویل قاعداً وتنعّم قائماً وتبدأ بالیمن فی تعلقک وتاکل بيمينک (اربعین ۵۸) پس تم پر لازم ہے کہ شلوار بیٹھ کر پہنے، عمامہ کھڑے ہو کر باندھے، جوتا اولاً دائیں پاؤں میں پہنیں اور دائیں ہاتھ سے کھائیں۔

رسول اللہ ﷺ نعمت عظمیٰ: اس لئے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت اس امت مرحومہ بلکہ تمام عالم پر اللہ تعالیٰ کا ایک بہت ہی بڑا احسان ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی بعثت کو ایک نعمت عظمیٰ کے طور پر ذکر فرمایا ہے لقد منّ اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیہم رسولاً من انفسہم یتلو علیہم آیاتہ ویزکّیہم ویعلّمہم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلّٰل مبین (الایۃ)۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے مؤمنین پر احسان عظیم فرمایا ہے کہ اس نے انہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان پر اللہ تعالیٰ کی آیات تلاوت کرتا ہے ان کے نفس کی اصلاح کرتا ہے اور انہیں قرآن کریم اور حکمت و دانائی کی تعلیم دیتا ہے جبکہ وہ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے۔

اسلئے رسول اللہ ﷺ کی سنتوں، عادات و اطوار اور بود و باش کے طریقوں کو ہلکانہ سمجھا جائے کیونکہ آپ ﷺ کی سنتوں کو ہلکا سمجھنا فرائض سے محرومی کا ذریعہ ہے۔

علامہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے تفسیر فتح العزیز میں لکھا ہے من تہاون بالسنة عوقب بحرمان الفرائض جسے سنت کے ادا کرنے میں سستی کی تو اس کو فرائض سے محرومی کی سزا ملے گی۔

اس لئے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ دونوں قسم کی سنتوں کی اتباع کرنی چاہئے سنت مؤکدہ کا ترک کرنا گمراہی اور ضلالت کا سبب ہے اور سنت زوائد کے ترک کرنے سے کمال ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ علامہ عبدالحی لکھنویؒ نے لکھا ہے والایات فی هذا الباب كثيرة والاخبار النبوية شهيرة کلّھا تدل صراحة او اشارة علی ان الاخذ بما التزمه رسول اللہ ﷺ موجب للهدایة

و خلافہ موجب للضلالة و اما سنن الزوائد فلما لم یکن ترکها موجبا للضلالة و لا مخالفا
اصل الهدایة و ان لم یحصل کمال الهدایة سمیت بذلك (السعیة ۱/ ۱۷۳)

اس بابت آیات قرآنی بہت ساری ہیں اور احادیث نبویہ صلوات اللہ علیہ وسلم مشہور ہیں جو
تمام کی تمام صراحۃ یا اشارۃ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جن امور پر رسول اللہ ﷺ نے مواظبہ فرمائی ہو
وہ موجب ہدایت ہیں اور اس کی مخالفت موجب ضلالت ہے اور سنن زوائد اگرچہ ان کا ترک کرنا موجب
ضلالت نہیں اور نہ اصل ہدایت میں خلل ہے لیکن اس کے باوجود (ان کے ترک کرنے سے) کمال ہدایت
حاصل نہیں ہوگی اسی وجہ سے ان کو سنن زوائد نام رکھا گیا ہے۔ اور مزید لکھتے ہیں

والتحقیق ان الترمذی لیس بمعتبر لافى السنن الهدی و لافى السنن الزوائد
انما الفرق بينهما بالعبادة والعادة (السعیة ۱/ ۱۷۳) اور تحقیق یہ ہے کہ بیشک سنتیں چاہئے سنن
حدیث ہوں یا سنن زوائد ان کا ترک کرنا معتبر نہیں ان میں فرق صرف عادت اور عبادت کی وجہ سے ہے۔

بعض سنتیں ترک کرنا موجب ملامت نہیں: مگر یہ بات ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ جو
سنتیں عادیہ ہوں اور ان پر آنحضرت ﷺ سے دوام بھی منقول نہ ہوں مثلاً خرید کھانا، عجوہ کھجور کھانا، جبہ پہننا
وغیرہ ان امور میں اتباع موجب اجر و ثواب ضرور ہے اور ان پر عمل کرنے والا عامل بالسنۃ ہوگا لیکن اگر کوئی
ان کو بجا نہ لائے تو ترک کرنے والے کو تارک السنۃ نہیں کہا جائے گا اور نہ اس پر اس ترک کی کوئی ملامت
ہوگی۔ اسی طرح جن سنتوں پر آنحضرت ﷺ سے دوام مروی ہو مگر ان میں دوام مطلوب اور مراد نہ ہو بلکہ
ماحول و معاشرہ کے اعتبار سے آنحضرت ﷺ نے دوام فرمایا ہو جیسے جو کی روٹی کھانا، کھجور کھانا، تہبند
باندھنا، خنجر استعمال کرنا وغیرہ تو ان سنتوں کے ترک کرنے والوں پر ملامتی یا ارتکاب ترک سنت کا الزام
نہ ہوگا۔ اگرچہ عمل کرنے میں کمال اتباع اور محبت رسول اللہ ﷺ کی علامت ہے اور آخرت میں رسول
خدا ﷺ کی رفاقت، معیت اور شفاعت کا ذریعہ ہے۔

ضعیف حدیث اور رسول اللہ ﷺ: آج کل بعض لوگوں کے دل و دماغ میں یہ بات ہے اور وہ سنت
کو سلسلہ رجال کے کسوٹی پر پرکھتے ہیں اگر سلسلہ رجال درست اور محدثین کے پیمانے پر صحیح اترتا ہو تو ٹھیک

ورنہ اس حدیث کو ضعیف کہتے ہوئے ترک کرتے ہیں۔ اھ

مگر یہ وہم اتباع سنت کے موافق نہیں اس لئے کہ سنت پر عمل کرنے کیلئے یہ ہرگز نہ سوچا جائے کہ یہ روایت ضعیف ہے اور یہ صحیح اس لئے کہ اس ضعف کا تعلق سلسلہ رجال کے ساتھ ہے متن حدیث کے ساتھ نہیں۔ اور سلسلہ رجال کا ضعف متن پر مؤثر نہیں ہوتا۔

علامہ سیوطیؒ نے لکھا ہے اذ ارأیت حذیفاً باسنادٍ ضعیفٍ فلک ان تقول هو ضعیف بهذا الاسناد ولا تقل ضعیف المعن (قواعد علوم الحديث ۵۸، تلخیص الراوی) کہ جب تم کسی حدیث کو سند کے اعتبار سے ضعیف دیکھ لو تو تم یہ کہہ سکتے ہو کہ یہ حدیث اس سند کے ساتھ ضعیف ہے لیکن اس کو ضعیف المعن نہیں کہہ سکتے۔

یہی وجہ ہے کہ فضائل اور مندوبات میں فقہاء کرام اور محدثین نے ضعیف احادیث پر عمل کرنے اور اس کو قابل قبول ماننے کی اجازت دی ہے۔

علامہ نوویؒ نے لکھا ہے قال العلماء من المحدثین والفقهاء وغيرهم يجوز ويستحب العمل فی الفضائل والترغیب والترہیب بالحديث الضعیف مالم یکن موضوعاً (الازکار ص ۵) محدثین اور فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ حدیث ضعیف پر عمل کرنا فضائل وترغیب وترہیب میں جائز اور مستحب ہے تا وقتیکہ موضوع نہ ہو اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے مقدمہ فتح الملہم میں لکھا ہے کہ ارباب حدیث اس امر پر متفق ہیں کہ فضائل وغیرہ میں حدیث ضعیف پر عمل کرنا درست ہے (فتح الملہم ۵۸/۱)

اور علامہ جلال سیوطیؒ کے ہاں تو ضعیف حدیث بھی احکام میں معمول بہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ و يعمل بالضعیف ایضاً فی الاحکام اذا کان فیہ احتیاط (تلخیص الراوی ۱۰۸) اور ضعیف حدیث پر احکام میں بھی عمل کیا جائے گا جب اس روایت پر عمل کرنے میں احتیاط ہو۔

حدیث ضعیف سے استدلال: علماء احناف کے ہاں تو ضعیف روایت کسی امر کے استحباب کے

لئے مفید ہے۔ علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں الا استحباب یثبت بالضعیف غیر الموضوع (اعلاء السنن ۱۱۰/۱۹) کہ ضعیف حدیث سے استحباب کا ثبوت ہو سکتا ہے جب وہ روایت موضوع نہ ہو اور

یہی بات علامہ عبدالحی نے تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔ فالحق فی هذا المقام: أنه اذا لم یثبت ندب شئی او جوازہ بخصوصہ بحدیث صحیح وورد بذلك حدیث ضعیف لیس شدید الضعف یثبت استحبابہ وجوازہ به بشرط ان یکون مندرجات تحت اصل شرعی ولا یکون مناقضا للاصول الشرعیة والا دلة الصحیحة (الاجوبة الفاضلة ص ۵۵) کہ جب کسی امر کا استحباب یا جواز کسی صحیح حدیث سے ثابت نہ ہو اور اس بارے میں ضعیف روایت وارد ہو تو اگر اسکی ضعف شدید نہ ہو تو اس روایت سے اس امر کا استحباب اور جواز ثابت ہوگا بشرطیکہ وہ کسی اصل شرعی کے تحت واقع ہو اور اصول شرعیہ اور ادلتہ صحیحہ سے متصادم نہ ہو۔

ضعیف حدیث سے استحباب کی مثالیں: اسلئے حنفیہ کثر اللہ سوادہم نے بہت سارے مسائل کے استحباب کے لئے ضعیف حدیث کو مستدل بنایا ہے وضاحت کے لئے چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

(۱) احناف کے ہاں اذان میں ارسال اور اقامت میں حد مستحب ہے اور اس کے لئے احناف ترمذی کی روایت پیش کرتے ہیں عن عبد المنعم بن نعیم عن یحیی بن مسلم عن الحسن وعطاء عن جابر أن رسول الله ﷺ قال لبلال یا بلال اذا اذنت فترسل فی اذانک واذ اقامت فاحذر واجعل بین اذانک و اقامتک قدر ما یتفرغ الاکل من اكله والشارب من شربه الخ (جامع ترمذی ۳۱۱/۱) حضرت جابرؓ سے روایت ہے پیشک رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا اے بلال جب تو اذان دے تو اپنے اذان میں ارسال کر اور جب تو اقامت کرے تو اس میں حد کر اور اذان اور اقامت میں اتنا فاصلہ رکھ کہ کھانے والا کھانے سے اور پینے والا پینے سے فارغ ہو جائے۔ حالانکہ اس روایت کے بارے میں امام ترمذیؒ خود فرماتے ہیں هذا الحدیث لانصر فہ إلا من هذا الوجه من حدیث عبد المنعم وهو اسناد مجهول، اس روایت کو ہم نہیں جانتے مگر عبد المنعم کے طریق سے اور یہ اسناد مجہول ہے۔ امام دارقطنیؒ اور دوسرے علماء جرح و تعدیل نے عبد المنعم کی تصحیف کی ہے اسکے علاوہ اگرچہ روایت امام حاکمؒ نے بھی روایت کی ہے مگر اس میں عمرو بن لائد الاسواری عن یحیی بن مسلم الخ ہے اور عمرو بن لائد مطعون ہے۔

(۲) احناف کثر اللہ سوادہم کے ہاں گردن کی مسح مستحب ہے اور اس کے لئے وہ ابو داؤد اور

مسند احمد کی روایت سے استدلال کرتے ہیں۔ طلحہ بن مصرف عن ابیہ عن جدہ قال رأیت رسول اللہ ﷺ واحدہ مرة واحدة حتی بلغ القذال، طلحہ بن مصرف کے دادا فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ اپنے سر مبارک پر ایک بار مسح فرماتے، یہاں تک کہ آپ ﷺ گردن تک پہنچاتے۔ حالانکہ یہ روایت ضعیف ہے شیخ عبدالفتاح ابو غدہؒ لکھتے ہیں وہلہ الاحادیث ضعفہ لا جل طلحہ بن مصرف فقال ابن القطان طلحہ و ابوہ وجدہ لا يعرفان وقال النووی طلحہ بن مصرف احد الائمة الاعلام من التابعین احتج به الائمة الستة و ابوہ وجدہ لا يعرفان (حاشیہ الا جوبة الفاضلة ۴۵۰) گردن کے مسح کے متعلق تمام تراحدیث طلحہ بن مصرف کی وجہ سے ضعیف ہیں۔ امام ابن قتان فرماتے ہیں کہ طلحہ کے باپ اور دادا کا پتہ نہیں کہ وہ کون ہیں امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ طلحہ بن مصرف تابعین کے بلند پایہ ائمہ میں سے ہیں ائمہ ستہ نے ان سے حجت پکڑی ہے۔ لیکن اس کے باپ اور دادا غیر معروف ہیں۔ لیکن اس کے باوجود علماء احناف کے ہاں گردن کا مسح کرنا مستحب ہے۔

(۳) ائمہ مجتہدین نے بسا اوقات احتیاط کی بناء پر ضعیف حدیث کی وجہ سے کسی امر کی کراہت کا فتویٰ بھی دیا ہے (۱) جیسے ماء شمس کے استعمال کی کراہت کا فتویٰ کب فقہ میں وضاحت کے ساتھ مذکور ہے کہ ماء شمس سے وضو کرنا مکروہ ہے اور اس کراہت کے لئے بطور استدلال حضرت عائشہؓ کی روایت پیش کی جاتی ہے قالت اسخنت ماء لرسول اللہ ﷺ فی الشمس لیغتسل بہ فقال لی یا حمیراء لا تفعلی فإنه یورث البوص (نصب الرایۃ ۱۰۲/۱) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے لئے سورج کی تیش پر پانی کو گرم کیا تا کہ آپ ﷺ اس سے غسل کر لیں تو آپ ﷺ نے فرمایا اے حمیرا ایسا نہ کرو کیونکہ اس سے برص کا مرض پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ روایت ضعیف ہے مگر چونکہ اسی میں احتیاط ہے اس لئے فقہائے کرام نے ماء شمس کے استعمال سے منع فرمایا ہے۔ لہذا حدیث مبارک اگر ضعیف بھی ہو لیکن اس کا تعلق آنحضرت ﷺ کی زندگی، اخلاق، اعمال اور اسوۂ حسنہ سے ہو تو اس کو معمول بہ مانا جائے گا۔ اور اس پر عمل باعث اجر و ثواب اور دنیا و آخرت کی کامیابی کا ذریعہ ہے۔

شمائل ترمذی: چونکہ آنحضرت ﷺ کی زندگی مختلف پہلوؤں پر محیط تھی۔ اس لئے اصحاب علم و کمال

نے ہر پہلو کو مستقل موضوع بنا کر اس پر تصانیف لکھی ہیں مگر ان پہلوؤں میں ایک اہم پہلو رسول اللہ ﷺ کے شمائل اور خصائل ہیں۔ اس پہلو کو بھی ایک مستقل حیثیت حاصل ہے۔ جس میں رسول اللہ ﷺ کی ظاہری، باطنی سیرت و صورت کے متعلق بحث ہوتی ہے اور اس میں آنحضرت ﷺ کے چال و حال، آپ کی نشست و برخاست، کھانے پینے کے طریقوں کو بیان کیا جاتا ہے اور آپ ﷺ کے لباس، آپ ﷺ کا مزاج و مذاق، حسن معاشرت، عسرو تنگدستی، عمر مبارک میں پیش آمدہ واقعات وغیرہ پر اس موضوع میں سیر حاصل بحث کی جاتی ہے۔ علماء امت نے اس موضوع پر تقریباً ہر زبان میں متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ مگر امام ترمذیؒ کی تصنیف شمائل ترمذیؒ کو خدا تعالیٰ نے ایک فائق اور بلند مقام عطاء فرمایا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح امام ترمذیؒ کی جامع ترمذی درس نظامی میں شامل نصاب ہے تو اسی طرح شمائل ترمذیؒ بھی درس نظامی کے نصاب میں شامل ہے۔ اور دورۂ حدیث کے طلباء کو سبقاً سبقاً پڑھایا جاتا ہے۔

شمائل ترمذی اکابرین امت کی نظر میں: ملا علی قاریؒ نے امام ترمذیؒ کی اس تصنیف کے بارے

میں فرمایا ہے کہ ومن احسن ما صنف فی شمائلہ و اخلاقہ ﷺ کتاب الترمذی المختصر الجامع فی سیرہ علی الوجه الاتم بحیث ان مطالع هذا الكتاب كأنه يطالع طلبة ذلك الجنب ويرى محاسنه الشريفة فی کل باب ولذا قيل والاذن تعشق قبل العين احياناً (جمع الومائل ۲/۱) رسول اللہ ﷺ کے اخلاق، عادات پر امام ترمذیؒ نے ایک اچھی اور عمدہ مختصر، جامع اور مکمل کتاب لکھی ہے۔ اس کے مطالعہ سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آنحضرت ﷺ کی سیرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ کا ہر گوشہ نظروں کے سامنے آ جاتا ہے حالانکہ وہ آنکھوں سے پوشیدہ ہیں اس لئے کہا گیا ہے کہ کان کبھی کبھی آنکھوں سے پہلے عاشق ہو جاتا ہے۔

اور علامہ بیجوریؒ نے اس کتاب کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان کتاب الشمائل للامام الترمذی کتاب وحید فی بابہ فرید فی ترتیبہ واستیعابہ حتیٰ عند ذلك الكتاب من المواهب و طارف المشارق والمغارب (المواهب اللدنیہ ص ۲) کہ امام ترمذیؒ کی کتاب شمائل ترمذیؒ آنحضرت ﷺ کے شمائل و خصائل کے باب میں ایک مفرد کتاب ہے۔ ترتیب و استیعاب میں ایک یکتا کتاب ہے یہاں تک اس کتاب کو مواہب میں سے شمار کیا گیا ہے اور مشارق و مغارب پر چھا چکی ہے۔

شمائل ترمذی کے شروع: امام ترمذیؒ کی اس تصنیف کی اس اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ ارباب علم نے ہر دور میں اس کی مختلف زبانوں میں شروحات اور تراجم لکھی ہیں۔ جن میں سے بعض کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔
(۱) جمع الوسائل (عربی): یہ کتاب مشہور و معروف محدث و فقیہ علامہ علی بن سلطان محمد القاری الشہیر بالملا علی قاریؒ المتوفی ۱۰۱۴ھ کی تصنیف ہے اور ایک جامع شرح ہے۔

(۲) المناوی شرح الشمائل: یہ حضرت الامام المحدث الشیخ عبدالرؤف المناوی المصریؒ المتوفی ۱۰۰۳ھ کی تصنیف ہے۔ اور اس وقت جمع الوسائل کے حاشیہ پر شائع ہو چکی ہے۔

(۳) المواہب اللدیۃ علی الشمائل المحمدیۃ: یہ علامہ الامام الشیخ ابراہیم اللہجوریؒ کی تصنیف ہے۔

(۴) زہر الحمائل علی الشمائل: یہ علامہ جلال الدین السیوطیؒ کی عمدہ کتاب ہے۔

(۵) الاتحافات الربانیۃ بشرح الشمائل المحمدیۃ: یہ علامہ احمد عبد الجواد احمد الرومیؒ کی تصنیف ہے۔

(۶) اشرف الوسائل شرح علی الشمائل: یہ علامہ ابن حجر المکیؒ کی تصنیف ہے۔

(۷) الفوائد الجلیلۃ المبعیۃ علی الشمائل المحمدیۃ: یہ علامہ محمد بن قاسم بن اسد المغربیؒ کی تصنیف ہے۔

(۸) اسنی الوسائل بشرح الشمائل: یہ علامہ اسماعیل بن محمد الجلوینیؒ المتوفی ۱۱۶۲ھ کی تصنیف ہے۔

(۹) المواہب المحمدیۃ بشرح الشمائل الترمذیۃ: یہ علامہ سلیمان بن عمر المعروف بالجمل المتوفی ۱۲۰۳ھ کی عمدہ تصنیف ہے۔

(۱۰) شرح شمائل الترمذی: للعلامہ ابراہیم بن محمد بن عرب شاہ المتوفی ۹۴۳ھ

(۱۱) شرح الشمائل الترمذی: للعلامہ سلطان بن احمد المصریؒ المزائیؒ المتوفی ۱۰۷۵ھ

(۱۲) شرح الشمائل: للشیخ عبداللہ نجیب العیثانی شارح الشفاء المتوفی ۱۲۱۹ھ

(۱۳) شمائل النبی ﷺ: للعلامہ مصلح الدین اللاریؒ محمد بن صلاح الدین جلال المتوفی ۷۹۹ھ

(۱۴) خصائل النبوی شرح شمائل ترمذی: یہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوریؒ کی اردو زبان میں عمدہ شرح ہے۔ جو اختصار کے ساتھ جامع بھی ہے۔

(۱۵) ترجمہ شمائل ترمذی: حضرت مولانا عبدالشکور لکھنویؒ کا اردو زبان میں ترجمہ ہے۔

(۱۶) شمائل ترمذی مع اردو ترجمہ و تشریح: مفسر قرآن علامہ مولانا صوفی عبدالحمید سواتی کے درسی افادات کا مجموعہ ہے۔

(۱۷) آفتاب نبوت کی کرنیں شمائل اور خصائل کی روشنی میں: یہ مولانا محمد حسین صدیقی مدظلہ کی شمائل ترمذی کی اردو زبان میں شرح ہے۔

(۱۸) شرح شمائل ترمذی: یہ مولانا عبدالقیوم حقانی مدظلہ بانی و مہتمم جامعہ ابو ہریرۃ خالق آباد نوشہرہ کی شمائل ترمذی کا عمدہ شرح ہے۔

ان کے علاوہ بھی بہت سارے شروح ہیں۔

کچھ شرح ہذا کے بارے میں: قائد جمعیت حضرت مولانا سمیع الحق صاحب زید مجدہم سیاسی میدان میں شہرت رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک کہنہ مشق اور ماہر ترین مدرس بھی ہیں۔ آپ مدظلہ نے ایام تدریس میں جو بھی کتاب پڑھائی، اس کتاب کی لفظی اور عبارتی تشریح کا نہ صرف حق ادا کیا بلکہ حالات حاضرہ اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کا حل اور اس موضوع کے سالہا و سالہا علم و دینیہ کے اذہان کو منور اور معطر فرمایا۔ اور خصوصاً احادیث کی کتابوں کو پڑھاتے وقت جس جامعیت اور سہل انداز سے طلباء کو درس حدیث دیتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قارئین ماہنامہ الحق کی اصرار پر آپ کے جامع ترمذی کے درسی افادات کو الحق میں بالاقساط شائع کیا جاتا ہے۔ جامع ترمذی کے درسی افادات کو مزید افادہ و استفادہ کے لئے بندہ ناچیز (مختار اللہ حقانی) نے جامع ترمذی کے کتاب الاطعمۃ والاشریۃ کو یکجا کر کے ”اسلام کا نظام اکل و شرب“ کے نام سے ایک ضخیم جلد میں مرتب کر کے شائع کیا۔ جس کو مجالس علم میں کافی پزیرائی حاصل ہوئی۔ اور یہ مقبولیت اس لئے ہے کہ مولانا سمیع الحق صاحب کے جامع ترمذی کے درسی افادات ہر خاص و عام کیلئے مفید ہیں۔ اسی طرح زیر نظر کتاب زین المحافل شرح الشمائل بھی مذکورہ صفات کی حامل کتاب ہے۔ مولانا اصلاح الدین حقانی مدظلہ استاذ الحدیث جامعہ اسلامیہ لکی مروت چونکہ خود شمائل ترمذی حضرت اقدس مدظلہ سے پڑھ چکے ہیں اور ساتھ ساتھ آپ مدظلہ کا درس آڈیو کیسٹ میں بھی محفوظ ہے اسلئے انہوں نے انتہائی عرق ریزی سے آپ کے انداز بیان اور طرز افہام و تفہیم کو مد نظر رکھتے

ہوئے زینت قرطاس کیا۔ جواب آپ حضرات کے ہاتھوں میں ہے۔

بندہ اپنے لئے سعادت سمجھتا ہے کہ مجھ ناچیز کو حضرت اقدس مدظلہ کے ان جواہر پاروں کی نظر ثانی، کمپوز کروانے اور ان کو کتابی شکل میں ترتیب دینے کی خدمت کا موقع ملا۔ بندہ ناچیز نے مناسب مقام پر کچھ حواش بھی لکھے اور ساتھ شمائل ترمذی میں جو روایات امام ترمذیؒ نے نقل کی ہیں ان کی تخریج بھی دیگر کتب حدیث سے کی۔ تاکہ کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ بعض معرکۃ الآراء فقہی مسائل کی قدرے وضاحت کی کوشش کی ہے۔ تخریج احادیث میں متعلقہ کتاب کا جلد اور صفحہ نمبر کتاب اور باب کو ذکر کیا ہے تاکہ اصل مراجع تک رسائی آسان ہو۔ اس کے علاوہ ترتیب، پروف ریڈنگ اور صحیح اغلاط کی کافی حد تک اپنی بساط کے مطابق کوشش کی ہے مگر یہاں اللہ عصمتہ کھابہ کی وجہ سے کتاب میں لفظی، معنوی اور ترتیبی غلطیوں کا امکان کوئی ناگزیر نہیں۔ اس لئے اہل علم اور قارئین حضرات سے التجاء ہے کہ دوران مطالعہ اگر کوئی لفظی، معنوی یا کتابتی غلطی نظر آئے تو ازراہ کرام ان اغلاط پر مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں ان کا ازالہ ہو سکے۔ آخر میں ان سب حضرات کا مشکور ہوں خصوصاً برادر مکرم مولانا عرفان الحق اظہار حقانی مدرس دارالعلوم حقانیہ کا جنہوں نے اس کتاب کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ وغیرہ میں تعاون کیا اور اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس مجموعہ کو حضرت اقدس مدظلہ، مولانا اصلاح الدین حقانی اور مجھ ناچیز کے لئے دنیا و آخرت میں ذخیرہ خیر بنائے۔ آمین

احقر العباد عتیق اللہ حقانی

خادم دارالافتاء، شعبہ تخصص فی الفقہ والافتاء

جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

۱۱ مئی ۲۰۲۰ء بروز جمعہ المبارک

مختصر سوانحی خاکہ شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ

نام و نسب: حضرت مولانا سمیع الحق دامت برکاتہم العالیہ ۱۸ ستمبر ۱۹۳۲ء کو حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحبؒ کے گھرا کوڑہ خٹک میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد سلطان محمود غزنویؒ کے ہمرا جہاد کیلئے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ اور پھر اکوڑہ خٹک میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آپ کا تعلق ایک علمی گھرانے سے ہے۔ کئی پشتوں سے یہ خاندان دینی اور مذہبی خدمات انجام دیتا چلا آرہا ہے۔

ابتدائی تعلیم: آپ نے پرائمری تک عصری تعلیم گاؤں ہی میں اپنے والد محترم حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق کے قائم کردہ انجمن تعلیم القرآن اسلامیہ پرائمری سکول میں حاصل کی۔ دینی تعلیم ابتدائی درجات سے لے کر درجات عالیہ تک جامعہ دارالعلوم حقانیہ میں حاصل کی۔ اور ۱۹۵۵ء کو دورہ حدیث سے فراغت کے بعد الامام الکبیر شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ سے ۸ مح ۱۳۷۵ھ کو دورہ تفسیر کیا۔

اعزازی اسناد: جامعہ دارالعلوم حقانیہ سے سند فراغت کے علاوہ بعض دوسرے اکابرین علماء کرام مثلاً قطب العالم شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر الدین غورغشتویؒ، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنیؒ، حضرت مولانا فخر الدین صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، اور مکہ مکرمہ کے مسند وقت شیخ علوی مالکیؒ نے آپ کو اعزازی اسناد اور اجازات حدیث سے نوازا۔

اساتذہ: ولی کامل حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالغفور سواتیؒ، مولانا عبدالحلیم زروبوئیؒ، قطب العالم شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ وغیرہ اکابرین سے شرف تلمذ آپ کو حاصل ہے۔

تدریس: تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۵۸ء کو جامعہ دارالعلوم حقانیہ ہی میں درس و تدریس کا آغاز کیا۔ اور جلد ہی خداداد صلاحیتوں کی بدولت ابتدائی کتب سے کتب حدیث کی تدریس تک پہنچ گئے جو

کہ آج تک جاری و ساری ہے۔

انداز تدریس: آپ کا انداز ایسا عام فہم اور سلیس ہے کہ ادنیٰ سمجھ رکھنے والا طالب علم بھی کتاب کے مطلب کو تقریباً مکافہ سمجھ جاتا ہے۔ عموماً مدرسین حضرات کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ وہ سال کے آغاز میں خوب تحقیق و تدقیق سے اسباق پڑھاتے ہیں۔ لمبی چوڑی تقاریر کرتے ہیں۔ بسا اوقات وہ محققانہ باتیں طلباء کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں۔ لیکن چند مہینے بعد اور خصوصاً سال کے آخر میں کتاب کو ختم کرنے کی غرض سے عبارت کا ترجمہ تک نہیں کرتے۔ ہاں کہیں ضروری بات ہو تو وہ کر جاتے ہیں۔ مگر مولانا صاحب کا انداز درس سال کے آغاز سے لیکر اختتام تک یکساں ہوتا ہے۔ آپ کی تقریر میں تکرار نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک بہتے دریا کی طرح رواں دواں ہوتی ہے۔ آپ درس میں محققانہ روایتی اسکاٹ کے ساتھ ساتھ جدید دور کے جدید تقاضوں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ بین الاقوامی سیاست، یہود و ہنود اور اسلام دشمن عناصر کے عزائم سے بھی طلباء کو آگاہ کرتے ہیں۔ اگرچہ مولانا صاحب نے تقریباً ہر فن میں کوئی نہ کوئی کتاب پڑھائی ہے اور ہر ایک کتاب کی تدریس کا ایک الگ انداز ہے۔ مگر علم حدیث کی کتابوں کی تدریس اور پڑھانے میں آپ کا دیگر محدثین حضرات سے الگ تھلگ اپنا ایک منفرد اور انوکھا انداز ہے۔ حدیث کی لفظی تشریح کے ساتھ اس حدیث کے اسرار و لطائف بھی بیان کرتے ہیں، فقہی مسائل، مذاہب و وجوہ اختلاف دلائل اور پھر ترجیح الراجح بیان کرتے ہیں۔ ترقی سائنس سے پیدا شدہ مسائل، جدید سیاسی صورت حال کا جائزہ، جدید معاشی نظام کا نشیب و فراز، نئے فتنوں کے عزائم، یہود و ہنود کے منصوبے، عالم اسلام کو درپیش مسائل اور پھر قرآن و سنت کی روشنی میں ان کا حل خصوصیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ جس کا اندازہ زیر نظر درسی افادات سے لگایا جاسکتا ہے۔

صحافت: درس و تدریس کے ساتھ ساتھ ۱۹۶۵ء میں آپ نے ماہنامہ الحق کے نام سے ایک دینی و علمی جریدے کا آغاز کیا۔ جسے بہت جلد ملک اور بیرون ملک مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی۔ اور تا دم تحریر نہایت آب و تاب سے جاری ہے۔

مشہور تلامذہ: ویسے تو اس طویل دور تدریس میں آپ کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے جو

ملک و بیرون ملک مختلف خدمات دینیہ میں مشغول ہیں۔ مگر ان میں چند مندرجہ ذیل ہیں:

حضرت مولانا مفتی غلام الرحمن (مہتمم جامعہ عثمانیہ پشاور)، حضرت مولانا اصلاح الدین (مرتب
تقریر شمائل ترمذی کتاب ہذا وانا)، حضرت مولانا محمد محسن شاہ (مہتمم جامعہ حلیمیہ درہ پیزو)، حضرت
مولانا نصیب علی شاہ (سابق ایم این اے، مہتمم المرکز الاسلامی بنوں)، مولانا حبیب اللہ حقانی (ناظم
دارالعلوم اسلامیہ لکی مروت)، حضرت مولانا حافظ ابن اثین (مہتمم دارالعلوم تحت نصرتی)، استاد المعقول
والمعقول حضرت مولانا تاج محمد حقانی (مدرس دارالعلوم کابلی)، حضرت مولانا عبید اللہ چترائی (سابق مہتمم
دارالعلوم تعلیم الاسلام باڑہ گیٹ پشاور)، حضرت مولانا گوہر شاہ (ایم این اے، مہتمم جامعہ اسلامیہ
چار سده)، حضرت مولانا غلام محمد صادق (ایم این اے، ناظم جامعہ اسلامیہ)، شیخ الحدیث حضرت
مولانا ادریس حقانی (ایم پی اے، اتمان زئی)، حضرت مولانا بدر منیر صاحب (مہتمم دارالعلوم تعلیم القرآن
بٹ خیلہ) حضرت مولانا صبغة اللہ حقانی (مہتمم مدرسہ ہاشمیہ کوئٹہ)، حضرت مولانا خیر محمد (جامعہ
خیر المدارس کوئٹہ)، حضرت مولانا سید عبدالباری آغا (سابق صوبائی وزیر مذہبی امور بلوچستان)، حضرت
مولانا عصمت اللہ (سابق وزیر خزانہ بلوچستان)، حضرت مولانا نصیب خان صاحب استاد حدیث
دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک)، حضرت مولانا سیف اللہ حقانی (رکس دارالافتاء دارالعلوم حقانیہ)، حضرت
مولانا الطاف الرحمن بنوی (استاد حدیث جامعہ امداد العلوم پشاور)، حضرت مولانا ثار اللہ حقانی (مہتمم
دارالعلوم اضنا خیل)، حضرت مولانا قاضی فضل اللہ صاحب (سابق ایم این اے چھوٹا لاہور حال مقیم
امریکہ)، حضرت مولانا محمد ابراہیم فانی (مدرس دارالعلوم حقانیہ)، حضرت مولانا حافظ شوکت علی
حقانی (مدرس دارالعلوم حقانیہ)، حضرت مولانا مفتی غلام قادر حقانی (مدرس دارالعلوم حقانیہ) مولانا
عبدالکبیر حقانی (سابق گورنر جلال آباد و معاون سرپرست شوریٰ عالی افغانستان)، حضرت مولانا سعید الرحمن
حقانی (پاکستان میں افغانستان کے سابق سفیر، معاون وزیر فوائد عامہ ”مواصلات و تعمیرات“)،
مولانا احمد اللہ حقانی (سابق وفاقی وزیر فوائد عامہ ”مواصلات و تعمیرات“)، مولانا سید غیاث الدین
حقانی (سابق وفاقی وزیر اوقاف)، مولانا مسلم حقانی (سابق معاون وزیر حج)، مولانا عبداللطیف

حقانی (سابق وفاقی وزیر زراعت)، مولانا عبدالرقيب حقانی (سابق وفاقی وزیر شہداء صالحین)، مولانا حفیظ اللہ حقانی (سابق سیکرٹری خارجہ و سابق وزیر منصوبہ بندی)، مولانا حاجی احمد جان حقانی (سابق وفاقی وزیر پانی و بجلی)، مولانا صدرا عظیم حقانی (نائب گورنر جلال آباد)، مولانا نور محمد ثاقب حقانی (سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ آف افغانستان)، اور دیگر بے شمار تحریک طالبان اور جہاد افغانستان کے قائدین بھی آپ کے تلامذہ کی فہرست میں شامل ہیں۔

اولاد و احفاد: اللہ تعالیٰ نے اولاد و احفاد کی نعمت سے بھی نوازا ہے۔ جن میں مولانا حامد الحق فاضل مدرس حقانیہ مہر قومی اسمبلی، مولانا راشد الحق فاضل مدرس حقانیہ ایڈیٹر ”الحق“، اسامہ سمیع، خزیمہ سمیع، عبدالحق ثانی ابن مولانا حامد الحق، محمد احمد بن مولانا راشد الحق سمیع وغیرہ شامل ہیں۔

تصنیف و تالیف: تدریسی، سیاسی اور دارالعلوم کی انتظامی ذمہ داریوں کے باوجود آپ نے تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ آپ کے تصانیف اور درسی افادات میں بعض اہم کتابیں درج ذیل ہیں:

- (۱) ملت اسلامیہ کا موقف (قومی اسمبلی میں مرزائیوں کو متفقہ طور پر غیر مسلم اقلیت اس کتاب کو پیش کرنے کے بعد قرار دیا گیا)
- (۲) حقائق السنن شرح جامع الترمذی (افادات حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق)
- (۳) اسلام کا نظام اکل و شرب و فلسفہ حلال و حرام (شرح جامع ترمذی کتاب الاطعمۃ والاشریہ)
- (۴) میری علمی اور مطالعاتی زندگی (۵) اسلام اور عصر حاضر
- (۶) قومی اسمبلی میں اسلام کا معرکہ (۷) زین المحافل شرح شمائل ترمذی ۲ جلدوں میں
- (۸) دعوات حق (خطبات شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق) دو جلدوں میں
- (۹) خطبات حق (خطبات مولانا سمیع الحق)
- (۱۰) مکتوبات مشاہیر اکابر امت بنام مولانا عبدالحق
- (۱۱) مکتوبات مشاہیر بنام مولانا سمیع الحق، کئی جلدوں میں

- (۱۲) صلیبی دہشت گردی اور اسلام کا محرک (عالمی میڈیا سے بے لاگ مکالمہ اور انٹرویوز)
 (۱۳) سینٹ میں شریعت بل کا محرک (۱۴) وفاقی مجلس شوریٰ (فوجی پارلیمنٹ میں اسلام کی جنگ)
 (۱۵) روسی الحاد (۱۶) عبادات و عبدیت
 (۱۷) مسئلہ خلافت و شہادت (۱۸) صحیحہ با اہل حق
 (۱۹) قرآن حکیم اور تعمیر اخلاق (۲۰) کاروان آخرت
 (۲۱) قادیان سے اسرائیل تک (۲۲) قومی اور ملی مسائل پر جمعیت کا موقف

اور اسی تصنیف و تالیف اور ریسرچ کیلئے آپ مدظلہ نے جامعہ دارالعلوم حقانیہ میں شعبہ مؤتمرا لمصنفین کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ جوان کی نگرانی میں شب و روز مصروف عمل ہے۔ تحریکات اور ملی خدمات: درس و تدریس کے ساتھ آپ نے مختلف تحریکات میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ صدر ایوب خان کے دور حکومت میں جب ماڈرن ازم کے داعی ڈاکٹر فضل الرحمن کے فتنہ نے سراٹھایا تو آپ نے اس کا بھرپور تعاقب کیا۔ جس پر ماہنامہ الحق میں شائع شدہ آپ کے ادارے دال ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں جب تحریک ختم نبوت شروع ہوئی، تو آپ نے اس تحریک میں بھی اپنے والد محترم اور قائد جمعیت علماء اسلام حضرت مولانا مفتی محمود اور دوسرے اکابر علماء کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت مفتی صاحب نے قومی اسمبلی میں امت مسلمہ کی ترجمانی کرتے ہوئے قادیانیت کے بارے میں ”ملت اسلامیہ کا موقف“ جو سنایا تھا۔ اس کا کافی حصہ آپ نے لکھا تھا۔

۱۹۷۷ء میں جب تحریک نظام مصطفیٰ شروع ہوئی۔ تو اس میں بھی آپ نے قائدانہ کردار ادا کیا۔ جس کی پاداش میں آپ نے ہری پور جیل میں قید و بند کی صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔

سیاسی خدمات: درس و تدریس، تصنیف و تالیف، ماہنامہ الحق کی ادارت اور دارالعلوم کے انتظامی امور کے ساتھ ساتھ ملکی سیاست میں بھی آپ نے اہم خدمات سرانجام دی ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں جب اکابرین جمعیت علماء اسلام حضرت مولانا عبداللہ در خواستی، حضرت مولانا مفتی محمود اور مجاہد ملت حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی نے حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق کو عام انتخابات میں حصہ لینے پر مجبور کیا۔ تو

آپ (مولانا سید الحق) کو مجبوراً حصہ لینا پڑا۔ اور حضرت شیخ الحدیث کی کامیابی کے بعد قومی اسمبلی میں ساری کارروائی پس پردہ آپ ہی چلاتے رہے۔ تحریک التواء کی قراردادیں، اور ۱۹۷۳ء کے آئین میں ترامیم پیش کرنے میں بھی آپ پیش پیش رہے۔

جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دور مارشل لاء میں آپ کو وفاقی مجلس شوریٰ کا ممبر نامزد کیا گیا۔ تو زکوٰۃ و عشر، حدود، قصاص و دیت اور امتناع قادیانیت آرڈیننس کا نفاذ اور آئین میں بے شمار اسلامی شقوق اور دفعات کا شمول آپ ہی کی شبانہ روز جدوجہد کی بدولت ممکن ہو سکا۔ اور جب (۱۹۸۵ء میں) سینٹ آف پاکستان کے آپ ممبر بنے۔ تو آٹھ سال کی طویل تاریخی جدوجہد کے بعد سینٹ سے شریعت بل منظور کروایا۔

اسلامی جمہوری اتحاد کا قیام: مملکت خداداد پاکستان پر جب سیکولرزم کے منحوس سائے دوبارہ پھیلنے لگے تو اس کے تدارک کیلئے آپ نے اس وقت اسلامی جمہوری اتحاد کی بنیاد رکھی۔ جس میں نویسیائی و مذہبی جماعتیں شامل ہوئیں۔ اور متفقہ طور پر آپ کو اس اتحاد کا سنیر نائب صدر منتخب کیا گیا۔

متحدہ علماء کونسل کا قیام: ۱۹۸۸ء میں جب بے نظیر کی حکومت قائم ہوئی۔ تو آپ نے اس کے خاتمہ کے لئے متحدہ علماء کونسل کے پلیٹ فارم پر تمام مکاتب فکر کے علماء اور اکابرین کو جمع کیا۔ جس کی بدولت نسوانی حکومت کا خاتمہ ممکن ہو سکا۔

متحدہ دینی محاذ کی تشکیل: بھارت میں جب بابری مسجد کے انہدام کا دلخراش حادثہ پیش آیا۔ تو ملک میں دینی اقدار و آثار کو تباہی سے بچانے کیلئے ۱۵ دسمبر ۱۹۹۲ء کو ایک بار پھر تمام دینی جماعتوں کے قائدین کو جمع کر کے ”متحدہ دینی محاذ“ کی تشکیل کی۔

تحریک تحفظ مدارس دینیہ: ۱۹۹۲ء میں جب بے نظیر حکومت نے مدارس دینیہ کے خلاف بے بنیاد الزامات لگانے، مدارس کی انکوائریاں اور تحقیقات کرانے کا سلسلہ شروع کیا، تو مولانا صاحب نے یکم جنوری ۱۹۹۵ء کو لاہور میں تمام مکاتب فکر کے علماء اور ارباب مدارس کو جمع کر کے ”تحریک تحفظ مدارس دینیہ“ قائم کی اور حکومت کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا۔

اب جبکہ جنرل پرویز مشرف کی فوجی حکومت اور اس کے ناعاقبت اندیش وزراء نے امریکہ کی

خوشنودی حاصل کرنے کیلئے مدارس دینیہ کے خلاف مہم شروع کی۔ تو اسی مرد مجاہد نے ۳۰ مارچ ۲۰۰۰ء کو دارالعلوم حقانیہ میں تمام مدارس کے مہتممین کو جمع کر کے مذکورہ منصوبہ کے سامنے بند باندھا۔

ملی بیکجی کونسل کا قیام: ۱۹۹۶ء میں ملک عزیز میں فرقہ واریت کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور حکومتی سطح پر امریکہ کے نیو ورلڈ آرڈر کی تکمیل کی سازشیں شروع ہوئیں۔ تو اس نازک وقت میں آپ ہی نے تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے ”ملی بیکجی کونسل“ قائم کی۔

سی ٹی بی ٹی: ۱۹۹۸ء میں جب نواز حکومت سی ٹی بی ٹی پر دستخط کیلئے آمادہ ہوئی تو مولانا صاحب نے نہ صرف اپنے ادارہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ سے اس کی مخالفت میں مدلل شرعی فتویٰ شائع کر کے راتوں رات سینٹ اور قومی و صوبائی اسمبلیوں کے ممبران میں تقسیم کروایا، بلکہ ۵ مئی ۱۹۹۸ء کو تمام دینی جماعتوں کی آل پارٹیز کانفرنس طلب کر کے اس ناپاک سازش کو ناکام بنایا۔

دفاع افغانستان و پاکستان کونسل کا قیام: جہاد افغانستان اور تحریک طالبان میں حضرت مولانا سمیع الحق صاحب کا کلیدی کردار کسی پر غفلت نہیں کہ انہوں نے اس جہاد میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ اور کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ تحریک طالبان میں شامل طلباء اور ان کے قائدین کے آپ نہ صرف مربی ہیں۔ بلکہ دارالعلوم حقانیہ کے مہتمم کی حیثیت سے ہزاروں کی تعداد میں علماء اور طالبان لیڈر آپ کے براہ راست شاگرد ہیں۔ جنوری ۲۰۰۱ء میں جب امریکہ نے افغانستان پر پابندیاں لگانے کا فیصلہ کیا تو مولانا صاحب نے ملک کی تمام دینی اور سیاسی جماعتوں کے مرکزی قائدین کو دارالعلوم حقانیہ میں جمع کیا۔ اس کانفرنس میں امریکی استعمار اور سامراج کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہوئے ”دفاع افغانستان و پاکستان کونسل“ کے قیام کا باضابطہ اعلان کیا گیا۔ اور اتفاق رائے سے مولانا صاحب کو اس کونسل کا چیئرمین نامزد کیا گیا۔

سود کے خلاف آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد: پاکستان کے اعلیٰ عدالتی ادارے سپریم کورٹ نے حکومت کو ۳۰ جون ۲۰۰۱ء تک سودی نظام ختم کرنے کا حکم دیا۔ اور حکومت نے حسب سابق اس سلسلہ میں لیت و لعل کی پالیسی اختیار کرنی شروع کی۔ تو مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ نے ۱۹ مئی ۲۰۰۱ء کو کراچی میں تمام دینی اور سیاسی جماعتوں کا مشترکہ سربراہی اجلاس طلب کیا۔ اور حکومت کو سپریم کورٹ کے فیصلہ پر عمل کرنے کا نوٹس دیا۔ اور بصورت دیگر حکومت کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کیا۔

مختصر تذکرہ مرتب کتاب

مولانا اصلاح الدین حقانی بن مولانا سراج الدین

ولادت: ۱۸ ستمبر ۱۹۵۸ء مطابق ۴ ربیع الاول ۱۳۷۸ھ بروز جمعرات بمقام ملازنی ضلع ٹانک

گھرانہ: آپ کے دادا اپنے علاقہ کے مشہور عالم تھے۔ والد صاحب مولانا سراج الدین مرحوم تقسیم سے قبل سہارنپور میں پڑھتے تھے۔ تقسیم ہند کی وجہ سے ۱۹۴۷ء میں جامعہ خیر المدارس ملتان آگئے اور وہیں سے فراغت حاصل کی۔ جید عالم دین اور اپنے علاقہ میں افتاء کے مرجع تھے۔

تعلیم: ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ملازنی میں حاصل کی۔ دینی کتب دادا مولانا شیخ امیر صاحب، والد صاحب مولانا سراج الدین صاحب اور مولانا عبدالحق صاحب رحمہم اللہ سے پڑھیں۔ یہیں سے ۱۹۷۵ء میں سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ سکول کے اساتذہ اور دیگر احباب کی رائے تھی کہ کالج میں داخلہ لیں۔ مگر اپنے شوق اور والدین جبکہ بالخصوص دادا جان کی خواہش نے دینی علوم کی طرف کھینچا۔ میٹرک کے نتیجہ کے بعد چونکہ مدارس کے تعلیمی سال کا کچھ حصہ گزر چکا تھا۔ اس لئے بڑے مدارس میں داخلہ کی توقع نہیں تھی۔ تو والد صاحب نے اپنے تعارف پر بنوں کے دارالعلوم الاسلامیہ میں ۲۶ جنوری ۱۹۷۶ء مطابق ۱۳۹۶ھ کو داخلہ دلوایا۔ جون ۱۹۸۰ء تک یہیں پڑھتے رہے۔ اور ابتدائی فنون یہیں پڑھے۔

۲۴ اگست ۱۹۸۰ء مطابق ۱۲ شوال ۱۴۰۰ھ کو مشہور عالم درسگاہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں داخلہ لیا۔ پانچ سال تک یہی پڑھتے رہے۔ شعبان ۱۴۰۵ھ میں وفاق المدارس کے عالمیہ کے امتحان سے فارغ ہو کر ۳ مئی ۱۹۸۵ء دارالعلوم حقانیہ سے سند الفراغت حاصل کی اور وفاق المدارس کے امتحان میں پاکستان بھر میں اول آنے کا اعزاز ملا۔

فراغت کے بعد دارالعلوم الاسلامیہ کی مروت دارالعلوم وزیرستان وانا (جنوبی وزیرستان انجنسی) اور جامعہ اسلامیہ زرگری ضلع ہنگو میں مختلف فنون اور حدیث پاک کی کتابوں کی تدریس کا موقع ملا جو الحمد للہ تاحال جاری ہے۔

عصری علوم: جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ میٹرک کا امتحان ریگولر طالب علم کی حیثیت سے اپنے گاؤں سے پاس کیا۔ پھر دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کا پرائیویٹ مطالعہ جاری رہا۔ ۱۹۸۰ء میں ایف اے کا امتحان پشاور بورڈ سے پاس کیا۔ ۱۹۸۳ء میں گول یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان دیا تو یونیورسٹی میں اول آئے۔ اور گولڈ میڈل کا مستحق قرار دیئے گئے۔ اور ۱۹۸۶ء میں ایم اے عربی کے امتحان میں یونیورسٹی بھر میں اول آئے۔ اور دوبارہ گولڈ میڈل کا مستحق قرار دیئے گئے۔

اور ۱۹۸۹ء میں ایم اے اسلامیات کے امتحان میں یونیورسٹی میں تیسری پوزیشن لی۔

تحریر و تحقیق: ابتداء ہی سے ادبی ذوق ملا تھا۔ سکول کے زمانہ میں بھی اساتذہ کے حکم سے مضامین لکھتے رہے۔ اشعار کا ملکہ بھی ملا تھا۔ طالعلمی کے زمانے کے بہت سے اشعار تو ضائع ہو چکے ہیں۔ اور فراغت کے بعد شعر گوئی کی طرف توجہ کم کرنی پڑی۔ البتہ اساتذہ کے دروس کے امالی محفوظ ہیں۔ بلکہ مطوّل اور مسلم شریف کے دروس کے امالی ایک انفعالی شخص اپنے نام سے چھپوا چکا ہے۔ الحمد للہ اس کو کوئی کوفت نہیں ہوئی۔ ان امالی میں مشکوٰۃ شریف کی تقریر سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ جس سے ہزاروں فوٹو سٹیٹ کا بیجا نکل چکی ہیں۔

حضرت مولانا شیخ الحدیث معفور اللہ صاحب مدظلہم کے درس کی اس تقریر سے ایک عالم استفادہ کر رہا ہے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب رحمہ اللہ کی حقائق السنن کے احادیث کی تخریج بھی کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں دیگر مضامین لکھنے کا شغف بھی تھا۔ جن میں الحق اکوڑہ خلک، اقرأ کراچی اور النصحہ چارسدہ وغیرہ جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مکمل شرح کی حیثیت سے زیر نظر کتاب نقش اول ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور سعادت دارین کا وسیلہ بنائے۔ آمین

بسم اللہ الرحمان الرحیم

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى قال الشيخ الحافظ

ابو عيسى محمد بن عيسى بن سورة الترمذی.

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں اور سلامتی ہو اس کے ان بندوں پر جن کو انہوں نے

منتخب کیا۔ شیخ حافظ ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذی فرماتے ہیں

کتاب کی ابتداء میں بسم اللہ اور حمد لانے کی متعدد وجوہ بیان کی گئی ہیں جن میں اہم وجوہ

درج ذیل ہیں۔

(۱) قرآن مجید کی اقتداء

(۲) تیسمن یعنی برکت کا حصول

(۳) ان احادیث کا اتباع جن میں بسم اللہ اور حمد کے بغیر کسی کام کے شروع کو ایتر اور

اجزم یعنی ناقص اور بے برکت کہا گیا ہے۔

(۴) سلف صالحین کی دیگر کتابوں کی تقلید

اجزاء کی تشریح اور ظرف کا متعلق: باء کو استعانت کے لیے لایا گیا ہے جو تیسمن اور تہمک کو مضمّن

ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک کی اعانت سے برکت حاصل کر رہا ہوں، بعض حضرات نے باء کو تعدیۃ

کے لیے قرار دیا ہے جیسا کہ علامہ بیہقی نے مضمونی اور جوہی کی طرف منسوب کیا ہے۔

لفظ اللہ اس ذات حق کے لیے علم کے مرتبہ میں ہے جو تمام صفات کمال سے متصف اور صفات

نقصان سے پاک ہے جبکہ رحمن اور رحیم دونوں رحمت سے مبالغہ کے صیغے ہیں جو کہ دنیا و آخرت میں اللہ

تعالیٰ کے فضل و کرم پر دال ہیں اور (دنیا و آخرت) کے لیے تسکین و تسلی کا سامان ہیں۔

بسم اللہ کی باء جارہ بظاہر فعل مقدر کے ساتھ متعلق ہے جو کہ ابتدائاً ولف ہے یا پھر ابتدائی یا

تالیفی جیسے مصادر کے ساتھ اس کا تعلق ہے یہ مقدم بھی مقدر کہا جاتا ہے اور مؤخر بھی لیکن محققین شراح و مفسرین نے مؤخر مقدر کرنے کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ اس طرح قصر حصر کے علاوہ تقدیم اسم الہی کی وجہ سے تعظیم بھی مستفاد ہوتا ہے نیز اسم الہی کو مقدم ماننے سے تبرک کا حصول بھی زیادہ قریب تر ہے اور یہی اصل مقصود بھی ہے۔

حمد کا مطلب: اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے تمام محامد کا مستحق ہے اور اختیاری محاسن کے مقابلے میں واقع تمام تعریفیں صرف اسی کے لائق و مناسب ہیں کیونکہ وہی ذات تمام محاسن کے لیے مبداء ہے جبکہ مخلوق اسی ذات کی جمالی اور جلالی صفات کے مظاہر ہیں۔

لفظ سلام کی تشریح: سلام سے یا تو تسلیم مراد ہے یعنی سلام بھیجنا یا یہ سلامتی کے معنی میں ہے اور اس کی تکمیل میں بھی دو احتمال ہیں یا تو تعظیم کیلئے ہے یعنی ہماری طرف سے عظیم سلام ہو۔ یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے لاحد و سلامتی ہو منتخب بندوں پر یا پھر تکثیر و تعیم کیلئے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر قسم کی سلامتی ہو ان لوگوں پر جو عبدیت کا اعلیٰ ترین مقام پانے کیساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے منتخب شدہ بھی ہیں یہ دونوں وصف انبیاء کرام، علماء و اولیاء، فرشتوں اور جنات صالحین میں پائے جاتے ہیں۔ لہذا نبی کریم ﷺ اہل بیت اور حضرات صحابہ سب کا حق ادا ہو گیا۔ اس مقام پر بعض شراح نے کہا ہے کہ الحمد کے مقابلے میں سلام کے لفظ کو نکرہ لانے میں نکتہ یہ ہے کہ حمد میں تعظیم اور سلام میں (تحقیر یعنی حمد سے کم درجہ گویا تقلیل و تصغیر مقصود ہے) اگرچہ اس قول کی ایک تاویل بھی علامہ بیجوری وغیرہ نے کی ہے۔ لیکن ملا علی قاری اور قسطلانی نے اس کو مردود قرار دیا ہے۔ اگر یہ تحقیر کے لیے نہیں تو پھر اس میں کیا نکتہ ہے۔ تو بعض شراح نے یہ کہا ہے کہ اس میں تکمیل تعظیم کے لیے ہے یا تکثیر و تعیم کے لیے۔ جیسے پہلے بیان ہو چکا ہے۔

کیا صلوٰۃ و سلام بیک وقت لازمی ہیں: یہاں پر یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ امام نووی نے صلوٰۃ و سلام کو ایک دوسرے کے بغیر لانے کو مکروہ قرار دیا ہے بلکہ خود جب امام مسلم نے صرف صلوٰۃ کا ذکر کیا ہے تو اس کے اس فعل کو مکر کہہ دیا ہے اس کا استدلال ہے کہ یا ایہا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما (الایۃ) میں صلوٰۃ و سلام کا یکجا امر ہوا ہے۔ لہذا صلوٰۃ کا افراد ناجائز ہے اسی طرح سلام کا

افراد بھی ناجائز ہوگا۔

اس سوال کے جواب میں بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ صلوٰۃ کا افراد اور اسی طرح سلام کا افراد ابتدائے اسلام میں مکروہ تھا مگر یہ کراہت بعد میں منسوخ ہو گئی لیکن ملا علی قاریؒ نے تاریخی ثبوت نہ ہونے کی بناء پر اس قول کو مردود کہا ہے۔ بعض حضرات نے جواب دیا ہے کہ مصنفؒ اور اسی طرح امام مسلمؒ پر افراد کا اعتراض اس وقت صحیح ہوتا جبکہ اسی مجلس میں اور اس پوری کتاب میں وہ ایسا کرنے کے مرتکب ہوتے یعنی اس مجلس میں سلام کے ساتھ صلوٰۃ ذکر نہ کرتے یا کتاب میں صلوٰۃ نہ لاتے۔ تو ان کو تارک صلوٰۃ کہا جاسکتا تھا جبکہ یہاں پر سلام صلوٰۃ کو متضمن ہے۔ نیز مصنف کی کتاب تو صلوٰۃ و سلام سے بھری پڑی ہے لیکن اصل اور صحیح جواب یہ ہے کہ امام نوویؒ نے کراہت کا جو دعویٰ کیا ہے وہ درست نہیں بلکہ خود شوافع میں ان کے سوا کوئی اس کا قائل نظر نہیں آتا۔ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں لم افق علی دلیل یقتضی الکراہۃ۔ علامہ جزیریؒ نے امام نوویؒ پر رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگرچہ صلوٰۃ و سلام میں جمع اولیٰ ہے لیکن لا اعلم احداً نصّ علی ذالک (قول الکراہۃ) من علماءنا ولا غیرہم۔

بائیں ہمہ امام ترمذیؒ تو ویسے بھی اس الزام سے بری نظر آتے ہیں کیونکہ انہوں نے سلام کا یہ انداز سورۃ النمل کی آیت ۵۹ سے بطور اقتباس اختیار کیا ہے لہذا اس کی ذمہ داری ان پر نہیں ڈالی جائیگی۔ بلکہ خود رب ذوالجلال کی طرف سے یہ انوکھا اور بہترین انداز تسلیم ہے۔ اب یہاں یہ استفسار ہو سکتا ہے کہ مصنف خود اپنے الفاظ میں حمد کیوں نہیں لائے اور اقتباس کا انداز اختیار کرنے کا کیا سبب ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس انداز میں ایک طرف تو اس امر کا احتیاط ملحوظ نظر ہے جو رب تبارک و تعالیٰ کی طرف سے صادر ہوا ہے کہ **وقل الحمد لله و سلام علی عباده الذین اصطفیٰ**۔ (سورۃ النمل ۵۹)

دوسری طرف ادائے حمد کے عمل عظیم میں اپنی عجز کو بھی اشارہ ہے اور یہ وضاحت کرنا مطلوب ہے کہ میں خود اپنی طرف سے حمد و صلوٰۃ کا حق ادا نہیں کر سکتا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔

خدا در انتظار حمدِ مانیت محمد چشم بر راہِ ثنائیت
محمد حامدِ حمدِ خدا بس خدا خود مدحِ آفرینِ مصطفیٰ بس

بلکہ حق یہ ہے کہ دنیا میں حضور اقدس ﷺ خود بھی حمد کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شفاعت کبریٰ کے موقع پر حالت سجدہ میں مجھ پر کچھ ایسے انداز سے حمد کا القاء فرمائے گا جو اس وقت سے پہلے میرے علم میں نہیں ہوگا۔ نیز ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں کہ سبحانک لا تحصی ثناء علیک أنت کما أنتیت علی نفسک۔

اے اللہ تو پاک ہے ہم تیری تعریف کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں تو ویسا ہے جیسا کہ تو نے اپنے آپ کی تعریف کی ہے۔

رہی یہ بات کہ وعلی عبادہ الذین اصطفیٰ میں سلامتی اللہ کے منتخب بندوں پر بتائی گئی ہے اور اللہ کے منتخب بندے انبیاء کرام ہیں۔ مگر سوال اٹھتا ہے کہ کفار کی جانب سے انبیاء اور ان کے صحابہ پر تو بہت زیادہ مظالم ہوئے ان کو زیادہ تکالیف پہنچائی گئیں۔ قتل کیے گئے، مارے گئے، گالیاں دی گئیں۔ اودیت فی اللہ عالم یؤذ احداً ارشاد نبوی ﷺ ہے تو سلامتی کا کیا مطلب؟ جواب یہ ہے کہ دراصل یہ انشاء ہے اور سلامتی کی دعا ہے اخبار نہیں ہے۔ لہذا اشکال نہیں رہا۔ اور اگر اخبار کے معنی میں لے لیں تو توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ انبیاء کرام تمام تکالیف کے باوجود منصب نبوت کی ادائیگی کو ملحوظ رکھنے میں سلامت رہے اور تھوڑی سی لغزش اور کوتاہی بھی ان سے اپنے منصب میں صادر نہیں ہوئی۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ عباد سے مراد یہاں انبیاء کرام ہیں جن کو خداوند کریم نے نبوت کے لیے منتخب فرمایا۔ لیکن عبدیت کے لقب سے ذکر کیا اور بندگی ہی کسی بندہ کے لیے عظیم ترین صفت ہے۔ حتیٰ کہ نبی کی عبدیت کو نبوت اور رسالت سے افضل سمجھا جاتا ہے کیونکہ عبدیت کا تعلق اللہ کی نسبت ہے اور رسالت دوسرے لوگوں کی نسبت سے ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کے لیے قرآن مجید میں ”عبدہ“ کا لفظ لایا گیا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ اضافت خود اپنی طرف کروا کر بندہ کی تشریف و تعظیم کرتے ہیں تو یہاں بھی اضافت تشریفی اور تعظیم کے لیے ہے۔ واضح رہے کہ ہر جگہ اضافت تعظیم کے لیے نہیں ہوتی۔ یہاں قرآن خارج اس پر دلالت کرتے ہیں کہ تشریفی ہے ورنہ ثم بعثنا علیہم عبادا لنا اولی باس شدید (الایہ) میں عباد سے مراد بخت نصر اور اس کے ساتھی ہیں جنہوں نے بیت المقدس کو ڈھایا تھا تو وہاں پر اضافت تعظیم کے لیے نہیں ہے۔

خطبہ میں تشہد: بعض حضرات نے امام ترمذیؒ کے اس خطبہ پر یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ اس میں تشہد موجود نہیں ہے۔ اور خود نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ کل خطبة ليست فيها تشهد فهي كاليد العجذمي۔ لہذا یہ خطبہ ناقص ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں خطبہ سے مراد ہر خطبہ نہیں بلکہ خطبہ نکاح مراد ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ امام ابو داؤدؒ نے یہ حدیث کتاب النکاح میں ذکر کیا ہے۔ تو گویا ان کے نزدیک بھی یہاں خطبہ نکاح مراد ہے۔ علاوہ ازیں ممکن ہے مصنفؒ نے زبانی طور پر تشہد ادا کیا ہو یا دل میں پڑھا ہو لہذا اشکال باقی نہیں رہے گا۔

شیخ و حافظ کی اصطلاحات: قال الشيخ الحافظ (۱): شیخ لغت میں عمر رسیدہ شخص کو کہتے ہیں لیکن علماء کی اصطلاح میں اس شخص پر بھی بولا جاتا ہے جو کسی فن میں ماہر، کامل اور قابل تقلید ہو۔ اگرچہ عمر کے لحاظ سے نوجوان ہو۔ بعض لوگوں نے حدیث کی تدریس کے لیے معمر ہونے کو ترجیح دی ہے۔ لیکن خود محدثین عظام کے عمل سے اس کی تردید ہوتی ہے، اور حافظ سے بھی ہمارے ہاں کی مروجہ اصطلاح کے مطابق حافظ قرآن مراد نہیں بلکہ حافظ الحدیث مراد ہے جو کہ علم اصول حدیث کی اصطلاح میں علم حدیث اور روایت حدیث سے شغف رکھنے والے حضرات کے ایک خاص مرتبہ پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ محدثین کے ہاں حافظ الحدیث وہ شخص ہے جسے ایک لاکھ احادیث کی متون اور اسانید و علل از برہوں اسے امام بھی کہا جاتا ہے اور یہاں یہ مراد ہے (۲)۔

ابو یحییٰ محمد بن سورۃ الترمذیؒ: اس مقام پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ امام ترمذیؒ نے خود شیخ اور حافظ کہہ کر خود ستائی اور فخر و تکبر کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔ بلکہ درحقیقت تلامذہ کے اعتماد کو حاصل کرنے کے لیے اور تہذیب بالنعمة کے طور پر حقیقت حال کا اظہار فرمایا ہے جو کہ بوقت ضرورت واجب بھی ہوتا ہے۔

(۱) قال کے فاعل کے بارے میں بعض اہل علم کی رائے یہ ہے کہ مصنفؒ خود اس کا فاعل ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ اس کا فاعل آپ کا ایک شاگرد ابو العباس محمد بن محبوب الروزی التوفی ۳۲۶ھ ہیں۔ (بخاری)

(۲) حضرت تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ آج کل حافظ وہ شخص ہے جس کا احادیث کے ساتھ اتنا لگاؤ اور شغف ہو کہ جب بھی وہ کسی حدیث کو سنے تو اس حدیث کے بارے میں اسے صحیح اور ضعیف ہونے کا پہچان ہو سکے اور اس کو ایک ہزار سے زائد احادیث یاد ہوں۔ (بخاری)

جس طرح کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر بننے سے قبل مصر کے بادشاہ ریان کے سامنے اپنی صلاحیتیں اور کمالات گن گن کر پیش کی تھیں۔ یا پھر امام ترمذیؒ نے قضاؤ لایہ لقب اختیار کئے۔ تاکہ یہ کمالات حاصل ہو جائیں۔ آج کل بھی اپنے ساتھ ڈاکٹر، پروفیسر، انجینئر، پی ایچ ڈی یا فاضل تعارف کے لئے لکھا جاتا ہے نہ کہ تعریف اور خود ستائی کیلئے۔

جبکہ بعض شراح (۱) کے خیال میں اس بات کا احتمال ہے کہ امام ترمذیؒ کے بعض شاگردوں نے جو ان کی کتابوں کے راوی اور ناقل ہیں ان القاب کا اضافہ کر دیا ہے اور خود امام ترمذیؒ نے کوئی خود ستائی نہیں کی۔ واللہ اعلم۔

ابو عیسیٰ کنیت کا حکم: ابو عیسیٰ اس کنیت کو اختیار کرنے سے حدیث میں بھی ممانعت آئی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرف باپ کے منسوب ہونے کی وجہ سے یہ کنیت رکھنا مکروہ بتایا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنے فرمان میں اس علت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا اِنَّ عِيسٰی عَلَيْهِ السَّلَامُ لَا اَبَ لَه (۲)۔ لیکن ملا علی قاریؒ نے کہا ہے کہ ابتداء ابو عیسیٰ کنیت رکھنا اگرچہ مکروہ ہے لیکن کسی شخص کو اگر اس کنیت سے شہرت حاصل ہو جائے تو جائز ہوگی۔ اس پر علماء کا اجماع ہے بلکہ خود نبی کریم ﷺ نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو اس کنیت سے پکارا ہے۔ لہذا کراہت کا قول درست نہیں البتہ ابتداء کنیت رکھنے میں چونکہ اس لفظ سے ایک فاسد معنی کا توہم ہوتا ہے لہذا خلاف اولیٰ ہوگا۔

(۱) جمع الوسائل ج ۱ ص ۸

(۲) المواب الدنیہ ص ۵

۱. باب ماجاء فی خلق رسول اللہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے حلیہ مبارک کے بارے میں

لفظ باب کا اعراب: لفظ باب مشہور ترکیب کے مطابق مرفوع ہے اور عموماً اسے ماجاء الخ کی طرف مضاف کر کے پڑھا جاتا ہے۔ اس طرح یہ خبر ہو کر اس کی مبتداء مخدوف ہوگی یعنی ”ہذا باب ماجاء الخ“ یا پھر مبتداء بن کر اس کیلئے خبر مقدر مانا جائیگا اور تقدیر عبارت یوں ہوگی ”باب ماجاء الخ هذا الکلام الآتی“ دوسرا احتمال یہ ہے کہ باب یعنی تنوین کے ساتھ مرفوع پڑھا جائے اس طرح یہ لفظ مبتداء مخدوف کی خبر ہوگی۔ یعنی ”هذا باب“ اور مابعد کا کلام یعنی ماجاء مستأنف کلام ہوگا۔

تیسرا احتمال وقف کا ہے یعنی باب موقوف پڑھا جائے اس تقدیر پر محل من الاعراب میں واقع نہیں ہوگا۔ علامہ کرمائی نے اس احتمال کو بھی جائز کہا ہے۔

خلق اور خُلِق کا فرق: خَلَق بفتح الخاء اور خُلِق بضم الخاء واللام میں معنی کے لحاظ سے فرق ہے۔ اول الذکر دراصل ایجاد، ابداع اور پیدا کرنے کے معنی میں مستعمل ہے نیز ظاہری صورت وضع قطع اور طبعی حیثیت پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ جن کا ادراک بصارت کے ذریعے ہوتا ہے۔

جبکہ مؤخر الذکر کا اطلاق عموماً باطنی سیرت یعنی عادات و اخلاق اور ان صفات و معانی پر ہوتا ہے جو آنکھوں اور بصارت کے ذریعے معلوم نہ ہوں بلکہ بصیرت سے معلوم ہو رہی ہوں۔ یہاں پر لفظ خَلَق خاء کے فتح کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس باب میں جو چودہ احادیث مذکور ہیں وہ اصلاً آپ ﷺ کی ظاہری صورت اور شکل و ہیئت سے متعلق ہیں۔

آپ ﷺ کے کمالات باطنی اور محاسن ظاہری: نبی کریم ﷺ باطنی کمالات کے ساتھ ساتھ ظاہری محاسن کے بھی جامع تھے۔ اگرچہ ان محاسن کا کما حقہ ادراک عام لوگوں کو نہیں ہوتا تھا۔ لیکن کمالات میں آپ ﷺ سے زیادہ حسن کا مالک کوئی بھی نہیں تھا۔ امام قرطبی کا قول ہے کہ اگر آپ ﷺ کے تمام محاسن ظاہر ہو جاتے تو صحابہؓ آپ ﷺ کو دیکھنے کی تاب نہ لاسکتے۔ لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان احادیث میں جو کچھ بیان ہے یہ صرف وہ ہیں جو صحابہؓ کو نظر آیا۔ جبکہ آپ ﷺ کا حقیقی حسن اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ حتیٰ

کہ یہاں پر ہر مبالغہ حقیقت سے کم تر ہے۔ کیونکہ ان کے اوصاف جمیلہ سے الفاظ عاجز ہیں خود صحابہ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں جیسا کہ شمائل ترمذی میں آگے آرہے ہیں۔

یہی وہ بات ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔

لواحي زليخا لورأين جبينه لاثرن بالقطع القلوب على اليد

ترجمہ: اگر حضرت یوسفؑ کی محبت کی وجہ سے زلیخا کو کلامت کرنے والی عورتیں میرے محبوب کی جبین حسین کو دیکھ لے تھیں تو ہاتھوں کی بجائے دل کو کاٹ دینے کو ترجیح دے تھیں۔

اور کیوں نہ ہو جب حضرت عائشہؓ سے سوئی گم ہو جاتی ہے تو رخ انور کی روشنی میں وہ مل جاتی ہے۔ مصنف شمائل ترمذی میں نبی کریم ﷺ کے اخلاق، سیرت اور صفات کے مختلف پہلوؤں کو روایات کی روشنی میں اجاگر کرتے ہیں۔ لیکن ظاہری اور صوری محاسن کو باطنی محاسن پر اس لیے مقدم کیا کہ ایک تو ادنیٰ سے اعلیٰ کو ترقی ہو، دوسری بات یہ کہ اس میں ترمیم و جود کے طرف بھی اشارہ ہے۔ چنانچہ جسمانی وجود صورت و حیثیت کے بعد ہی اخلاق اور سیرت کا نمبر آتا ہے۔ علاوہ ازیں ظاہری صورت باطن کی ترجمان ہوتی ہے، اسلئے کہتے ہیں کہ الظاهر عنوان الباطن۔ چنانچہ آپ ﷺ نے خلق کو مقدم ذکر کیا۔

(۱) أخبرنا أبو رجاء قتيبة بن سعيد عن مالك بن أنس عن ربيعة بن

أبي عبد الرحمن عن أنس بن مالك أنه سمعه يقول كان رسول

الله ﷺ ليس بالطويل البائن ولا بالقصير ولا بالابيض الممق ولا

بالأدم ولا بالجعد القلط ولا بالسبط بعنه الله تعالى على رأس أربعين

سنة فاقام بمكة عشر سنين وبالمدينة عشر سنين فتوفاه الله تعالى

على رأس ستين سنة وليس في رأسه ولحيته عشرون شعرة بيضاء (۱)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نہ بہت لمبے قد کے تھے نہ

(۱) صحيح البخاری ۵۰۲/۱ کتاب المناقب باب صفة النبي ﷺ، صحيح مسلم ۵۸/۲ کتاب

الفضائل باب في صفة شعر النبي ﷺ وصفاته الخ (مختار)

پستہ قد کے نہ خالص (چونہ کی طرح) سفید تھے اور نہ بالکل گندم گوں (سانولے) تھے۔ آپ ﷺ کے بال مبارک نہ زیادہ ٹھنکے یا لے تھے نہ بالکل سیدھے تھے۔ چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو نبوت بخشی۔

پھر دس برس مکہ میں رہے اور مدینہ میں بھی دس برس قیام فرمایا۔ پھر ساٹھ سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو وفات دی۔ اس وقت آپ ﷺ کے سر مبارک اور داڑھی مبارک میں بال بھی سفید نہ تھے۔

حدیث اور اخبار میں فرق: ادائے حدیث کے متعدد معنی مثلاً حدثنا، أخبرنا، اور أنبانا وغیرہ ہیں۔ یہاں پر اخبارنا ذکر ہے جبکہ بعض نسخوں میں حدثنا کا لفظ آتا ہے۔ یہ دونوں لفظ لغت میں ہم معنی ہیں اور اصطلاح میں بھی حنفیہ میں محدثین مثلاً امام مالکؒ اور امام بخاریؒ کے نزدیک ایک ہیں۔ جبکہ امام ابن جریجؒ، امام شافعیؒ اور بعض دیگر حضرات نے ان دونوں لفظوں میں فرق بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ استاد حدیث کی قراءت کرے اور شاگرد سنے تو حدثنا کا لفظ مستعمل ہوتا ہے اور اگر شاگرد استاد کے سامنے حدیث پڑھ کر سنائے تو اخبارنا کے لفظ سے روایت کی جاتی ہے۔ تیسرا لفظ أنبانا کا ہے جو عموماً اس موقع پر بولا جاتا ہے جہاں قرأت نہ ہو بلکہ شیخ نے صرف اجازت دی ہو۔

پھر فرق کی صورت میں تحدیث یعنی شیخ کی قرأت بہتر ہے یا اخبار یعنی شاگرد کی قرأت۔ اس میں اختلاف ہے امام ابو حنیفہؒ اور بعض ائمہ نے مؤخر الذکر کو ترجیح دی ہے۔ جبکہ دیگر اہل عراق مسماع من الشیخ یعنی تحدیث کو اولیٰ کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک دونوں برابر ہیں۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ اس اختلاف کو اختلاف زمانہ و حالات پر محمول کیا جائے۔ متقدمین کے زمانہ میں طلبہ کے حضور اور کمال توجہ کی وجہ سے شیخ کی قرأت کو ترجیح دی جاتی تھی کیونکہ نبی کریم ﷺ اور صحابہؓ کا بھی ادائے حدیث کا طریقہ یہی تھا جبکہ بعد میں طلبہ میں کمال توجہ کے فقدان کے سبب ان سے حدیث پڑھوا کر شیخ بھیج کیا کرتا تھا۔ حضور ﷺ کی مجلس میں تو طلبہ کے حضور کی حالت اور تھی۔ حضرت عروہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جب آپ ﷺ بات کرتے تو صحابہؓ ایسے ساکن اور متوجہ ہوتے تھے کہ ان علی رؤوسهم الطیر گویا سر پر پرندے بیٹھے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ: اس حدیث کے راوی ابو حمزہ انس بن مالک بن نضر انصاری خزرجی ہیں۔ آپ ہجرت سے دس سال قبل مدینہ میں پیدا ہوئے۔ والدہ ام سلیم عطر پہچا کرتی تھیں۔ جب اس میں نبی کریم ﷺ کا پسینہ ملا یا تو اس کی خوشبو میں ایک خوشگوار اضافہ ہوا۔ ہجرت کے بعد حضرت انس کی والدہ ان کو لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ تیرا خادم ہے۔ اس کیلئے دعا فرمائیں۔ آپ ﷺ نے دعا فرمائی اللھم بارک لہ فی مالہ وولده واطل عمرہ واغفر لہ۔ اے اللہ اس کے مال واولاد میں برکت دے۔ اس کی عمر دراز فرما اور اس کی بخشش فرما۔ حضرت انسؓ اخیر عمر میں فرمایا کرتے تھے کہ تین دعائیں تو میری زندگی ہی میں قبول ہو چکی ہیں۔ چنانچہ اپنے صلیبی اولاد میں سے اٹھانوے کو تو دفن کر چکا ہوں۔

اور مال ایسا ملا کہ میرے باغ میں پھل سال میں دو مرتبہ لگتے ہیں۔ اور زندگی ایسی ملی کہ اس سے تنگ آچکا ہوں، جبکہ چوتھی دعا یعنی منفرت کی قبولیت کی توقع ہے۔ آپ کی اولاد کی تعداد سو سے متجاوز تھی۔ صرف طاعون جارف میں آپ کی اولاد میں اسی ۸۰ افراد کا انتقال ہوا تھا۔ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ سو بچے پیدا ہوئے جن میں زینہ اولاد کی تعداد اٹھتر ۸ تھی عمر بھی سو سال سے متجاوز تھی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں فقہ کی تعلیم دینے کیلئے بصرہ تشریف لے گئے۔ چنانچہ بہت سے ائمہ نے آپؐ سے استفادہ کیا۔ اور وہیں ۹۳ھ میں وفات پائی (۱)۔ بصرہ میں وفات ہونے والے صحابہ میں آپؐ آخری صحابی تھے۔

نبی کریم ﷺ کی قد وقامت: حلیہ کی تفصیل میں سب سے پہلے حضور اقدس ﷺ کے قد مبارک کا بیان ہے۔ راوی فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ زیادہ لمبے قد والے نہیں تھے۔ بائیں کے معنی الگ اور ممتاز کے بھی ہوتے ہیں۔ اور بعید کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ لہذا طویل بائیں کے معنی ہیں۔ اتنا لمبا جو دوسروں سے الگ اور ممتاز نظر آئے۔ یا وہ جس کے اعضاء ایک دوسرے سے دور دور ہوں۔

(۱) جمع الوسائل میں تاریخ وفات ۱۱ھ لکھی ہے جو درست معلوم نہیں ہوتی۔ شاید ناخ نے احدی و تسعین کی جگہ غلطی سے احدی و سبعین لکھ دیا ہو۔ ورنہ آپ کی تاریخ وفات میں ۹۰ء، ۹۱ء، ۹۲ء اور ۹۵ ہجری کے مختلف اقوال تو پائے گئے ہیں ۱۱ھ کا قول جمع الوسائل کے سوا کہیں بھی نہیں ملتا۔ بلکہ خود ملا علی قاریؒ نے مرقات میں آپ کی تاریخ وفات ۹۳ھ لکھی ہے اور یہی قول راجح بھی ہے۔ دیکھیں مرقات شرح مشکوٰۃ ج ۱، ص ۱۴۴ (اصلاح الدین)

ولا بالقصیر ”لا“ سابقہ نفی کی تاکید کے لیے ہے۔ اور قصیر پستہ قد کو کہتے ہیں۔ گویا آپ ﷺ پستہ قد بھی نہیں تھے۔ لہذا مطلب یہ ہوا کہ آپ میانہ قد شخص تھے۔ جس طرح کہ آگے دوسری احادیث میں اس کی تصریح موجود ہے۔ لیکن بعض دیگر احادیث میں یہ بھی مروی ہے۔ آپ ﷺ طویل کی طرف مائل اور قریب تھے یعنی میانہ قد سے قدرے اونچے تھے۔ اسلئے جہاں روایات میں مریسوع (میانہ قد) کا لفظ آتا ہے اس سے مراد میانہ قد کے قریب ہے بالکل میانہ قد مراد نہیں۔ حضرت براء بن عازبؓ کی حدیث میں اس کی تصریح ہے۔ اور حضرت انسؓ کی اس حدیث میں بھی اس بات کی طرف اشارہ موجود ہے کیونکہ اس میں قصیر کی تو مطلقاً نفی کی گئی ہے۔ لیکن طویل کی نفی مطلقاً نہیں بلکہ طویل بآن کی نفی کی گئی ہے (۱)۔

چہرہ مبارک کا رنگ: ولا بالابيض الا مہق ولا بالادم: امہق مہق سے صفت مشبہ ہے۔ جو خالص سفیدی کو کہتے ہیں جس میں نورانیت اور ملاحظت نہ ہو جیسا کہ بعض گوروں یا برص کے مریضوں کا مکروہ رنگ ہوتا ہے۔ اور ادمہ سخت گندمی رنگ کو کہتے ہیں۔ جو سیاہی کی طرف مائل ہو۔ خلاصہ یہ ہوا کہ آپ ﷺ کا رنگ بالکل سفید اور تیز گندمی نہیں تھا۔ بلکہ ہلکا گندمی سفید رنگ تھا۔ بیہقی کی روایت میں ”کان ابيض بياضه الى السمرة“ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس حدیث سے اگلی حدیث میں آپ کو اسمر اللون کہا گیا ہے۔ وہاں بھی دراصل سخت سفید کی نفی مقصود ہے ورنہ آپ گندمی رنگ کے نہیں تھے بلکہ پندرہ صحابہؓ نے آپ ﷺ کے رنگ کو سفید بتایا ہے (۲)۔ لیکن وہ سفید مراد ہے جس میں سرخی کے خلط کی وجہ سے ملاحظت ہو۔ بعض روایات میں ”ازہر اللون“ کے الفاظ آئے ہیں یعنی رخ انور میں تجلی اور نورانیت ہوا کرتی تھی۔ اور جس روایت میں ”کان ابيض کأنما صیغ من فضة“ کے الفاظ آئے (۱) مگر اس کے باوجود آپ ﷺ کا معجزہ تھا کہ مجمع میں کوئی بھی جتنا لمبا آدمی ہوتا تھا آنحضرت ﷺ اس سے کچھ لمبے معلوم ہوتے تھے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ

پستہ قد نہ لامبے کوئی مفہوم ہوتے ہیں میانہ قد سے کچھ نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں

مگر مجمع میں ہوتے تھے جب کبھی حضرت والا نمایاں اور اونچا ہوتا تھا سر و قد بالا (بخاری)

(۲) جمع الوسائل ص ۱۷، اور اسی کثرت روایت کی وجہ سے علامہ منادیؒ وغیرہ نے تطبیق کی بجائے سفید رنگ بیان کرنے والی احادیث کو راجح اور گندمی رنگ بیان کرنے والی احادیث کو مرجوح قرار دیا ہے۔ (بخاری)

ہیں اس سے بھی یہی مباحث مراد ہونی چاہیے۔

بال کھلے مگر قدرے گھنگریا لے تھے: ولا بالجعد القلط ولا بالسبط. جعودة گھنگریا لے پن کو کہتے ہیں اور قسط جعد کی صفت ہے۔ اس سے مراد سخت گھنگریا لے ہونا ہے۔ جیسے افریقہ کے حبشی لوگوں کے بال ہوتے ہیں۔ جبکہ سبط سین مفتوحہ اور باء ساکن یا مفتوح یا مکسور کے ساتھ کھلے ہموار بالوں کو کہتے ہیں۔ جن میں سرے سے ہلکی اور موڑ نہ ہو۔ لہذا آپ ﷺ کے بالوں کی کیفیت یہ ہوئی کہ کھلے ہونے کے ساتھ ساتھ قدرے گھنگریا لے بھی تھے نہ بالکل ہموار اور نہ زیادہ گھنگریا لے۔ حضرت انسؓ کی ایک اور روایت میں آیا ہے کہ کان شعروہ بین شعرین لا رجل سبط ولا جعد (بخاری)

علامہ زحشریؒ کہتے ہیں کہ وفي العرب جعودة وفي العجم سبوة۔ تو گویا اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عرب و عجم میں محبوب بنانے کیلئے دونوں خوبیوں سے نوازا۔

بعثت کے وقت عمر: بعثہ اللہ علی راس اربعین سنة: چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو رسالت عطا فرمائی۔ محدثین کے نزدیک چالیس سال مکمل ہونے کے بعد آپ ﷺ کو نبوت عطا کی گئی۔ اس لیے راس اربعین سے مراد چالیسویں سال کا آخری سرا ہے۔ نہ کہ ابتدائی سرا۔ لیکن اس میں یہ اشکال ہے کہ ابتدائی وحی رمضان میں نازل ہوئی جبکہ آپ ﷺ کی ولادت ربیع الاول میں ہوئی تھی۔ اسلئے بعثت کے وقت یقیناً آپ ﷺ کی عمر چالیس سال نہ تھی۔ اس اشکال کی مختلف توجیہات ہیں بہترین توجیہ یہ ہے کہ راوی نے کسر کا اعتبار نہیں کیا ہے ورنہ درحقیقت آپ ﷺ کی عمر ساڑھے چالیس یا ساڑھے انتالیس برس تھی۔ علامہ قرطبیؒ نے اسے راجح کہا ہے۔ لیکن علامہ ابن حجرؒ نے مسعودیؒ اور علامہ ابن عبد البرؒ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت بھی ولادت کی طرح ربیع الاول ہی میں ہوئی تھی اور اس قول کو اصح الاقوال بھی کہا ہے۔ اس تقدیر پر چالیس سال کی عمر میں بعثت کا قول حقیقت پر محمول ہوگا۔ (۱)

(۱) احقر کے خیال میں یہ توجیہ بھی ممکن ہے کہ ٹھیک چالیس کی عمر میں یعنی ربیع الاول کے مہینے میں آپ ﷺ پر روایئے صادقہ کے نزول کا دور شروع ہوا ہو۔ اور پھر چھ ماہ بعد رمضان المبارک میں پہلی وحیؒ افرأ باسم ربک (الایہ) نازل ہوئی ہو اور روایئے صادقہ کو بھی بعثت کا زمانہ شمار کر لیا گیا ہو واللہ اعلم بالصواب (اصلاح الدین)

بعض روایات میں تریالیس (۳۳) سال کا بھی ذکر ہے۔ علامہ ملا علی قاریؒ نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ نبوت چالیس سال بعد اور رسالت تریالیس سال بعد عطا کی گئی۔ اسی طرح رسالت نبوت کے تین سال بعد ملی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلی وحی چالیس سال کی عمر میں آئی ہو اور پھر تقریباً تین سال فترۃ الوحی کے بعد تریالیس سال کی عمر میں تالیف سے وحی آئی ہو۔ اور فترۃ وحی کے زمانہ کو بعثت میں شمار نہ کیا گیا ہو۔

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا قیام: فاقام بمکہ عشر سنین: جناب نبی کریم ﷺ نبوت کے بعد مکہ مکرمہ (زادھا اللہ شرفاً) میں دس برس ٹہرے مگر صحیح روایات کے مطابق آپ ﷺ نبوت کے بعد تیرہ برس تک مکہ میں رہے۔ اس تعارض کو دفع کرنے کیلئے بعض شراح نے زیر نظر حدیث کو مرجوح قرار دیکر تیرہ سال والی روایات کو متعدد وجوہ کی بناء پر راجح کہہ دیا ہے۔ لیکن بعض حضرات نے تاویل کا سہارا لیکر دونوں روایتوں میں تطبیق کرتے ہوئے کہا ہے کہ چالیس سال کی عمر میں آپ ﷺ کو نبوت اور تین سال بعد رسالت ملی۔ یوں رسول ہونے کی حیثیت سے آپ ﷺ مکہ میں دس سال رہے۔ لیکن اس تاویل کو مد نظر رکھ کر بھی بعد کی عبارت یعنی ساٹھ سال کی عمر میں وفات کی بات پر اشکال باقی رہتا ہے۔ اسلئے یہاں یہی کہنا بہتر ہوگا کہ راوی نے کسر کا اعتبار نہ کر کے دس سال کا ذکر کیا ہے۔ اور ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نبوت کے بعد قیام مکہ کے ابتدائی تین سال مخالفت اور تکالیف سے خالی ہونے کی وجہ سے باقی کئی زندگی کی طرح نہیں تھے لہذا انہیں عہد نبوت میں شمار نہیں کیا گیا۔

وبالمدينة عشر سنین: نبی کریم ﷺ بارہ ربیع الاول کو سو موار کے دن مدینہ منورہ پہنچے اسی سال آپ ﷺ نے ہجری سن تاریخ کے اجراء کا حکم دیا اور حضرت عمرؓ نے محرم کے مہینے کو پہلا مہینہ قرار دیکر تاریخ کا اجراء کیا۔ اور مدینہ منورہ میں تشریف آوری کے ٹھیک دس سال بعد ۱۲ ربیع الاول کو آپ ﷺ وفات پائے۔ جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

حضور ﷺ کی عمر مبارک: علی دأص مستین سنة جناب نبی کریم ﷺ کی عمر میں روایات مختلف ہیں۔ اس مقام پر ساٹھ سال کا ذکر ہے۔ بعض صحابہ نے پینسٹھ سال اور کچھ نے تریسٹھ سال عمر بتائی ہے۔

مؤخر الذکر قول کو صحیح ترین قول قرار دیا گیا ہے (۱)۔ جبکہ اس حدیث میں یہ تاویل کی جاتی ہے کہ یہاں راوی نے کسر کا الغاء کر کے اس کا اعتبار نہیں کیا ہے جبکہ پچیسٹھ سال والے قول کے بارے میں شرح حدیث کہتے ہیں کہ راوی نے ولادت اور وفات کے دو سال مستقل گن کر اصل عمر میں دو سال کا اضافہ کر دیا ہے۔ جبکہ یہ دونوں سال پورے سال نہیں تھے۔

تأخیات حسن زلف کی بقاء: ولیس فی راسه ولحینہ عشرون شعرة بیضاء وفات کے وقت حضور اکرم ﷺ کے سر اور داڑھی میں بیس بال سفید نہیں تھے۔ حضرت انسؓ کی دیگر روایات میں ان سفید بالوں کی تعداد گیارہ، چودہ، سترہ یا اٹھارہ مذکور ہے۔ ابن عمرؓ کی حدیث میں بیس کے قریب بتائے گئے ہیں۔

اس کی تحقیق اور مزید تفصیل توریش مبارک کے باب میں آجائے گی۔ لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ سفید بال نور اور وقار ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے احادیث میں ان کی مدح فرمائی ہے پھر نبی کریم ﷺ اس منقبت سے محروم کیوں رہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ سفید بال واقعہ وقار اور قابل لحاظ حیثیت پر دلالت کرتے ہیں لیکن جوان جذبات کے حامل افراد اور بالخصوص عورتوں کی نظر میں بالکل سفید بال ناپسندیدہ ہوتے ہیں۔ اور شاید اسی حکمت کو مد نظر رکھ کر نبی کریم ﷺ نے تغییر شیب یعنی سفید بالوں کو رنگنے کا حکم دیا ہے تاکہ حسن اور نفاست برقرار رہے۔ ولم یسنة الله بالشیب (۲)۔ اور چونکہ نبی کریم ﷺ کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہر قسم کے قابل نفرت احوال و کیفیات سے برأت اور ہر قسم کی محبوبیت عطا فرمائی تھی اس لیے آپ ﷺ کو بالوں میں سفیدی بھی محض علامتی طور پر ظاہر کر دی تاکہ ہدایت میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے اور کوئی شخص بھی طبعی نفرت کا بہانہ نہ کر سکے۔ نہ ازواج مطہرات کی طبیعت میں ناپسندیدگی آ سکے۔

(۱) امام بخاریؒ نے حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے ان النبی ﷺ عوفی وهو ابن ثلاث سنین (صحیح بخاری ۵۰۱/۱) اور اسی پر علماء کا اتفاق ہے (بخاری)

(۲) مگر بالوں یا داڑھی کا سفید ہونا کوئی عیب نہیں بلکہ وقار کی علامت ہے ایک روایت میں آتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کے بال سفید ہوئے تھے آپؐ نے جب دیکھا تو حیران ہو کر اللہ تعالیٰ سے استفسار کیا تو اللہ جل شانہ نے فرمایا یہ تو مؤمن کی وقار ہے تو اس پر آپؐ نے یہ دعا کی اللہم زدنی وقاراً کما راعی اللہ میرے اس وقار میں اضافہ فرما۔ (بخاری)

پھر نبی کریم ﷺ سے نفرت یا ناپسندیدگی میں کفر کا خطرہ بھی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو سفید بالوں کی طرح دیگر عیوب سے بھی محفوظ رکھا۔ حتیٰ کہ علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ نبی کریم ﷺ کا لے تھے تو کافر ہو جائے گا۔

(۲) حَدَّثَنَا حميد بن مسعدة البصري ثنا عبد الوهاب الثقفي عن حميد عن أنس بن مالك قال قال رسول الله ﷺ ربعة وليس بالطويل ولا بالقصير حسن الجسم و كان شعره ليس بجعد ولا سبط اسمر اللون اذا مشى يتكفأ (۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ میانہ قد تھے نہ زیادہ لمبے اور نہ پستہ قد۔ خوبصورت معتدل بدن والے تھے آپ ﷺ کے بال نہ بالکل ٹھنکے یا لے تھے نہ بالکل سیدھے۔ نیز آپ ﷺ گندمی رنگ کے تھے جب راستہ پر چلتے تو آگے کی طرف جھکے ہوئے چلتے تھے۔

حمید الطویل کون تھے؟ عن حميد عن أنس حضرت انسؓ سے روایت کرنے والے تابعی کا نام حمید ہے۔ لیکن حمید الطویل کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ علامہ مناویؒ نے اس کے نام کے بارے میں آٹھ دیگر اقوال بھی ذکر کئے ہیں (۲)۔ الطویل کے نام سے شہرت کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ شخص خود لمبے نہیں تھے لیکن اس کے ہاتھ اتنے لمبے تھے کہ کسی مردے کے ساتھ کھڑے ہو کر ہاتھ پھیلاتے تو ایک ہاتھ میت کے سر اور دوسرے پاؤں سے جا لگتا تھا۔ اور بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ چونکہ اس کا ایک دوسرا پڑوسی بھی اس کا ہم نام تھا اور وہ اس کی نسبت زیادہ پستہ قد تھا لہذا حضرت انسؓ کے اس شاگرد کو حمید الطویل اور اس دوسرے شخص کو حمید القصیر کہا جانے لگا۔ حمیدؒ کی وفات بھی نماز میں کھڑے کھڑے ہوئی تھی۔ ۱۴۲ھ ۱۴۳ھ میں وفات پائی۔

(۱) جامع ترمذی ۱/ ۳۰۳ کتاب اللباس باب ماجاء فی الجمۃ واتخاذ الشعر، شرح السنۃ

للبیہقی ۱۳/ ۲۲۰ باب صفۃ النبی ﷺ رقم حدیث ۳۶۳۰ (مختار)

(۲) ترویہ، دارویہ، طرحان، مہران، عبد اللہ، عبد الرحمن، تخلص وغیرہ (مختار)

قد کا بیان: کان رسول اللہ ﷺ ربعة (۱)، ربعة راء مفتوحہ کے ساتھ مربوع کے معنی میں ہے۔ جس کا معنی میانہ قد کے ہوتے ہیں راوی خود اس لفظ کی تشریح لیس بالطویل ولا بالقصیر سے کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بات ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ آپ ﷺ میانہ قدی سے قدرے طول کی طرف مائل تھے۔ حسن الجسم قد کا حسن بیان کرنے کے بعد تعظیم کرتے ہیں کہ ہر لحاظ سے آپ حسین تھے۔ حسی اور عقلی اعتبار سے آپ ﷺ کا جسم حسین اور جاذب نظر تھا۔ اور رنگ، بدن کی نرمی اور ساخت کے لحاظ سے تمام بدن میں حسن و اعتدال تھا۔ گویا نہ زیادہ موٹے تھے نہ بالکل کمزور بلکہ سڈول جسم، متوازن اور متناسب اعضاء کے مالک تھے۔ اور اگرچہ حسن میں ہر علاقہ کے لوگوں کا معیار مختلف ہوتا ہے لیکن تناسب اعضاء سب کے ہاں قدر مشترک ہے۔ جبکہ حسن صورت تناسب اعضاء کا نام ہے۔

لون اسمر کی توجیہ: اسمر اللون آپ ﷺ کے رنگ کے بارے میں پچھلی حدیث میں تفصیل گذر چکی ہے یہاں اسمر کہا گیا ہے جسکے معنی ہیں سانولا یعنی سیاہی مائل سرخ۔ اب صحیح روایات کے مطابق یہ روایت حقیقت سے بعید لگتی ہے اس لئے بعض لوگوں نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ یہاں بدن کے ان حصوں کے رنگ کا بیان ہے جو دھوپ میں کھلے رہنے کی وجہ سے سیاہی مائل ہو چکے تھے جبکہ آپ ﷺ کے بدن کا اصل رنگ سفید تھا اور بعض لوگوں کے خیال میں یہاں لفظ میں قہیف ہو گئی ہے اصل میں ازھر اللون یعنی پھول جیسا چمکدار رنگ والے تھے جبکہ علامہ ابن جوزی نے اس روایت ہی کو غیر صحیح قرار دیا ہے۔

باوقار چال کی کیفیت: اذا مشی یتکفأ یعنی چلتے ہوئے آگے کی طرف جھکے ہوئے ہوتے تھے (۲)۔ جیسا کہ دوسری روایات میں آتا ہے کانتعا ینحط من صلب یعنی گویا آپ اترائی میں اتر رہے ہوں۔ یہ شجاعت، ہیبت اور وقار کی رفتار ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے اس جملہ کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ آپ ﷺ جب

(۱) ربعة کی جمع ربعات، ربعات اور مربوعات آتی ہے جس کا معنی ہے المتوسط بین الطویل والقصیر (متاوی ص ۱۶) یہاں آنحضرت ﷺ کیلئے مؤنث کا صیغہ باعتبار نفس استعمال کیا گیا ہے کہا جاتا ہے ربعة وامرأة ربعة (مختار)

(۲) جدید علماء اطباء نے اس کے کئی فوائد بھی بیان کئے ہیں (۱) جوڑوں میں درد نہیں ہوگا (۲) ستر میں تھکاوٹ محسوس نہیں ہوگی (۳) نگاہ تیز ہوگی (۴) یہ بات یورپین سیاحوں کی کتابوں میں ملتی ہے کہ لمبے ستر میں پاؤں کے پنجوں پر وزن ڈالو اور قدرے جھک کر چلو اس طرح ستر جلدی طے ہو جائے گا (مختار)

چلتے تو سرعت کیساتھ چلتے تھے۔ اور بعض شراح کے نزدیک معنی یہ ہے کہ چلتے ہوئے قوت کیساتھ قدم اٹھاتے تھے تیوں تشریحات اپنی جگہ صحیح ہیں آپ کی رفتار کے بارے میں مستقل باب میں تفصیل آجائے گی

(۳) حَلَلْنَا مُحَمَّدَ بْنَ بَشَّارٍ يَعْنِي الْعَبْدِيُّ لَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ ثَنَاشِعَةَ

عن أبي اسحق قال سمعت البراء بن عازب يقول كان رسول

اللہ ﷺ رجلاً مربوعاً بعيداً ما بين المنكبين عظيم الجمة إلى شحمة

اذنيه عليه حلة حمراء مارأيت شيئاً قط أحسن منه (۱)۔

ترجمہ: حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک میانہ قد آدمی تھے

آپ ﷺ کے دونوں موٹھوں کے درمیان قدرے زیادہ فاصلہ تھا۔ لمبے بالوں

والے تھے جو کان کی لوتک آئے تھے آپ ﷺ پر ایک سرخ (دھاری دار) جوڑا تھا۔

میں نے آپ ﷺ سے زیادہ حسین کبھی کوئی چیز نہیں دیکھی۔

راوی حضرت براء بن عازب: عن براء بن عازب ابوعمارہ براء بن عازب انصاری حارثی

اوی صحابی ہیں ان کے والد بھی صحابی ہیں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ہم عمر ہیں۔ کوفہ میں رہا کرتے تھے۔ نبی

کریم ﷺ کے ہمراہ سب سے پہلے غزوہ خندق میں شرکت کی۔ نیز حضرت علیؓ کے ہمراہ جنگ جمل، جنگ

صفین اور جنگ نہروان میں شریک رہے۔ ۶۷ھ میں کوفہ میں وفات پائی۔

کان رسول اللہ ﷺ رجلاً مربوعاً: یعنی نبی کریم ﷺ میانہ قد آدمی تھے اس جگہ اگرچہ

کان کا خبر بظاہر رجلاً ہے لیکن مقصود مربوعیۃ کا اثبات ہے نہ کہ رجلیۃ کا۔ اور مربوعیۃ کی بات بھی تقریباً ہے

کیونکہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ آپ میانہ قد سے اونچے تھے بعض شراح کہتے ہیں کہ یہ لفظ رجلاً بکسر

الجیم ہے۔ جس میں بالوں کی صفت بیان کرنا مقصود ہے یعنی آپ ﷺ کے بال کھلے ہوئے تھے زیادہ

(۱) صحیح بخاری ۵۰۲/۱ کتاب المناقب باب صفة النبی ﷺ، صحیح مسلم ۲۵۸/۲ کتاب

الفضائل باب فی صفة شعر النبی ﷺ وصفاته، الخ، ابو داؤد ۲۰۷/۲ کتاب اللباس باب فی

الرخصة فی ذلک. (مختار)

کھنگریا لے نہ تھے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ مردانگی بیان کرنا بے معنی ہے اور کسی بھی صحابی سے مروی نہیں ہے۔ لیکن پہلی تاویل بھی صحیح ہے۔ کیونکہ رجلا دراصل توطہ ہے مربوطاً کیلئے جو بالذات مقصود ہے۔ اب بھی کہتے ہیں فلاں ایسے آدمی تھے۔

سینہ اور کولھوں کی چوڑائی: بعید ما بین المنکبین، بعید باء کے فتح کے ساتھ فعیل کے وزن پر ہے جبکہ بعض روایات میں باء کے ضمہ کے ساتھ تغیر کے صیغہ پر آیا ہے۔ منکب کندھے کو کہتے ہیں اس طرح اس حدیث میں اس بات کا بیان ہے کہ آپ ﷺ کے کولہوں کے درمیان فاصلہ تھا جو پیٹھ کے بالائی حصہ کی چوڑائی پر دلالت کرتا ہے نیز اس کے ساتھ سینہ کی چوڑائی بھی لازم ہے۔ اور یہی درحقیقت مقصود بھی ہے کیونکہ سینہ کی فراخی سخاوت، وقار اور نجابت کی علامت ہے۔

زلف مبارک: عظیم الجمۃ جمۃ جیم کے ضمہ کیساتھ جموم سے ہے جس کے معنی اجتماع کے ہوتے ہیں۔ وتحبون المال حباً جماً اس لفظ کے مفہوم کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے بعض کے ہاں یہ وفرہ سے بڑھے ہوئے بالوں کو کہتے ہیں۔ بعض کے ہاں پیشانی کے بالوں کے مجموعہ کو کہا جاتا ہے لیکن علامہ ابن اثیرؒ نے لکھا ہے کہ سر کے وہ بال جو کانوں کے لو تک پہنچے وفرہ کہلاتے ہیں۔ اور اگر اس سے قدرے لمبے ہوں تو لمہ کہلاتے ہیں۔ اور اس سے بڑھ جائیں اور کندھوں پر پڑھیں تو نمہ کہا جائیگا۔ ترتیب کو لفظ و لُج میں اشارہ ہے یعنی واو وفرہ لام لمتہ اور جیم نمہ۔ اور اسی تحقیق کو علامہ بیجوریؒ اور بعض دیگر شراح نے ترجیح دی ہے۔ لہذا اس تحقیق کے مطابق اس مقام پر جمہ سے مراد وفرہ ہوگا کیونکہ یہاں ”إلى شحمة الاذن“ کی قید لگادی گئی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ شحمة الخ کا قید عظیم کے لفظ کیلئے ہے نہ کہ جمہ کیلئے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ جمہ کا بڑا حصہ کانوں کی لووں تک تھا لیکن کچھ بال بڑھ کر کندھے پر بھی پڑھے رہتے تھے۔ نبی کریم ﷺ کے بالوں کی لمبائی کے بارے میں روایات مختلف ہیں جو کہ مختلف اوقات اور ازمنہ پر محمول ہیں۔ ان کی تفصیل اپنے باب میں آجائے گی۔

سرخ جوڑے کا استعمال: علیہ حلۃ حمراء ایک جیسے دو کپڑوں کو جو ایک ساتھ مستعمل ہوں حلۃ ہے۔ اردو میں جوڑا کہتے ہیں۔ یہ عموماً ازار یعنی لنگوٹی اور رداء یعنی اوڑھنے کے چادر پر مشتمل ہوتا تھا جو دو یعنی

لکیر دار چادروں کا مجموعہ تھا اور اسی وحدت کی بناء پر اس کی صفت مفرد دلائی گئی ہے۔ مگر یہاں سرخ رنگ کے جوڑے کا ذکر ہے جس سے امام شافعیؒ اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ سرخ لباس کا پہننا جائز ہے۔ جبکہ احناف کے نزدیک خالص سرخ لباس مردوں کیلئے جائز نہیں (۱)۔ تو حدیث مذکور سے جواب یوں دیا جاتا ہے کہ یہ جوڑا یا تو ان دو چادروں سے مرکب تھا جن میں سرخ لکیریں تھیں۔ خالص سرخ جوڑا نہیں تھا (۲)۔

جس طرح کہ یمنی چادروں کے بارے میں معروف بات ہے کہ خالص سرخ نہیں ہوتے تھے۔ اور اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ جوڑا جو آپ ﷺ زیب تن کئے ہوئے تھے خالص سرخ تھا تو ہم کہتے ہیں کہ یہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیات میں سے تھا۔ دوسرے لوگوں کیلئے جائز نہیں اور یا یہ کہ آپ ﷺ نے یہ جوڑا منع کئے جانے سے قبل پہنا ہوگا۔ اور سرخ لباس سے نبی بعد میں وارد ہوئی۔ جس طرح کہ احادیث نبی اس پر ناطق ہیں۔

حسن بے مثال: مارایت شیئاً أحسن منه۔ میں نے ان سے زیادہ حسین کوئی چیز نہیں دیکھی۔ یعنی نہ کوئی انسان نہ سورج نہ چاند۔ نہ اور کوئی چیز ان سے زیادہ حسین نظر آئی۔ اس تعیم سے صحابی کی محبت ظاہر ہوتی ہے۔ نیز حقیقت میں اہل علم کا اس پر اتفاق بھی ہے کہ آپ ﷺ کو جس قدر ظاہری محاسن سے نوازا گیا تھا۔ کائنات کی کوئی چیز بھی ان محاسن تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس لیے یہ حقیقت ہے کہ آپ ﷺ سے زیادہ حسین

(۱) علماء احناف میں علامہ سرخسیؒ امام شافعیؒ کی طرح سرخ لباس کو جائز سمجھتے ہیں۔ لکھتے ہیں وفيه دليل انه لا لباس بلبس الثوب الأحمر (شرح السير الكبير ۱/۱۵۱) مگر اہل قاریؒ نے لکھا ہے والحاصل ان عندنا يؤول الحمراء بالنسب لها خطوط حمراء ويعد من خصائصه ﷺ بعد تسليم صحة الحديث او يحمل لبسه على ما قبل نهيم (جمع الوسائل ۲/۱۲۱) گویا علماء احناف کے ہاں بھی یہ مسئلہ مختلف فیہا ہے بقول علامہ شافعیؒ کے کہ علامہ شرنبلالیؒ نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے جس میں انہوں نے سرخ لباس پہننے کے بارے میں آٹھ اقوال ذکر کیے ہیں اور ترجیح کراہت کو دی ہے۔ اقوال ولكن جل الكعب على الكراهة كالسراج والمحيط والاختيار والمنقفي والذخيرة وغيرها وبه اتفق العلامة قاسم اور (المختار ۲/۳۵۸) کتاب الکراهية فصل فی لبس (مختار)

(۲) اور اس کی تائید حضرت قد امہ کلابیؒ کی روایت سے بھی ہوتی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو عرفہ کی رات دیکھا کہ آپ ﷺ کے جسم مبارک پر سرخ دھاری دار نقش حلقہ تھا (بخاری)

کوئی بھی نہیں۔ غالباً حضرت حسان بن ثابتؓ نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

واحسن منك لم ترقط عینی واجمل منك لم تلد النساء

خلقت مبراً من كل عیب كاتك قد خلقت كمتشاء

اور ام المؤمنین سیدنا عائشہؓ نے آپ ﷺ کے حسن کے بارے میں فرمایا ہے

لواحي زليخا لوراين جبينه لاثرن بالقطع القلوب على اليد

اسی طرح شاعر نے کہا حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضاء داری آنچہ خوباں ہمہ دار مد تو تہا داری

(۴) حدثنا محمود بن غيلان ثنا وكيع ثنا سفيان عن أبي اسحاق

عن البراء بن عازب قال ما رأيت من ذى لمة فى حلة حمراء أحسن

من رسول اللہ ﷺ له شعر يضرب منكبيه بعيد ما بين المنكبين لم

يكن بالقصير ولا بالطويل (۱)۔

ترجمہ: حضرت براءؓ سے روایت ہے کہ میں نے کانوں سے لمبے بال رکھنے والے کسی

شخص کو سرخ جوڑا پہنے ہوئے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ حسین نہیں دیکھا۔ نبی

کریم ﷺ کے بال موٹھوں تک آرہے تھے۔ آپ ﷺ کے دونوں موٹھوں کے

درمیان کا حصہ ذرا زیادہ چوڑا تھا۔ آپ ﷺ نہ پستہ قد تھے نہ زیادہ لمبے تھے۔

سفيان ثوري یا ابن عيينه: حدثنا سفيان، اس میں اختلاف ہے کہ یہ کون سے سفيان ہیں۔ بعض

شرح کہتے ہیں کہ ابو اخطی ہمدانی کے مشہور تلامذہ میں سفيان بن عيينہ ہی ہے۔ اس لئے وہی مراد ہیں۔ لیکن

علامہ قسطلانی کا خیال ہے کہ یہ سفيان ثوری ہیں کیونکہ امام ترمذی نے جامع ترمذی میں یہی حدیث اسی سند

کے ساتھ ذکر کی ہے۔ جس میں انہوں نے ثوری کی تعیین کی ہے۔ ملا علی قاریؒ نے بھی اسی کو صحیح قرار دیا ہے

اور یہی رائج معلوم ہوتا ہے۔

(۱) صحیح بخاری ۵۰۲/۱ کتاب المناقب باب فی صفة النبی ﷺ، شرح السنة

للبخاری ۲۲۳/۱۳ باب صفة النبی ﷺ (مختار)

کیفیات لہ، جتہ، وفرۃ میں تطبیق: مارایت من ذی لہۃ فی حلۃ حمراء الخ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کی جسم مبارک کی کچھ تفصیل کے ساتھ ساتھ بالوں کا بھی ذکر ہے یہاں لہۃ کا ذکر ہے جبکہ جتہ کا ذکر پچھلی حدیث میں کیا گیا ہے آپ ﷺ کی بالوں کی کیفیت بدلتی رہتی تھی۔ کبھی وفرہ کبھی اس سے بڑھ کر لہۃ اور کبھی اس سے بھی بڑھ کر جتہ تک پہنچ جاتے تھے۔ اس لئے صحابہ میں سے جس نے جس حالت میں آپ ﷺ کو دیکھا بیان فرمایا۔ چنانچہ بالوں کے بارے میں روایات میں تعارض نہیں ہے۔ ”من ذی لہۃ“ میں من تاکید عموم کی غرض سے زائد لایا گیا ہے۔ ذی کبھی اشارہ کیلئے آتا ہے اور کبھی صاحب کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ یہاں مؤخر الذکر معنی مراد ہے۔ لہۃ وہ بال ہیں جو کان کے لو سے نیچے بڑھ جائیں۔ الامام کا معنی نزول ہے اسی سے لہۃ مستعمل ہے۔ اور لہۃ یلہم کا ایک معنی جمع کرنا بھی ہے۔ کہا جاتا ہے۔ لہۃ اللہ شعث فلان۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کے پرانندہ امور کو مجتمع کر دے۔ گویا کانوں کے نیچے بالوں کو جمع کر دیا جاتا ہے۔ فی حلۃ حمراء یہ حال ہے ترکیب میں۔ یعنی اس حال میں کہ وہ صاحب لہۃ سرخ جوڑا پہنے ہوئے ہو۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حمراء سے مراد خالص سرخ رنگ کا جوڑا نہیں۔ بلکہ یہ دراصل سرخ قحط کپڑا ہوتا تھا جس میں دوسرے رنگ کی دھاریں ہوتی تھیں۔ ہاں بظاہر سرخ اس لیے نظر آتا تھا کہ دوسرا رنگ مغلوب ہو جاتا تھا۔ اس سلسلے میں تفصیل باب لباس رسول اللہ ﷺ میں آ رہی ہے۔ مارایت یہاں روایت سے روایت بصری مراد ہے اس لئے یہ فعل ایک مفعول چاہتا ہے۔ اس صورت میں ”احسن“ ذی لہۃ سے حال ہوگا۔ اور اگر روایت قلبی مراد ہو تو فعل دو مفعولوں کا متقاضی ہوگا۔

لہۃ شَعْرٌ شعر بالوں کو کہتے ہیں۔ اور اس میں چار لغات ہیں شَعْرٌ سکون عین کے ساتھ۔ شَعْرٌ عین کے فتح کے ساتھ۔ شَعْرٌ یحین کے سکون اور تاء کے ساتھ۔ اور شَعْرٌ عین کے فتح اور تاء کے ساتھ۔ یہاں پہلے دونوں لغتوں کے مطابق مروی اور مستعمل ہے۔

یضرب منکبہ، یضرب یصل کے معنی میں ہے۔ اور لہۃ کی صفت ہے۔ پہلے بھی گزر چکا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بال موٹڑھوں کو چھوتے تھے لیکن یہاں یہ اشکال ہے کہ موٹڑھوں کو جو بال چھوتے ہیں۔ ان کو جتہ کہتے ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور یہاں تو لہۃ کا ذکر ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان

الفاظ کا ایک دوسرے کی جگہ استعمال شائع ہے۔ اس لیے یہاں لہجہ کا ذکر ہے۔ لیکن مراد لہجہ ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ لہجہ ہی مراد ہوا اگرچہ براہ راست موٹھوں تک نہیں پہنچتا۔ لیکن اگر بال کان کی لو سے بڑے ہوئے اور گھنے ہوں۔ تو سر کو حرکت دینے سے بال کندھوں تک آ جاتے ہیں بہر حال اس صورت میں بال ہر وقت موٹھوں سے لگے ہوئے نہ تھے بلکہ حرکت کے وقت موٹھوں کو چھوتے تھے۔

موٹھوں کے درمیان وسعت: بعید مابین المنکبین، منکب کلب سے ماخوذ ہے۔ پھیرنے کے معنی میں مستعمل ہے۔ کہا جاتا ہے نکبت و جھہ۔ میں نے اس کا منہ پھیرا۔ چونکہ کسی طرف مڑنے اور پھرنے میں موٹھوں کو پھیرنا پڑتا ہے۔ اس لیے موٹھوں کو منکب کہا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ کے موٹھوں کے درمیان وسعت تھی لیکن تھوڑی۔ بعید کو تصغیر کے صیغہ سے اس لیے لایا کہ زیادہ چوڑائی کبھی جسمانی طور پر بد صورتی کا باعث بنتی ہے۔ جبکہ کچھ نہ کچھ فاصلہ ضروری بھی ہے اور موٹھوں کے درمیان فاصلے کی وجہ سے سینہ بھی چوڑا پڑتا ہے۔ جو کہ مردانہ حسن کا حصہ ہے اور نہایت درجہ کی مردباری اور تحمل پر بھی دلالت کرتا ہے۔

(۵) عن محمد بن إسماعيل ثنا أبو نعيم ثنا المسعودي عن

عثمان بن مسلم بن هرمز عن نافع بن جبیر بن مطعم عن علي بن أبي طالب قال لم يكن النبي ﷺ بالطويل ولا بالقصير شثن الكفين والقدمين ضخم الرأس ضخم الكراديس طويل المسربة اذا مشى تكفأ كأنما ينحط من صبيب لم اقبله ولا بعده مثله ﷺ.

حدثنا سفيان بن وكيع ثنا أبي عن المسعودي بهذا الاسناد

نحوه بمعناه (۱) .

ترجمہ: حضرت علی بن ابی طالب سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نہ زیادہ لمبے تھے نہ پتہ قد، ہتھیلیاں اور دونوں پاؤں پر گوشت تھے (یا سخت تھے) بڑے سر

(۱) المسندک للحاکم ۲/۶۰۶، جامع ترمذی ۲/۸۳ کتاب المناقب باب ماجاء فی صفة

النبي ﷺ (مختار)

والے تھے اور ہڈیوں کے جوڑ بھی بڑے بڑے تھے۔ سینہ سے ناف تک بالوں کی ایک باریک دھاری تھی۔ جب چلتے تھے تو قوت سے چلتے تھے جیسے کسی اونچی جگہ سے نیچے کو اتر رہے ہوں۔ میں نے نبی کریم ﷺ جیسا نہ آپ سے پہلا دیکھا اور نہ بعد میں دیکھا۔

سند کو خلاف عادت عن سے شروع کرنے کی وجہ: عن محمد بن اسماعیل۔ امام ترمذی کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سند کو حدیث سے شروع کرتے ہیں لیکن یہاں پر انہوں نے سند کو حدیث سے شروع کرنے کی بجائے عن سے شروع کیا ہے۔ شرح کہتے ہیں کہ یہ یا تو شاگردوں کی ترمیم ہے یا پھر یہ حدیث امام ترمذی نے قصد کی ہے۔ اور حدیث سے ذکر کرنے کا التزام انہوں نے جامع ترمذی میں کیا ہے جبکہ شمائل ترمذی مستقل کتاب ہے لیکن بعض نسخوں میں حدیث محمد بن اسماعیل کے الفاظ بھی ہیں۔ یہ حدیث امام ترمذی نے امام بخاری سے روایت کی ہے۔ جو ترمذی کے شیوخ میں سے ہیں۔ امام ترمذی کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ خود امام بخاری نے بھی ان سے روایت کی ہے جس کو روایۃ الاکابر عن الاصاغر کہا جاتا ہے۔

ہرمز: یہ نام بعض کے نزدیک منصرف اور بعض کے نزدیک عجمہ اور علیست کی وجہ سے غیر منصرف ہے لیکن دوسرا قول رائج ہے۔

علی بن ابی طالب: حضرت علی کرم اللہ وجہہ خلفائے راشدین میں سے چوتھے خلیفہ ہیں۔ باپ کا نام عبد مناف اور کنیت ابو طالب تھی۔ ماں کا نام فاطمہ بنت اسد تھا جو ایمان اور ہجرت دونوں سے مشرف ہو چکی تھیں۔ خود آپ کی کنیت ابو تراب اور ابو الحسن ہے۔ بچوں میں آپ بالاتفاق سب سے پہلے ایمان لائے اور بعض اقوال کے مطابق آپ مردوں میں بھی سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔ اس وقت آپ کی عمر مختلف اقوال کے مطابق پندرہ، چودہ، تیرہ، آٹھ یا دس سال تھی۔

حضرت علی کا اعزاز: جنگ تبوک کے علاوہ تمام غزوات میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ شریک رہے اس جنگ میں بھی خود نبی کریم ﷺ نے آپ کو مدینہ طیبہ میں یہ کہہ کر شہرایا کہ ”اما ترضی ان تكون منی بمنزلة هارون من موسى الا انه لا نبي بعدي“ کیا تجھے یہ پسند نہیں کہ تیری نسبت مجھ سے ایسی ہو

جیسے ہارون کو موسیٰ سے تھی۔ ہاں مگر میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔

آپ کا رنگ گہرا سا نولا تھا، بڑی بڑی آنکھیں تھیں، قد سے پستہ قد تھے، بڑی داڑھی اور سر مبارک میں گنجا پن تھا۔ حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد اٹھارہ ذی الحجہ ۳۵ھ کو مسند خلافت پر بٹھا دیئے گئے۔ چار سال نو ماہ اور چند دن خلافت کا فریضہ انجام دیا۔ سترہ رمضان ۴۰ھ کو بروز جمعہ صبح کی نماز کے وقت عبدالرحمن بن ملجم مرادی نے کوفہ میں خنجر مارا اور تین دن بعد وفات پائے۔ آپ کے دونوں بیٹوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ اور بھیجے حضرت عبداللہ بن جعفرؓ نے آپ کو غسل دیا۔ حضرت حسنؓ نے نماز جنازہ پڑھائی، اور وہیں دفن ہوئے آپ کی عمر تریسٹھ برس تھی۔ اہلسنت کا اس پر اجماع ہے کہ مرتے وقت روئے زمین پر آپ سے افضل شخص نہ تھا۔

تشریح حدیث: لم یکن النبی ﷺ بالطویل نبی کریم ﷺ کے قد و قامت کا بیان ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نہ زیادہ لمبے تھے نہ زیادہ کوتاہ، بلکہ میانہ قد والے تھے۔ لیکن یہاں مراد اقرب الی الطول ہے۔ یعنی میانہ قد سے کچھ اونچے تھے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

ہتھیلیوں کی سختی اور نرمی: شش الکفین، شش سبع اور گرم دونوں بابوں سے آتا ہے جس کے معنی ہیں غُلْظ و خَشْن یعنی سخت اور کھردرا ہونا۔ یہ نعومت اور لین کے مقابل ہے کام اور محنت کی وجہ سے ہاتھ کی سختی کو شش کہتے ہیں۔ امام اسمعی لغت کے امام ہیں انہوں نے شش کی تشریح میں کہا ہے کہ الغلیظ الاصابع من الکفین والقدمین (۱)۔ یعنی شش اس آدمی کو کہا جاتا ہے جس کے ہاتھ پاؤں کی انگلیاں سخت اور کھردری ہوں۔ لیکن علامہ ابن حجرؒ نے شش الکفین والقدمین کی تفسیر غلیظ الاصابع والراحۃ سے کی ہے۔ یعنی صرف انگلیوں کی خشونت نہیں بلکہ ساتھ ساتھ ہتھیلیوں کی سختی (۱) شش الکفین الخ مرفوع بھی پڑھا گیا ہے اور منصوب بھی، مرفوع کی صورت میں یہ خبر ہے اور مبتداء محذوف ہوگئی اور منصوب کی صورت میں کان مقدر کے لئے خبر ہے۔ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے قال میرک الروایۃ فیہ بالرفع لیکون خبراً هو المحذوف قیل ویجوز النصب لیکون خبراً لکان المقدر (جمع الوسائل ۲۵/۱) اور نصب کی صورت اس میں حال ہونے کا بھی احتمال ہے (مناوی) (مختار)

بھی مراد ہے اور اس کی تائید ضخم الکفین والقدمین سے بھی ہوتی ہے (۱)۔

اشکال وازالہ: لیکن یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ دوسرے مقام پر حضرت انسؓ کی روایت ہے فرماتے ہیں کہ ”ما مسست خزاناً ولا حویراً الین من کف رسول اللہ ﷺ“ یعنی میں نے ریشمی کپڑے کو بھی نبی کریم ﷺ کے ہاتھ سے نرم نہیں پایا۔

اس حدیث کا بظاہر حضرت علیؓ کی حدیث سے تعارض معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں سختی کا ذکر ہے۔ بعض حضرات نے دونوں حدیثوں میں تطبیق کرتے ہوئے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کام کاج اور محنت و مشقت کیا کرتے تھے اور صحابہؓ کے ساتھ خدمت میں شرکت فرماتے جیسا کہ غزوہ خندق کے موقع پر خندق کی کھدائی اور دوسرے مواقع پر لکڑیاں کاٹنے اور جمع کرنے کے کام میں آپ ﷺ صحابہ کرامؓ کے ساتھ برابر کے شریک رہے۔ تو ایسی حالت میں آپ ﷺ کے ہاتھ سخت ہو جاتے جبکہ عام حالات میں آپ ﷺ کے ہاتھ نرم ہوتے تھے۔ ابن بطالؒ نے ششن الکفین والقدمین (۲) کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ مملوءة لحمًا۔

(۱) بخاریؒ کہا جاتا ہے کہ امام اصمعیؒ نے ششن کا ترجمہ غلیظ الاصابع والقدمین سے کیا۔ تو کس نے ان پر یہ اعتراض کیا۔ کہ یہ لفظ تو نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں کے بارے میں آیا ہے۔ اس پر انہوں نے قسم کھائی کہ آئندہ کے لیے وہ کبھی بھی حدیث میں وارد الفاظ کی تشریح نہیں کریگا۔ (مناوی۔۔ جمع الوسائل ص ۲۵) (اصلاح الدین)

ششن کی لغت میں دو معانی ہیں (۱) کھر درا ہونا (۲) پر گوشت ہونا، یہاں دوسرا معنی مراد ہے اسلئے کہ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ مبارک ریشم سے زیادہ نرم تھے۔ اور اس کی تائید حضرت ابو ہریرہؓ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کی ہتھیلی گوشت سے پڑتی تھی۔ اور حضرت ہند بن ابی حالہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ہتھیلی ذرا پھیلی ہوئی تھی۔ ملا علی قاریؒ نے جمع الوسائل میں لکھا ہے کہ بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ہتھیلی مبارک کا کشادہ ہونا سخاوت سے کتلیہ ہے۔ اور علامہ مناویؒ نے فرمایا ہے کہ یہ وسعت قوت کی طرف اشارہ ہے (جمع الوسائل ۲۵/۱) یاد رہے کہ ہتھیلی کا کشادہ اور ہڈ گوشت ہونا مردوں میں مدوح اور خواتین میں مذموم ہے (بخاری)

(۲) حضرت ہند بن ابی حالہؓ کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کے قدم مبارک ہڈ گوشت تھے۔ ملا علی قاریؒ نے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ آپ ﷺ کے پاؤں کی انگلیاں موٹی تھیں۔

(جمع الوسائل ۲۰/۱) (بخاری)

یعنی آپ ﷺ کے ہاتھ اور پاؤں گوشت سے بھرے ہوئے تھے گویا شمعین سے سختی مراد نہیں۔ اس صورت میں دونوں حدیثوں میں تعارض ہی نہیں۔

سر مبارک: ضخیم الزام، ضخیم اور ضخامت دونوں مصدر آتے ہیں جمع میں بڑے ہونے کو کہتے ہیں جیسے بڑی کتاب ”کتاب ضخیم“ کہتے ہیں۔ یعنی آپ ﷺ کا سر بڑا تھا۔ حکماء، اطباء اور علم الابدان کے ماہرین کہتے ہیں کہ سر کا بڑا ہونا، دماغی قوتوں کے کمال پر دلالت کرتا ہے۔ یہ وصف موجود ہو، تو فکری، نظری اور دماغی قوتیں صحیح اور درست ہوں گی۔ لہذا سر کا بڑا ہونا خوبی ہے۔

ضخم الکرا دیس۔ کرا دیس کرحوس کی جمع ہے بعض شراح کا خیال ہے کہ کرحوس عظم السواس یعنی ہڈی کے سرے کو کہتے ہیں۔ جو دوسری ہڈی سے ملکر جوڑ بنتا ہے اور بعض کے خیال میں کرحوس ”مجتمع العظمین التقیا“ یعنی دو ہڈیوں کے آپس میں ملنے کی جگہ اور جوڑ کو کہتے ہیں۔ احادیث میں ایک اور لفظ ”جلیل المشاش“ آتا ہے وہ بھی ضخیم الکرا دیس کا ہم معنی ہے۔ بہر حال معنی یہ ہوئے کہ نبی کریم ﷺ کی ہڈیاں اور جوڑ مضبوط تھے جو کہ جسمانی قوت، محنتندی، شجاعت، اور نجابت کی علامت ہے۔

سینہ کے بال: طویل المسربة، مسربة میں راء کا ضم اور فتح دونوں منقول ہیں۔ سرب يسرب سے ہے۔ جس کے معنی ہیں پانی کا برتن یا مشک سے نیچے کی طرف جاری ہونا۔ آنسو اور پانی کے بہنے کے راستے کو نیز مرغی یعنی چراگاہ کو بھی مسرب کہتے ہیں۔ کیونکہ لوگ چراگاہ میں اپنے حیوانات کھلے چھوڑ دیتے ہیں۔ بہر حال اونچائی سے اترائی کی طرف بھکر اور دھار کی طرح چلے جانے کو مسروب کہتے ہیں۔ یہاں مقصود یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے سینہ پر زیادہ بال نہ تھے صرف اوپر کے ابھرے ہوئے حصہ پر تھوڑے تھوڑے بال تھے لیکن سینہ مبارک سے ناف تک بالوں کی ایک باریک لمبی دھاری تھی جس طرح کہ آگے امام احمسیؒ کی تشریح سے واضح ہوتا ہے نیز بیہقی وغیرہ میں تصریح ہے کہ ”لہ شعرات فی سرتہ کالقصب“ یعنی حلق سے لے کر ناف تک ایک باریک دھاری تھی جیسے ٹہنی ہو۔

انداز رفتار: اذا مشی تکفأ تکفؤاً، کففت الاءاء کے معنی برتن کے الٹ جانے کے ہیں۔ یعنی آپ ﷺ کی چال ایسی تھی جس میں آگے کی طرف میلان اور جھکاؤ ہوتا تھا۔ اور رفتار کی یہ ہیئت عاجزی اور فروتنی کی علامت ہے۔ تو معنی یہ ہوا کہ نبی کریم ﷺ جاتے ہوئے تواضع سے آگے کی طرف جھک کر

جاتے تھے۔ دوسرا معنی یہ کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ جاتے ہوئے سرعت سے جاتے تھے قدم چھوٹے نہیں ہوتے تھے۔ تیسرا معنی جو کہ آگے ایک اور حدیث کے لفظ اذا مشیٰ تعلق سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ آپ ﷺ قوت اور طاقت سے جاتے تھے۔ کائنما ینحط من صلبہ گویا آپ بلندی سے پستی کی جانب اتر رہے ہیں۔ یہاں من فی کے معنی میں ہے عموماً اترائی کی طرف جاتے ہوئے انسان تیزی اور احتیاط کے ساتھ قدم جما جما کر رکھتا ہے اور کچھ کچھ آگے کی طرف جھکا بھی ہوتا ہے۔ نیز ایسی حالت میں چلنا تکبر اور نخوت سے بھی خالی ہوتی ہے۔ لہذا اس تشبیہ سے تمام مقاصد حاصل ہوتے ہیں۔ صلب حدود اور المنحد من الارض یعنی زمین کی گہرائی اور پستی کے حصے کو کہتے ہیں۔ صلب ادغام کے ساتھ بھی اسی معنی میں مستعمل ہے۔ لیکن اس کے ایک اور معنی عشق شدید کے بھی آتے ہیں اس لیے رفع التباس کے لیے ادغام کو چھوڑ دیا۔ لم اقبلہ ولا بعدہ مثله : حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ جیسا نہ ان سے پہلے دیکھا نہ ان کے بعد دیکھا ہے۔

اشکال و ازالہ : یہاں یہ اشکال ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت علیؓ سے عمر میں بڑے تھے اور ایک ہی گھر کے آدمی تھے۔ تو نبی کریم ﷺ سے پہلے کا ذکر عبث ہے کیونکہ آپ سے پہلے کسی غیر کا دیکھنا ممکن نہ تھا۔ بلکہ بدو شعور سے آپ ﷺ کو دیکھ لیا تھا اس کا جواب یہ ہے کہ لم اقبلہ کا معنی ”لم اسمع قبلہ“ یا ”لم افہم قبلہ“ ہے یعنی میں نے نبی کریم ﷺ سے پہلے گزرنے والوں کے بارے میں نہ یہ سنا نہ جانا کہ آپ ﷺ سے پہلے بھی کوئی آپ جیسا حسین گزرا ہے۔ لہذا روایت سے صرف بصری روایت مراد نہیں ہے۔ اس طرح نبی کریم ﷺ کی تمام لوگوں پر فضیلت ظاہر ہو گئی۔ نیز یہاں پر اگرچہ نبی کریم ﷺ سے حسین ترکی نفی ہے لیکن نبی کریم ﷺ کے مثل کی نفی بھی مقصود ہے گویا آپ جیسا حسین کوئی نہیں تھا حدیث شائع امام ترمذیؒ سابقہ حدیث کی تائید کے لیے دوسری سند لا رہے ہیں۔

مشکلہ اور نحوہ : پہلی سند میں امام بخاریؒ ابو نعیم کے واسطے سے عبدالرحمن مسعودیؒ سے روایت کرتے تھے اس سند میں سفیان بن وکیع اپنے والد وکیع کے واسطے سے مسعودی سے روایت کرتے ہیں۔ لہذا مصنف مسعودیؒ سے دو واسطوں کے ذریعے روایت کرتے ہیں۔ نحو بمعناہ ضابطہ یہ ہے کہ اگر کوئی حدیث دو

سندوں کے ساتھ مروی ہو تو اگر دونوں لفظاً اور معنیاً موافق ہوں تو ایسی صورت میں مثلہ کے الفاظ لائے جاتے ہیں۔ لیکن اگر روایتیں لفظاً مخار اور معنیاً متحد ہوں تو دوسری سند کے ساتھ نحوہ لاتے ہیں۔ اور کبھی دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ مجازاً استعمال ہوتے ہیں۔ اب یہاں یہ شبہ ہوتا تھا کہ شاید نحوہ سے مثلہ مراد ہو یعنی روایتوں میں لفظی اور معنوی اتحاد ہوگا۔ تو اس وہم کو دفع کرنے کے لیے مصنف نے بمعناہ کا لفظ تاکیداً بڑھا دیا۔ تاکہ صرف معنوی اتحاد پر تنبیہ ہو اور یہ وہم دفع ہو کہ نحوہ مثلہ کی جگہ مستعمل ہے۔

(۶) حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ عَبْدِ الضَّيْبِيِّ الْبَصْرِيُّ وَعَلِيُّ بْنُ حَجَرٍ وَابُو

جَعْفَرُ مُحَمَّدُ بْنُ الْحُسَيْنِ وَهُوَ ابْنُ أَبِي حَلِيمَةَ وَالْمَعْنَى وَاحِدٌ قَالُوا ثَنَا

عِيسَى بْنُ يُونُسَ عَنْ عَمْرِو بْنِ عَبْدِ اللَّهِ مَوْلَى غَفَرَةَ قَالَ حَدَّثَنِي إِبْرَاهِيمُ

بْنُ مُحَمَّدٍ مَنْ وَلَدَ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ قَالَ كَانَ عَلِيٌّ إِذَا وَصَفَ رَسُولَ

اللَّهِ ﷺ قَالَ لَمْ يَكُنْ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ بِالطَّوِيلِ الْمُعْطِ وَبِالْقَصِيرِ

الْمُعَرَّدِ وَكَانَ رُبْعَةً مِنَ الْقَوْمِ لَمْ يَكُنْ بِالْجَعْدِ الْقَطِطُ وَلَا بِالسَّبْطِ كَانَ

جَعْدًا رَجُلًا وَلَمْ يَكُنْ بِالْمَطْهَمِ وَلَا بِالْمُكْثَمِ وَكَانَ فِي وَجْهِهِ تَدْوِيرٌ

أَبْيَضٌ مَشْرَبٌ أَدْعَجُ الْعَيْنَيْنِ أَهْدَبُ الْأَشْفَارِ جَلِيلُ الْمَشَاشِ وَالْكُنْدُ

أَجْرَدٌ ذُو مَسْرَبَةٍ ثَنَنَ الْكَفَيْنِ وَالْقَدَمَيْنِ إِذَا مَشَى تَقَلَّعَ كَأَنَّمَا يَنْحَطُّ

فِي صَبَبٍ وَإِذَا تَلَفَّتِ الْعَفْتُ مَعًا بَيْنَ كَتْفَيْهِ خَاتَمُ النَّبُوَّةِ وَهُوَ خَاتَمُ

النَّبِيِّينَ أَجْوَدُ النَّاسِ صَدْرًا وَأَصْدَقُ النَّاسِ لَهْجَةً وَالْيَنَّهُمْ عَرِيكَةٌ

وَأَكْرَمُهُمْ عَشِيرَةً مِنْ رَأَاهُ بِدَاهَةِ هَابِهِ وَمَنْ خَالَطَهُ مَعْرِفَةُ أَحَبِّهِ يَقُولُ

نَاعَتَهُ لَمْ أَرِ قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ مِثْلَهُ ﷺ (۱)۔

ترجمہ: ابراہیم بن محمد جو حضرت علیؑ کی اولاد میں سے ہیں فرماتے ہیں کہ حضرت علیؑ

نبی کریم ﷺ کا حلیہ بیان کرتے ہوئے کیا کرتے تھے کہ حضور اقدس ﷺ سے زیادہ لمبے

(۱) جامع ترمذی ۲/۲۰۵ کتاب المناقب باب ماجاء فی صفة النبی ﷺ، المستدرک للحاکم

۲/۲۰۶، مسند احمد ۱/۲۷۷ شرح السنة للبقوی ۱۳/۲۸۲ باب صفة النبی ﷺ (مختار)

تھے نہ زیادہ پستہ قد بلکہ میانہ قد لوگوں میں سے تھے۔ حضور ﷺ کے بال نہ زیادہ گھنگریالے نہ بالکل سیدھے تھے بلکہ قدرے خم دار بالوں والے تھے۔ نہ آپ ﷺ موٹے بدن کے تھے نہ گول چہرے والے تھے البتہ تھوڑی سی گولائی آپ ﷺ کے چہرہ انور میں تھی۔ سفید سرخی مائل رنگ کے حامل تھے آپ ﷺ کی آنکھیں نہایت سیاہ اور پلکیں دراز تھیں۔ ہڈیوں کے سرے (جوڑوں پر) موٹے تھے، نیز دونوں مونڈھوں کے درمیان کا حصہ بھی موٹا تھا (سوائے بعض حصوں کے) بدن کا اکثر حصہ بالوں سے خالی تھا۔ سینہ مبارک سے لیکر ناف تک بالوں کی ایک لکیری تھی۔ ہاتھ اور قدم مبارک پر گوشت تھے۔ جب چلتے تو قدموں کو قوت سے اٹھاتے گویا پستی کی طرف اتر رہے ہیں اور جب کسی کی طرف توجہ فرماتے تو پورے بدن مبارک کے ساتھ توجہ فرماتے۔ دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت تھی اور آپ نبیوں کو ختم کرنے والے تھے۔ سب سے زیادہ نخی دل کے مالک تھے اور سب سے زیادہ نخی زبان نرم طبیعت والے تھے نیز سب سے زیادہ شریف خاندان والے تھے جو شخص آپ ﷺ کو اچانک دیکھتا وہ آپ ﷺ سے مرعوب ہو جاتا تھا۔ البتہ جو شخص آپ ﷺ کو پہچان کر آپ سے گھل مل جاتا وہ آپ ﷺ کی محبت میں گرفتار ہو جاتا تھا۔ آپ ﷺ کا حلیہ بیان کرنے والا (خواہ وہ کوئی بھی ہو) صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ جیسا (جمال و کمال کا حامل) شخص نہ آپ ﷺ سے پہلے دیکھا نہ آپ ﷺ کے بعد دیکھا۔

حضرت علیؑ کی روایت اور امام اصمعی کی لغوی تشریحات:

قال ابو عیسیٰ ^۱ سمعت ابا جعفر محمد بن الحسین يقول سمعت
الاصمعی يقول فی تفسیر صفة النبی ﷺ الممغط الذاهب طولا قال
وسمعت اعراباً يقول فی کلامه تمغط فی نشأته ای مڈھا مڈھا شديداً
والمرتد الذاخل بعضه فی بعض قصراً واما القطط فالشديد الجعودة

والرجل الذی فی شعره حجونة ای تشنّ قليلا واما مطهم فالبادن
 الكثير اللحم والمكثّم المدور الوجه والمشرّب الذی فی بياضه
 حمرة والادعج الشديد سواد العين والأهدب الطویل الأشفار
 والکند مجتمعة الکفین وهو الکاهل والمسربة هو الشعر الدقیق
 الذی کأنه قضیب من الصدر إلى السرة والشن الغلیظ الأصابع من
 الکفین والقدمین والتقلع ان یمشی بقوة والصبب الحدور تقول
 انحد رنا فی صبوب و صبب وقوله جلیل المشاش یرید رؤس
 المناکب و العشرة الصلبة والعشیر الصحاب و البداة المفاجة
 یقال بدهته بامرأی لبعثته.

ترجمہ: امام ابو یسٰی الترمذیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابو جعفر محمد بن حسینؒ سے سنا ہے
 انہوں نے فرمایا کہ میں نے امام اسمعیؒ سے سنا جو رسول اللہ ﷺ کے حلیہ مبارک کی
 تشریح فرماتے تھے کہ الممغط اس شخص کو کہا جاتا ہے جو درازی کی طرف جا رہا ہو، وہ
 کہتے ہیں کہ میں نے ایک دیہاتی کو یہ کہتے سنا کہ اس نے اپنے تیر کو چلے پر
 چڑھا کر خوب کھینچا۔ اور المسترد کا مطلب یہ ہے جو انسانی اعضاء جو پستی کی وجہ
 سے بعض بعض کے ساتھ ملے ہوئے ہوں۔ اور قسط سے بالوں کا شدت کے ساتھ
 گھٹنکریا لے ہونا مراد ہے۔ اور وجل کا معنی معمولی گھٹنکریا لے ہونا ہے۔ مطهم
 بھاری جسم والے شخص کو کہا جاتا ہے اور مکثّم گول چہرے والے آدمی کو کہا جاتا ہے۔
 مشرب اس رنگ کو کہا جاتا ہے کہ سفیدی میں سرخی کی ملاوٹ ہو اور ادعج بالکل سیاہ
 آنکھوں والے شخص کو کہا جاتا ہے اور اهدب لمسی پلکوں والے شخص کو کہتے ہیں اور کند
 دونوں کندھوں کے اکٹھے ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ گویا ایک باریک لکیر جو سینے سے
 ناف تک چلی گئی ہو اور شن سے مراد ہاتھوں اور پاؤں کا پُر گوشت ہونا ہے اور تقلع

کا مطلب ہے کہ آدمی قوت کے ساتھ چلے اور صیب سے مراد پستی یا ڈھلوان ہے جیسا کہ تو کہتا ہے کہ ہم ٹہلی جگہ میں اتر گئے اور راوی نے جو کہا ہے کہ آپ ﷺ جلیل المشاش تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کندھوں کے کنارے بڑے تھے اور عشر کا معنی رفاقت اور عشیر سے مراد ساتھی ہے اور بد اہلہ سے مراد اچانک ملاقات ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ میں اس کے پاس کوئی معاملہ لے کر اچانک آیا۔

حدیث کی سند کی بحث: والمعنی واحد یعنی احمد بن عبدہ علی بن حجر اور محمد بن الحسین تینوں کی روایات میں معنوی موافقت ہے اگرچہ لفظاً ان میں مغایرت ہے۔ قالوا حدثنا عیسیٰ الخ یعنی تینوں حضرات میں سے ہر ایک نے فرمایا کہ ”حدثنا عیسیٰ لہذا یہ حدثنا پہلے حدثنا کا بیان اور اس کی تفصیل ہو جائے گی۔ ابراہیم بن محمد، ابراہیم کے والد محمد سے ابوالقاسم محمد بن الحنفیہ مراد ہیں۔ جو علم و شجاعت میں بہت مشہور تھے۔ ان کی والدہ خولہ بنت جعفر بن حنفیہ کی قیدیوں میں سے تھیں اور حضرت علیؑ کے حصے میں آئیں۔ بعض غالی شیعہ محمد بن الحنفیہ کے بارے میں الوہیت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ فلعنہم اللہ

ولد کی بحث: شراح کہتے ہیں کہ ابراہیم کی ملاقات حضرت علی سے ثابت نہیں خود امام ترمذی بھی ایک جگہ اس کی تصریح کر چکے ہیں اس لیے یہ حدیث منقطع ہوگی۔ من ولد علی ولد، واو، اور لام دونوں کے فتح کے ساتھ مروی ہیں اور واو کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ بھی درست ہے۔ امام قسطلانی فرماتے ہیں کہ اول صورت میں یہ اسم جنس اور دوسری صورت میں اسم جمع ہے بہر حال حضرت ابراہیمؒ، حضرت علیؑ کے پوتے ہیں۔

تناسب قد و قامت: المغطیہ باب انفعال یعنی انمغاط سے اسم فاعل کا صیغہ ہے جسکے معنی ہوتے ہیں زیادہ لمبا ہونا۔ تمغط البعیر کا معنی ہوتا ہے ”ملبدنہ فی السیر شلیدا“ یعنی اونٹ نے سفر میں لمبے لمبے قدم لئے۔ یہاں مراد وہ سے زیادہ اور نمایاں طول ہے۔ ولا بالقصیر المتعدد، متعدد کا معنی بعد میں خود نقل کرتا ہے۔ یہاں تنای فی القصر کے معنی میں مستعمل ہے۔ مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کے اعضاء ایک دوسرے میں مضموم یعنی گھسے ہوئے نہ تھے۔ آپ پستہ قد نہ تھے بہر حال نبی کریم ﷺ کی میانہ قدی اس

حدیث میں اور اس قسم کی دوسری احادیث میں مذکور ہے لیکن صحیح احادیث کے مطابق آپ میا نہ قدی سے کچھ بڑھ کر طول کی طرف مائل تھے۔ چنانچہ حند بن ابی ہالہ کی روایت میں اس کی تصریح فرماتے ہیں کان اطول من المربع۔ یعنی میا نہ قدی سے قدرے اونچے تھے۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کسی جماعت اور مجمع میں کھڑے ہوتے تو سب سے اونچے نظر آتے تھے۔ لیکن اس کا حدیث باب سے کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ آپ ﷺ کا سب سے بلند نظر آنا درازی قد کی وجہ سے نہ تھا بلکہ یہ آپ ﷺ کا معجزہ تھا کہ ہر مجلس میں آپ ﷺ نمایاں نظر آتے تھے۔ وکان ربعة من القوم مردوں میں میا نہ قد تھے۔ قوم اس جماعت کو کہتے ہیں جس میں عورت نہ ہو کیونکہ قومیت کی خصوصیت مردوں میں ہے۔ ولم یکن بالجعد القبط یہاں آپ ﷺ کے بال مبارک جو جسم کا حصہ ہیں کا بیان ہے جعد کے معنی انطوی و انقبض۔ یعنی مڑنے اور گھٹکریا لے ہونے کے ہیں۔ جبکہ قسط سے مراد شدہ جعودہ ہے۔ یعنی سخت گھٹکریا لاپن۔ ولا بالسبط سبط عدم نکسر شعر یعنی بالوں کے بالکل ہموار اور غیر چھیدہ ہونے کو کہتے ہیں۔ بلکہ کان جعداً رجلاً یعنی سیدھے اور قدرے گھٹکریا لے بال تھے۔

چہرے کی ساخت: ولم یکن بالمطہم چہرے کا بیان ہے۔ مطہم کے متعدد معانی ہیں یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ سمین البدن یعنی فربہ اور نحیف البدن یعنی کمزور دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ امام اصمعیؒ تو ہادن کثیر اللحم کا ترجمہ کرتے ہیں یعنی موٹا پُر گوشت۔ جبکہ بعض لوگوں نے منتفخ الوجہ سے تفسیر کی ہے جس کا معنی گوشت سے بھرے چہرے والا ہوتا ہے۔ اور چہرے میں حد سے زیادہ گوشت کا ہونا بھی حسن کو ختم کر دیتا ہے کیونکہ اس طرح چہرہ گویا سوجا ہوا اور متورم نظر آتا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ مطہم یہاں رنگ کی صفت ہے سرخ مائل بسیاحہ کو اسمو کہا جاتا ہے لیکن سفیدی اور سرخی کے مقابلے میں زیادہ سیاحی آجائے تو طہمہ کہتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سیاحی مائل نہ تھے لیکن یہ معنی کچھ بعید معلوم ہوتا ہے۔

ولا بالمکثم مکثم مدور الوجہ اور خالص گول چہرے والے کو کہتے ہیں اس سے چہرے کا حسن ختم ہو جاتا ہے اسی طرح چہرے میں زیادہ لمبائی بھی بد صورتی پیدا کرتی ہے۔ اور اگر کچھ

تدویر اور کچھ طول ہو تو اسے کتابی چہرہ کہتے ہیں۔ اور اس سے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایسے چہرے والے کو عربی میں اسمیل الوجهہ کہتے ہیں۔ تو نبی کریم ﷺ کے چہرہ انور میں اگرچہ تدویر تھی اور کامل استطالہ نہ تھی۔ جیسے کہ خود راوی کہتے ”وکان فی وجہہ تدویر“ لیکن بالکل گول چہرہ بھی نہ تھا جس طرح کہ روسیوں اور چینیوں کا ہوتا ہے۔

رنگ کا بیان: ابیض مشرب: ابیض، کان کا خبر ہو تو منصوب ہوگا۔ لیکن رائج یہ ہے کہ یہ مرفوع ہو اور مبتداء محذوف کی خبر ہو یعنی ہوا ابیض کیونکہ مشرب بھی مرفوع ہے۔ اور مشرب راء کی تخفیف کے ساتھ اشراب کا اور اس کی تشدید کے ساتھ باب تفصیل کا اسم مفعول ہے دونوں صحیح ہیں۔ اشراب اصل میں خلط لون بلون یعنی ایک رنگ کا دوسرے میں مخلوط ہونے کو کہتے ہیں۔ تو یہاں مقصود یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا رنگ سفید تھا لیکن اس میں سرخی تھی۔ سفیدی میں سرخی آمیزش ہو تو یہ حسن میں اضافہ کا سبب بنتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کے رنگ کے بارے میں صرف ایک حدیث میں اسمر یعنی گندم گون کا لفظ مستعمل ہے۔ اس کے علاوہ جہاں بھی آپ ﷺ کے رنگ ذکر کیا گیا ہے وہ ابیض یا ابیض مشرب بالحمرة ہے یعنی سرخی مائل سفید رنگ تھا۔

چشم مبارک کی ساخت: ادعج العینین ذعج مدعج کے معنی ہیں سیاهی کا سخت سیاہ ہونا۔ چونکہ رنگوں میں افضل کا صیغہ تفصیلی معنی سے خالی ہوتا ہے اس لیے مراد یہاں یہ ہے کہ آپ ﷺ کی آنکھوں کی سیاهی زیادہ سیاہ تھی۔ آنکھیں نیلی یا بھورے رنگ کی نہ تھیں۔ شرح نے تصریح کی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے آنکھوں کی سفیدی زیادہ سفید تھی اور بعض روایات کے مطابق اس میں سرخ ڈورے بھی تھے یہ دونوں چیزیں آنکھوں کے لیے انتہائی درجہ کا حسن ہیں۔ کیونکہ آنکھوں کی سفیدی میں زردی آجائے یا میلی نظر آئیں تو اس سے آنکھوں کا حسن ختم ہو جاتا ہے۔ اھذب الاشفار اھذب ھذب سے ہے لٹکنے کے معنی میں مستعمل ہے۔ ھذبہ جھار اور پھند نے کو کہتے ہیں ایک حدیث میں آتا ہے ”کھذبہ ثوبی ھذا“ میرے اس کپڑے کے پھند نے کی طرح۔ کپڑے کا وہ حصہ جو ٹٹک رہا ہو کپڑے کی لمبائی اور طول کی علامت ہے۔ چنانچہ اھذب سے بھی مراد اس مقام پر یہی ہے کہ پلکیں لمبی اور لٹکی ہوتی تھیں۔ اور اشفار و فرہ کی جمع ہے

جس کے معنی ہیں پلکوں کا غبت یعنی آنکھ کا وہ حصہ جس پر پلکیں ہوتی ہیں لیکن یہاں غبت ذکر ہے اور ثابت یعنی بال مراد ہیں۔ کیونکہ خیدگی پلکوں میں ہوتی ہے ان کے غبت میں نہیں ہوتی اور غبت اور ثابت میں ملاہست کے سبب یہ مجاز صحیح ہے۔ یا پھر یہاں مضاف مخدوف ہے۔ اور اھذب الاضفار سے مراد اھذب شعر الاضفار ہے۔ یعنی پلکیں لمبی اور دراز تھیں۔

جلیل المشاش: مُشاشہ کی جمع مُشاش آتی ہے یہاں اس سے مراد ہڈیوں کے سرے ہیں جو بڑے بڑے اور مضبوط تھے۔ ضخم الکرا دیس اور جلیل المشاش کا ایک ہی معنی بنتا ہے والکعد، کعد سے مراد موٹڑھوں کے درمیان کی جگہ ہے جہاں موٹڑھوں کی ہڈیاں ملتی ہیں۔ اور اس کا بڑا اور مضبوط ہونا جسمانی قوت کی علامت ہے۔ اجرد، اجرد کے معنی ہیں بالوں سے خالی۔ نبی کریم ﷺ کے عام بدن پر بال نہ تھے۔ پاؤں، ہاتھ، پیٹھ وغیرہ بدن کے اکثر حصے بالوں سے خالی تھے۔ بعض لوگ اجرد کے معنی میں یہ کہتے ہیں کہ بدن پر چھوٹے چھوٹے بال تھے کیونکہ اجرد دراصل اس گھوڑے کو کہتے ہیں جس کے بدن پر بال چھوٹے چھوٹے ہوں لیکن یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اجرد کا یہ معنی حیوانات کی نسبت سے ہے جس طرح کہ قاموس میں اس کی تصریح ہے۔ اور انسان کے اوصاف محمودہ میں سے یہ ہے۔ کہ چند مخصوص اعضاء کے سوا جسم کے دوسرے حصے بالوں سے بالکل خالی ہوں جس طرح کہ بعض حصوں پر بالوں کا زیادہ ہونا پسندیدہ وصف ہے۔ ذو مسربة عربی یعنی سینہ کے وسط میں ناف تک بالوں کی پتلی لکیر تھی۔ عربیہ کی تفصیل کھلی حدیث میں گزر چکی ہے۔ اسی طرح شن الکفین والقدمین کا ترجمہ گزر چکا ہے۔ اذا مشی نقلع چلتے کی کیفیت کا بیان ہے۔ قلع کے معنی گڑی ہوئی چیز کو تیغ سے نکالنے کے ہیں۔ نبی کریم ﷺ جب چلتے تو گویا پاؤں زمین میں دھنسنے ہوئے ہیں۔ اور آپ ﷺ انہیں نکال نکال کر جارہے ہیں۔ یعنی پوری قوت سے زمین سے اٹھاتے ہیں۔ اس میں اس قوت اور مضبوطی کی طرف اشارہ ہے جو نبی کریم ﷺ کی رفتار سے معلوم ہوتی تھی۔ کانما ینحط من صعب الخ گویا آپ ﷺ اونچائی سے اترائی کی طرف جارہے ہیں۔ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

التفات تام: واذا التفت التفت معاً۔ نبی کریم ﷺ کے اخلاق عالیہ کا ایک عظیم پہلو ذکر کر رہے

ہیں۔ کہ جب آپ ﷺ کسی کی طرف توجہ فرماتے تو پوری ہمہ تنی سے توجہ فرماتے۔ شرح کہتے ہیں کہ ”لابسارق النظر کما هو عادة المتکبرین“ یعنی متکبرین کی طرح آپ ﷺ کن آنکھوں سے نہیں دیکھتے تھے۔ بلکہ آپ ﷺ تو خلق عظیم کی دولت سے مالا مال تھے۔ اگر معمولی درجہ کا کوئی آدمی بھی آپ ﷺ سے بات کرتا تو سینہ مبارک اس کی طرف پھیر کر خوب توجہ سے بات سنتے اور پیٹھ پھیر کر کسی سے بات کرنے سے احتراز کرتے۔

ایک تشریح یہ بھی کی جاتی ہے کہ آپ ﷺ ہر کام کو ہمہ تن اور توجہ سے کرتے تھے۔ خواہ وہ کوئی دنیوی کام ہو یا اخروی کام، التفات تام کے بغیر نہیں کرتے۔ نئی نوع انسان کی اصلاح نبوت کے مشن اور جہاد و دعوت میں آپ ﷺ تمام وسائل اور صلاحیتوں کو مستعمل فرماتے۔ لیکن دوسری جانب ازواج مطہرات، اقارب اور دوستوں کے حقوق کا بھی پورا پورا خیال فرماتے۔ اور ضابطہ بھی ہے کہ مکمل التفات اور کامل توجہ کے بغیر کوئی کام بھی درست نہیں ہوتا۔ بین کتفیه خاتم النبوة۔ ایک بڑی جسمانی علامت اور آپ ﷺ کی صداقت کی نشانی کا ذکر ہے وہ یہ کہ آپ ﷺ کے دونوں کندھوں کے درمیان بدن پر نبوت کی مہر تھی جو کہ آپ ﷺ کی صداقت اور نبوت کی بڑی علامت تھی۔ مہر نبوت کے بارے میں مستقل اور مفصل بحث اپنے باب میں آئے گی اور اس کی کیفیت، کیت اور رنگ وغیرہ حالات کا ذکر ہوگا۔

وہو خاتم النبیین یہ جملہ معترضہ ہے۔ گویا راوی کے خیال میں یہ مہر ختم نبوت کی دلیل تھی۔

فراخ دلی: أجود الناس صدراً آپ تمام مخلوق سے سینہ کے اعتبار سے زیادہ نخی تھے۔ یہاں صدر سے مراد قلب ہے کیونکہ صدر محل اور قلب حال ہے۔ محل کو ذکر کر کے مجازاً حال مراد ہے۔ مطلب یہ کہ آپ دریا دل اور نخی تھے۔ نیز کشادہ دل اور محل کی یہ حالت تھی کہ مخالفین کا ہر قسم ہر مخالفت برداشت کرتے رہے مظالم سہتے رہے لیکن اپنے مشن سے دستبردار نہ ہوئے۔ بلکہ تمام تر عداوتوں کے باوجود دشمن سے ملاقات کے وقت پیشانی مبارک پر بل نہ آنے دیا۔ رعنی مال کے سلسلے میں سخاوت تو وہ تو کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ہاں اس میں اس پر بھی حبیہ ہے کہ آپ ﷺ کی سخاوت دل سے تھی۔ تکلف، ریا کاری اور تصنع سے سخاوت نہیں کرتے تھے۔

آپ ﷺ کی صدق گفتاری اور نرم مزاجی: وأصدق الناس لهجة، زبان اور کلام کے لحاظ سے سارے عالم میں سچے تھے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اللہ تعالیٰ خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں ومن أصدق من الله حديثاً۔ پھر دوسرے نمبر پر نبی کریم ﷺ کے بارے میں ارشاد ہے والذي جاء بالصدق۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ما ينطق عن الهوى ان هو الا وحي يوحى۔ وہ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کرتے اس کی بات تو صرف وحی ہے جو اس پر اتاری گئی ہے۔ یہاں لهجة سے مراد زبان اور کلام ہے۔ یعنی آپ ﷺ ہمیشہ سچ بولا کرتے تھے۔

والبينهم عريكة: عريكة فطرت اور طبیعت کو کہتے ہیں اور البين لان يلبين سے اسم تفضیل ہے۔ یعنی آپ ﷺ تمام عالم میں نرم طبیعت کے مالک تھے۔ مزاج میں فطری نرمی تھی اور نرم خوئی میں ہزار ہا حکمتیں ہوتی تھیں۔ خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فضا غليظ القلب لا نفصوا من حولك (الآية) اللہ تعالیٰ کی رحمت کاملہ سے تم ان کے لیے نرم ہو گئے ہو اور اگر تم بے رحم اور سنگ دل ہوتے تو لوگ تم سے بکھر جاتے۔

سخت گیر، سنگ دل اور تیز زبان شخص کے قریب لوگ نہیں جاتے۔ اور جس شخص میں محبت، الفت اور عضو در گزر کی خوبیاں ہوں تو لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ جس سے آپ ﷺ کے لیے منصب نبوت کے فرائض ادا کرنے میں سہولت ہوتی تھی۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ البين کے معنی منقاد کے ہیں۔ اور آپ ﷺ کی طبیعت حق کے لیے مسخر اور منقاد تھی۔

خاندانی شرافت اور معاشرتی کرامت: واکرمهم عشيرة. عشيرة صحبت کو بھی کہتے ہیں۔ اور چونکہ ابتدائی صحبت اور مجالست اپنے ہم قوم افراد اور قبیلہ کے لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے اس لیے عشيرة قبیلہ کو بھی کہتے ہیں۔ بہر حال ایک معنی یہ ہوا کہ قبیلہ کے لحاظ سے آپ ﷺ تمام لوگوں میں معزز اور اشرف ترین ہیں۔ کیونکہ قریش کا خاندان سارے عالم میں شریف ترین خاندان ہے ایک حدیث میں ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام فرماتے ہیں کہ مجھے بنو ہاشم سے زیادہ اشرف خاندان نظر نہیں آیا۔ تو آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے خاندانی نجابت و شرافت سے نوازا تھا۔ لیکن ایک دوسرے نسخہ کے مطابق یہ لفظ

عشرۃ ہے جس سے مراد مصاحبت و معاشرت ہی ہے پھر مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ بود و باش اور رفاقت میں تمام لوگوں سے اکرم تھے۔ حقوق دینے اور ولولہ آنے میں، نیز دوسروں کے آرام و راحت کا خیال رکھنے میں آپ ﷺ اپنی نظیر آپ تھے۔ معاملات میں نرمی برتتے، لیکن اس نرمی اور معاملات کی بھی ایک خاص حد تھی وہ یہ کہ حدود شریعت کے اندر رہ کر آپ ﷺ سب کچھ برداشت کرتے تھے لیکن اگر حدود شریعت کو پامال کیا جاتا تو اللہ تعالیٰ کے حقوق پر دست اندازی ہوتی تو آپ ﷺ کے غصہ کی انتہا نہیں ہوتی تھی۔ ایسی ہی حالت کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ لم یقم لغضبه شئی (۱)۔ تو پھر آپ ﷺ کے غصہ کے سامنے کوئی چیز ٹہر نہیں سکتی تھی۔

(۷) حَدَّثَنَا سَفِيَانُ بْنُ وَكَيْعٍ قَالَ ثَنَا جَمِيعُ بْنُ عَمِيرٍ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ الْعَجَلِيُّ أَمَلَاءُ عَلَيْنَا مِنْ كِتَابِهِ قَالَ أَخْبَرَنِي رَجُلٌ مِنْ بَنِي تَمِيمٍ مِنْ وَلَدِ أَبِي هَالَةَ زَوْجِ خَدِيجَةَ يَكْنَى أَبُو عَبْدِ اللَّهِ عَنْ إِبْنِ لَأْبِي هَالَةَ عَنْ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ سَأَلْتُ خَالَي هِنْدَ بْنَ أَبِي هَالَةَ وَكَانَ وَصَافًا عَنْ حَلِيَّةِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَأَنَا اشْتَهَى أَنْ يَصِفَ إِلَيَّ شَيْئًا اتَّعَلَّقَ بِهِ فَقَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَخْمًا مَفْخَمًا يَتَلَاوُزُ وَجْهَهُ تَلَالُؤُ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ أَطُولُ مِنَ الْمَرْبُوعِ وَأَقْصَرُ مِنَ الْمَشْدَبِ عَظِيمُ الْهَامَةِ رَجُلُ الشَّعْرَانِ انْفَرَقَتْ عَقِيقَتُهُ فَرَقَ وَالْأَفْلَاحُ يَجَاوِزُ شَعْرَهُ شَحْمَةُ أُذُنِهِ إِذَا هُوَ وَفَرَةٌ أَزْهَرُ اللَّوْنِ وَاسِعُ الْجَبِينِ أَزْجُ الْحَوَاجِبِ سَوَابِغٌ مِنْ غَيْرِ قَرْنٍ بَيْنَهُمَا عَرَقٌ يَدْرَهُ الْغَضَبُ أَقْنَى الْعَرْنَيْنِ لَهُ نَوْرٌ يَعْطُوهُ يَحْسِبُهُ مَنْ لَمْ يَتَأَمَّلْهُ أَشْمَ كَثُّ اللَّحْيَةِ سَهْلُ الْخَلْدَيْنِ ضَلِيعُ الْفَمِ مَفْلَجُ الْإِسْنَانِ دَلِيقُ الْمَسْرُوبَةِ كَانَ عُنُقُهُ جَيِّدَ دُمِيَّةٍ فِي صَفَاءِ الْفَضَّةِ مُعْتَدِلُ الْخَلْقِ بَادِنٌ مَتَمَاسِكٌ سَوَاءُ الْبَطْنِ وَالصَّدْرِ عَرِيضُ الصَّدْرِ بَعِيدُ مَا بَيْنَ الْمَنْكَبَيْنِ ضَخْمٌ

الکرا دیس أنور المتجرد موصول ما بین اللبّة والسرة بشعر یجرى
 كالخط عاری الشدین والبطن مناسوی ذلك أشعر الذراعین
 والمنکبین و اعالی الصدر طویل الذنبدین وحب الراحة شثن الکفین
 والقدمین سائل الأطراف أوقال سائل الأطراف خمصان الاخمصین
 مسیح القدمین ینبو عنهما الماء اذا زال زال قلعا ً یخطو تکفیا ً و یمشی
 هو ناخریغ المشیة اذا مشی ً کما نما ینحط من صلب و اذا التفت التفت
 جمیعاً خافض الطرف نظره الی الارض اکثر من نظره الی السماء جلّ
 نظره الملاحظة یسوق أصحابه یدء من لقی بالسلام (۱)۔

ترجمہ: ہمیں سفیان بن وکیع نے بیان کیا کہ ہمیں جمیع بن عمیر بن عبد الرحمن الجلی نے
 اپنی کتاب سے سنایا کہ ہمیں بنو قیم کے ایک آدمی نے جو ابی ہالہ کی اولاد سے تھا اور
 وہ حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کا پہلا خاوند تھا اس کی کنیت ابو عبد اللہ تھی وہ ابو ہالہ کے ایک
 فرزند سے روایت کرتا ہے اور انہوں نے حضرت حسن بن علیؓ سے یہ روایت سنی ہے وہ
 فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں حند بن ابی ہالہ سے حضور اقدس ﷺ کے حلیہ
 مبارک کے بارے میں دریافت کیا جبکہ وہ آنحضرت ﷺ کے حلیہ مبارک کو بہت ہی
 وضاحت سے بیان فرماتے تھے۔ مجھے یہ خواہش ہوئی کہ وہ ان اوصاف جمیلہ میں
 سے کچھ میرے سامنے بھی ذکر کریں تاکہ میں ان کے بیان کو اپنے لئے حجت اور سند
 بناؤں یعنی میں اس کے ساتھ تعلق قائم کر لوں۔ تو انہوں نے فرمایا کہ آپ ﷺ اپنی
 ذات میں عظیم تھے اور دوسروں کے نزدیک بھی عظیم تھے۔ آپ ﷺ کا چہرہ مبارک
 چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا تھا۔ آپ ﷺ درمیانہ قد سے قدرے لمبے تھے
 اور دراز قد سے قدرے پست تھے۔ آپ ﷺ کا سر مبارک معتدل بڑا تھا۔ آپ ﷺ
 کے بال مبارک کسی قدر بل کھائے ہوئے تھے۔ اکثر سر کے بالوں میں خود مانگ نکل

آتی تھی تو آپ ﷺ مانگ رہے دیتے ورنہ آپ ﷺ خود مانگ نکلنے کا اہتمام نہ فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کے بال مبارک کانوں کی لو سے تجاوز کر جاتے تھے جب کہ آپ ﷺ بڑھالیتے۔ آپ ﷺ کا رنگ مبارک سرخ و سفید تھا اور پیشانی مبارک کشادہ تھی۔ آپ ﷺ کے آبرو مبارک باریک اور خم دار اور گنجان تھے اور دونوں آبرو جدا جدا تھے۔ ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہیں تھے دونوں آبروں کے درمیان ایک باریک رگ تھی جو غصہ کے وقت ابھر آتی تھی آپ ﷺ کی ناک مبارک اونچی بلندی مائل تھی اور اس پر ایک چمک اور نور تھا ابتداءً (بغور کے) دیکھنے والا گمان کرتا کہ آپ ﷺ کی ناک اونچی ہے آپ ﷺ کی داڑھی مبارک گھنی تھی۔ آپ ﷺ کے رخسار مبارک ہموار تھے۔ آپ ﷺ کا دہن مبارک کشادہ تھا، سامنے کے دانتوں میں قدرے کشادگی تھی سینے سے ناف تک باریک بالوں کی لکیر تھی آپ ﷺ کی گردن مبارک مورنی کی گردن جیسی تھی جو صفائی میں چاندی جیسی تھی۔ آپ ﷺ کے تمام اعضاء معتدل اور بر گوشت تھے اور بدن مبارک کھٹا ہوا تھا، پیٹ اور سینہ مبارک برابر تھے۔ سینہ مبارک کشادہ تھا۔ آپ ﷺ کے دونوں کندھوں کے درمیان قدرے فاصلہ تھا۔ آپ ﷺ کے اعضاء کی جوڑوں کی ہڈیاں بھی بڑی اور مضبوط تھیں۔ جسم مبارک کا لباس سے خالی حصہ بڑا روشن اور چمکدار تھا۔ سینہ اور ناف کو بالوں کی ایک باریک لکیر ملائی تھی اور سینہ کے اوپر حصہ میں بال تھے۔ آپ ﷺ کی دونوں کلاہیاں دراز تھیں، دونوں پاؤں کے تلوے گہرے تھے، دونوں قدم مبارک ہموار تھے، پانی ان کی وجہ سے بہہ جاتا تھا۔ جب آپ ﷺ چلتے تو قوت سے قدم اٹھاتے اور جب قدم رکھتے تو جھک کر چلتے۔ قدم زمین پر آہستہ سے رکھتے۔ آپ ﷺ کی چال مبارک تیز تھی۔ آپ ﷺ چلتے تو کشادہ قدم رکھتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ ﷺ ڈھلان سے اتر رہے ہیں۔ جب آپ ﷺ کسی کی طرف متوجہ ہوتے تو پورے بدن کے ساتھ توجہ فرماتے۔ آپ ﷺ کی نگاہ مبارک نیچے رہتی تھی اور بسبوت آسمان کے زمین کی

طرف زیادہ رہتی تھی۔ آپ ﷺ عموماً گوشہ چشم سے دیکھتے تھے اور چلنے میں صحابہ کرام کو آگے رکھتے تھے جس سے ملتے تھے تو سلام کرنے میں خود ہی پہل فرماتے تھے۔

حدیث کے بعض راویان کا تذکرہ: باب کی اس حدیث میں جمع بن عمیر العجلی کا ذکر ہے۔ بعض نسخوں میں جمع بن عمر کا ذکر ہے۔ اس راوی کے بارے میں اہل علم نے لکھا ہے کہ یہ ایک غالی رافضی ہے اسلئے اس نے اپنے باپ کا نام عمر کی جگہ عمیر رکھا اس لئے کہ رافضیوں کا حضرت عمرؓ سے تعصب ہے تو اس تعصب کی وجہ سے جمع نے بھی اپنے باپ کا نام عمیر بتایا ہے۔

املاء علیہنا من کتابہ، کہ اس نے ہمیں اپنی کتاب سے املاء کروائی، محدثین کرام کا ایک تو روایت حدیث یہ تھا کہ صرف نفس روایت کو بیان فرماتے تھے۔ اس کے الفاظ کی تشریح، معانی اور مطالب نہیں ہوتے تھے۔ اور دوسرا طریقہ یہ تھا کہ الفاظ حدیث کے ساتھ ساتھ ان الفاظ کے معانی مطالب اور تشریح بھی بیان کرتے تھے۔ اور اسی کو املاء کہا جاتا تھا۔ مگر یہاں املاء سے یہ اصطلاحی معنی مراد نہیں بلکہ یہاں لغوی معنی یعنی لکھوانا مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جمع نے یہ روایت اپنی کتاب (۱) سے لکھوا دی۔

صاحب مواہب نے لکھا ہے کہ هو الالیق ہنا کہ یہی معنی مناسب ہے۔

رجل من بنی تمیم من ولدابی ہالقزوج خدیجۃ یگنی ابا عبد اللہ، اس آدمی کے نام میں اختلاف ہے بعض نے یزید بن عمرو بتایا ہے جبکہ بعض نے عمرو اور بعض نے عمیر (۲)۔ اس لئے یہ آدمی مجہول ہے اور اس کی اس جہالت کی وجہ سے روایت بھی معلول ہے۔

ابو ہالۃ کون تھے: یہ ام المؤمنین خدیجۃ الکبریٰؓ کے شوہر اول تھے اس کا نام مالک، ہند، نباش بن زرارہ یا زرارہ بن نباش بتایا جاتا ہے۔

(۱) حفاظت حدیث کے تین طریقے ہیں (۱) حفظ (یادداشت) اس طریقے کا سارا مدار حفظ پر ہوتا ہے (۲) تعامل یعنی سنی گئی روایات پر عمل کرنا اس کا مدار عمل پر ہوتا ہے (۳) کتابت (لکھائی) اس طریقے کا مدار کتابت پر ہوتا ہے کہ سنی گئی روایات کو کاغذ وغیرہ پر لکھوا کر محفوظ کر دیا جائے۔ یہ تین طریقے روز اول سے رائج تھے۔ (مختار)

(۲) اور علامہ نور الدین علی بن ابی بکرؓ نے لکھا ہے قال ابو عیید ابو ہالۃ کان زوج خدیجۃ قبل رسول اللہ ﷺ واسمہ النباش وابنہ ہنلبن النباش من بنی امیید بن عمرو بن تمیم (مجمع الزوائد ۸/ ۲۹۱ کتاب علامات النبوة (مختار)

یگنی ابا عبد اللہ، یعنی ابو ہالہ کا تعارف زوج خدیجہ سے جس شخص نے کیا ہے اس کی کنیت ابو عبد اللہ ہے اور ترتیب کے لحاظ سے یہ جملہ رجل موصوف کے لئے صفت ثالثہ ہے۔ اس لئے کہ نحوی ترتیب کے لحاظ سے رجل موصوف من بنی تمیم صفت اول من ولد ابی ہالہ زوج خدیجہ پورا جملہ صفت ثانیہ اور یگنی الخ صفت ثالثہ۔

ایک اشکال کا جواب: البتہ یہاں ایک اشکال وارد ہوتا ہے کہ یگنی تو فعل مجہول کا صیغہ ہے۔ ابا عبد اللہ اس کا نائب قاعل ہوا جبکہ قانون یہ ہے کہ جس طرح قاعل مرفوع ہوتا ہے۔ نائب قاعل بھی مرفوع ہوتا ہے تو یہاں ابو عبد اللہ ہونا چاہئے تھا جبکہ یہاں ابا عبد اللہ ہے تو یہ منصوب کیوں؟
الجواب: تو اس اعتراض کے اہل علم حضرات نے مختلف جوابات دیئے ہیں۔

(۱) بعض کا تو کہنا ہے کہ یہاں ابا عبد اللہ نائب قاعل نہیں بلکہ مفعول ثانی ہے اور نائب قاعل مضمیر مضر ہے اور مفعول کا اعراب نصب ہے۔

(۲) بعض نے لکھا ہے کہ یہاں یہ بھی اشکال ہے کہ یہاں ابا عبد اللہ منصوب بالمدح ہو اور اعنی فعل مقدر ہو یعنی یکنی اعنی ابا عبد اللہ ہوگا۔

(۳) اور یہ جواب بھی دیا گیا ہے کہ نصب نزع حافض ہے اصل عبارت یہ تھی یگنی باہی عبد اللہ یکنی ابا عبد اللہ ہوا۔

عن ابن ابی ہالہ، ابو ہالہ کے بیٹے کا نام ہند ہے اور سند میں ابو عبد اللہ کے نام سے ذکر ہوا۔ اس کا نام بھی ہند ہے مگر اس کو ابو عبد اللہ کے نام سے ذکر کیا تا کہ تمیز آجائے۔

مسائل خالی ہند بن ابی ہالہ، یہ حضرت حسنؓ کے ماموں تھے اس لئے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت خدیجہ الکبریٰ کے ساتھ نکاح کیا تو اس کے ساتھ پہلے شوہر ابو ہالہ کا ایک بیٹا تھا جس کا نام ہند تھا۔ اور حضرت فاطمہؓ حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کی بیٹی تھی۔ اس لئے ہند بن ابی ہالہ (۱) حضرت

(۱) ہند بن ابی ہالہ حضور اقدس ﷺ کے ربیب تھے کیونکہ جب آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کے ساتھ شادی کر لی تو آپ ﷺ میں آپ ﷺ کی پرورش میں آئے۔ چنانچہ وہ آپ ﷺ کے ربیب بنے۔ اس لئے وہ آپ ﷺ کے ساتھ بے تکلف تھے۔ اس لئے آپ ﷺ کے عادات، خصائل اور حلیہ مبارک کا آپ کو خوب علم تھا (مختار)

فاطمہؑ کا اخیانی بھائی بنا۔ اور اسی طرح وہ حضرت حسنؑ کا ماموں بھی ہوا۔ اس لئے آپؐ نے فرمایا کہ میں نے اپنے ماموں ہند بن ابی حاتمہ سے پوچھا چونکہ وہ آپ ﷺ کے ربیب تھے اور بچپن آپ ﷺ کی پرورش میں گزرا تھا۔ اور آپ ﷺ سے بے پناہ محبت تھی اس عشق و محبت کی وجہ سے وہ آپ ﷺ کی بہت زیادہ تعریف کیا کرتا تھا۔

سوال: یہاں پر ایک سوال اٹھتا ہے حضرت حسنؑ گھر کا فرد تھا تو اس کو خود آنحضرت ﷺ کے بارے میں خود علم ہونا چاہئے تھا۔ اس نے اپنے ماموں سے کیوں پوچھا؟

الجواب: تو حضرات محدثین نے اس اشکال کا جواب یہ دیا ہے کہ جس وقت آنحضرت ﷺ کا وصال ہوا تو حضرت حسنؑ کی عمر سات سال (۱) تھی۔ اور ظاہر بات ہے کہ اس کا بچپن تھا ابھی پختگی نہیں آئی تھی اور نہ اتنی عمر میں علم و فہم کا ذوق ہوتا ہے لیکن جب پختگی آئی اور علم و آنحضرت ﷺ کے سیرت و کردار، عادات و اخلاق کے جاننے کا جذبہ پیدا ہوا تو آپؐ نے اپنے ماموں سے پوچھا جو آپ ﷺ کیساتھ زیادہ رہ چکے تھے اور اس کو رسول اللہ ﷺ کے عادات و اخلاق کا بہت زیادہ علم تھا اور خود نہ جاننے اور اپنے نانا محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں جاننے کے ذوق و خواہش پر آپؐ کا یہ جملہ کہ اوانا اشتہی ان یصف لی منها شیئاً اتعلق بہ، کہ میری خواہش ہے کہ وہ مجھے آنحضرت ﷺ کے کچھ اوصاف بیان کریں اور میں اس کے ساتھ اپنا تعلق قائم کروں (۲)۔

اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ میں اس کی اقتداء کروں لہذا کان لکم فی رسول اللہ أسوة حسنہ (الآیۃ) اے ایمان والوں تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ میں بہترین نمونہ ہے۔

(۱) حضرت حسنؑ رسول خدا ﷺ کے نواسے ہیں اور شیر خدا حضرت علیؑ اور خاتون جنت حضرت فاطمہؑ الزہریؑ کے فرزند ہیں آپ ﷺ ۳۰ھ میں پیدا ہوئے، ۲۲ روایات خود آنحضرت ﷺ سے سنی تھیں۔ آپؐ بڑے حسین و جمیل اور انجائی بہادر تھے۔ کئی جہادوں میں شریک رہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا الحسن والحسین سید شباب اہل الجنة، بعض لوگوں کی آپؐ سے دشمنی تھی جس کی وجہ سے آپؐ کو زہر دیا گیا۔ چنانچہ ۴۹ھ کو انتقال کر گئے۔ آپؐ کے تین بھائی تھے۔ خود آپؐ، حسینؑ، حسنؑ اور ایک بہن ام کلثومؑ تھی۔ (بخاری)

(۲) تمام صحابہ کرامؓ کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ ہر قول و فعل پر عمل کریں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ آپؐ نے قدم بھی وہاں رکھتے تھے جہاں رسول اللہ ﷺ قدم رکھ چکے تھے اور اس جگہ وضو فرماتے تھے جہاں آپ ﷺ وضو کر چکے تھے۔ (بخاری)

کان وضافاً، وضافاً لکفائی کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس کے کئی معانی ہیں کثرت سے بیان کرنا، بار بار بیان کرنا، حرے لے لے کر بیان کرنا، اور یہاں سب معانی لئے جاسکتے ہیں۔

لقال کان رسول اللہ ﷺ فخمًا مفخمًا، فخمًا خاء کے کسرے کے ساتھ باب نصر اور کرم سے وہ شخص مراد ہوتا ہے جو عظمت والا ہو اور جسامت کے اعتبار سے موزون ہو اور مفخمًا سے مراد جو لوگوں میں عظمت والا ہو تو مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ خود اپنی ذات میں بھی عظیم تھے اور دوسروں کی نظروں میں بھی عظیم تھے۔ بعض لوگوں میں عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنی ذات میں کمتر ہوتے ہیں مگر دوسروں کے سامنے بڑا بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اصولاً ایسا کرنا بڑا سمجھا جاتا ہے۔ مگر رسول اللہ ﷺ کی بات الگ ہے آپ ﷺ حقیقت میں ایسے ہی تھے کہ کان عظیمًا فیاتی ومعظمًا عند الناس کہ آپ ﷺ اپنی ذات میں بھی عظیم تھے اور لوگوں کی نظروں میں بھی عظیم تھے۔ آپ ﷺ اپنے لئے یہ دعا بھی فرمایا کرتے تھے اللہم اجعلنی فی عینی صغیراً وفی أعین الناس کبیراً کہ اے اللہ مجھے اپنی نگاہ میں چھوٹا اور لوگوں کی نگاہوں میں بڑا بنادے۔ اور شیخ عبدالرؤف مناویؒ فرماتے ہیں فخم عظیم عند اللہ معظم عند الناس (مناوی)

یتلألاً وجهه تلالو القمر ليلة البدر رسول اللہ ﷺ کا چہرہ انور چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا تھا اور یہ کوئی تخیلاتی بات نہیں تھی بلکہ حقیقت میں ایسا ہی تھا۔ لؤلؤ (۱) موتی کو کہا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت چمکتا ہے اس لئے علامہ مناویؒ نے لکھا ہے لؤلؤ هو الاضواء والاشراق یتلألؤ وجهه ای یستنیر ویشرق ویضیٰ۔

أطول من المربع واقصر من المشدب، کہ آپ ﷺ کا قدمبارک عام درمیانے قد سے ذرا لمبا تھا اور زیادہ لمبے قد سے قدرے آپ ﷺ کا قد کچھ کم تھا۔

(۱) موتی کی حقیقت یہ ہے کہ جب بارش ہوتی ہے تو سمندر میں موجود پیلی کا منہ قدرتی طور پر کھلا رہتا ہے۔ اور جب بارش ہوتی ہے اور بارش کا قطرہ اس پیلی میں داخل ہو جاتا ہے تو پیلی کا منہ قدرتی طور پر بند ہو کر پیلی سمندر کی تہ میں چلی جاتی ہے اور پھر ایک خاص مدت کے اندر اس بارش کے قطرے سے موتی بن جاتا ہے مردوں کیلئے اس دنیا میں بھی موتیوں کا استعمال روا ہے اور جنت میں تو ایک خاص قسم کا لباس ہے۔ یحلقون فیہا من اساور من ذهب ولؤلؤ (الایہ) کہ موتیوں کو وہاں سونے اور موتیوں کے ہار پہنائے جائیں گے جبکہ دنیا میں مردوں کیلئے سونا چاندی کا استعمال حرام اور خواتین کیلئے جائز ہے (بخاری)

المربع درمیانی قد کو کہا جاتا ہے۔ امام ذہبی نے لکھا ہے کہ المربع هو الی الطول اقرب
تو مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا قد مبارک زیادہ دراز نہیں تھا بلکہ طول کی طرف قدرے مائل تھا۔

القصر من المشذب (۱)، مشذب باب تقصیل سے جس درخت کی شاخیں کاٹ دی گئی ہوں
اس لئے شذب کاٹ چھانٹ کو کہا جاتا ہے۔ درخت کی جب شاخیں کاٹ دی جائیں تو وہ درخت
لبا نظر آتا ہے تو مشذب کا معنی طویل بائن ہے۔ اسی سے تشذیب ہے یعنی کھجور یا کسی درخت کی زائد
اور خشک شاخوں کو کاٹنا۔ اہل علم نے تہذیب اخلاق کو بھی تشذیب کہا ہے۔ مطلب یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا
قد مبارک اس درخت کے مانند لبا نہیں تھا جس کی شاخیں کاٹ دی گئی ہوں بلکہ اس سے کم تھا۔ مگر اس کے
باوجود اگر کوئی طویل سے طویل تر آدمی آپ ﷺ کے ساتھ چلتا تو آپ ﷺ بلند معلوم ہوتے تھے اور یہ
آپ ﷺ کا معجزہ تھا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ہر حیثیت سے رفعت عطا فرمائی تھی۔
ورفعنا لک ذکرک (الایۃ)

عظیم الہامۃ، ہامۃ کھوپڑی کو کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع ہامات آتی ہے۔ اصولی طور پر
عرف عام میں بڑا سر محمود اور چھوٹا سر معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اور سر کا بڑا ہونا عقل مندی کی علامت ہے۔ اس
لئے جس کا سر بڑا ہو تو اس میں دماغ بھی زیادہ ہوگا اور اس شخص میں سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کی استعداد بھی
زیادہ ہوگی۔ اور جس کا سر چھوٹا ہو تو اس میں دماغ بھی کم ہوتا ہے اور دماغ کم ہونے کی وجہ سے اس میں
سوچنے، سمجھنے اور غور کرنے کی صلاحیت بھی کم ہوگی۔ تو رسول اللہ ﷺ کا سر مبارک قدرتی طور پر بغیر عارضہ
کے اعتدال کے ساتھ بڑا تھا اور ایسا بڑا ہونا کمال کی علامت ہے۔

رجل الشعر، آپ ﷺ کے بال قدرے ٹھنڈے یا لے تھے ان انفرقت عقیقہ فرق والا فلا اگر
آپ ﷺ کے سر مبارک پر مانگ نکل آتی تو نکال لیتے ورنہ چھوڑ دیتے یعنی مانگ نکالنے میں تکلف نہیں
فرماتے تھے۔

عقیقہ، کالفظ بال اتارنے اور نافرمانی کرنے میں استعمال ہوتا ہے عقیقہ کو عقیقہ اس لئے

(۱) قال الہیثمی المشذب، المقرط فی الطول وکذلک هو فی کل شی قال جریر الکوی بہا شذب
العروق مشذب.. فکأنما وکیب علی طریبال (مجمع الزوائد ۸/ ۴۹۱) کتاب علامات النبوة (مختار)

کہا جاتا ہے کہ اس میں بچے کے بال کاٹے جاتے ہیں (۱)۔ مگر اس روایت میں مطلق بال مراد ہیں اور اس لفظ کے استعمال کی وجہ شاید یہی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں پیدا ہونے کے بعد اس کے بال اتارے جاتے تھے اور کچھ اور رسومات ادا کی جاتی تھیں اور وہ تمام رسومات آنحضرت ﷺ کی نہیں کی گئیں تو یہ بال آنحضرت ﷺ کے عقیدہ والے بال تھے۔

مگر بعض اہل علم نے اس کو رد کیا ہے۔ اس لئے کہ آپ ﷺ کا تعلق بنو ہاشم سے تھا اور بنو ہاشم عرب کا شریف خاندان اور ایک شریف خاندان سے کیسے ممکن ہے کہ ایسے کام میں غفلت کرے۔ اس لئے ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے فأنه مستبعد جداً في العادة فإن عادتهم حلق الشعر المولود في السابع وكذا ذبح الغنم وإطعام الفقراء (جمع ۱/۳۲) (۲)

آنحضرت ﷺ کا قدرتی مانگ: فلا یجاوز شعره شمعة اذنبه اذا هو وفرة، رسول اللہ ﷺ نے تین طرح کے بال رکھے تھے۔

- (۱) وفرة، جب بال کانوں کے لو تک پہنچ جائے تو اسے وفرة کہا جاتا ہے۔
- (۲) لعة اور جب بال کانوں کے لو سے تجاوز کر جائے اور منکبین تک نہ پہنچے ہوں تو اسے جمہ کہا جاتا ہے
- (۲) جمعة، جو کانوں کی لو سے تجاوز کر کے منکبین تک پہنچ جائیں تو اسے جمہ کہا جاتا ہے گویا رسول اللہ ﷺ کے بالوں کا حد اول وفرة تھا درمیانی حد لعة تھا اور آخری حد جمعة تھا۔ مگر عموماً آپ ﷺ کے بال وفرة ہوا کرتے تھے (۳)۔

(۱) علامہ مناویؒ نے لکھا ہے والعقبة كالحقيقة واصل العنق القطع والشق ومن ثم قيل للذبيحة التي تذبح عن المولود يوم سابعه عقبة لأنها يشق حلقها وقيل للشعر الخارج على رأس المولود من بطن أمه عقبة لأنه يحلق لم قيل للشعر النابت بعد ذلك عقبة مجازاً لأنه منها ونباته من اصول (مناوی علی هامش جمع الوسائل ۱/۳۲) (مختار)

(۲) بعض شارحین نے لکھا ہے کہ ممکن ہے رسول اللہ ﷺ کے بال معجزانہ طور پر رہ چکے ہوں اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کا والد محترم ان کی پیدائش سے تقریباً چھ ماہ قبل وفات پا چکے تھے اور آپ ﷺ کے بال باقی رکھے گئے تاکہ ان پر مشرکانہ رسوم ادا نہ کی جائیں۔ (مختار)

(۳) مردوں کے لئے اس طرح کے بال رکھنا جائز بلکہ موافق السنہ ہیں اور اس سے زیادہ لمبے کرنا جیسے کہ آج کل کے فیشن ایبل حضرات، خواتین کی طرح بال رکھتے ہیں خلاف سنت اور گناہ ہے (مختار)

ازہر اللون، رسول اللہ ﷺ کا رنگ مبارک سرخ و سفید تھا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے رنگ مبارک میں ایک خاص چمک تھی (۱)۔ اور ویسے سے بھی عموماً سرخ و سفید رنگ زیادہ خوبصورت لگتا ہے۔
واسع الجبین، رسول اللہ ﷺ کشادہ جبین والے تھے یعنی آپ ﷺ کی پیشانی طولا و عرضاً کشادہ تھی۔ انسان میں ایسی پیشانی حسن کی علامت ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پیشانی مبارک ایسی چمکدار تھی کہ گویا سورج دوڑ رہا ہے۔ علماء کرام فرماتے ہیں کہ جبین کا وسیع اور کشادہ ہونا خوش قسمتی کی علامت ہے۔ ایسا آدمی عموماً سخی اور خوش اخلاق ہوتا ہے۔ پیشانی اگر وسیع اور کشادہ ہو تو آدمی باوقار اور وجہہ معلوم ہوتا ہے۔
ازج الحواجب الخ، رسول اللہ ﷺ کے آبرو باریک اور خمدار ہونے کے ساتھ ساتھ کامل تھے مگر ملے ہوئے نہ تھے اور ان دونوں آبروؤں کے درمیان ایک باریک رگ تھی جو غصہ کے وقت ابھرتی تھی۔
ازج زج سے مشتق ہے۔ جس کا معنی ہے دوڑنا، نیزہ مارنا زجاج شیشہ کو کہا جاتا ہے اور نیزے کے پھل کو بھی زج کہا جاتا ہے۔

حواجب، حواجب کی جمع ہے اور حواجب دربان اور چوکیدار کو کہا جاتا ہے چونکہ یہ بھویں بھی آنکھوں کی حفاظت کرتی ہیں اور جب کوئی شے آنکھوں کی طرف آتی ہے تو یہ بھویں خود بخود بند ہو جاتی ہیں اور آنکھوں کو اس چیز کے نقصان سے بچاتی ہیں۔

حواجب کے تین صفات: بھوؤں اور آبروؤں میں تین صفات کا ہونا حسن و جمال کا باعث ہوتا ہے۔
(۱) طویل ہونا (۲) باریک ہونا (۳) دونوں ما جبین کے درمیان قدرے فاصلہ ہونا تو ازج میں اول دو صفات کا ذکر ہے اور سوا لیس من غیر قرن میں تیسری صفت کا ذکر ہے۔

حواجب جمع ذکر کرنے کی وجہ: یہاں ایک اشکال ہوتا ہے کہ حواجب جمع کا صیغہ ہے جب کہ ہر انسان کے دو حواجبین ہوتی ہیں تو حدیث پاک میں حواجبین کیوں نہ کوڑ نہیں حواجب کا ذکر کیوں ہے؟
الجواب: مگر اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ عربی لغت میں کبھی کبھی حثنیہ پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حمل مبالغہ ہو اور یہ مبالغہ ان دونوں کے امتداد کی وجہ سے ہو۔

عرق و اعصاب میں فرق: یہاں یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ عرق جس کی جمع عروق ہے ان رگوں کو کہا جاتا ہے جو مجوف ہوں اور عصب جمع اعصاب ان رگوں کو کہا جاتا ہے جو مجوف نہ ہو۔ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے العرق بکسر العین هو أجوف يكون فيه الدم والعصب غير أجوف (جمع ۴۴)
تو رسول اللہ ﷺ کا بین الحاجبین والی رگ غصہ کے وقت ابھرتی تھی جو رسول اللہ ﷺ کے انتہائی قوت غضب پر دلالت کرتی ہے۔

افنسی العربین الخ، رسول اللہ ﷺ کی ناک باریک، بلند اور قدرے لمبی تھی۔ چہرے کے حسن میں ناک کے باریک اور بلند ہونے میں بڑا دخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل ذوق ناک میں تین صفات کا موجود ہونا حسن و جمال تصور کرتے ہیں (۱) قدرے لمبائی (۲) باریک ہونا (۳) قدرے بلند ہونا۔ اور ناک مبارک پر ایک نور اور چمک ہوتا تھا۔

کٹ اللحیة (۱)، اور آپ ﷺ کی داڑھی مبارک گھنی تھی۔ کٹ گنجان کو کہا جاتا ہے۔ باب نصر سے گھٹا ہونا اور گنجان ہونا آتا ہے۔ اہل علم کا کہنا ہے کہ داڑھی کا گھٹنا اور وسیع ہونا خوشنمائی کی علامت ہے اور چوڑی و لمبی داڑھی سے چہرہ حسین و جمیل لگتا ہے۔

داڑھی کی مقدار: ائمہ اربعہ کے ہاں ایک مشت کے برابر داڑھی رکھنا لازمی ہے۔ اور ایک مشت سے زیادہ ہو تو اس کا کٹوانا جائز ہے۔ بعض مصری علماء کرام داڑھی کو سنت عادیہ سمجھتے ہیں اور سنت عادیہ کی مخالفت موجب گناہ یا ملامت نہیں۔ البتہ جمہور اہل علم داڑھی کو سنت مؤکدہ سمجھتے ہیں۔

سہل الخدین: اور آپ ﷺ کے رخسار ہموار تھے رخساروں کا نرم اور ہموار ہونا اور کیل چھائیوں، داغ و جھبوں سے محفوظ ہونا حسن سمجھا جاتا ہے۔

سہل اس زمین کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے جو بلند و بالا ہو۔ تو سہل کا معنی ہے غیر مرتفع۔ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے رخسار مبارک بالکل صاف، نرم، ہموار اور پر گوشت تھے۔

کشادہ وین: ضلیع الفم ضلع دراصل پسلیوں کی صفت ہے۔ چوڑی اور لمبی پسلیوں والے کو

(۱) علامہ سیوطیؒ نے لکھا ہے الکثونة ان تكون اللحبة غیر رقیقة ولا طویلة ولكن فیها کثانة من غیر عظم

ولا طول (مجمع الزوائد ۳/ ۴۹۲ کتاب علامات النبوة) (مختار)

ضلیع کہتے ہیں یہاں مطلق کشادگی کے معنی پر ہے بعض اقوام کے ہاں بہت چھوٹا منہ حسن سمجھا جاتا ہے اور بعض کشادہ دہنی کو حسن سمجھتے ہیں نبی کریم ﷺ کا منہ مبارک زیادہ چھوٹا نہ تھا بلکہ اپنے جسم کے دیگر اعضاء کے بالکل موافق ذرا کھلا ہوا اور کشادہ تھا۔ یہ صفت دراصل مافی الضمیر کے بہتر اظہار کرنے میں مدد ہوتی ہے فصاحت کی علامت ہے اور خطابت اور دعوت کے کام میں معاون ہے۔

گردن اور دانتوں کی خوبصورتی: مفلج الأسنان فلج دانتوں کی کشادگی کو کہتے ہیں اور دانتوں کے درمیان تھوڑی کشادگی فطری حسن کو جلا بخشی ہے بالکل بند اور ملے ہوئے دانت خوبصورت بھی دکھائی نہیں دیتے اس کے مقابلے میں جو صفت آتی ہے وہ الصن ہے جو کہ ملے ہوئے دانتوں والے فحش کو کہتے ہیں لیکن شراح کہتے ہیں کہ فلج آپ ﷺ کے ثنایا یعنی آگے کے دانتوں میں تھا جو کہ مدوح صفت ہے بخلاف پچھلے دانتوں کے ان میں فج نہیں تھا۔

کان عنقه جید دمیۃ آپ ﷺ کی گردن گڑیا کی گردن کی طرح ہموار تھی گویا کسی ماہر مضمور نے اگلیوں سے بنائی ہو۔ الدمیۃ المنحوت من العاج او الرخام یعنی ہاتھی دانت یا سنگ مرمر کو تراش کر بنائی ہو۔ گڑیا کو دمیۃ کہتے ہیں۔ دمی اس کی جمع ہے۔ متنبی کا شعر ہے کہ

خرجت غداة النفر اعترض الدمی فلم ارأحلی منک فی العین والقلب
الغرض آپ ﷺ کی گردن مبارک بھی اعتدال و استواء اور حسن ساخت میں ایسی تھی جیسے کسی ماہر بت تراش نے ہاتھی دانت سے تراش کر بنائی ہو۔

معتدل الخلق یہ گزری ہوئی تفصیل کے لئے اجمال ہے یا پھر بعد کے لئے اجمال ہے یعنی خلاصہ کلام یہ ہے کہ ساری جسمانی ساخت میں بہت زیادہ اعتدال تھا گویا آپ ﷺ سڈول جسم کے مالک تھے۔ ہر ہر چیز میں توازن اور اعتدال و تناسب تھا۔

جسم نہایت معتدل تھا: بادن متماسک ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ اس سے قبل کے الفاظ کان کی خبریت کی بناء پر منصوب تھے لیکن آگے کے الفاظ مرفوع مردی ہیں۔ آپ ﷺ فریبہ تھے لیکن اعضاء میں تماسک تھا یعنی اعتدال کے ساتھ اعضاء پر گوشت تھے۔ لیکن ان کا گوشت لٹکا ہوا نہیں تھا جس طرح کے

پہلے بھی مطمئن ہونے کی نفی کی گئی ہے۔ عموماً ورزش اور جفاکشی کی کمی اور تنعم و بسیار خوری کے باعث جسم کا گوشت جوانی ہی میں لٹکنے لگتا ہے لیکن نبی کریم ﷺ کی زندگی تو فوجی زندگی تھی جفاکشی کے کاموں اور سخت سے سخت تر مشقت کے کاموں میں آپ ﷺ پیش پیش رہتے تھے۔ عبادات میں بھی ایسا انہماک تھا کہ پاؤں میں درم آ جاتا تھا اس وجہ سے بدن میں پکڑ پیدا ہوا تھا یعنی گوشت ہڈیوں کے ساتھ اور اعضاء ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے چمٹے ہوئے تھے۔ یہ صفت صحت و تندرستی کی علامت بھی ہے۔ اور بظاہر یہی لگتا ہے کہ آپ ﷺ کی یہ صفت بڑھاپے تک برقرار تھی۔

سواء البطن والصدر زیادہ خوراک اور کم ورزش کے باعث عموماً پیٹ بڑھ جاتا ہے وزن بڑھ جاتا ہے جو ایک طرح بد صورتی کے ساتھ ساتھ سستی اور نکال کا سبب بنتا ہے۔ دوسری طرف کئی بیماریوں کا خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ اطباء کا اس پر اتفاق ہے کہ پیٹ بڑھنا ایک مستقل بیماری ہے لیکن آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام کو تو قوت لا یحوت ملتی تھی پھر مشقتیں اور جفاکشی اس پر مستزاد ہوتی تھی۔ نیز دین کا غم اور امت کی فکر الگ کھائے جا رہی تھی اس لئے پیٹ بڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ جس کی وجہ سے جسم بہت معتدل تھا۔ عریض الصدر بعض روایات میں رجب الصدر آیا ہے سینہ کا چوڑا ہونا مردانہ حسن کے علاوہ تحمل اور بردباری کی علامت بھی ہے۔

جسم مبارک کی رنگت: انور المتجرد، متجرد بدن کے اس حصے کو کہتے ہیں جس پر بال نہ ہوں یا اس حصے کو جس سے کپڑا ہٹایا جائے یعنی برہنہ حصے کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کی تفسیر میں دو احتمال ہیں یہ بھی صحیح ہے کہ جب آپ ﷺ کپڑا بدن سے ہٹا دیتے تو چھپے ہوئے اعضاء ظاہر ہو کر دوسرے اعضاء کی نسبت زیادہ روشن دکھائی دیتے تھے کیونکہ کھلے ہوئے اعضاء کا رنگ گندم گون ہوتا ہے لیکن اس سے بہتر تفسیر یہ ہے کہ عام حالت میں جو اعضاء کپڑے سے خالی اور ظاہر ہوتے ہیں وہ منور اور روشن ہوتے تھے جبکہ کپڑے کے اندر چھپے ہوئے اعضاء تو اور بھی زیادہ منور ہوتے تھے۔ اس توجیہ میں اس قول پر رد بھی ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ کا رنگ گندم گون تھا۔

سینہ کے بال: موصول ما بین اللبۃ والسرۃ بشعر سینے کے اوپر گڑھا ساد دکھائی دیتا ہے لہ

کہلاتا ہے اور مسرة ناف کو کہتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان بالوں کی ایک لکیر تھی جو بارہکی میں خط جیسے تھی۔ اسی مفہوم کو پہلے دقیق المسربة سے بیان کیا گیا ہے۔

عاری الثمین والبطن مما سوى ذلك اس خط اور بالوں کی لکیر کے علاوہ سینہ اور پیٹ پر بال نہیں تھے۔ بعض لوگوں نے اس روایت سے اور حضرت انسؓ کی روایت سے جس میں بیاض الإبط کا ذکر ہے۔ بظلوں کے نیچے کے بالوں کی بھی نفی کی ہے مگر یہ درست نہیں کیونکہ روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ بظلوں کے بالوں کو نکالا کرتے تھے۔

أشعر النراعین والمنكبين وأعلى الصدر، أشعر أجود کی ضد ہے یعنی مذکورہ حصوں پر بال زیادہ اور طویل تھے۔ طویل الزندین، زند کلائی کو کہتے ہیں آپ ﷺ کی کلائیوں اور لمبی تھیں۔ رجب الراحة آپ ﷺ کی ہتھیلیاں چوڑی اور کشادہ تھیں اس لحاظ سے بھی ان میں فراخی پائی جاتی تھی اور یہی حسن فراخی اس معنوی فراخی پر بھی دلالت کرتی ہے جو کہ نبی کریم ﷺ میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ کی سخاوت بے مثل تھی بعض لوگوں نے اس جملہ کا معنی ”واسع القوة“ سے بھی کیا ہے یعنی شہائد کے وقت آپ ﷺ بہت مضبوط اور جے ہوئے رہتے تھے۔ لیکن پہلا معنی راجح ہے کیونکہ یہاں بدن کی ظاہری ساخت کا بیان مقصود ہے۔

ہاتھ پاؤں اور اطراف کا ذکر: مسائل الأطراف او قال شائل الأطراف راوی کو شک ہے کہ اس کے استاد نے سائل کا لفظ بولا تھا یا شائل کہا تھا بلکہ بعض روایات میں سائلن الأطراف اور بعض روایات میں سائلن الأطراف بھی آیا ہے جو سائل کے قریب المعنی ہیں سائلن سائل کا اسم فاعل ہے جس کے حقیقی معنی ”بہا ہوا“ ہوتے ہیں لیکن یہاں پر لہا ہونے کے معنی میں مستعمل ہے کہا جاتا ہے ”سائلن غرة الفرس“ بمعنی استطالت و عرصت اور شائل شال مشول کا اسم فاعل ہے جو رفع اور ارتقاع یعنی متعہی اور لازم دونوں معنوں میں مستعمل ہے کہتے ہیں شال المیزان ترازو کا ایک پلڑا دوسرے سے اونچا ہو گیا اور ”شال الفرس ذنبہ“ کا معنی ہے گھوڑا دم اٹھا کر بھاگا۔ اطراف ہاتھ پاؤں اور سر یعنی دھڑ سے جدا ہونے والے اعضاء نیز انگلیوں پر بھی بولا جاتا ہے بہر حال یہاں پر نبی کریم ﷺ کے ہاتھ

پاؤں کا ذکر ہے کہ وہ لمبے اور سیدھے تھے۔ ٹیڑھے اور چھوٹے نہ تھے۔

قدم مبارک کی ساخت: **خمصان الأخمصین**، خمصان فتح خاء کے ساتھ بھی درست ہے لیکن

روایت ضم خاء کے ساتھ ہے یہ مبالغہ کا صیغہ ہے اور اخمص بھی خمص خمو صا و مخمصہ سے ہے جس کے اصل معنی خالی ہونے کے ہیں اخمص اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے پاؤں کا درمیانی حصہ

گوشت سے خالی ہو اور چلتے وقت سارا پاؤں زمین پر نہ لگے اور اس کا دوسرا معنی ہے ”ما يتجافى عن الأرض عند وضع القدم“ یعنی پاؤں کا وہ حصہ جو چلتے وقت زمین پر نہ لگے یہاں پر بھی اس دوسرے

معنی میں مستعمل ہے یہ وصف پاؤں کے حسن میں اضافہ کرتا ہے اس کے برعکس پاؤں پر گوشت زیادہ ہو اور سارے کا سارا زمین پر پڑے تو یہ متورم اور بد صورت دکھائی دیتا ہے۔ اخمص قد میں کو کہا جاتا ہے۔ متنتی کا

شعر ہے کہ **فبايما قدم سعيت إلى العلى ادم الهلال لاخمصيك خداء**

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کے پاؤں میں یہ صفت ثابت کی گئی ہے لیکن حضرت ابو ہریرہؓ کی

ایک حدیث میں آتا ہے کہ ”اذا وطئى بقدمه وطئى بكلها ليس له اخمص“ جس میں اس

صفت کی بصراحت نفی کی ہے سند کے لحاظ سے بھی محدثین کے ہاں بہ نسبت اس حدیث کے ابو ہریرہؓ کی

حدیث قوی ہے کیونکہ ہند کی اس حدیث میں جمیع کے علاوہ مجہول راوی بھی ہیں۔ لہذا اس حدیث کی توجیہ

میں یہی کہا جائے گا کہ چونکہ نبی کریم ﷺ کے قدم مبارک کا خمص نہایت اعتدال پر تھا نہ معدوم تھا۔ اور

نہ اتنا زیادہ تھا کہ پاؤں ٹیڑھا نظر آئے۔ اس لئے ہند کی اس حدیث میں جس خمص کا اثبات ہے وہ

معتدل خمص ہے اور ابو ہریرہؓ کی حدیث میں جس خمص کی نفی ہے وہ اعتدال سے باہر کا خمص ہے اور

اسی وجہ سے خمصان کا معنی بھی زیادہ اخمص نہیں کیا جائے گا بلکہ یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کا خمص نہایت

معتدل تھا۔ اس طرح دونوں حدیثوں کا تعارض ختم ہو جاتا ہے۔ مسیح القدمین مسیح چکنے اور ہموار کو

کہتے ہیں اور یہ اس لئے کہ مسیح اور مسلسل ملنا ہموار اور چکنے ہونے کا سبب بنتا ہے آپ ﷺ کے پاؤں مبارک

نشیب و فراز سے خالی تھے ہڈیاں ادھر ادھر کو نکلی ہوئی نہ تھیں۔

ينبو عنهما الماء چونکہ پاؤں میں دراڑیں وغیرہ نہ تھیں اس لئے پانی پڑتے ہی ان سے جدا ہو

جاناتا تالبا ینبو، نبوة کے معنی اچٹنا کے ہیں کہتے ہیں ”لکل سيف نبوة ولكل جواد كبوة“ یعنی تلوار جو بھی ہو کبھی کبھی اچٹ جاتی ہے اور گھوڑا بہترین ہو تو بھی کبھی کبھی ٹھوکر کھا جاتا ہے۔

سبک رفتاری: ویمشی ہونا آرام سے جانے کا مقصد وقار و سکون کی رفتار ہے جس میں جلدی نہ ہو اگرچہ تیز ہو اور دراصل اس میں عجلت کی نفی مقصود ہے جس کا تو ہم زال قلعا سے ہو سکتا ہے۔ عباد الرحمن کی صفت میں ہے اللین یمشون علی الارض ہونا جس میں تکبر اور تجبر کا شائبہ نہ ہو۔

ذریع المشیة، مشیة ایک قدم اور دوسرے قدم کے درمیانی مساحت کو کہتے ہیں کچھ لوگ چلتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہیں یہ نکال وستی یا تکبر کی علامت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس نبی کریم ﷺ بے تکلفی کے ساتھ لمبے ڈگ بھرتے تھے۔ چستی کے ساتھ جسے ہوئے قدم اٹھاتے تھے نیز تکبر سے محفوظ تھے۔ چنانچہ فطری طور پر آپ ﷺ کی رفتار بھی تیز ہوتی تھی۔ ایک صحابی فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ جاتے تو گویا زمین آپ ﷺ کے لئے سمنٹی جاتی تھی بعض لوگ طسی الارض کو آپ ﷺ کا معجزہ قرار دیتے ہیں اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ہر جگہ اسے معجزہ پر بھی حمل نہیں کیا جائیگا۔ مثلاً اسراء اور معراج میں تو اس معجزہ کا ظہور ہوا۔ لیکن عمومی طور پر ویسے ہی آپ ﷺ کے قدم بھی لمبے تھے۔ جس کی وجہ سے رفتار بھی تیز تھی۔ واذا التفت التفت جميعاً اس کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔

دنیا سے صرف نظر: خافض الطرف آپ ﷺ میں یہ کمال درجہ کی حیا موجود تھی کسی سے بات کرتے تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ کرتے نظر اکثر نیچی ہوتی تھی دنیا اور جہانداری کی چیزوں کو کبھی نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ دنیا سے آپ ﷺ کا تعلق ہی نہ تھا اللہ تعالیٰ ہی سے تعلق تھا۔ نبوت کی ذمہ داریوں اور فرائض کے بوجھ نے آپ ﷺ کو اجازت ہی نہ دی کہ دنیا کی طرف میلان بھی پیدا ہو۔ خود فرماتے ہیں کہ مالی وللدنیا ما انا الا کراکب استظل تحت الشجرة دنیا سے مجھے کیا کام میں تو ایک مسافر کی طرح ہوں جو تھوڑی دیر سنانے کے لئے درخت کے نیچے بیٹھ جائے۔

یعنی اصل منزل ہماری آخرت ہے دنیا اور اس کے کاموں میں دل لگانا اولیاء اور انبیاء کا کام نہیں غالباً المدخل میں نظر سے گزرا۔ ایک بزرگ جن کا نام غالباً محمد بن اسلم تھا یا کوئی اور راستے میں جا رہے

تھے ایک کوٹھی پر نظر پڑی تو کھڑے ہو کر پوچھا لمن هذه الدار یہ گھر کس کا ہے پھر خیال آیا کہ یہ کیا کیا۔ آخر تیرا اس سے کیا مطلب۔ اس پر نہ تیری دنیا موقوف ہے نہ آخرت، مجھے اس سوال سے کیا تعلق؟ چنانچہ ایک سال تک اس ایک نگاہ غلط انداز اور لایعنی سوال کا کفارہ ادا کرنے کے لئے روزے رکھے۔

بہر حال نبی کریم ﷺ نے بھی ہمیشہ دنیا سے صرف نظر کر کے آخرت اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ دی فکر آخرت اور مشاہدہ عالم الغیب میں مشغول رہے جس کی وجہ سے نظر عموماً نیچی رہتی تھی نیز اس عمل میں ایک گونہ تواضع اور انکسار بھی تھا جو کہ آپ ﷺ کی فطری خوبی تھی۔ نظره إلى الأرض أطول من نظره إلى السماء یہ ماقبل کے لئے تاکید ہے۔ لیکن ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن سلام کی حدیث نقل فرمائی ہے وہ کہتے ہیں کہ کان ﷺ إذا جلس يتحدث يكسر ان يرفع طرفه إلى السماء۔ نبی کریم ﷺ جب بیٹھے ہوئے باتیں کیا کرتے تھے تو اکثر آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے تھے۔

تطبیق بین الاحادیث: ان دونوں حدیثوں میں تطبیق یوں کی گئی ہے جب آپ ﷺ خاموش بیٹھے ہوتے تھے تو نظر زمین پر ہوتی تھی اور باتیں کرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا کرتے تھے۔ یا یوں کہ آپ ﷺ عام حالت میں نظر نیچی رکھتے تھے کیونکہ دنیا اور اس کے لوازم سے کوئی غرض نہ تھی لیکن وحی کا انتظار ہوتا تھا تو نظر آسمان کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ جلّ نظره الملاحظة، ملاحظة "نظر بالاحاط" یعنی کن انھیں سے دیکھنے کو کہتے ہیں لاحاط آنکھ کے اس گوشہ کو کہتے ہیں جو کان کی طرف ہوتا ہے بعض متصوفین دنیا کی ہر چیز کو یک قلم رد کر دیتے ہیں اور عیسائی راہبوں کے طریقہ پر چلتے ہوئے کبھی کبھار غلط نگاہ بھی دنیا پر ڈالنا گوارا نہیں کرتے جس کی وجہ سے اکثر ان کے متعلقین کے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔ لیکن نبی کریم ﷺ کا عمل اس کے برعکس تھا آپ ﷺ کسی شخص کو کسی چیز میں دلچسپی لیتے ہوئے دیکھتے تو اس کی دلجوئی اور خاطر داری کے لئے آپ ﷺ بھی اس کی دلچسپی میں تھوڑی سی شرکت فرماتے لیکن حریص اور لالچی لوگوں کی طرح انھماک سے احتراز ضرور کرتے بس ایک اوپری سی نظر سے دیکھتے۔ کیونکہ آپ ﷺ کو طمع و حرص کی نظر سے منع کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ولا تمدن عینیک إلى ما متعنا به (آلایہ)

یسوق اصحابہ آپ ﷺ صحابہ کی جماعت کے ساتھ چلتے تو ان کے پیچھے پیچھے چلتے آگے نہ

جاتے لوگوں کے آگے جانے والے کو قائد اور پیچھے جانے والے کو سائق کہتے ہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سفر میں پیشوا اور لیڈر کو قوم کے پیچھے چلنا چاہیے تاکہ آگے جانے والوں کی حالت معلوم ہو سکے۔ ویسے بھی نبی کریم ﷺ صحابہ کی انتہائی نگہداشت فرماتے تھے ہر وقت ان کی کامیابی و سرفروشی کے لئے فکر مند اور ان کے تزکیہ کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ اسی لئے آپ ﷺ صحابہ کے پیچھے چلتے جیسے چرواہے مویشی کو ہانک کر لے جا رہے ہوں نیز اس میں تواضع بھی ہے علاوہ ازیں چونکہ آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے فرشتے بھی چلتے تھے۔ لہذا ان کے لئے جگہ خالی کروانے کے لئے بھی آپ ﷺ صحابہ کو آگے کر لیتے تھے۔

یہذا من لقی بالسلام آپ ﷺ تکبر اور خود پسندی سے نہایت دور رہتے تھے کبھی یہ خیال تک نہیں گزرا کہ لوگ سلوٹ، سلام، استقبال اور خوش آمدید کریں۔ انسانیت کے سب سے عظیم ترین مرتبہ پر فائز ہونے کے باوصف ہر چھوٹے بڑے پر سلام میں سبقت آپ ﷺ کا شیوہ تھا۔ اور یہی انسانیت کی معراج بھی اور گارڈ آف آنر ہے۔ آج کل تو بعض طالب علم بھی ایسے ہیں کہ راستہ جاتے ہوئے اساتذہ سے ملتے ہیں تو اساتذہ کے سلام کا انتظار کرتے ہیں اور پھر اساتذہ کے سلام کا جواب بھی ٹھیک طرح سے نہیں دیتے۔ بہر حال سلام میں نبی کریم ﷺ کے اتباع کی کوشش کرنی چاہیے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ دو ملنے والوں میں جو شخص سلام میں ابتداء کرے وہی اللہ تعالیٰ سے زیادہ قریب تر ہے (۱)۔

فقہائے کرام کا فیصلہ ہے کہ اگرچہ ابتداء بالسلام سنت ہے اور اس کا جواب واجب ہے مگر اس باب میں واجب کی نسبت سنت کو فضیلت حاصل ہے اور ابتداء بالسلام کا ثواب زیادہ ہے اس لئے یہاں یہ توجیہ درست نہیں ہوگی کہ آپ ﷺ امت کو جواب سلام کا موقع دے کر ان سے واجب عمل کروانا چاہتے تھے تاکہ ان کو ثواب زیادہ حاصل ہو۔

(۸) حَدَّثَنَا أَبُو مَوْسَى مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ ثَنَا

شُعْبَةُ عَنْ سَمَاقِ بْنِ حَرْبٍ قَالَ سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ سَمُرَةَ يَقُولُ كَانَ

رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ضَلِيعَ الْفَمِ أَشْكَلَ الْعَيْنِ مِنْهُوسَ الْعَقْبِ قَالَ شُعْبَةُ

قُلْتُ لِسَمَاقٍ مَا ضَلِيعَ الْفَمِ قَالَ عَظِيمُ الْفَمِ قُلْتُ مَا أَشْكَلَ الْعَيْنِ قَالَ

(۱) ترمذی، ابوداؤد، شمائل

طویل شق العین قلت ما منهوس العقب قال قليل لحم العقب (۱)۔

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ فراخ دہن تھے آپ ﷺ کی آنکھوں کی سفیدی میں سرخ ڈورے پڑے ہوئے تھے ایڑی مبارک پر بہت کم گوشت تھا۔ شعبہؓ نے کہا کہ میں نے حضرت سماکؓ سے پوچھا کہ ضلیع الفم کا کیا معنی ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا عظیم الفم۔ (فراخ دہن) یعنی فصاحت۔ پھر میں نے پوچھا کہ اشکل العین کا کیا معنی ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ اس سے مراد فراخ چشم ہے۔ میں نے پھر کہا کہ منهوس العقب کا کیا معنی ہے۔ آپؐ نے کہا کہ کہا گیا ہے لحم العقب۔

عن جابر بن سمرۃ، ابو عبد اللہ جابر عامریؓ حضرت سعد بن ابی وقاص کے بھانجے ہیں کوفہ میں رہا کرتے تھے اور ۴۷ھ میں وفات پائی ان کے والد حضرت سمرہ بن جندبؓ بھی صحابی ہیں۔ اصل میں فرازی ہیں انصار کے حلیف رہے انہوں نے ۵۹ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔

اشکل العین اس کا ایک معنی یعنی طویل شق العین تو سماک سے روایت کر کے مصنف خود کرتا ہے لیکن اکثر علماء کے نزدیک اشکل کے معنی اور ہیں وہ کہتے ہیں کہ آنکھیں دو صفت رکھتی ہیں ایک شکلة جو کہ مدوح ہے دوسری شہلة جو کہ مذموم ہے شکلة کے معنی یہ ہیں کہ آنکھوں کی سفیدی میں سرخ ڈورے ہوں اور آنکھوں میں خمار سا آجاتا ہے۔ اور نشلی آنکھیں خوبصورت دکھائی دیتی ہیں اور شہلة کا مطلب یہ ہے کہ آنکھوں کی سیاہی میں سرخ ڈورے یا نیلا پن ہو یہ صفت آنکھوں کے لئے حسن نہیں بلکہ عیب ہے۔

خلاصہ یہ کہ راجح قول کے مطابق اشکل العین اس شخص کو کہتے ہیں جس کی آنکھوں کی سفیدی میں سرخ ڈورے ہوں۔ حلقہ عراقیؒ نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کی آنکھوں میں شکلة آپ ﷺ کی نبوت کی علامات میں سے ایک علامت تھی۔

منهوس العقب اور ایک اور روایت میں منهوش العقب بھی آیا ہے نہس اور نہش

دونوں گوشت کو ہڈی سے الگ کرنے کیلئے نوچنے کو کہتے ہیں۔ یہاں قلیل اللحم کے معنی میں آیا ہے گویا کہ آپ ﷺ کے ایڑیوں کے گوشت کو نوچا گیا ہو۔ یعنی ایڑیاں گوشت سے خالی تھیں۔ قال شعبہ شعبۃ اپنے شیخ سے بعض مشکل الفاظ کے معانی پوچھتے ہیں طویل شق العین شرح کے قول کے مطابق یہ معنی سماک کے وہم کا نتیجہ ہے اس سے قبل اس کے راجح معنی ہم بیان کر چکے ہیں۔

(۹) حَدَّثَنَا هُنَادِبْنُ السَّرِيِّ ثَنَا عَثْرَبْنُ الْقَاسِمُ عَنْ أَشْعَثَ يَعْنِي ابْنَ سَوَادٍ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فِي لَيْلَةِ اضْحِيَّانَ وَعَلَيْهِ حَلَّةٌ حُمْرَاءُ فَجَعَلَتْ أَنْظُرَ إِلَيْهِ وَإِلَى الْقَمَرِ فَهُوَ عِنْدِي أَحْسَنُ مِنَ الْقَمَرِ (۱)

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ چاند کی چودھویں رات کو نبی کریم ﷺ کو دیکھا آپ ﷺ اس وقت سرخ جوڑا زیب تن کئے ہوئے تھے میں کبھی چاند کو دیکھتا اور کبھی آپ ﷺ کو پس خدا کی قسم نبی کریم ﷺ میری نظر میں چاند سے زیادہ حسین دکھائی دے رہے تھے۔

لَيْلَةُ اضْحِيَّانَ علامہ زمخشری کہتے ہیں کہ اس وزن پر اوصاف بہت کم آتے ہیں یہ لفظ ضحیٰ سے ہے جس کے معنی ہیں روشن ہونا۔ ضحیٰ چاشت کے وقت کو بھی کہتے ہیں جب دن چڑھنے کی وجہ سے ہر چیز روشن ہو جائے قربانی کو بھی اضحیہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ باطن کو منور کرتا ہے۔ لَيْلَةُ اضْحِيَّانَ اس رات کو کہتے ہیں جو ابتداء سے آخر تک روشن ہو سر شام چاند نکل آئے اور صبح تک روشنی پھیلاتا رہے۔ یہ دراصل قمری مہینہ کی تیرہویں اور چودھویں رات ہوتی ہے۔ أَحْسَنُ مِنَ الْقَمَرِ چاند کی روشنی بہت خوبصورت ہوتی ہے اس میں حرارت نہیں ہوتی بلکہ برودت اور سکون و راحت ہوتی ہے۔ دیکھنے سے انسان کو تسکین ملتی ہے سرور حاصل ہوتا ہے وہ تمام صفات نبی کریم ﷺ کے چہرہ انور میں بھی تھیں آپ ﷺ کے چہرے کی نورانیت چاند سے بھی زیادہ تھی اور یہ محض عقیدت کی بناء پر نہیں کہتا بلکہ نفس الامر ہی ایسا تھا اور یہ

(۱) صحیح مسلم ۲/۲۵۷ کتاب الفضائل باب ماجاء فی صفة شعر النبی ﷺ، مسند احمد ۲/۸۸ (مختار)

ترمذی ۱۸۳/۲ کتاب المناقب باب ماجاء فی صفة النبی ﷺ، مسند احمد ۲/۸۸ (مختار)

عقیدہ رکھنا آج بھی جزو ایمان ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے چہرے کا نور بہت زیادہ تھا۔ ابن مبارک اور ابن جوزی کی ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے۔ عن ابن عباسؓ انہم ﷺ لم یکن لہ ظل ولم یقم مع شمس قط الاغلب ضوءہ علی ضوء الشمس لم یقم مع سراج الاغلب ضوءہ علی ضوء السراج۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا سایہ نہیں ہوتا تھا اور وہ جب بھی سورج کے ساتھ کھڑے ہوتے تو سورج کی روشنی پر آپ ﷺ کی روشنی غالب آ جاتی تھی اور جب بھی کسی چراغ کے ساتھ کھڑے ہوتے تھے تو چراغ کی روشنی پر آپ ﷺ کی روشنی غالب آ جاتی تھی۔

(۱۰) حدثنا سفیان بن وکیع ثنا حمید بن عبدالرحمن الرواسی

عن زہیر عن ابی اسحاق قال سأل رجل البراء بن عازب آکان وجہ

رسول اللہ ﷺ مثل السیف قال لابل مثل القمر (۱)۔

ترجمہ: ابوالخلیفہ فرماتے ہیں کہ کسی شخص نے حضرت براءؓ سے پوچھا کہ کیا نبی کریم ﷺ کا چہرہ مبارک تلوار کی طرح تھا تو انہوں نے کہا کہ نہیں بلکہ بدر (چاند) کی طرح تھا۔

تشبیہ میں بھی انتہائے ادب تھا: لابل مثل القمر تلوار اس زمانے میں بیش قیمت ہتھیار تھا اور جب یہ نئی اور صیقل شدہ ہوتی تو اس کی چمک قابل دیدہ ہوتی تھی چونکہ تلوار اس وقت عام حالات میں بھی لوگوں کے پاس ہوتی تھی اس لئے لوگوں کے درمیان چمک دمک میں تشبیہ دینے کے لئے تلوار متعارف تھی لہذا سائل کا مقصد یہ تھا کہ کیا آپ ﷺ کا چہرہ انور چمک میں تلوار کی طرح تھا اور ممکن ہے کہ استطلات کا مفہوم بھی ملحوظ ہو اور یہ مقصد ہو کہ کیا نبی کریم ﷺ کا چہرہ تلوار کی طرح لمبا اور منور تھا۔ حضرات صحابہ کرامؓ کے نزدیک چونکہ ادب کا زیادہ پاس ہوتا تھا نبی کریم ﷺ کا مرتبہ اور شان کو وہ مشابہت اور تشبیہ میں بھی ملحوظ رکھتے اس لئے حضرت براءؓ نے کہہ دیا کہ تلوار کی طرح نہیں بلکہ چاند کی طرح تھا۔

سیف نہیں چاند سے تشبیہ کے وجوہات: اس تشبیہ کو بدلنے میں متعدد وجوہ ہیں ایک وجہ تو یہ ہے کہ مشبہ یہ یعنی تلوار میں تدویر نہیں جو کہ نبی کریم ﷺ کے چہرہ میں تھی بلکہ تلوار لمبی ہوتی ہے لہذا انہوں نے اس تشبیہ کی نفی کی۔

اور دوسری تشبیہ ذکر کی تاکہ مشبہ اور مشبہ بہ میں حتی الامکان من کل الوجوہ قرب ہو تو بہتر ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ تلوار مصنوعی چیز ہے اس کا تور بھی مصنوعی اور وقتی ہوتا ہے یہ ٹوٹتی ہے، استعمال سے کند ہو جاتی ہے اور اسے زنگ بھی لگتا ہے جس سے چمک ختم ہو جاتی ہے جبکہ چاند میں اس قسم کا کوئی عیب نہیں وہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا دائمی منور جسم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نور بخشا ہے۔ انسان کے عمل کا اس میں کوئی دخل نہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے بھی نبی کریم ﷺ کو چراغ سے تشبیہ دی ہے۔ جو کم از کم تلوار سے زیادہ روشن اور چاند کے قریب ہے فرماتے ہیں کہ یٰٰاٰیہا النبیؐ انا ارسلنک شاهداً و مبشراً و نذیراً و داعیاً الی اللہ باذنه و سراجاً منیراً (الاحزاب ۴۵، ۴۶)

اے پیغمبر ﷺ ہم نے تجھ کو گواہ اور خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ نیز اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی طرح دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر۔ اور چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ آپ کے مشکوٰۃ نبوت سے صحابہ کرام رشد و ہدایت اور روشنی کے چراغ اور ماہ و انجم بن کر نکلے اصحابی کما النجوم (الحديث) پھر چراغ اور شمع اندھیروں اور تاریکیوں سے لڑ لڑ کر سپید شمع بن جلتی رہتی ہے۔

ع شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

تو سراجاً منیراً میں علوم و نکات کا ایک مسند پہاڑ ہے۔ نیز دوسرے صحابہ بھی قمری کے ساتھ آپ ﷺ کے چہرے کو تشبیہ دیا کرتے تھے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ تلوار کا محل استعمال جنگ، بدامنی، ہلاکت اور قتل و غارت ہے اگرچہ بعض اوقات تلوار کا استعمال جائز بلکہ موجب ثواب بھی ہوتا ہے لیکن فی نفسہ یہ ایک قبیح امر ہے۔ جبکہ نبی کریم ﷺ بنیادی طور پر رحمۃ للعالمین ہیں امن کا پروانہ لے کر دنیا میں تشریف لائے آپ ﷺ کا مقصد

بعثت اہلاک نہیں احیاء ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے کہ یا ایہا الذین آمنوا استجبوا للہ والرسول إذا دعاکم لما یحییکم (الآیۃ انفال ۲۴) اے ایمان والو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے کہنے کو بجالایا کرو جبکہ رسول تم کو تمہاری زندگی بخش چیز کی طرف بلاتے ہوں۔

وہ زندگی کے ہر میدان میں امت کے لئے پیغام حیات ہیں یوں مشبہ اور مشبہ بہ میں کوئی جوڑ نہیں رہتا جبکہ چاند خالص ایک نعمت ہے خیر ہی خیر ہے شر کا کوئی شائبہ نہیں۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ قمر کے لغوی مفہوم میں غلبہ کا معنی پایا جاتا ہے۔ مقارۃ قمار ایک دوسرے پر غلبہ کیلئے ہوتا ہے۔ اور نبی کریم کو بھی غلبہ دلانے کیلئے اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا۔ فرماتے ہیں ہوالہدیٰ ارسل رسولہ بالہدیٰ و دین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون (توبہ ۳۳) وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے گو مشرکین اس سے ناخوش ہوں۔

اور سیف کے مفہوم میں اہلاک اور فنا کے گھاٹ اتارنا ہے۔ جبکہ اس قسم کی مناسبت تلوار اور نبی کریم ﷺ کی ذات مبارک میں نہیں ہے۔ اس حدیث میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ کلام میں آداب ہر صورت میں ملحوظ رکھنے چاہیں۔

ہارون الرشید کے بیٹوں کا واقعہ: ہارون الرشید کے دو بیٹے امین الرشید اور مامون الرشید تھے۔ دونوں کا تاریخ میں بڑا نام ہے۔ اول الذکر ہارون الرشید کی چینی بیوی زبیدہ خاتون کے بیٹے تھے۔ جبکہ دوسرے ایک کنیز کے بیٹے تھے۔ مامون الرشید کو اللہ تعالیٰ نے ذہانت و فطانت سے نوازا تھا اور بچپن ہی سے اساتذہ اور بڑوں کے آداب کا لحاظ رکھا کرتے تھے۔ اسی لئے وہ ہارون الرشید کو زیادہ پیارے تھے۔ ایک دن زبیدہ خاتون نے شکایت کی کہ ہارون میرے بیٹے پر ایک کنیز کے بیٹے کو ترجیح دیتا ہے جس کی وجہ سے ہارون نے دونوں کا امتحان لے کر زبیدہ پر ظاہر کر دیا کہ مامون الرشید واقعی زیادہ پیارے مستحق ہیں۔ وہ اس طرح کہ اس نے چند مسواک ہاتھ میں لے کر پہلے امین الرشید کو بلایا اور پوچھا کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے اس نے جواب دیا کہ ”مساویک“ جس کے دو معنی ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ یہ لفظ مسواک کی جمع ہے۔ اس لحاظ سے جواب درست تھا لیکن اس کا دوسرا معنی ”تیرے گناہ“ یا ”تیرے عیوب“ بھی بنتا ہے۔ اس لحاظ سے

باپ کو یہ جواب دینا مناسب نہ تھا۔ اس کے بعد ہارون الرشید نے مامون کو بلا کر پوچھا کہ بیٹے میرے ہاتھ میں کیا ہے اس نے قدرے سوچ کر جواب دیا کہ ”ضد محاسنک“ اور سوء ادب کے محض احتمال کی وجہ سے براہ راست مساویک نہ کہا اگرچہ ضد محاسنک بھی مالا مساویک بنتا ہے کیونکہ مساوی محاسن کی ضد ہے۔

(۱۱) حَدَّثَنَا أَبُو دَاوُدَ الْمَصَاحِفِيُّ سَلِيمَانُ بْنُ سَلَمٍ ثَنَا النَّظَرُ بْنُ

شَمِيلٍ عَنْ صَالِحِ بْنِ أَبِي الْأَخْضَرِ عَنْ ابْنِ شَهَابٍ عَنْ أَبِي سَلَمَةَ عَنْ

أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أبيضَ كَأَنَّمَا صَبِغَ مِنْ فِضَّةٍ رَجُلٌ

الشعر (۱)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ اس قدر سفید اور

خوبصورت تھے گویا کہ چاندی سے آپ ﷺ کا بدن مبارک ڈھالا گیا ہو۔ آپ ﷺ

کے بال مبارک ہموار مگر قدرے خم دار تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ: ابو ہریرہؓ، تمام صحابہؓ میں سے زیادہ احادیث روایت کرنے والے ہیں۔ آپؓ کے

نام و نسب میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ جاہلیت کے زمانہ میں آپ کا نام عبد شمس یا عبد عمرو تھا۔

اسلام لانے کے بعد نبی کریم ﷺ نے آپ کا نام تبدیل کر دیا۔ جس کے بارے میں بھی اختلاف ہے لیکن

سب سے مشہور دو نام عبد اللہ اور عبد الرحمن بن صخر الدوسی۔ اس کے علاوہ آپؓ کے نام میں چالیس تک کے

اقوال پائے جاتے ہیں پھر آپؓ اپنی کنیت کی وجہ سے اتنے مشہور ہوئے کہ گویا آپؓ کا کوئی نام ہی نہ

تھا (۲)۔ غزوہ خیبر سے کچھ قبل اسلام لائے اور غزوہ خیبر میں شریک ہوئے۔ پھر نبی کریم ﷺ کی ایسی

مصاحبت اختیار کی۔ جہاں نبی کریم ﷺ جاتے آپؓ بھی ساتھ ہوتے اور ایک ایک لفظ اور ادا کو یاد رکھا

کرتے تھے۔ حصول علم کے شوق میں فائق برداشت کئے۔ آپؓ خود فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ

سے شکایت کی کہ یا رسول اللہ ﷺ آپؓ سے سنی ہوئی باتیں یاد نہیں رہتیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ چادر

(۱) جامع ترمذی ۲/۸۳ کتاب المناقب باب ماجاء فی صفة النبی ﷺ

(۲) آپؓ کے کنیت کی وجہ تسمیہ کے بارے میں الامحافل میں ہے و سبب التسمیۃ ان رسول اللہ ﷺ رأى هرة فی

پھیلاؤ۔ میں نے پھیلائی تو آپ ﷺ نے تھوڑی دیر کے بعد فرمایا کہ اس چادر کو ابھی لپیٹ کر سینے سے لگاؤ تو میں نے چادر کو اپنے سینے سے لگایا تو اس کے بعد میں کوئی بھی روایت نہ بھولا۔

(البدلیۃ والتعلیۃ ۱۰۵/۸، بخاری ۲۲/۱)

صحابہ اور تابعین میں سے آٹھ سو سے زائد لوگ آپ ﷺ سے روایت کرتے ہیں (۱) امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے زمانہ میں روایۃ حدیث میں آپ ﷺ سے زیادہ حافظہ والا کوئی نہیں تھا (۲)۔ بارہ ہزار تسبیحات روزانہ کا معمول تھا۔ مدینہ کے گورنر بھی رہے ۵۷ھ، ۵۸ھ، ۵۹ھ کو اٹھتر سال کی عمر میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

کان رسول اللہ ﷺ ابیض کانما صبیغ من فضة

ایسے سفید اور صاف رنگ کے مالک تھے گویا چاندی کو قالب میں ڈھال کر بنایا گیا ہو۔

صبیغ صاغ بصوغ سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے بنانے اور سانچہ میں ڈھال کر بنانے کو کہتے

ہیں۔ اس حدیث میں آپ ﷺ کے رنگ کی سفیدی اور نورانیت کا ذکر ہے۔

(۱۲) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ أَنَا اللَّيْثُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ أَبِي الزُّبَيْرِ عَنْ

جَاهِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ عَرَضَ عَلَيَّ الْأَنْبِيَاءُ فَإِذَا

مُوسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ ضَرْبُ مِنَ الرِّجَالِ كَأَنَّهُ مِنْ رِجَالِ شَوْءٍ وَرَأَيْتُ

عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَإِذَا أَقْرَبُ مِنْ رَأْيَتُ بِهِ شَبَهَا عُرْوَةَ بْنِ

مَسْعُودٍ وَرَأَيْتُ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَإِذَا أَقْرَبُ مِنْ رَأْيَتُ بِهِ شَبَهَا

صَاحِبَكُمْ يَعْنِي نَفْسَهُ الْكَرِيمَةَ وَرَأَيْتُ جِبْرِيلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَإِذَا أَقْرَبُ

مِنْ رَأْيَتُ بِهِ شَبَهَا دَحِيَّةَ (۳)۔

ترجمہ: حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مجھ پر

(۱) حاکم نیشاپوریؒ نے ۲۸ صحابہ کے اسماء لکھے ہیں جنہوں نے آپ ﷺ سے روایت کی ہے۔ (مختار)

(۲) بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ کان ذکر کیا فقہیہا صاحب لیل و صبح منلوی ص ۵۸ ہو کلنا فی اعلام الموقعین۔

اور صحابہ کرام میں سے سب سے زیادہ روایت کرنے والے ہیں ہووا اکثر الصحابة رواية باجماع۔ (مختار)

(۳) مسند احمد ۳/۲۲۶

تمام انبیاء پیش کئے گئے پس میں نے موسیٰ کو دیکھا تو وہ ذرا دبلے پتلے بدن کے آدمی تھے۔ گویا کہ قبیلہ شموہ کے لوگوں میں سے ہیں۔ اور حضرت عیسیٰ کو دیکھا تو ان سب لوگوں میں جو میری نظر میں ہیں عروہ بن مسعود ان سے زیادہ ملتے جلتے معلوم ہوئے۔ اور حضرت ابراہیمؑ کو دیکھا تو میرے دیکھے ہوئے لوگوں میں سے تمہارا ساتھی یعنی خود میں ان سے زیادہ مشابہ ہوں۔ اور جبرئیلؑ کو دیکھا تو ان کے ساتھ مشابہ ان لوگوں میں سے جو میری نظر میں ہیں وحیہ کلی ہیں۔

جابر بن عبد اللہ: عن جابر بن عبد اللہ، ابو عبد اللہ جابر بن عبد اللہ انصاری سلمیٰ صحابی ہیں ان کے والد حضرت عبد اللہ غزوہ احد میں شہید ہوئے جبکہ حضرت جابرؓ نبی کریم ﷺ کے ساتھ مختلف اقوال کے مطابق سترہ، اٹھارہ، یا انیس غزوات میں شریک ہوئے۔ آخری عمر میں پینائی جاتی رہی مدینہ میں ۳۷ھ کو ۹۴ سال کی عمر میں وفات پائی۔

عرض انبیاء: عرض علی الانبیاء نبی کریم ﷺ پر انبیاء کا پیش ہونا یا تولیۃ الاسراء کے موقع پر بیت المقدس میں ہوا تھا یا معراج کی رات آسمانوں میں جو عرض ہوا تھا وہ مراد ہے۔ اور بعض روایات کے قرینہ سے یہ عرض منامی تھا یعنی خواب میں رسول پاک ﷺ سے ان کی ملاقات کرائی گئی تھی۔ بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ اُرانی اللیلة عند الکعبۃ فی المنام فاذا رجل آدم کاحسن مایری من الرجال تضرب لمتہ بین منکیبہ (الحديث) اور بخاری ہی کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں۔ لیلة امری ہی رایت موسیٰ (الحديث) اس مقام پر تین انبیاء کا ذکر ہے جن میں سے دو تو بنی اسرائیل کے نبی تھے جن کو اہل کتاب خوب جانتے تھے۔ تیسرے حضرت ابراہیمؑ نبی کریم ﷺ کے آباء میں سے ہیں اور تمام مشرکین اور اہل کتاب کے ہاں مشہور و معروف تھے۔

موسیٰ علیہ السلام کا حلیہ: ضرب من الرجال الخ بعض علماء کہتے ہیں کہ ضرب کے معنی ہیں معتدل خفیف اللحم لیس بنا حل ولا مطہم یعنی وہ شخص جو نہ تو زیادہ کمزور ہو نہ زیادہ فرب۔ اور بعض شراح کا خیال ہے کہ ضرب نوع اور قسم کے معنی میں مستعمل ہے۔ گویا کہ موسیٰ خاص قسم کے لوگوں میں

سے تھے۔ بعض اقوام امتیازی شکل و شباہت اور خاص جسمانی ہیئت کے مالک ہوتے ہیں کچھ بڑے کٹے اور مضبوط قسم کے ہوتے ہیں بعض کمزور اور نحیف ہوتے ہیں تو ضروب من الرجال کا معنی یہ ہوگا کہ آپ اس طرح کی ایک خاص قوم کے فرد معلوم ہو رہے تھے۔ اور جب نبی کریم کو صحابہ کرامؓ میں کوئی خاص تشبیہ دینے کیلئے دکھائی نہ دیا تو آپ نے پہلے ایک غیر معین قبیلہ سے اس کی تشبیہ دی پھر اس قبیلہ کا تعین ”کافہ من رجال شنوءہ“ سے کیا۔ شنوءہ یمن کا ایک قبیلہ ہے جس کو عرب جانتے تھے یا یہ قحطانیوں کی ایک شاخ ہے۔ یہ لوگ بھی جسمانی لحاظ سے متوسط اور معتدل تھے۔ نہ زیادہ فربہ اور نہ کمزور۔ چونکہ یہ لوگ ذاتی تعلقی کی بناء پر دوسرے لوگوں کو اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتے تھے۔ غیر قوم میں رشتوں سے پرہیز کرتے تھے چنانچہ ان کے انساب بالکل خالص اور رنگ دلکش تھے اور اسی وجہ سے ان کو شنوءہ کہا گیا کیونکہ شناءۃ کا اصل معنی بُعد اور دوری ہے (۱)۔

لَا إِذَا اقْرَبَ مِنْ رَأَيْتَ بِهِ شَبْهًا عُرْوَةً، اقْرَبَ مُبْتَدَأَہِ اور عُرْوۃ بن مسعود خبر ہے۔
عُرْوۃ بن مسعود: حضرت عُرْوۃ بن مسعود رضی اللہ عنہ صحابی ہیں۔ آپ کے عجیب حالات کتب سوانح میں لکھے ہیں۔ صلح حدیبیہ میں کفار کی طرف سے شریک ہوئے بلکہ ان کی طرف سے سفارت کی۔ ۹ھ کو اسلام لائے اور اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے حضور ﷺ سے اجازت طلب کی۔ اجازت ملنے پر آپ نے جا کر قوم کو توحید کی دعوت دی تو کسی نے تیر مار کر شہید کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیوی اور اخروی وجاہت سے نوازا تھا۔ لیکن حضرت عُرْوۃ کا حلیہ بہر حال ہمارے لئے ایک نامعلوم بات ہے۔ ہاں عیسائیوں نے اندازوں اور تخمینوں سے عیسیٰ کی جو تصاویر بنائی تھیں ان کے مطابق آپ بہت حسین تھے۔ اور ممکن ہے کہ واقعہ ان تصاویر سے کوئی تصویر آپ سے ملتی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ”وجیہ“ کہا ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ جو صاحب وجاہت اور پر وقار شخصیت کے مالک تھے انگریز لوگ کہتے

(۱) ملا علی قاریؒ اور علامہ عبدالرؤف مناویؒ نے اس احتمال کو ذکر کیا ہے اس صورت میں ”کافہ من رجال شنوءہ“ ناقص کا بیان ہوگا۔ کیونکہ پہلے بھی حضرت موسیٰؑ کے بدن کا چھریا ہونا مذکور ہے۔ اور اس قبیلہ کے ساتھ تشبیہ میں بھی مقصود یہی ہے۔ لیکن پھر دونوں نے نیز دیگر شراح نے یہ کہا ہے کہ رائج یہ ہے کہ یہ کلام تاکید نہ ہو بلکہ مستقل تشبیہ ہو اور حضرت موسیٰؑ کی شکل و صورت کی تشبیہ اس قوم سے دینا مقصود ہو جبکہ پہلے موسیٰؑ کے جسمانی اعتدال کا بیان تھا۔ (اصلاح الدین)

ہیں کہ ان کا حلیہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ملتا جلتا تھا ایک دفعہ آپ راو پنڈی جیل میں تھے جیل کا عیسائی داروغہ ہر وقت آپ کو کن انکھیوں سے دیکھا کرتا تھا۔ کسی نے پوچھا کہ تم ہر وقت بخاری کو اس طرح کیوں دیکھتے ہو اس نے کہا کہ حضرت عیسیٰ کے خدو خال، رعب و وقار کی جتنی تفصیلات ہم تک پہنچی ہیں وہ سب شاہ جی صاحب میں دیکھ رہا ہوں۔

حضرت ابراہیمؑ سے مشابہت: صاحبکم یعنی نفسہ الکریمة: یہ راوی نے اپنی طرف سے تفسیر کر دی۔ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ملت ابراہیمی کا مجدد بنایا تھا۔ اور حضرت ابراہیمؑ کی بہت سی ظاہری اور معنوی صفات آپ ﷺ کو عطا کی گئی تھیں۔ جسمانی صورت اور حلیہ میں بھی آپ ﷺ حضرت ابراہیمؑ سے زیادہ مشابہ تھے۔ ایک جگہ آپ فرماتے ہیں کہ انا اشدہ ولد ابراہیم۔ میں ابراہیمؑ کی اولاد میں ان کے ساتھ سب زیادہ مشابہت رکھتا ہوں۔

ابراہیمؑ کا لفظ یا تو اب رحیم یعنی شفیق باپ سے نکلا ہے اور آپ تمام لوگوں کے لئے شفیق باپ ہی تھے۔ تمام ادیان و ملل کو آپ ﷺ سے بے انتہا محبت ہے۔ آپ کو حقیقت میں ایک شفیق باپ کا درجہ دیتے ہیں۔ تمام لوگ آپ کے اتباع کے مدعی ہیں۔ حتیٰ کہ ہندو جیسی مشرک قوم بھی ابراہیمؑ کے اتباع کے مدعی ہیں۔ ان کے بعض الفاظ مثلاً برہمن اور براہمنہ کا رشتہ لفظ ابراہیم سے معلوم ہوتا ہے۔ یہودی اور عیسائی بھی سب آپ کو پیشوا تسلیم کرتے ہیں۔ اس لئے آپ کو اب رحیم کہا گیا ہے۔ قرآن میں ہے و تو رکنا علیہ فی الآخِرین سلام علی ابراہیم۔ (الایۃ)

بعض شراح کے خیال میں ابراہیمؑ ابراہام اور براہم سب عبرانی الفاظ ہیں۔ وراثت جبرئیل یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے عرض کی بات جو ربی تھی اور جبرئیل تو نبی نہیں۔ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ قول قصہ کی ابتداء یعنی ”عرض علی“ پر عطف ہے۔ یا جواب یہ ہے کہ حضرت جبرئیلؑ کا انبیاء کرام کے ساتھ زیادہ تعلق اور بہت اختلاط تھا جس کی وجہ سے ان کا ذکر بھی انبیاء کے ضمن میں کیا گیا جو غیر مناسب نہیں۔ گویا آپ بھی انبیاء کے ایک فرد ہیں جس طرح ابلیس کو جن ہونے کے باوجود کثرت اختلاط کی وجہ سے فرشتوں میں شمار کیا گیا تھا۔ اور اسی وجہ سے فرشتوں کو سجدہ کا حکم اسے بھی شامل تھا۔ لہذا نبی

کریم ﷺ نے حضرت جبرئیلؑ کا ذکر بھی انبیاء کے ساتھ فرمایا۔ ویسے بھی پرٹوکول اور تشریفات کیلئے مستقل شعبے ہوتے ہیں تو عرض انبیاء میں حضرت جبرئیلؑ کی موجودگی مناسب معلوم ہوتی ہے۔

وجہ کلی: دحیہ، حضرت دحیہ بن خلیفہ ذال کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ مشہور کلی صحابی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حسن و جمال اور وجاہت سے نوازا تھا۔ رسول پاک ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شرکت کی۔ مثالی حسن کے مالک تھے۔ شہر میں داخل ہوتے تو عورتیں پردوں سے باہر نکل آتیں۔ نبی کریم ﷺ کی طرف سے سفارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ان کو قیصر روم کے پاس بھی بھیجا تھا۔ شام میں سکونت اختیار کی اور حضرت معاویہؓ کے زمانہ تک زندہ رہے۔

فرشتہ ہونے کی وجہ سے اگرچہ جبرئیلؑ شخصی و معین انسانی شکل نہیں رکھتے تھے لیکن وحی لاتے ہوئے کبھی کبھار انسانی شکل میں آتے تو دحیہ کلی کی شکل میں آتے تھے۔ دنیا کے سفارتی ضوابط میں سے ایک ضابطہ یہ بھی ہے کہ سفارتی تعلقات کیلئے وجیہ، حسین و جمیل، اور باوقار شخص کو منتخب کیا جاتا ہے۔ تاکہ وہاں لوگ اس سے مرعوب اور متاثر ہوں۔ اسی طرح بھیجے والے وفد میں ارکان کے علم اور عقل و کمال کے ساتھ ساتھ قوت و شجاعت اور جسمانی کیفیات سب کا لحاظ ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ باہر کے سفارتی پیغامات کیلئے حضرت دحیہ کو بھیجے۔ کیونکہ آپؐ میں مذکورہ خوبیاں اور صلاحیتیں موجود تھیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کا سفیر بھی دحیہ کی شکل میں آتا تھا۔ اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں رسول اللہ ﷺ کا عظیم مقام ہے اسی وجہ سے وجیہ اور مقبول شخصیت کے حامل انسان کی شکل میں اپنا قاصد آپ ﷺ کے پاس بھیجتے تھے۔

(۱۳) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ سَفِيَّانُ بْنُ وَكَيْعٍ الْمَعْنِيُّ وَاحِدٌ قَالَ اَنَا

يَزِيدُ بْنُ هَارُونَ عَنْ سَعِيدِ الْجَرِيرِيِّ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا الطَّفِيلِ يَقُولُ رَأَيْتُ

رَسُولَ اللَّهِ ﷺ وَ مَا بَقِيَ عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ أَحْمَرًا غَيْرِي قُلْتُ صَفْهُ

لِي قَالَ كَانَ أبيضَ ملبِحًا مقصدا (۱)۔

(۱) صحیح مسلم ۲/۲۶۶ کتاب الفضائل باب صفة شعره ﷺ وصفاته وحلیۃ ابوداؤد ۲/۲۲۰

ترجمہ: ابو طفیلؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا اور آپ ﷺ کو دیکھنے والوں میں اب روئے زمین پر میرے سوا کوئی نہیں رہا۔ (سعید جریری کہتے ہیں) میں نے ان سے کہا کہ نبی کریم ﷺ کا کچھ حلیہ میرے لئے بیان فرمائیں۔ تو انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ سفید رنگت والے حسین اور معتدل جسم والے تھے۔

ابو الطفیل: ابو الطفیل عامر بن واطلہ لیشی کنانیؓ (۱) ہجرت کے سال یا غزوہ احد کے سال پیدا ہوئے۔ اور ۱۰۲ھ اور صحیح قول کے مطابق ۱۱۰ھ کو وفات پائی۔ وما بقی علی وجه الارض احدا راہ غیری۔ اس جملہ میں ایک طرف تو صحابیت پر تنبیہ ہے نیز اس بات کی ترغیب بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے متعلق جو کچھ سننا ہو مجھ سے سیکھو۔ کیونکہ صحابہ کی جماعت سے صرف میں باقی ہوں۔ میرے بعد اور کوئی نہیں ملے گا۔ گویا موقع اور اپنی موجودگی کی اہمیت بیان کرنے کے لئے آپؐ نے یہ بات کہہ دی۔ یہ وہ وقت تھا جب تمام صحابہ وفات پا چکے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپؐ کے بعد صحابہ میں سے کچھ لوگ مثلاً عمران بن حصین وغیرہ باقی تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت ابو الطفیلؓ کو اپنے سوا کسی دوسرے صحابی کے حیات کا علم نہ تھا۔ بعد کے مؤرخین و محققین کو معلوم ہوا ہوگا۔ لیکن چونکہ اس زمانہ میں اطلاعات کا موجودہ نظام نہ تھا۔ اسلئے یا تو آپؐ دوسرے زندہ صحابی کو جانتے نہ تھے یا انکی زندگی سے لاعلم تھے۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ جب تک جوانی کا اثر باقی ہو خود کو بوڑھا ٹاٹا ہر کرنے سے ہر کوئی کتراتا ہے۔ بلکہ عموماً اپنی عمر کم بتا کر جوان دکھائی دینا پسند کرتا ہے۔ لیکن جب بڑھا پاٹاری ہو جاتا ہے تو اپنی عمر آٹھ دس سال زیادہ بتاتا ہے۔ اس سے دراصل دوسروں پر برتری اور اپنی تجربہ کاری کا احساس دلانا مقصود ہوتا ہے۔ حضرت ابو الطفیلؓ صحابی ہونے کے ناطے سے جھوٹ تو نہیں بول سکتے لیکن آپؐ کا یہ بیان حقیقت ہونے کی وجہ سے دوسرے لوگوں پر حقیقتہً آپؐ کی برتری اور لوگوں کے درمیان ممتاز مقام پر دلالت کرتا ہے۔

یہاں پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ حضرت ابو الطفیلؓ کی بات صحیح نہیں اسلئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اس وقت زندہ تھے جنہوں نے نبی کریم ﷺ کو بھی دیکھا تھا اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابو الطفیلؓ نے تصریح کی ہے کہ سطح زمین پر میرے سوا کوئی دوسرا دیکھنے والا موجود نہیں وہ آسمانوں کی بات نہیں کر رہا۔

(۱) امام ابو حنیفہؒ کو حضرت ابو طفیل عامر بن واطلہؓ سے ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ (معارف)

حضرت خضرؑ کی حیات و موت: باقی رہے حضرت خضرؑ جن کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ بھی زندہ ہیں اور بعض نگوینی امور کو سرانجام دینے کیلئے دنیا ہی میں رہتے ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بعض صوفیوں کا مسلک ہے جبکہ اکثر محققین مثلاً علامہ ابن قیمؒ، علامہ ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن حجرؒ وغیرہ جیسے محققین محدثین حیات خضر علیہ السلام سے منکر ہیں۔ علامہ ابو حیانؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ والجمہور علی انه مات یعنی جمہور علماء کے خیال میں وہ زندہ نہیں ہیں۔ اگرچہ صوفیہ کا ایک معتد بہ گروہ کہتا ہے کہ وہ زندہ ہیں اور نگوینی امور میں ان کو بڑا عمل دخل ہے۔ حتیٰ کہ بعض جاہل اور خود غرض پیروں نے تو حد کر دی وہ سڑک پر کھڑے ہو کر ہوائی معانقہ کرتے ہیں اور پوچھنے پر فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے ملاقات ہو گئی۔ خضر علیہ السلام تو ان کے جیب ہی میں رہتے ہیں۔ جہاں بھی ضرورت پڑی تو جھٹ سے کہہ دیا کہ خضرؑ نے اس کام کے بارے میں مجھے یہ ہدایت دے دی۔ بہر حال اگرچہ صوفیائے کرام میں چند قابل اعتماد لوگ بھی حضرت خضرؑ کے حیات کے قائل ہیں۔ لیکن اس مسئلہ میں ان کا قول مستند نہیں ہے۔ حضرت خضرؑ کی وفات کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر وہ زندہ ہی ہیں تو کبھی تو نبی کریم ﷺ کے ساتھ مل چکے ہوتے۔ حالانکہ ذخیرہ احادیث میں اور صحابہ کے سوانح میں کبھی بھی آپ ﷺ اور ان کی ملاقات کا ذکر نہیں ملتا۔ احد اور بدر کے سخت معرکے ہوئے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے تمام سابقہ انبیاء کرام علیہ السلام سے نبی آخر الزمان ﷺ کی نصرت کا عہد بھی لیا تھا۔ فرماتے ہیں کہ واذا اخذ اللہ میثاق النبیین لما آتیکم من کتاب وحکمة ثم جاءکم رسول مصدق لما معکم لتؤمنن بہ و لتنصرنہ (الایۃ آل عمران آیت ۸۱) اور جبکہ اللہ تعالیٰ نے عہد لیا انبیاء سے کہ جو کچھ میں تم کو کتاب اور علم دوں، پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو مصدق ہو، اس کا جو تمہارے پاس ہے۔ تو تم ضرور اس رسول پر اعتقاد بھی لانا اور اس کی مدد بھی کر دو گے۔

تو کیا حضرت خضرؑ نے جو برسوں سے پیر صاحب کی خدمت میں مصروف ہیں، مگر اس عہد کے باوجود نبی کریم ﷺ سے ملاقات بھی گوارا نہیں کی۔ لہذا معلوم ہوا کہ حضرت خضرؑ ابو الطفیلؒ کے اس قول کے وقت موجود نہیں تھے۔ اور اگر بالفرض وہ زندہ بھی ہیں لیکن نبی کریم ﷺ سے نہیں ملے تو بھی حضرت ابو الطفیلؒ کی بات صحیح ہے کیونکہ انہوں نے ”ما بقی احذاراہ غیری“ کہہ دیا ہے۔ اور حضرت خضرؑ تو

نبی کریم ﷺ سے نہیں ملے نہ انہیں دیکھا ہے۔ باقی اسماء الرجال اور جرح و تعدیل کی کتب میں درج ہے کہ ہندوستان میں ایک شخص وہیہ تک موجود تھا جو کہ بابا رتن کے نام سے مشہور تھا اور صحابہ کرام میں سے تھا۔ اسی طرح بعض لوگ معمر مغربی کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ طویل زمانے تک زندہ رہے۔ تو اول تو یہ خرافات ہیں علامہ ابن حجر عسقلانی نے ان باتوں کو افسانہ قرار دیا ہے۔ اور اگر بالخصوص کوئی نبی کریم ﷺ کو دیکھنے والا حضرت ابوالطفیلؓ کے بعد تک موجود رہا ہو تو بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا وجود حضرت ابوالطفیلؓ کو معلوم نہ تھا حتیٰ کہ انکو جھوٹا کہا جائے۔

کان أبيض ملبحاً ملح کا ایک معنی حسین کے ہوتے ہیں ملح سے ہے جو حسن کے معنی میں ہے اور دوسرا معنی ملح کا بیاض مشرب بالحمرة بھی ہے تو گویا آپ کا رنگ سرخ و سفید تھا۔

مقصداً قصد سے ہے (۱) جس کے معنی میاندروی کے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے کہ
وعلى الله قصد السبيل لوگوں پر اللہ کیلئے وسط سبیل کا اتباع واجب ہے۔ (نمل ۹)
یعنی وہ راستہ جو افراط و تفریط سے خالی ہے۔ علم معاشیات کو اقتصادیات اسی لئے کہتے ہیں کہ
اچھے اور حقیقی معاشی نظام میں افراط و تفریط نہیں ہوتا۔ الغرض نبی کریم ﷺ اپنی خلقت اور اخلاق دونوں لحاظ سے بالکل اعتدال پر تھے۔ افراط و تفریط سے میرا تھے۔

(۱۴) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ أَخْبَرَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ الْمُنْذِرِ

الْحِزَامِيُّ أَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ ثَابِتٍ الزَّهْرِيُّ حَدَّثَنِي إِسْمَاعِيلُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ

ابْنِ أَخِي مُوسَى بْنِ عَقْبَةَ عَنْ كَرِيبٍ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ

اللَّهِ ﷺ أَمْلَجَ الشَّيْئَتَيْنِ إِذَا تَكَلَّمَ رَأَى كَأَنَّهُ نَوْرٌ يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ ثَنَائِيهِ (۲)۔

(۱) باب تشبیل سے اسم مفعول ہے بمعنی متوسط کے جہاں سے لے لیا جاتا ہے رجل مقصداً ای متوسط۔ علامہ بخاری نے لکھا ہے والمراد أنه ﷺ متوسط بين الطول والقصر وبين الجسامة والنحافة بل جميع صفاته على غاية من الأمر الوسط فكان لونه وهيكله وشعره وشرعه مثلاً عن طرفي الإفراط والتفريط (المواهب اللدنية ص ۲۹) (مختار)

(۲) مجمع الزوائد ۸/۲۹۸ کتاب علامات النبوة باب فی صفته ﷺ معجم الاوسط الطبرانی رقم

الحديث ۷۷۱، معجم الكبير للطبرانی رقم الحديث ۱۲۱۸۱

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اگلے دانت مبارک کچھ کشادہ تھے جب باتیں کرتے تو ایک نور سا ظاہر ہوتا جو دانتوں کے درمیان سے نکلتا تھا۔

حضرت ابن عباسؓ: نبی کریم ﷺ کے چچا زاد بھائی اور ام المؤمنین حضرت میمونہؓ کے بھانجے حبر الامۃ، ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ فضل و کرم سخاوت اور علم کی وجہ سے تمام صحابہ میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے آپ کے حق میں علم و حکمت اور فقہ و تادیل کی دعا فرمائی تھی۔ حضرت مسروقؓ فرماتے ہیں کہ جب ابن عباسؓ پر میری نظر پڑتی تو وہ لوگوں میں حسین ترین شخصیت دکھائی دیتے تھے۔ اور جب وہ کوئی بات کرتے تو میں کہتا کہ وہ فصیح ترین شخص ہیں۔ اور جب حدیث بیان کرتے تو میرے خیال میں وہ سب سے زیادہ علم والے دکھائی دیتے۔

ذہانت اور وسیع علم کی وجہ سے حضرت عمرؓ آپ کو اکابر صحابہ کے ساتھ بٹھاتے تھے اور مشوروں میں آپ کے مشورہ کو وقعت دیتے تھے۔ حالانکہ آپ کی عمر نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت صرف تیرہ سال تھی آخر میں نابینا ہو گئے اور طائف میں ۶۸ھ یا ۷۸ھ کو وفات پائی۔

الفلج الثبتین (۱)، ثنیتین، ثنیۃ کا ثنیۃ ہے سامنے کے دو دانتوں کو کہا جاتا ہے اور الفلج اس شخص کو کہتے ہیں جس کے سامنے کے دانتوں میں تھوڑی کشادگی ہو۔ اس کی ضد اللص ہے جو کہ ملے ہوئے دانتوں والے کو کہتے ہیں جبکہ فرق سامنے کے صرف دو دانتوں کی کشادگی کے ساتھ مختص ہے۔ رائی کالنور آپ ﷺ کے دانت مبارک ایسے چمکیے اور سفید تھے کہ بات کرتے ہوئے جب کبھی دانت دکھائی دیتے تھے تو ایسا نور نکلتا ہوا دکھائی دیتا تھا گویا بادلوں کے درمیان بجلی چمک رہی ہے۔

(۱) علامہ بخاریؒ نے لکھا ہے ثنیۃ ثنیۃ بنشد بدالیاء وفي نسخ الثنايا بصيغة الجمع قال الطیبي الفلج

هنا الفرق بقريئة اضافته إلى الثنايا إذا الفلج فرجة بين الثنايا والرابعيات والفرق فرجة بين الثنايا

اهـ (المواهب اللدنیة ص ۲۹) (مختار)

۲۔ باب ما جاء في خاتم النبوة (۱)

آنحضرت ﷺ کی مہر نبوت کا بیان

یہاں ایک بڑے جسمانی نشانی کا بیان ہے جو کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت اور ختم نبوت کی دلیل ہے۔ لفظ خاتم اور اس کا معنی: خاتم بفتح التاء اور خاتم بکسر التاء دونوں طرح مستعمل ہے لیکن بالکسر راجح ہے اور دونوں بمعنی مایختصم یہ یعنی آلہ ختم مہر لگانے کا آلہ جسے طالع بھی کہتے ہیں۔ اور یہ دونوں عاقبہ کل شئی یعنی ہر چیز کے آخر کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ مہر بھی عموماً خط یا دستاویز کے آخر میں لگتا ہے۔ اس غرض سے کہ اب اس میں کمی بیشی نہ ہو سکے۔ نبی کریم ﷺ کا مہر انگوٹھی کی شکل میں تھا۔ جس کی تفصیل کے لیے الگ باب آرہا ہے۔ یہاں اول الذکر معنی لیا جائے گا لیکن یہاں کوئی طالع مراد نہیں بلکہ اس کا اثر مراد ہے۔ یعنی وہ نشانی جو مہر لگانے کے بعد باقی رہ جاتی ہے کیونکہ اس مقام پر مقصود وہ ابھرا ہوا گوشت ہے۔ جو مہر لگانے سے پیدا ہوا تھا۔ چونکہ یہ مہر تمام کتب سماویہ میں نبی کریم ﷺ کی نبوت اور ختم نبوت کی تصدیق کی علامت کے طور پر مذکور ہے۔ اس لیے یہاں اس کی اضافت نبوت کی طرف کی گئی ہے (۲) اور قرآن کریم میں خاتم کی اضافت انبیاء کی طرف کی گئی ہے (۳)۔ جو عاقبت اور آخر کے معنی میں مستعمل ہے یعنی وہ نبی جو سب سے آخر میں آئے۔ وہاں جھوٹے نبیوں نے دجل و تلحیس کی متعدد تاویلات بھی کی ہیں۔ مثلاً مرزا غلام احمد قادیانی نے اس کے معنی میں تحریف کر کے کہا ہے کہ یہاں خاتم سے مہر مراد ہے اور نبی کریم ﷺ آنے والے انبیاء کے لیے مہر یعنی صدق ہیں۔ تو آپ ﷺ کے بعد جو نبی آئے گا اس کی نبوت کی تصدیق کے لیے آپ ﷺ مہر کا کام دیتے ہیں اور میری نبوت کی تصدیق نبی کریم ﷺ کر چکے ہیں۔ لیکن یہ سراسر افتراء اور تلحیس ہے کیونکہ خود نبی کریم ﷺ سے اس جملے کی توضیح

(۱) بفتح التاء كالتألف والطابع وبالكسر لغة (مختار)

(۲) مہر نبوت آنحضرت ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔ آپ ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے نبی کو یہ خصوصیت نہیں دی گئی تھی (شرح المشائل للمنادی علی حاشی جمع الوسائل) (مختار)

(۳) ما كان محمد اباً احداً من رجالكم ولكن رسول الله وخاتم النبيين (الاحزاب ۴۰) (اصلاح الدين)

مختلف طریقوں سے منقول ہے۔ آپ ﷺ نے لابیسی بعدی دو ٹوک الفاظ فرمائے ہیں۔ لہذا خاتم کے معنی مہر نہیں عاقبہ اور آخر ہوگا اور اگر مہر کا معنی بھی لیں تو بھی اس کا مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ مہر آخر میں اس لئے لگتی ہے کہ اس میں کمی و بیشی نہ ہو سکے۔ اور نبی کریم ﷺ اس لحاظ سے سلسلہ انبیاء کے لیے مہر ہیں یعنی آپ ﷺ پر یہ سلسلہ ایسے منقطع ہو گیا کہ اب اس میں کمی و بیشی کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ مجموعی لحاظ سے اس باب میں جو احادیث مذکور ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہر نبوت کندھوں کے درمیان میں نمایاں قسم کی چیز تھی۔

(۱) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ أَنَا حَاتِمُ بْنُ اسْمَعِيلَ عَنِ الْجَعْدِ ابْنِ

عبد الرحمن قال سمعت السائب بن يزيد يقول ذهب بي خالتي

فقلت يا رسول الله ان ابن اختي و جع فمسح رسول الله ﷺ راسي

و دعالي بالبركة و توضا فشربت من وضوئه و لمت خلف ظهري

ف نظرت الى الخاتم الذي بين كفيه فاذا هو مثل زر الحجلة (۱)۔

ترجمہ: حضرت سائب بن یزید فرماتے ہیں کہ میری خالہ مجھ کو نبی کریم ﷺ کے

پاس لے گئیں اور عرض کیا کہ میرا بھانجا بیمار ہے نبی کریم ﷺ نے میرے سر پر ہاتھ

پھیرا اور میرے لیے برکت کی دعا فرمائی اور نبی کریم ﷺ نے وضو فرمایا تو میں نے

آپ ﷺ کے وضو کا پانی پیا۔ میں نبی کریم ﷺ کے پس پشت کھڑا ہوا تو میں نے مہر

نبوت دیکھی جو مسہری کی گھنڈیوں جیسی تھی۔

سائب بن یزید: یہ مشہور صحابی ہیں ابو یزید کندی کنیت تھے۔ ۲ھ میں پیدا ہوئے۔ حجتہ الوداع کے موقع پر

اپنے والد کے ہمراہ حج کو بھی آئے تھے۔ ۸۰ھ یا ۸۶ھ اور بعض روایات کے مطابق ۹۱ھ میں وفات پائی۔

علامہ بیہقیؒ نے ۹۴ سال عمر لکھی ہے۔ لیکن یہ محل نظر ہے کیونکہ خود انہوں نے تاریخ وفات ۸۹ھ بتائی ہے۔

ذہبت ہی خالتي الخ بیماری کی وجہ سے میری خالہ مجھے نبی کریم ﷺ کے پاس لے گئیں اس

(۱) صحیح بخاری ۵۰۱/۱ کتاب المناقب باب خاتم النبوة، صحیح مسلم ۲۵۹/۲ کتاب

الفضائل باب البات خاتم النبوة (مختار)

عمل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بزرگوں اور نیک بندوں کے پاس تبرک کے لیے جانے میں کوئی حرج نہیں۔ اس عورت کا نام تو معلوم نہیں البتہ علامہ جزئی نے اس کی دوسری بہن کا نام نمر بنت قاسط اور ملا علی قاری نے حضرت سائبؓ کی والدہ کا نام علیہ بنت شریح لکھا ہے۔

وَجَع (۱): یہ لفظ فتح واؤ اور کسرہ جیم کے ساتھ وجع سے صفت ہے اس کے معنی ہیں درد مند ہونا۔ یعنی ذوو وجع درد والا ہے۔ مذکورہ صحابیؓ کا یہ درد پاؤں میں ہو رہا تھا۔

بعض روایات میں وقع بھی آیا ہے یعنی إِنَّ ابْنَ اَخْتِي وَقَعَ (۲) کے الفاظ آئے ہیں۔ لغت یہ سخت اور پتھریلی زمین پر چلنے کی وجہ سے پاؤں کے درد کو بھی کہتے ہیں اور اصل میں یہ پولیو کی طرح ایک خاص بیماری ہے۔ جو پاؤں میں درد اور لنگڑے پن کا سبب بنتی ہے۔

نبی کریم ﷺ کی مسیحائی شان: فمسح داسی (۳) یہاں یہ اشکال ہے کہ درد پاؤں میں ہوتا تھا اور نبی کریم ﷺ نے سر پر ہاتھ پھیرا؟ لیکن اس کا جواب آسان ہے۔ وہ یوں کہ نبی کریم ﷺ نے شفاء ہاتھ نہیں پھیرا تھا بلکہ محض شفقت کی بناء پر ہاتھ پھیرا تھا۔ ہاں ساتھ ساتھ کچھ دم وغیرہ بھی کیا ہوگا۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ پاؤں کے ساتھ ساتھ سر میں بھی شکایت ہو۔ اور نبی کریم ﷺ نے پاؤں کی نسبت سر کے علاج کو اہمیت دے کر ہاتھ پھیرا۔ اور بعض شراح کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے پاؤں کے علاج کے طور پر ہی سر پر ہاتھ پھیرا تھا اور نبی کریم ﷺ کا عظیم مسیحائی مقام ہے۔ کہ درد پاؤں میں ہے اور سر پر ہاتھ پھیرنے سے وہ درد جاتا رہا۔ آپ کو یہ اعجازی تاثیر بہت وافر مقدار میں ملی تھی۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام برص کے مریضوں اور اندھوں کا علاج کر سکتے تھے تو نبی کریم ﷺ تمام امراض کا علاج ایک توجہ سے کر سکتے تھے جس کے متعدد واقعات کتب احادیث میں منقول ہیں۔ مثلاً غزوہ خیبر کے موقع پر حضرت علیؓ کی دکھتی آنکھ

(۱) ذوو وجع وهو يقع على كل مرض (مواهب اللدنیہ ص ۳۵) (مختار)

(۲) وقع گر جانے کو کہا جاتا ہے الاحفافات میں ہے الوقع وجع القدمین، مطلب یہ ہے میرا ہانچہ گر گیا ہے جس کی وجہ سے اس کے پاؤں میں تکلیف ہے۔ مگر زیادہ مشہور وجع ہے۔ (مختار)

(۳) دم کرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ جس جگہ تکلیف ہو اسی جگہ ہاتھ پھیرے کما فی المواہب یوخلد منه ان یسن للراقی ان یمسح محل الوجع من المریض (مختار)

آپ ﷺ کی اعجازی تاثیر سے فوراً ٹھیک ہو گئی۔ غار ثور میں ہجرت کے موقع پر حضرت ابو بکر صدیق کو سانپ نے ڈس لیا۔ آپ ﷺ نے اس پر لعاب لگایا تو حضرت ابو بکر صدیق ٹھیک ہو گئے۔ یہودی سردار ابورافع عبداللہ بن ابی الحقیق کے قتل کے بعد حضرت عبداللہ بن عتیک واپسی پر سیڑھی سے اترتے گر پڑے اور پٹلی ٹوٹ گئی حضور اقدس ﷺ کے پاس پہنچ کر تفصیل بتلا دی آپ ﷺ نے فرمایا پاؤں پھیلاؤ۔ حضور اقدس ﷺ نے اس پر ہاتھ پھیرا تکلیف ایسی زائل ہو گئی کہ کبھی تھی ہی نہیں۔ بہر حال آپ ﷺ کے صرف ہاتھ لگانے سے بہت سی مہلک بیماریاں فوراً ختم ہو چکی ہیں۔ حضرت سائبؓ کے سر پر جہاں ہاتھ لگا تھا روایت میں ہے کہ وہاں کے بال موت کے وقت تک سیاہ رہے۔

برکت: ودعالی بالبرکۃ الخ امام راغبؒ کے ہاں برکت کے معنی ہیں وقوع الخیر الالہی فی الشی الخ یعنی کسی چیز میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر کا وقوع۔ یہ عمر، صحت، علم، مال، رزق وغیرہ میں واقع ہوتی ہے۔ اوقات میں بھی برکت ہوتی ہے جس کا معنی یہ ہے کہ تھوڑے سے وقت میں اللہ تعالیٰ بہت بڑا کام انسان سے کرائے۔ ہمارے بزرگوں نے بہت تھوڑے عرصہ میں علوم و فنون کے ذخائر چھوڑے ہیں۔ حضرت تھانویؒ کی ہزار کے لگ بھگ تصانیف ہیں۔ علامہ ابن تیمیہؒ کی تصانیف اتنی ہیں کہ روزانہ سینکڑوں صفحات اوسط نکلتے ہیں۔ امام سیوطیؒ کی تصانیف ہزار سے اوپر ہیں۔ مولانا عبدالحی لکھنویؒ سے تھوڑی عمر میں اللہ تعالیٰ نے تصنیف و تالیف کا عظیم کام لیا۔ جیہ الاسلام مولانا قاسم نانوتویؒ سے مختصر عمر کی میں کتنے بڑے کام لئے۔ یہ تھی برکت۔ حضرت سائبؓ کو بھی اللہ تعالیٰ نے طویل عمر کے ساتھ صحت و عافیت بھی بخشی تھی۔ اخیر عمر میں فرمایا کرتے تھے ”انّی مامتعت بسمعی و بصری الا ببرکۃ دعاء النبی ﷺ“

فوضاً (۱): یہ وضو، یا تو نماز کے لیے فرمایا یا قصد حضرت سائبؓ کو وضوء کا پانی پلانے کیلئے آپ نے وضو کیا۔ خربت من وضوئہ واؤ کے فتح کے ساتھ ہے جو اس پانی کو کہتے ہیں جو وضو کرنے کیلئے رکھا گیا ہو۔ اور بعض کہتے ہیں کہ وضو کرنے کے بعد جو فاضل پانی بچ جاتا ہے اور بعض کے خیال میں (۱) وضو بضم الواو غسل الاعضاء کو کہا جاتا ہے جو شرعی طریقہ سے ہو، وضو بفتح الواو اس پانی کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ وضوء کیا جاتا ہے۔ (بخاری)

وہ مستعمل پانی جس سے وضو کیا جائے وضو کہلاتا ہے۔ یہاں پر اول معنی درست دکھائی نہیں دیتا کیونکہ نبی کریم ﷺ کے وضو کیلئے رکھے ہوئے پانی سے پینا سوء ادب ہے۔ دوسرا معنی محتمل ہے لیکن تیسرا معنی راجح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وضو کیا اور اعضاء مبارکہ سے جو پانی لگا تو اس کو پیا جس میں یقیناً شفاء کا اثر ہوگا۔

ماء مستعمل کا حکم: رہا یہ مسئلہ کہ مستعمل پانی پاک ہے یا نجس تو یہ فقہ کا مسئلہ ہے اور فقہ کی کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے یا ترمذی کے ابواب الطہارات اس کے بیان کیلئے مناسب جگہ ہے۔ یہاں صرف اتنا معلوم ہونا چاہیے کہ امام ابو حنیفہؒ سے معروف قول کے مطابق یہ نجاست غلیظہ کے ضمن میں آتا ہے اور اس کا منشاء یہ بتایا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کو اللہ تعالیٰ نے وافر مقدار میں فراست ایمانی سے نوازا تھا۔ آپ کسی کے وضو کا پانی دیکھ کر بتا دیتے کہ اس شخص نے فلاں گناہ کیا ہے جو کہ وضو کی وجہ سے دھل کر پانی میں شامل ہو گیا۔ اگر وضو کے مستعمل پانی میں کبیرہ گناہوں کی نجاست شامل ہوتی تو آپ نے حکم دیا کہ یہ نجس ہے اور اگر گناہ صغیرہ کا احساس ہو جاتا تو نجاست خفیفہ کہہ دیتے۔ یہ تو مزاج کی لطافت کی بات ہے۔ بعض لوگوں کو بول و دراز سے بھی بدبو کا احساس نہیں ہوتا اور بعض لوگ بہت دور سے اس کا احساس کر لیتے ہیں۔ اسی طرح بعض اکابر محض سوگندہ کر بتا دیتے تھے کہ یہ کھانا حلال ہے اور یہ حرام کمائی سے خریدا ہوا ہے۔ بہر حال حضرت امام ابو حنیفہؒ کے ہاں ایک قول میں وضو کا مستعمل پانی نجس ہے۔ روایت ہے کہ آپ نے اپنے اس فتوے سے بعد میں رجوع بھی کیا ہے۔ اس لئے احناف کا مسلک یہ ہے کہ یہ پانی طاہر ہے مطہر نہیں (۱)۔

(۱) شرح دقلیہ میں ہے: الاختلاف الثالث فی حکمہ فعند ابی حنیفہ ہو نجس نجاسة غلیظة وعند ابی یوسف ہو نجس نجاسة خفیفة وعند محمد طاهر طاهر غیر طہور (۸۹/۱) وروایۃ عن ابی حنیفہ (الہدایۃ ۱/۱۶۳) وعلیہ الفتویٰ کما فی البناۃ وهو الاقویٰ من حیث الدلیل کما بسطناہ فی المعایۃ (عمدة الرعاۃ ۸۹/۱) اور اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے علامہ عبدالحی لکھنویؒ لکھتے ہیں: ومن لطائف الاقوال ما فی المیزان لعبد الوہاب الشعرانی قال سمعتُ سیدی علیاً الخواص قال مدارک الامام ابی حنیفہ دقیقة بطلع علیہا الاہل الکشف من اکابر الاولیاء وکان ابو حنیفہ اذا رای ماء المیضۃ یعرف سائر الذنوب التی فیہ فلذا جعل ماء الطہارة اذا تطہر بہ المکلف لہ ثلاثة احوال احدها انہ کالنجاسة الغلیظة لاحتمال ان یکون المکلف ارتکب کبیرة والثانی انہ کالنجاسة المتوسطة لاحتمال ان یکون ارتکب صغیرة والثالث طاهر فی نفسه غیر مطہر لغيرہ لاحتمال ان یکون ارتکب مکروہاً او خلاف الاولی (عمدة الرعاۃ ۸۹/۱) (مختار)

امام شافعیؒ اگر اس حدیث سے مستعمل پانی کی طہارت پر استدلال کریں تو یہ درست نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ اگر یہاں مستعمل پانی مراد بھی ہو پھر بھی یہ تو نبی کریم ﷺ کے وضو کا پانی تھا اور آپ گناہوں سے پاک تھے تو وضو کی وجہ سے نجاست کا خلط پانی میں متصور نہیں ہے جبکہ دوسرے لوگوں کے وضو کا مستعمل پانی اس پانی پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت سائبؓ نے استشفاء کی نیت سے وہ پانی پی لیا تھا جو نبی کریم ﷺ نے وضو میں مستعمل کیا تھا اور تداوی کیلئے استعمال عذر بھی ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ پہلے سے با وضو ہوں اور اس موقع پر محض وضو کی تجدید کی ہو ایسے وضو میں مستعمل پانی امام ابوحنیفہؒ کے ہاں بھی نجس نہیں ہے۔ بعض حضرات نے نسخ کا احتمال بھی لیا ہے مگر درحقیقت تاریخ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے یہ احتمال راجح نہیں ہے۔

حضرت سائب کا طفلانہ تحس: فقمت خلف ظہرہ میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے کھڑا ہو گیا اس وقت نبی کریم ﷺ وضو فرما رہے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ صحابی محض اتفاقاً آپ کے پیچھے آئے ہوں اور ہو سکتا ہے کہ چونکہ اس وقت حضرت سائب بن یزید چھوٹے تھے اور بچوں میں کرید اور تحس کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ لہذا ممکن ہے کہ ختم نبوت کے بارے میں سننے کے بعد خود مشاہدہ کرنے کی تمنا ہو۔ اور قصداً آپ ﷺ کے پیچھے آ کھڑے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ مہر نبوت دیکھنے کی نیت سے نہیں بلکہ ادباً پشت کی جانب کھڑے ہونے کو ترجیح دی ہو۔ نبی کریم ﷺ کا ہر قیص استعمال کرتے تھے مگر عموماً رداء یعنی چادر استعمال فرماتے تھے اور چادر کبھی کبھی بدن سے سرک کر ہٹ جاتی ہے۔ خصوصاً وضو اور دوسرے کام کرتے ہوئے چادر کے سرکنے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے تو شاید یہ صحابی بھی اس انتظار میں کھڑے ہوں کہ مہر نبوت نظر آنے کا موقع ملے گا۔

مہر نبوت کا محل: فنظرت إلی الخاتم الذی بین کتفہ۔ مہر نبوت آپ ﷺ کی پیٹھ پر کس جگہ واقع تھی راوی کے قول الذی بین کتفہ سے معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) کاندھوں کے درمیان میں واقع تھی۔

(۲) دوسرا قول اس بارے میں یہ ہے کہ عند کتفہ الایمن یعنی دائیں کندھے کے قریب تھی۔

(۳) جبکہ ایک قول یہ ہے کہ بائیں کندھے کے قریب محاذات قلب میں تھی۔

جیسا کہ علامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ اخبار اس پر متفق ہیں کہ یہ بانیں کندھے کے نزدیک تھیں اور چونکہ نبوت کی صداقت و حقانیت کیلئے مہر بڑی علامت تھی اسلئے قلب سے اسکا قرعی تعلق بھی تھا۔ مشدک حاکم نے ایک روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام کو نبوت کی ایک علامت بخشی تھی لیکن وہ انکے دائیں ہاتھ میں ہوتی تھی جبکہ نبی کریم ﷺ کو خصوصی طور پر یہ علامت پیٹھ پر کندھوں کے درمیان میں عطا کی گئی تھی۔

ظہور مہر نبوت کا زمانہ: یہ مہر کب سے لگی تھی اس کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔

(۱) ایک قول یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ولادت کے ساتھ ساتھ مہر نبوت کا ظہور بھی ہوا تھا۔

(۲) دوسرا قول یہ کہ ولادت کے بعد یہ علامت ظاہر ہوئی۔

(۳) ایک روایت کے مطابق شق صدر کا مجزرہ ہوا تو یہ مہر بھی ظاہر ہوئی۔

علامہ ابن حجرؒ اور قاضی عیاضؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے لیکن امام نوویؒ وغیرہ نے اس کو غلط قرار دیا ہے (۱)۔

(۴) جبکہ بعض کے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ عمر کے چالیسویں سال جب آپ کی بخت ہو

گئی تب یہ علامت ظاہر ہو گئی کیونکہ یہ نبوت کی علامت ہے اور اس سے پہلے نبوت کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ تو ظہور علامت کی ضرورت نہ تھی اس کی تائید میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بعض روایات کے مطابق نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد یہ علامت غائب ہو گئی (۲) لیکن محققین کے قول کے مطابق غائب ہونے کی بات درست نہیں جیسے کہ علامہ مناویؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔

(۱) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے: واختلفوا هل ولده ارضه او وضع بعد ولادته فعند ابی نعیم انه لما ولد اخرج الملك صرة من حبر ابيض فيها خاتم فضرب على كفه كالبيضة وفي حديث البزار وغيره انه قيل يا رسول الله ﷺ كيف علمت انك نبی وبم علمت حتى استيقنت قال اتاني النان وفي رواية ملكان وانا بطحاء مكة فقال احدهما لصاحبه اغسل بطنه غسل الاناء واغسل قلبه غسل الملاء ثم قال احدهما لصاحبه خط بطنه فخاط بطني وجعل الخاتم بين كفتي كما هو الآن ووليا عني وكاني ارى الامر معاينة (جمع الوسائل ۱/۷۱) اور بعض کی رائے یہ ہے کہ یہ پیدائشی تھی۔ (مختار)

(۲) وفات کے بعد مہر ختم ہوا: اور جب آنحضرت ﷺ کا انتقال ہوا تو وہ مہر ختم ہو گئی۔ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے: روى البيهقي في الدلائل عن شيوخه انهم قالوا لما شك الناس في موت رسول الله ﷺ وضعت اسماء بنت عميس يدها بين كتفيه فقالت توفي رسول الله ﷺ فلو رفع الخاتم من بين كتفيه (جمع الوسائل ۱/۷۰) (مختار)

زر الحجلة: فاذا هو مثل زر الحجلة حجلہ سے حجلہ عروسی مراد ہے عموماً خاص مہمان یا اہم شخصیت کیلئے مجلس میں ممتاز اور الگ جگہ بنائی جاتی ہے جسے منصفہ بھی کہتے ہیں۔ جیسا کہ دارالحدیث میں شیخ الحدیث کیلئے بنا ہوا ہمار چھوٹا سا تخت ہے جسے ہم مسند کہتے ہیں اسی طرح دلہا یا دلہن کو بھی نمایاں جگہ پر بٹھایا جاتا ہے جہاں چھوٹی سی چھت لگی ہوتی ہے چادروں اور پھولوں سے اس جگہ کی تزئین ہوتی ہے یہ ایک بیش قیمت تحت ہوتا ہے جسے چھپر کھٹ اور مسہری بھی کہتے ہیں۔ عربی میں اسے حجلۃ العروس کہا جاتا ہے۔

حجلہ یا چھپر کھٹ پر بیش قیمت پردے اور منقش چادریں ہوتی ہیں ان پر کپڑے وغیرہ سے بنے ہوئے گول گول بن ہوتے ہیں انہی کو ”زر“ کہتے ہیں اردو میں اسے گھنڈی کہتے ہیں جس کی جمع ازار ہے۔ مختصر المعانی میں آپ نے یہ شعر پڑھا ہوگا لا تعجبوا من بلی غلائم قد زر ازارہ علی القمر ترجمہ: اس محبوب کے بدن سے لگے ہوئے کپڑے کی بوسیدگی سے تعجب نہ کرو کیونکہ اس کی گھنڈیاں تو چاند کے اوپر باندمی گئی ہیں (اور چاند ریشمی کپڑے کو جلدی بوسیدہ کر دیتا ہے)

ایک اور روایت میں مثل رز الحجلة کے الفاظ منقول ہیں (۱) یعنی راء مقدم ہے۔

اس صورت میں حجلہ سے مراد کوتر کی جسامت کا ایک خاص قسم کا پرندہ ہے اس کی چونچ سرخ ہوتی ہے جسے چکور اور کبک کہتے ہیں۔ عربی میں دجاج البر کے نام سے مشہور ہے۔ رز اس کے اٹھنے کو کہتے ہیں اصل میں یہ لفظ رزت الجرادة سے ہے ٹڈی جب اٹھ دیتی ہے تو وہ اپنی دم زمین میں دھنسا دیتی ہے اور انجکشن کی طرح ایک بار میں بہت زیادہ اٹھ دے دیتی ہے۔ ٹڈی کے اس عمل کیلئے رزت الجرادة بولا جاتا ہے۔ بہر حال یہاں تشبیہ سے مراد یہ ہے کہ حجم میں مہر نبوت رز الحجلة یعنی چکور کے

(۱) عن سائب بن يزيد قال ذهبت بي خالتي إلى رسول الله ﷺ فقالت يا رسول الله إن ابن اختي وقع فمسح رأسي ودعالي بالبركة وتوضأ فشربت من وضوئه ثم قمت خلف ظهره فنظرت إلى خاتم بين كتفيه مثل زر الحجلة قال ابن عبد الله الحجلة من حجل الفرس الذي بين عيبيه. وقال ابراهيم بن حمزة مثل رز الحجلة قال ابو عبد الله الصحيح الرء قبل الزاء (بخاری ج ۲ ص

اٹھے جتنا تھا (۱)۔ مہر کی سمت اور مقدار کی تعبیر کسی نے کم اور کسی نے زیادہ کر دی کہ ہر ایک کا ایک اندازہ اور تخمینہ ہوتا ہے اس لئے روایات متعارض نہیں۔ تفصیل آرہی ہے۔

(۲) حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ يَعْقُوبَ الطَّالِقَانِيُّ أَخْبَرَنَا أَيُّوبُ بْنُ جَابِرٍ عَنْ

سَمَّاكِ بْنِ حَرْبٍ عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ رَأَيْتُ الْخَاتَمَ بَيْنَ كَتِفَيْ

رَسُولِ اللَّهِ ﷺ غَدَةً حُمْرَاءَ مِثْلَ بَيْضَةِ الْحَمَامَةِ (۲)۔

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ

کی مہر نبوت کو آپ ﷺ کے دونوں کندھوں کے درمیان دیکھا جو سرخ رسولی جیسے تھی

اور مقدار میں کبوتر کے اٹھے جتنی تھی۔

مہر نبوت کا رنگ: غدة حمراء، الغدة القطعة المرتفعة من اللحم في الجسم یعنی بدن میں

گوشت کے ابھرے ہوئے ٹکڑے کو غده کہتے ہیں اردو میں اسے غدود کہا جاتا ہے اس کی جمع غدود آتی ہے۔

یہاں پر مہر نبوت کا رنگ سرخ بتایا گیا ہے اس کے رنگ میں روایات مختلف ہیں کہیں زرد اور کہیں سبز بھی

مروی ہے۔

مسلم کی ایک روایت میں سیاہ اور ایک دوسری روایت میں جلد کی رنگت کا ذکر آیا ہے۔ لیکن

روایات میں تطبیق آسان ہے کیونکہ یہ رنگ یا تو مختلف اوقات میں تبدیل ہوتا رہا اور موسم کی تبدیلیوں سے

اس میں فرق آتا رہا (۳) اور پایہ ہے کہ دیکھنے والے کو جس طرح محسوس ہوا اسی طرح روایت کر دی۔

ایک روایت کے مطابق اس مہر پر باطن میں وحده لا شریک لہ اور ظاہر میں قوجہ

(۱) چکور کا اٹھ امرغی کے اٹھ سے قدرے چھوٹا ہوتا ہے اور کبوتری کے اٹھ سے ذرا بڑا ہوتا ہے۔ اور مولانا شیخ زکریا

نے فرمایا ہے کہ حقیقت میں یہ سب تشبیہات ہیں اور ہر شخص کی تشبیہ اس کے ذہن کے مطابق ہوتی ہے جو تقریبی حالت ہوتی

ہے اور تقریب کے اختلاف میں اشکال نہیں ہوتا بندہ کے نزدیک یہ توجیہ زیادہ مناسب ہے (خصائل) (مختار)

(۲) مسلم ۲۵۹/۲ کتاب الفضائل باب البات خاتم النبوة، جامع ترمذی ۱۸۴/۲ کتاب المناقب

باب فی خاتم النبوة (مختار)

(۳) قال شیخ إبراهيم البيهقي ولا تدافع بين هذه الروايات لأنه كان يفاوت باختلاف

الاقوات فكانت كلون جسده تارة وكانت حمراء تارة وهكذا بحسب الاوقات (المواهب

اللدنية ص ۳۱) (مختار)

حيث كنت فانت منصور کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ مگر یہ مرجوح ہے کیونکہ بعثت انبیاء بھی ایک آزمائش ہے ایمان لانا اور نہ لانا بندوں کے اختیار میں ہے۔ اور بات ایسی ہوتی تو انکار کی گنجائش باقی نہ رہتی اور یہ اضطرار کے مترادف ہوتا دراصل اس وہم کا فحشایہ بنا کہ انگوٹھی کو بھی خاتم کہا جاتا ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کی انگوٹھی پر کچھ الفاظ کندہ تھے۔ اس سے بعض حضرات کو یہ وہم ہوا کہ یہ الفاظ خاتم نبوت پر لکھے ہوئے تھے۔

مہر نبوت کا حجم: مہر نبوت کے حجم یعنی کیت اور مقدار میں بھی روایات مختلف ہیں ایک روایت میں مثل زر الحجلة آیا ہے یعنی چھپر کھٹ کے پردے کے گھنڈی جتنا تھا۔ بعض نے ان کے معنی انڈے اور جملہ کے معنی چکور کیلئے ہیں یعنی چکور کے انڈے جتنا تھا۔ ایک اور روایت میں صرف شعرات مجتمعات مروی ہے۔ مصنف کی روایت میں بضعة ناشرة یعنی گوشت کا ابھرا ہوا ٹکڑا ذکر ہے۔ ابن حبان کی ایک روایت میں بیضة نعامة آیا ہے۔ مسلم کی روایت میں کبيضة الحمام مذکور ہے۔ بیہقی کی روایت میں سیب اور ابن عساکر کی روایت میں بندقہ یعنی غلیل کی گولی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بعض روایات میں کائس المحجم ذکر ہے۔ بعض نے صرف چمکتی روشنی بتایا ہے۔ ابوسعید خدری کی روایت میں مثل الجمع یعنی مٹھی جتنا کہا گیا ہے۔ نیز یہ بھی ہے کہ اس کے ارد گرد مسوں کی طرح سیاہ تل تھے۔ بہر حال ان تمام روایات میں تطبیق آسان ہے اور وہ اس طرح کہ اس کے حجم اور کیفیت میں اختلاف زمانے پر مبنی ہے یعنی مختلف اوقات میں اس کا حجم بھی مختلف ہوتا رہا۔ کبھی چھوٹا ہوتا تو کبھی بڑا ہو جاتا تھا۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ درحقیقت یہ تمام اقوال تشبیہات اور اندازے ہیں۔ تحدیدی بات نہیں۔ جس صحابی نے مہر نبوت کو دیکھا اس نے اپنی تقریبی تخمینے سے اس کی کیت و کیفیت کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے اس وجہ سے رواۃ کے بیانات میں اختلاف واقع ہوا ہے (۱)۔

خلاصہ تمام روایات کا یہ ہے کہ مہر نبوت جلد پر ایک ابھری ہوئی چیز تھی جو کہ آپ ﷺ کی پیٹھ پر صاف اور واضح دکھائی دیتی تھی۔ اس کے ارد گرد بال بھی تھے اور رنگ میں تبدیلی بھی واقع ہوتی تھی۔ غلیل کی (۱) اور ایک جواب یہ بھی ہے کہ گزشتہ حدیث پاک میں گھنڈیوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے وہ اس کی خوبصورتی کے لحاظ سے ہے اور اب ہناؤٹ کے لحاظ سے بیان ہے کہ مہر نبوت اپنے بناؤٹ میں کبوتری کے انڈے کے مشابہ تھی (فیض الباری)، (بخاری)

گولی جتنا چھوٹا ہو جاتا تھا اور کبھی کبھی بڑھ کر مٹھی جتنا ہو جاتا تھا (۱)۔

(٣) حَدَّثَنَا أَبُو مَصْعَبٍ الْمَدَنِيُّ أَخْبَرَنَا يَوْسُفُ بْنُ الْمَاجِشُونِ عَنْ أَبِيهِ عَنْ عَاصِمِ بْنِ عَمْرِو بْنِ قَتَادَةَ عَنْ جَدِّهِ رَمِيثَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ وَلَوْ أَشَاءَ أَنْ أَقْبَلَ الْخَاتَمَ الَّذِي بَيْنَ كَتْفَيْهِ مِنْ قُرْبِهِ لَفَعَلْتُ يَقُولُ لِسَعْدِ بْنِ مَعَاذٍ يَوْمَ مَاتَ اهْتَزَلَهُ عَرْشُ الرَّحْمَنِ .

ترجمہ: حضرت رمیوہ کہتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے (اتنے قریب سے) سنا کہ اگر میں چاہتی کہ قرب کی وجہ سے آپ ﷺ کے کندھوں کے درمیان کے مہربوت کو چوم لوں تو ایسا کر سکتی۔ آپ ﷺ حضرت سعدؓ کی وفات کے روز ان کے بارے میں فرما رہے تھے کہ ان کی موت کی وجہ سے حق تعالیٰ شانہ کا عرش بھی جھوم اٹھا۔

الماجشون اور رمیثہ: عن یوسف بن الماجشون: یوسفؑ کے باپ یعقوبؑ اور

ان کے دیگر آباء کو ماحون کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ یعقوب کے دادا ابو سلمہ حمیمی کا لقب تھا۔ کہتے ہیں کہ چہرے کی سرخی کے سبب اسے ماحون کہا جاتا تھا۔ یہ لفظ جیم کے کسرہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ منقول ہے۔ بعض نے فتح کو بھی درست قرار دیا ہے۔ اصل میں یہ فارسی لفظ ماہ گون یعنی چاند نما یا مے گون سے معرب ہے میگون کے معنی شراب جیسی رنگت والا ہوتے ہیں۔

عن جلقہ ومیثہ بنت عمرو بن ہشام عمرو بن ہشام کی بیٹی کم عمر صحابیہ ہیں ان سے دو حدیثیں مروی ہیں اس حدیث میں غزوہ خندق کے موقع کی روایت کرتی ہیں۔

لقربہ: یعنی بسبب قربہ اور قرب کا مصدر اپنے مفعول کو مضاف ہے یعنی لقربہ ایسا ہی کریم ﷺ کے ساتھ قرب کے بیان میں دراصل صحابیہ کا مقصد یقینی روایت اور کمال معرفت پر تنبیہ کرنا ہے یعنی اتنے

(۱) کتب سابقہ میں بھی آنحضرت ﷺ کے مہر نبوت کا ذکر موجود تھا۔ شاہ مقوقس کے پاس جب رسول اللہ ﷺ کا خط مبارک پہنچا تو اس نے کہا کہ کتب سابقہ میں نبی آخر الزمان کی تین علامات میں نے پڑھی ہیں (۱) اس کے دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی (۲) دراز گوش پر سوار ہوں گے (۳) معمولی چادر اوڑھنے میں بھی تکلف نہیں کریں گے۔

قریب سے مہر دیکھ لی کہ چاہتی تو چھوم بھی سکتی تھیں (۱)۔

سعد بن معاذ اور اهتزاز عرش الرحمن: یقول لسعد بن معاذ یعنی یقول فی شانہ اوفی حقہ، یعنی حضرت سعد بن معاذ کے حق میں یا اس کے بارے میں فرمایا تو لام اس جگہ فی کے معنی پر مستعمل ہے۔ قرآن مجید میں لام فی کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وقال الذین کفرو للذین آمنوا لو کان خیراً ما سبقونا لیه۔ (الایۃ)

بہر حال اس جگہ بھی نبی کریم ﷺ حضرت سعد کی مدح کرتے ہوئے ان کے بارے میں کچھ فرماتے ہیں۔ حضرت سعد بن معاذ قبیلہ اوس کے سردار تھے۔ ۳۷ سال کی بھرپور جوانی میں جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ یہ ۵ھ کا واقعہ ہے جب جنگ خندق میں تیر لگنے کی وجہ سے خون زیادہ بہہ گیا اور شہادت پائی۔ ستر ہزار فرشتے بھی نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔ نبی کریم ﷺ نے آپ کی موت کے بارے میں فرمایا کہ اهتز له عرش الرحمن یعنی آپ کی وفات سے اللہ تعالیٰ کا عرش ہل گیا۔ اس کی کئی توجہات ہیں۔

(۱) اهتز، ہز سے باب افتعال کا ماضی ہے کہتے ہیں ہز زقہ فاہتز میں نے اسے ہلایا تو وہ ہل گیا۔ ہز اور اهتز دونوں کے معنی حرکت کرنا اور جھومنا ہے۔ لیکن اهتز از کا لفظ خوشی میں بھی مستعمل ہے کیونکہ خوشی کے موقع پر بھی انسان جھومنے لگتا ہے دل کی دھڑکن بھی خوشی کی وجہ سے تیز ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے اهتز از خوشی میں جھومنے کو بھی کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ نفس حرکت اضطراب، ہلنے اور جھومنے کا نام ہے۔ اللہ

(۱) ولو اشاء ان اقبل الخاتم الذی بین کتفیه من قوبہ، مہربوت کی جگہ کے بارے میں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ مہربوت دونوں موڑھوں کے درمیان بائیں بازو کے مساوی بائیں کندھے کے نیچے قلب کے مقابل میں تھی اس کی علت یہ بیان کرتے ہیں کہ اسی جگہ سے شیطان وسوسہ ڈالتا ہے۔ اس مہربوت کی وجہ سے آپ ﷺ شیطانی وسوسہ سے محفوظ ہو گئے تھے۔ ملا علی قاریؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے اس بات کو نقل کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شق صدر کے موقع پر جب دل کو دھڑم سے دھویا گیا اس کے بعد میری پیٹھ پر مہربوت لگا دی گئی جس کی ٹھنک کو میں نے اپنے دل میں محسوس کیا۔ (بخاری)

مہربوت کی خوشبو: اور اس مہربوت سے خوشبو آتی تھی۔ ملا علی قاریؒ نے اس پر حضرت جابرؓ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ اپنے پیچھے بٹھایا تو میں نے آپ ﷺ کی مہربوت کو بوسا دیا تو اس سے ٹھنک کی خوشبو آ رہی تھی۔ (بخاری)

تعالیٰ کا عرش اس خوشی میں جھومنے لگا کہ حضرت سعد بن معاویہ کی عظیم قربانی اور للّٰہیت اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہو گئی۔

(۲) دوسری توجیہ یہ ہے کہ عرش سے مراد یہاں اہل العرش اور حملۃ العرش یعنی عرش کو اٹھانے والے فرشتے مراد ہیں جن کو ملائکہ کروہیین کہتے ہیں (۱)۔ شاعر کہتا ہے

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھیں کرویاں
قرآن کریم ہلاتا ہے کہ ان فرشتوں کو مومنین کے ساتھ بے انتہا محبت ہے حتیٰ کہ ان کے بال بچوں تک کیلئے دعا کرتے رہتے ہیں۔

الذین یحملون العرش و من حوله یسبحون بحمد ربہم و
یومنون بہ و یستغفرون للذین آمنوا ربنا وسعت کل شیء رحمۃ و
علماً فاغفر للذین تابوا و اتبعوا سبیلک و قہم عذاب الجحیم۔ ربنا
وادخلہم جنت عدن الّتی وعدتہم و من صلح من آباءہم و ازواجہم
و ذریا تہم انک انت العزیز الحکیم (۱)۔

ترجمہ: وہ فرشتے جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو اس کے ارد گرد ہیں۔ وہ اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور ایمان والوں کیلئے استغفار کیا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تیری رحمت اور علم ہر چیز کو شامل ہے۔ سو ان لوگوں کو بخش دیجئے جنہوں نے توبہ کر لی ہے اور آپ کے راستے پر چلتے ہیں اور ان کو عذاب جہنم سے بچا لیجئے۔ اے ہمارے رب! اور ان کو ہمیشہ رہنے کی میسرگوں میں جن کا تم نے ان سے وعدہ کیا ہے داخل کر دیجئے، اور ان کے ماں باپ اور

(۱) اور ایک توجیہ یہ بھی ہے کہ اللہ کے عرش میں جنہیں پیدا ہوئی ان کافروں پر غصہ کی وجہ سے کہ انہوں نے اسلام کے سچے جاں نثار کو زخمی کیا جس سے ان کی شہادت ہو گئی۔ بقول ایک انصاری شاعر کے

وما اھتز عرش اللہ من موت ہالک سمعنا بہ إلا تمعدابی عمرو (کسی مرنے والے کی موت پر اللہ کا عرش نہیں ہلا مگر سعد ابی عمرو کی موت پر) (ابو عمرو آپ کی کنیت ہے) (بخاری)

(۲) سورۃ المؤمن ۸، ۷

بیویوں اور اولاد میں سے جو لائق ہوں ان کو بھی داخل کر دیجئے بلا شک تو زبردست حکمت والا ہے۔

تو ان فرشتوں نے جب حضرت سعدؓ کی عجیب و غریب قربانی دیکھ لی تو بہت خوش ہو گئے اور کیف و وجد میں آئے اور جب حملۃ العرش حرکت کریں گے تو عرش میں بھی حرکت آئے گی۔

(۳) تیسری توجیہ یہ ہے کہ عرش، کرسی، آسمان، اور زمین تمام کے تمام مومن کے اعمال صالحہ کی وجہ سے خوش ہوتے ہیں۔ اعمال سیر کی وجہ سے انہیں دکھ ہوتا ہے جب تک اعمال صالحہ جاری ہوں گے وہ انبساط و مسرت میں ہونگے وہ جگہ جہاں مومن سجدے کیا کرتا تھا سجدوں کے انقطاع سے روتا ہے۔ وہ راستہ جن سے اس کے اعمال حسنہ گزرتے تھے اعمال کے سبب خوش ہوتا تھا۔ اعمال کے انقطاع سے اسے دکھ ہوتا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ آسمان و زمین مومنین کی موت پر روتے ہیں کفار کے لئے وہ نہیں روتے۔ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ

فما بكت عليهم السماء والارض و ما كانوا منظرين (دخان ۲۹)

پس نہ تو ان (فرعونیوں پر) آسمان و زمین کو رونا آیا اور نہ ان کو مہلت دی گئی۔

بہر حال یہ غم و اضطراب کا ریشہ تھا جو عرش کی حرکت کا سبب بنا۔

(۴) چوتھی توجیہ یہ ہے کہ عرش سے مراد عرش الرحمان نہیں بلکہ مراد وہ چار پائی ہے جس پر

لاش پڑی تھی جیسا کہ براء بن عازبؓ کی روایت میں ہے اهتز السریور (۱) چار پائی حرکت میں آئی۔ یعنی جس چار پائی پر لاش پڑی تھی فرشتوں کے ہجوم کی وجہ سے وہ ہچکولے کھا گئی لیکن اس صورت میں پھر عرش الرحمان کا لفظ اچھی طرح منطبق نہیں ہوتا۔

حضرت براءؓ کے بارے میں غلط فہمی اور اس کا ازالہ: حضرت جابرؓ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت براء بن عازبؓ نے حدیث کی یہ تشریح اس لئے کی ہے کہ حضرت سعدؓ اسی اور حضرت براءؓ خزر جی ہیں۔ اور معاشرت کی وجہ سے دونوں قبیلوں میں بدگمانیاں تھیں۔ اور چونکہ حضرت سعدؓ کے بارے

(۱) عن جابر سمعت النبی ﷺ يقول اهتز العرش لموت سعد بن معاذ. فقال رجل لجابر فان البراء يقول اهتز السریور فقال كان بين هذين الحيين ضغائن سمعت النبی ﷺ يقول اهتز عرش الرحمان لموت سعد بن معاذ. (صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۳۶) (اصلاح الدین)

میں رسول اللہ ﷺ کا یہ قول اوس کیلئے بھی بڑا اعزاز تھا اس لئے اس نے پرانی چشمک کی بنا پر عرش الرحمن کا مفہوم اتریر سے بدل دیا۔

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو کسی جلیل القدر صحابی سے اس قسم کی عصیت کا صدور بعید از قیاس ہے کہ وہ محض حسد کی بناء پر نبی کریم ﷺ کے قول میں بھی تحریف کر لے بلکہ اس قسم کی تبدیلی کرنے والا عادل ہی نہیں رہتا اس کی روایت قبول نہیں۔ لہذا اصل بات یہ ہے کہ حضرت براءؓ کو اگرچہ غلط فہمی ہوئی ہے لیکن وہ اس پر مبنی نہیں کہ حضرات براءؓ خزرجی ہیں اور حضرت سعد اوسی بلکہ یہ الزام ہی بے بنیاد اور سراسر غلط ہے وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں صحابی اوسی (۱) ہیں لہذا مذکورہ وجہ تبدیلی کیلئے نہیں بن سکتی۔

رہا حضرت جابرؓ کی حدیث تو وہ درحقیقت حضرت براءؓ کی طرف سے اس کی توجیہ کیلئے اعتذار کر رہے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ انہوں نے یہ تبدیلی یا توجیہ اس لئے نہ کی کہ اوسی ہونے کی وجہ سے حضرت سعدؓ کی فضیلت پر پردہ ڈال دے۔ اس لئے کہ یہ کام تو حضرت جابرؓ کے قبیلہ کے کسی شخص کو کرنا تھا کیونکہ خزرج کو حضرت سعدؓ کے قبیلہ اوس سے پرانی چشمک تھی۔ چنانچہ حضرات براءؓ بن عازبؓ کی بات عجیب لگتی ہے کہ اوسی ہونے کے باوجود اپنے سردار کی فضیلت کا انکار کر رہے ہیں اسلئے ظاہر ہے وہ کسی غلط فہمی کی بناء پر ایسا کر رہے ہیں نہ کہ حسد کی بناء پر۔ بہر حال ان کے خیال میں بھی عرش الرحمان ہی درست ہے اور یہ رائج بھی ہے (۲)۔

(۱) علامہ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں حضرت براءؓ کا شجرہ یوں لکھا ہے۔ براء بن عازب بن الحارث بن عدی بن مجدعة بن حارثة بن الحارث بن الخرج بن عمرو بن مالک بن الاوس (اصلاح الدین)

(۲) کوئٹہ قال جابر ذالک اظہار الحق واعترافاً بالفعل لاهله فکانه تعجب من البراء کیف قال ذالک مع انه اوسى ثم قال اما انا وان كنت حزر جيتاً وکان بين الاوس والخزرج ضغائن لا یمنعنی ذالک ان اقوال الحق نذكر الحديث والعذر للبراء انه لم يقصد تغطية فضل سعد وإنما فهم ذالک فجزم به (فتح الباری) شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے یہی فرمایا ہے کہ جس کو حضرت جابرؓ بیان فرما رہے ہیں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ محقق ہے اس میں کسی قسم کی زیادتی و تحریف نہیں ہے حضرت براءؓ کو پورے الفاظ یاد نہیں کیونکہ میں خزرجی ہوں اور حضرت سعدؓ اوسی ہیں اوس اور خزرج میں مدتوں کینہ رہا ہے تو ایک قبیلہ والا دوسرے مقابل کے قبیلہ کے فضائل میں زیادتی نہیں کر سکتا بلکہ پورا بیان کیا ہے کہ عرش الرحمن کے الفاظ تھے (تقریر ترمذی) (بخاری) غیر ذوی العقول کا ادراک: یہاں ایک اشکال سامنے آتا ہے کہ عرش تو غیر ذی عقل ہے اور غیر ذی عقل سے کسی کی (باقی اگلے صفحہ پر)

نے ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو میری انگلیاں مہر نبوت پر پڑیں۔ میں نے پوچھا کہ مہر نبوت کیا چیز تھی انہوں نے کہا کہ کچھ بالوں کا مجموعہ تھا۔

ابو زید عمر بن الخطاب الانصاری مشہور بدری صحابی ہیں نبی کریم ﷺ کے زمانے میں جن چار صحابہ نے قرآن جمع فرمایا تھا ان میں آپ کا نام گرامی بھی ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے آپ کے بارے میں دعا کی تھی انکے پوتے کہتے ہیں کہ ایک سو بیس سال تک زندہ رہے اور آپ کی داڑھی اور سر میں صرف چند بال سفید تھے۔

یا ابا زید بعض نسخوں میں ”یا ابا زید“ بغیر الف کے لکھا گیا ہے۔ لیکن ہمزہ کا سقوط صرف کتابت میں جائز ہے قرأت میں یا ابا زید ہی پڑھا جاتا ہے۔

صحابی کو مسخ ظہر کا حکم: فامسح ظہری الخ کبھی کبھی کپڑوں میں حشرات میں سے کوئی چیز مثلاً چیونٹی، بچھو یا بھڑ وغیرہ گھس جائے تو اپنے ساتھیوں سے کہا جاتا ہے کہ ذرا اس کی تلاش کرنے میں مدد دے۔ تو شاید آپ ﷺ کو بھی کسی موذی چیز کا احساس ہو چکا ہو لہذا صحابی سے کہا کہ وہ دیکھ لے کہ کہیں بچھو وغیرہ نہ ہو اور ممکن ہے کہ آپ ﷺ کی پیٹھ میں کبھی انٹی ہو اور صحابی کو کھجلائے کا حکم دیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نور نبوت سے یہ محسوس کر لیا ہو کہ اس صحابی کو مہر نبوت دیکھنے کی خواہش اور تمنا ہے جیسا کہ بعض صحابہ کو تجسس ہوتا تھا اور اس علامت کو دیکھنے کے متنی ہوتے تھے۔ تو نبی کریم ﷺ نے یہ خواہش اپنی فراست سے محسوس کی اور صحابی کے اطمینان کے لیے مہر نبوت دیکھنے کی دعوت دی لیکن اس صحابی نے کپڑے کے اندر سے ہاتھ ڈال کر دیکھا ہے آنکھوں سے نہیں دیکھا نبی کریم ﷺ کے پاس عموماً قمیص نہیں ہوتی تھی اور ہو سکتا ہے کہ قمیص پہنے ہوئے ہوں تو شاید گریباں پیٹھ کی جانب ہٹا ہوا ہو۔ جس طرح کہ آج کل بھی بعض علاقوں کا دستور ہے۔ کہ گریباں سینہ کی بجائے پیٹھ پر بنایا جاتا ہے۔

قلت مال خاتم شاگرد کا مقصد ماہیت سے سوال نہیں بلکہ وہ کیفیت کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہے۔ شعرات مجتمعات بالوں کا گچھا سا تھا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس حدیث کا دیگر ان احادیث سے بظاہر تعارض ہے جن میں مہر نبوت کو لحم ثابت (ابھرے ہوئے گوشت) یا عذہ اور رضعہ ناشزۃ وغیرہ سے

تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ اگر ایک طرف مہر نبوت ابھرا ہوا گوشت تھا تو دوسری طرف اس کے ارد گرد بال بھی تھے اب یا تو اس راوی کی انگلیاں صرف بالوں پر پڑی ہیں لہذا وہ ابھرے ہوئے گوشت کا ذکر نہیں کرتا یا پھر یہاں عبارت حذف مضاف سے ہے تقدیر یوں ہوگی کہ لحم نات ذو شعرات یعنی ابھرا ہوا گوشت تھا جس کے ارد گرد بال تھے۔

علامہ بیجوریؒ نے علم قیافہ والوں کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ جس شخص کی پیٹھ پر سیاہ دھبہ ہو جس پر بال ہوں اس کی اپنی زندگی بھی تھکا دینے والی ہوگی۔ نیز اس کے اقارب اس کی وجہ سے دنیا میں شداوند جھیلیں گے۔ نیز اس کی موت بھی زہر سے ہوگی اور تینوں باتیں نبی کریم ﷺ کے حق میں ظاہر ہو چکی ہیں (۱)۔

(۲) حَدَّثَنَا أَبُو عَمَّارٍ الْحُسَيْنُ بْنُ حَدِيثِ الْخَزَاعِيِّ ثَنَا عَلِيُّ بْنُ حُسَيْنِ بْنِ وَاقِدٍ ثَنِي أَبِي عَبْدِ اللَّهِ بْنِ بَرِيدَةَ قَالَ سَمِعْتُ أَبِي بَرِيدَةَ يَقُولُ جَاءَ سَلْمَانَ الْفَارِسِيُّ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ حِينَ قَدِمَ الْمَدِينَةَ بِمَائِدَةٍ عَلَيْهَا رَطْبٌ فَوَضَعَهَا بَيْنَ يَدَيِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ يَا سَلْمَانُ مَا هَذَا فَقَالَ صَدَقَةٌ عَلَيْكَ وَعَلَى أَصْحَابِكَ فَقَالَ ادْفَعِهَا فَإِنَّا لَا نَأْكُلُ الصَّدَقَةَ قَالَ فَرَفَعَهَا فَجَاءَ الْغَدُ بِمِثْلِهِ فَوَضَعَهُ بَيْنَ يَدَيِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ مَا هَذَا يَا سَلْمَانُ فَقَالَ هَدِيَّةٌ لَكَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِأَصْحَابِهِ ابْسُطُوا لِي نَظَرَ إِلَى الْخَاتَمِ عَلَى ظَهْرِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَأَمِنَ بِهِ وَكَانَ لِيَهُودٌ فَاشْتَرَاهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِكَذَا وَكَذَا دِرْهَمًا عَلَى أَنْ يَغْرُسَ لَهُمْ نَخِيلًا فَيَعْمَلُ سَلْمَانُ فِيهِ حَتَّى تَطْعَمَ فَغْرُسَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ

(۱) واعلم أنهم قالوا من كان على ظهره شامة عليها شعر نبات كان كثير العناء وأصاب أهل بيته لأجله مكروه ويكون موته من قبل السم وقد كان كذلك فكان ﷺ كثير العناء لمآل من الشدائد وأصاب بني هاشم لأجله ما لا يخفى وأما الموت بالسم فقد قال ما زالت أكلة خبير تعار دني فهذا وإن انقطاع أبهرى (المواهب اللدنية ص ۳۴) (منحار)

النخل إلا نخلة واحدة غرسها عمر فحملت النخل من عامها ولم تحمل النخلة فقال رسول الله ﷺ ما شان هذه النخلة فقال عمر يا رسول الله ﷺ انا غرستها فنزعها رسول الله ﷺ فغرسها فحملت من عامها (۱)۔

ترجمہ: حضرت بریدہ بن الحبیب فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو حضرت سلمانؓ ایک خوان لے کر آئے جس میں تازہ کھجوریں تھیں اور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے سلمان یہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ یہ آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کے ساتھیوں پر صدقہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہم لوگ صدقہ نہیں کھاتے اس لئے اسے میرے پاس سے اٹھا لو۔ دوسرے دن پھر حضرت سلمانؓ اسی طرح کھجوریں لائے اور نبی کریم ﷺ کے سامنے رکھ دیں۔ نبی کریم ﷺ نے پھر پوچھا کہ اے سلمان یہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ آپ ﷺ کیلئے ہدیہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ ہاتھ بڑھاؤ پھر حضرت سلمانؓ نے نبی کریم ﷺ کی پشت مبارک پر مہربوت دیکھی تو مسلمان ہو گئے۔ حضرت سلمانؓ اس وقت یہود کے غلام تھے پس نبی کریم ﷺ نے ان کو اتنے دراهم دے کر خریدا (یعنی بدل کتابت ادا کرنے میں مدد دی نیز یہود نے یہ شرط لگائی) کہ سلمانؓ ان کے لیے (تین سو) کھجور کے درخت لگائیں اور پھل لانے تک ان کی خبر گیری بھی کریں۔ پس نبی کریم ﷺ نے اپنے دست مبارک سے وہ درخت لگائے سوائے ایک درخت کے جسے حضرت عمرؓ نے لگایا۔ چنانچہ وہ تمام درخت اسی سال پھل لائے سوائے اس درخت کے کہ وہ پھل نہ لایا۔

نبی کریم ﷺ نے اس درخت کے بارے میں دریافت کیا کہ اسے کیا ہو گیا ہے تو

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ ﷺ اسے میں نے لگایا تھا نبی کریم ﷺ نے اس کو اکھاڑا پھر خود اپنے ہاتھ سے لگایا۔ چنانچہ وہ درخت بھی اسی سال پھل لایا۔

سمعت ابی ہریدۃ۔ ہریدہ لفظ ”ابی“ سے بدل یا عطف بیان ہے۔ اس کے والد کا نام حصیب بنضم حاء ہے ہریدہ صحابی ہیں۔ غزوہ بدر سے پہلے اسلام لائے تھے مگر کسی وجہ سے اس میں شرکت نہ کر سکے۔ بصرہ میں ۶۲ھ یا ۶۳ھ میں وفات پائی۔

سلمان فارسیؓ کی فضیلت اور قبول اسلام: حضرت سلمان فارسیؓ کی زندگی کے واقعات بڑے عجیب و غریب ناک ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے بہت طویل عمر بخشی تھی۔ دوسو، ڈھائی سو، تین سو، ساڑھے تین سو، اور چار سو سال تک کی روایات موجود ہیں۔ آپ کا تعلق اصفہان کے ایک شہر سے تھا۔ چونکہ ایران کے لوگ گھڑ سواری میں بہت ماہر تھے اسلئے عرب لوگ ایران اور اس سے ملحقہ علاقوں کو فارس کہتے تھے اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ نام ان کے دادا فارس بن کیومرث کی وجہ سے پڑا۔ بہر حال علاقے کی وجہ سے آپؓ کو بھی فارسی کہا جاتا تھا۔ آپؓ اصفہان کے ایک دولت مند آدمی کے بیٹھے تھے باپ خود مجوسی تھا اور بیٹے سے بہت محبت تھی اس نے بیٹے کو مجوسیت کیلئے وقف کر دیا۔ یہاں تک کہ سلمان آتش کدہ کا محافظ بن گیا۔ خوش قسمتی سے ایک دن آپؓ کا گزرا ایک عیسائی گرجے پر ہوا اور محض سیر کی خاطر آپؓ اس میں داخل ہو گئے اندر جا کر ان کی عبادت اور دین حق کا نور دیکھا تو بہت متاثر ہوئے اور شام تک وہیں رہے پھر تو آپؓ کو عیسائیت پسند آگئی اور جب بھی موقع ملتا عیسائی پادریوں کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔ باپ نے پہلے تو سختی سے منع کیا مگر بے سود بالآخر آپؓ کو بیڑیاں پہنا کر گھر میں قید کر دیا مگر پادریوں سے آپؓ کا رابطہ بدستور رہا۔ اور ان سے مذہب کے مرکز کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے بتا دیا کہ اس کا مرکز شام میں ہے۔ چنانچہ آپؓ نے پادریوں کو کہلا بھیجا کہ جب شام سے سوداگر لوگ آئیں تو مجھے اطلاع دے دیں۔ کچھ مدت بعد سوداگر آئے اور آپؓ کو اطلاع ملی۔ جب وہ واپس شام جانے لگے تو آپؓ نے بیڑیاں کاٹ دیں اور بھاگ کر ان کے ساتھ شام چلے گئے وہاں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس مذہب کا سب سے زیادہ علم فلاں پادری کے پاس ہے۔ چنانچہ آپؓ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عیسائیت میں اپنی رغبت اور

خواہش ظاہر فرمائی۔ اس نے آپؐ کو اپنے ہاں رکھ لیا اور عیسائیت کی تعلیم دی۔ جب وہ مر گیا تو اس کی جگہ ایک اور پادری کو قائم مقام بنا دیا گیا۔ جو بقول سلمان فارسی پہلے سے بہتر تھا۔ دنیا سے بے رغبت اور مخلص تھا۔ آپؐ اس کی خدمت میں رہنے لگے کچھ عرصہ بعد یہ شخص وفات ہونے لگا تو حضرت سلمان فارسیؓ نے پوچھا کہ آپؐ کے بعد میں کس کے پاس جاؤں اس نے بتایا کہ نصیبین میں فلاں شخص کے پاس چلے جاؤ۔ چنانچہ آپؐ وہاں گئے اور مذکورہ شخص کی تلاش کر کے تلمذ اختیار کی۔ وہ بھی وفات ہونے لگے۔ تو اس کی ہدایت کے مطابق آپؐ غموریا کے ایک پادری کی خدمت میں گئے۔ اس مقام پر آپؐ نے کچھ مال بھی کمایا اور کچھ گائیں اور بکریاں آپؐ کے پاس جمع ہو گئیں۔ یہ آدمی وفات ہونے کے قریب ہوا تو حضرت سلمانؓ نے اس سے پوچھا کہ اب کہاں جاؤں گا۔ اس نے بتایا کہ خدا کی قسم جس طریقہ پر ہم لوگ ہیں اس صحیح اور سچے طریقہ پر اب کوئی باقی نہیں رہا البتہ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی کا زمانہ قریب آ گیا ہے جو ملت ابراہیمی کے علمبردار ہو گئے اور عرب میں پیدا ہو گئے۔ ان کی ہجرت کرنے کی جگہ میں کھجوریں زیادہ ہوں گی۔ وہ ہدیہ تو قبول کریں گے لیکن صدقہ نہیں کھائیں گے۔ ان کے دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی۔ پس اگر ہو سکے تو تم اس جگہ پہنچ جانا۔

حضرت سلمان فارسیؓ یہ سن کر تلاش حق میں نئی منزل کی طرف نکل پڑے۔ آخر کار بنو کلب کے کچھ تاجروں سے ملاقات ہو گئی۔ آپؐ نے ان کو اپنے ساتھ عرب لے جانے کی درخواست کی اور اس کے عوض بکریاں اور گائیں ان کی نذر کر دیں۔ وہ آپؐ کو مکہ لائے لیکن یہاں پر ان کو اپنا غلام ظاہر کر کے بیچ ڈالا۔ پھر بنو قریظہ کے کسی یہودی نے انہیں اہل مکہ سے خرید اور مدینہ لے آیا۔ جسے دیکھ کر آپؐ کو یقین ہو گیا کہ یہی نبی آخر الزمان کی ہجرت گاہ ہوگی۔ اگرچہ وہ آزاد تھے لیکن انہیں غلام کی طرح بیچا گیا۔ چنانچہ مدینہ میں آپؐ کے مختلف مالکوں کا ذکر ملتا ہے۔ کبھی کسی کے ہاں اور کبھی کسی کے ہاں۔ پے در پے آپؐ کے دس مالک تبدیل ہوتے رہے، جکتے رہے اور مدینہ میں رہتے رہے۔ ہجرت نبوی ﷺ کے وقت بھی آپؐ بنو قریظہ کے کسی یہودی شخص کی ملکیت میں تھے۔

الغرض دوڑھائی سو سال تک یہ تکالیف اور مصائب جھیلتے ہوئے حق کی تلاش میں آپؐ سرگرداں

نبی کریم ﷺ کا علم بھی حاصل ہوا۔ طویل عمر کے باوجود آپ نے ہمیشہ زہد و قناعت کا دامن تھامے رکھا۔
مائدۃ اور چنے گئے اشیاء: مائدۃ مادیمید حرکت کے معنی میں ہیں اللہ تعالیٰ زمین کے بارے میں فرماتے ہیں ان تمید بکم۔ ای لثلاث تمید بکم۔ یعنی زمین میں ہم نے بڑے بڑے پہاڑ اس لیے پیدا کئے کہ یہ ہلنے سے محفوظ رہے۔ اور چونکہ دسترخوان پر بھی سارے لوگ حرکت کرتے ہیں۔ ہاتھ چلتے رہتے ہیں، برتن بھی حرکت میں ہوتے ہیں۔ یہ لودہ لوکا شور ہوتا ہے۔ خود دسترخوان اور جو کچھ اس پر ہوتا ہے سب متحرک ہوتے ہیں اس لئے دسترخوان کو بھی مائدہ کہا جاتا ہے (۱)۔

اس طرح مادکا ایک اور معنی میں بھی مستعمل ہے کہتے ہیں مادہ ای اعطاه اور چونکہ دسترخوان بھی اپنی ساری چیزیں لوگوں کو پیش کر کے دیتا ہے اسلئے اسے مائدہ کہا گیا ہے۔

علیہا رطب: کپے ہوئے تازہ کھجور کو رطب کہتے ہیں۔ خشک کھجور کو تمر کہتے ہیں کچا جو پکنے کے قریب ہوا سے بسر کہتے ہیں اگر پختگی سر کی طرف سے ظاہر ہو چکی ہو اور دم کی طرف تھوڑا سا کچا پن باقی ہو تو اسے رطب مذنب کہتے ہیں اور اگر پختگی دم کی جانب سے ظاہر ہو اور کھجور کے سر کی جانب تھوڑا سا کچا پن باقی ہو تو اسے بسر مذنب کہتے ہیں۔ طبرانی کی ایک اور روایت میں تمر کا لفظ بھی آیا ہے۔ اب اشکال یہ ہے کہ ان روایات میں بظاہر تعارض ہے جس کی توجیہ ضروری ہے تو اس کے دو جواب ہیں کہ یا تو یہ مختلف مواقع کے لحاظ سے ہے۔ صحابی نے کبھی رطب، کبھی تمر اور کبھی ثرید پیش کیا ہوگا اور طعام سب کو کہا جاتا ہے لیکن اس سے زیادہ واضح جواب یہ ہے کہ خواجہ تو بڑی چیز ہے دسترخوان پر تو روٹی، سالن، چٹنی، پیاز اور پلاؤ پھل وغیرہ سب چیزیں ہو سکتی ہیں تو ہو سکتا ہے کہ دسترخوان مذکورہ تمام انواع پر مشتمل ہو لیکن صحابہ میں سے کسی نے تمر کا (۱) مگر ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے والمشہور عند ارباب اللغة أن المائدة خوان علیہ عام فاذا لم یکن علیہ

طعام فلا یسمی مائدة فعلى هذا قوله علیہا رطب لتعین ما علیہا من الطعام (جمع الوسائل ۱/ ۷۹)
 اسی لئے علامہ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا ہے وقد تطلق المائدة ويراد بها ما علیہ من الطعام وان لم یکن خواناؤه. لیکن وقد یطلق علی الطعام نفسه او اناؤه (شرح الشمائل لشیح مناوی علی هامش جمع ج ۱ ص ۷۹) کما فی القرآن الکریم والنزل علینا مائدة من السماء (الایہ) اسلئے مائدۃ کا اطلاق ان سب پر ممکن ہے (عبار)

ذکر کیا ہو کسی نے رطب کا کسی نے ثید کا کسی نے طعام کا۔ جبکہ حقیقت میں تمام چیزیں دسترخوان پر موجود تھیں۔

علم الغیب اور نبی کریم ﷺ: یا سلمان ما هذا خطاب کا صیغہ مستعمل ہے، بریلوی حضرات اس سے علم غیب کے ثبوت پر استدلال کرتے ہیں یوں کہ دیکھو اگر نبی کریم ﷺ کو علم غیب نہ تھا تو سلمان کا نام آپ کو کیسے معلوم ہو گیا لیکن اس جہالت کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ یہاں علم غیب کا اثبات تو درکنار اس کی نفی ہوتی ہے اور وہ یوں کہ خود نبی کریم ﷺ پوچھتے ہیں کہ ما هذا لا یہ کیا ہے؟ استفہار تو اس چیز کے بارے میں ہوتا ہے جو معلوم نہ ہو۔ اگر معلوم ہوتا تو وہ کیوں پوچھتے؟ اور اگر وہ کہتے ہیں کہ پھر نبی کریم ﷺ کو نام کیسے معلوم ہوا؟ تو اس کا واضح جواب یہ ہے کہ پہلی ملاقات کے وقت ضروری تو نہیں کہ نام بھی نہ سنا ہو اس وقت مجلس ہی میں صحابہ نے بتا دیا ہوگا کہ یہ نو وارد سلمان ہیں یا مجلس سے قبل غائبانہ تعارف ہو چکا ہوگا کہ اتنی لمبی عمر اور ایسی رنگت کا سلمان نامی ایک فارسی شخص بھی مدینہ میں رہتا ہے اسکے علاوہ اور بھی کئی طریقے ہو سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے علم کے مثلاً حضرت جبریلؑ نے بتایا ہوگا کہ یہ آنے والا سلمان ہے وہ باتیں تو راوی نہیں کرتا، راوی تو صرف واقعہ بیان کرتا ہے تو اس سے علم غیب کیونکر ثابت ہوگا۔ جبکہ ما هذا اس وقت کہا جاتا ہے جب کسی چیز کی ماہیت یا کیفیت کے بارے میں پوچھا جائے۔ لہذا یہ صراحت عدم علم پر دلالت کرتا ہے۔ بہر حال یہ عجیب علم غیب ہے کہ ساتھ جو چیز رکھی ہے وہ تو معلوم نہیں اور جب حضرت سلمانؓ کی دلجوئی، خاطر داری اور تالیف قلب کیلئے نبی کریم ﷺ نے نام لیکر پکارا۔ کیونکہ نام سے پکارنا بے تکلفی اور محبت پر دلالت کرتا ہے اور محبوب کے اس شفقت بھرے خطاب سے ان کی تکالیف اور طویل اسفار کی ساری تھکاوٹ کا فور ہو گئی۔

صدقہ اور ہدیہ میں فرق: صدقہ علیک: صدقہ اور ہدیہ میں تین وجوہ سے فرق ہے۔ ایک یہ کہ صدقہ جس کو دیا جائے وہ اس مال کا مالک ہو جاتا ہے۔ رجوع کر کے مال کو واپس نہیں کیا جاسکتا جبکہ ہدیہ میں امام ابو حنیفہؒ کے ایک قول کے مطابق رجوع جائز ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ صدقہ میں ترحم اور شفقت باعث بنتا ہے جس کو دیا جائے اس کے عجز و مسکنت کا اعتبار اور اس پر ترس ہوتا ہے جبکہ ہدیہ

میں ترحم وغیرہ نہیں ہوتا ہدیہ تو بادشاہوں، نوابوں، امیروں، غریبوں اور مسکینوں سب کو پیش کیا جاتا ہے۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ صدقہ میں مصدق علیہ کی ایک گونہ تحقیر اور اہانت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل علم طبقہ اگرچہ اللہ تعالیٰ اور لوگوں کے ہاں معزز اور مشرف ہوتا ہے لیکن محض خیرات خوری کی نظر سے لوگ انہیں دیکھتے ہیں تو ان کے رویے سے حقارت ٹپکتی نظر آتی ہے جو چیز خراب اور باسی ہو جاتی ہے کہہ دیتے ہیں کہ طالب علموں کو دیدو۔ جبکہ ہدیہ کا مقصد ہی مہدیؑ لہ کی تعظیم ہوتا ہے۔ ہدیہ دینے والا عزت و اکرام اور عقلمت کی نظر سے دیکھ کر ہی ہدیہ دیتا ہے۔

حضرت سلمان فارسی صدقہ پیش کر کے آزمائش کرتے ہیں کہ صدقہ نہ لیا پھر تو پیغمبر برحق ہیں ورنہ نہیں۔ یہاں پر یہ اشکال پیش آتا ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ تو اس وقت غلام تھے جو کسی چیز کے مالک نہیں بن سکتے تو اس کا صدقہ صدقہ کیسے بنے گا۔ لیکن اس کا جواب آسان ہے وہ یہ کہ اس وقت غلاموں کے احکام میں یہ حکم موجود نہ تھا بلکہ یہ حکم اسلام میں نازل ہوا کہ غلام کا سب کچھ آقا کا ہوتا ہے لیکن یہ شبہ پھر بھی ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کا ہدیہ کیوں قبول کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت سلمانؓ کی غلامی دراصل شرعی غلامی نہ تھی بلکہ غیر شرعی طور پر اسے بیگار میں پکڑا گیا تھا۔ جنگ میں کہیں ان کو نہیں پکڑا تھا بلکہ محض ظالمانہ تسلط و تغلب کے ذریعے یہود کے قبضہ میں تھے اسلئے وہ اپنی کمائی کے خود مالک تھے۔ اس کا صدقہ اور ہدیہ دونوں درست تھے۔

فقہال ارفعہا یعنی اٹھا لویہ ہمارے کام کا نہیں اور ایک روایت میں ادفعہا بھی آیا ہے پھر مطلب یہ ہے کہ مجھ سے اٹھا کر میرے ساتھیوں کو دے دو جو صدقہ کے مستحق ہیں۔ مثلاً اصحاب صفہ غربت کے سبب اکثر فاقہ کشی کیا کرتے تھے۔ ان کا کالیف اور مشقتوں کی برکت ہی تھی کہ ان کو علم کی بے پناہ دولت ملی۔ ان کو بھی طالب علموں کی طرح صدقات ملتے تھے لیکن ان صدقات کے ساتھ مشقت نہایت ضروری ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ اور صدقات سے معاملہ: والد ماجد حضرت شیخ الحدیث

مولانا عبدالحقؒ قدس سرہ اپنی صحت کے زمانہ میں ابتدائے سال اور انتہائے سال میں تقریر و ہدایات کے علاوہ عصر کی نماز پڑھانے کے بعد دس پندرہ منٹ تقریر فرماتے۔ جس میں بہت بڑا سبق اور کام کی باتیں

ہوتی تھیں آج ان ارشادات سے ہم محروم ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طلبہ میں اخلاقی پستی سرایت کر رہی ہے۔ اخلاقی تربیت، خلوص و اللہیت اور علم میں فنائیت کی باتیں سننے کی بناء پر پرانے فضلاء بڑے خوبیوں کے حامل ہوتے تھے۔

بہر حال مولانا بعض اوقات یہ بتاتے کہ جو ہم کھاتے ہیں اوساخ الناس ہیں۔ زکوٰۃ اور خیرات کندہ میل کچیل ہے بلکہ سو، حرام، سنگٹنگ، ملاوٹیں ہر گندی کمائی خیرات کی شکل میں بھی ہمارے ہاں آتی ہے۔ لیکن ان کو ہضم کرنا پھر بھی کارے دارو۔ اسلئے جس طرح سخت غذا کو ہضم کرنے کیلئے کھیل، دوڑ، مشقت و محنت کرنی پڑتی ہے۔ سخت چیزیں کھائے اور محنت نہ کرے تو آدمی بیمار ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ آپ فرماتے کہ ان اموال میں باطنی سختی ہوتی ہے ان کو ہضم کرنے کا واحد راستہ طالب علم کیلئے سخت محنت ہے۔ تعلیم و تعلم درس و تدریس مطالعہ اور عمل کر کے محنت کی جائے تو یہ اوساخ الناس آدمی کو راست آئیں گے۔ ورنہ آدمی کو بیمار کر کے قریب الموت کر دیتے ہیں۔ بہر حال نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو لوگ صدقہ کے مستحق ہیں ان کو دے دو۔ علامہ حافظ عراقی فرماتے ہیں کہ ادفعھا کے نسخے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کلو اوامسک یعنی تم کھاؤ خود نہیں کھایا۔

حضور ﷺ کا صدقات سے احتراز: انا لاناكل الخ جمع کا صیغہ لانے کیلئے تین توجیہات کی جاتی ہیں کہ یا تو تعظیماً اپنے آپ کیلئے جمع کا صیغہ استعمال کیا۔ یا پھر دوسرے انبیاء کو بھی اپنے ساتھ شامل کیا۔ یعنی نحن معاشر الانبياء لاناكل الصدقة یعنی ہم انبیاء کا طبقہ صدقہ نہیں کھاتے کیونکہ یہ تو اوساخ الناس ہیں اور ہم اوساخ الناس سے محفوظ ہیں یا پھر انا سے مراد انا و اہل بیعی یعنی میں اور میرا خاندان لینگے کیونکہ جو حکم اس سلسلے میں نبی کریم ﷺ کا تھا وہی بنو ہاشم کا بھی تھا۔ لہذا مطلب یہ ہوا کہ میں اور میرا خاندان صدقہ کا مال نہیں کھاتے (۱)۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلمان کا یہ صدقہ نقلی صدقہ تھا۔ لہذا معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ نہ

(۱) بنو ہاشم اور صدقات: یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ سادات اور بنو ہاشم کیلئے زکوٰۃ یا صدقات واجبہ کھانا جائز ہے یا نہیں۔ تو اکثریت کی رائے یہ ہے کہ سادات اور بنو ہاشم کیلئے کسی بھی صورت میں زکوٰۃ یا دیگر صدقات واجبہ جائز نہیں علامہ ابن قدامہؒ نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے فرماتے ہیں لا نعلم خلافاً فی ان بنی ہاشم (بقیہ اگلے صفحہ پر)

تفلی صدقہ کھاتے تھے نہ واجبی۔ اور اس کا سبب یہی ہے کہ صدقہ میں صدق علیہ کے فقر و عجز اور صدق کی نسبت حقارت کا پہلو ہوتا ہے۔ نیز اس طرح کسی تہمت سے بھی آپ بچ جاتے ہیں۔ کیونکہ اکثر و بیشتر یوں ہوتا ہے کہ مکار اور جعلی پیر اور دھوکہ باز رہنما قسم کے لوگ کچھ مدت فاقہ مستیاں کرتے ہیں۔ پھر خود اسے اور اس کی اولاد کو سونے چاندی میں کھیلنے کا موقع ملتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کا سد باب کیا تا کہ کوئی یہ نہ کہے کہ اولاد کیلئے شکرانوں اور نذرانوں کا راستہ کھول دیا ہے بلکہ نبی کریم ﷺ نے بتا دیا کہ میرا ہر کام خالصتاً اللہ ہی کیلئے ہے۔ اعلان فرمایا کہ ان اجری الا علی اللہ عز وجل اللہ تعالیٰ ہی دے گا۔

قال فرفعها اور دوسری روایات کے مطابق فدفعها ہوگا یہ بریدہ بن حصیب کا قول ہے۔ فجاء الغلب مثله، موقع شناسی اور استاد و شیوخ کی مزاج شناسی بہت بڑی خوبی ہے۔ حضرت سلمانؓ دوسرا تجربہ کر کے اپنے یقین کی تکمیل کرتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) لا تحلّ لهم الصدقة المفروضة (المعنی ۵۱۹/۲) اور علامہ عینیؒ نے لکھا ہے وفی الايضاح الصدقات الواجبات کلها عليهم لا تجوز باجماع الائمة الأربعة (البنایۃ شرح الہدایۃ ۲۰۳/۴) مگر جب رسول اللہ ﷺ اس دار فانی سے رحلت فرما گئے اور اس کے بعد بنو ہاشم کا مال غنیمت میں حصہ ختم ہوا تو بعض فقہاء کرام نے اس صورت میں جواز کا فتویٰ دے دیا۔ جس میں مذاہب اربعہ کے جلیل القدر فقہاء و محدثین شامل ہیں خود امام ابو حنیفہؒ سے بھی جواز کا قول مروی ہے وعن الامام انه يجوز لبني هاشم في زمانه لأن لهم في عوضها خمس الخمس ولم يصل اليهم (مجمع الانهر ۲۳/۱) اور اسی کو امام محمدؒ نے ترجیح دی ہے فی الآثار للمحمد عن الامام رواه ابن قال محمّد وبالجملة لأن الحرمة مخصوصة بزمانه عليه الصلوة والسلام (فقہ الزکوۃ ۲/۳) اور امام طحاویؒ نے بھی اس کو راجح کہا ہے وفی شرح الآثار عن ابی حنیفۃ لا بأس بالصدقات کلها علی بنی ہاشم والحرمة للعوض وهو خمس الخمس فلما سقط ذلك بموته ﷺ حلت لهم الصدقة قال الطحاوی وبه نأخذ (البنایۃ شرح الہدایۃ ۲۰۳/۴) اور اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے متاخرین اہل علم میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا عبدالغفور مدنیؒ، مولانا محمد معصومؒ، مولانا عبدالقدیرؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ، مولانا قاضی عیاد الاسلام قاسمیؒ، مولانا قاضی عبدالکریم مدظلہ، محدث کبیر مولانا مفتی محمد فرید مدظلہ، مولانا سیف اللہ رحمانیؒ، علامہ وجہ زحلی مدظلہ، ڈاکٹر یوسف قرظاوی مدظلہ وغیرہ اکابر علماء امت نے فی زمانہ خمس الخمس نہ ہونے اور بعض دوسرے حالات کی وجہ سے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ تفصیل کیلئے احقر کا رسالہ ”سادات اور بنو ہاشم کو زکوۃ کی شرعی حیثیت“ مطالعہ کیا جائے (مختار)

اشراف نفس اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کا استغناء: سید الطائفہ حکیم الامت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کا واقعہ ہے کہ اپنے طالب علموں اور مریدوں کے ساتھ بیٹھے تھے، خوب بھوکے تھے، اتنے میں ایک شخص اٹھ کر چلا گیا اور کھانے سے بھرا خوانچہ لایا۔ ساتھی بہت خوش ہوئے کہ کچھ کھانے کو مل گیا لیکن حاجی صاحب نے کہہ دیا کہ اٹھاؤ لیجاؤ ہم یہ نہیں کھائیں گے۔ اسلئے کہ ہم بھوکے تھے۔ تم نے محسوس کیا، تمہارے جانے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ تم کچھ لاؤ گے۔ چنانچہ ہمیں انتظار اور اشراف نفس پیدا ہو گیا۔ لہذا یہ ہمارے لئے جائز نہیں اسے لیجاؤ۔ وہ مرید خوانچہ لے کر نکلے اور غائب ہو گئے۔ پھر دوسرے دروازہ سے اچانک داخل ہو گئے اور خوانچہ رکھ کر کہا کہ لیجئے کھائیں۔ جب میں واپس گیا تو آپ کا طمع منقطع ہو گیا تھا۔ اب آپ کا تمہیں یقین تھا کہ میں کچھ نہیں لاؤں گا۔ لہذا اشراف نفس بھی ختم ہو گیا حاجی صاحب نے فرمایا کہ واقعی اس شخص نے ہمیں شکست دی۔

فقال ما هذا ماہیت سے نہیں بلکہ کیفیت سے استفسار ہے کہ یہ طعام کس حیثیت سے لائے ہو۔ صدقہ ہے کہ تحفہ یا ہدیہ ہے۔ سلمانؓ نے فرمایا کہ ہدیہ لک یہ تیرے لئے تحفہ اور ہدیہ ہے۔ صدقہ میں ترحم اور ہدیہ میں اکرام کا فرق لام اور علی سے بھی ظاہر ہوتا ہے کیونکہ علی ترحم کیلئے ہوتا ہے اور لام میں اکرام ہوتا ہے تو معنی یہ ہوا کہ اکراما لک یعنی آپ کی تعظیم کیلئے یہ ہدیہ پیش کیا ہے (۱) اس سے قبل حضرت سلمانؓ نے صدقہ علیک و علی اصحابک کہا تھا لیکن چونکہ ہدیہ صرف مہدی لہ کا اکرام مقصود ہوتا ہے۔ اس لئے اس مقام پر ہدیہ لک ولاصحابک کی بجائے لک پر اکتفاء کیا۔

بسط اور نشاط: فقال لا صحابہ ابسطو یہ صیغہ بسط یسط سے ہے جس کے متعدد معانی ہیں بسط کے معنی ہاتھ بڑھانے کے ہیں تو معنی یہ ہوگا کہ ہاتھ بڑھاؤ اور کھاؤ۔ نیز بسط کا معنی پھیلانے کے بھی آتے ہیں تو معنی یہ ہوگا کہ مجلس میں کھانا پھیلاؤ تاکہ سارے حاضرین کھا سکیں۔ علاوہ ازیں بسط پھیل (۱) صدقہ اور ہدیہ میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ صدقہ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف آتا ہے۔ اس لئے کہ مالدار اور صاحب ثروت لوگ فقراء و مساکین کو کچھ مال دیتے ہیں اور اس سے اللہ کی رضا اور اس کا تقرب مقصود ہوتا ہے جبکہ ہدیہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف جاتا ہے۔ اس میں بزرگوں کی خوشحالی اور خوشنودی کی غرض پائی جاتی ہے اور تقرب الی اللہ بھی ہوتا ہے مگر اس سے اصل دوسرے کا اعزاز مقصود ہوتا ہے (مختار)

جانے کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ تو مطلب یہ ہوگا کہ پھیل جاؤ تا کہ کھانا درمیان میں رکھا جاسکے۔ یا تا کہ سلمانؓ کے بیٹھنے کے لیے جگہ بن سکے۔ بعض لوگوں نے بسط کو انبساط کے معنی میں لیا ہے جس کے معنی کشادہ روئی ہیں۔ پھر ترجمہ یہ ہوگا کہ کشادہ رو ہو جاؤ۔ اور سلمانؓ سے دل لگی کی باتیں کرو۔ کیونکہ وہ بھی تمہاری جماعت کا بننے والا ہے۔ اور ایک روایت میں انشطوا آیا ہے جو نشاط سے ہے سرور کا معنی ہیں۔ صحابہؓ اکثر اوقات میں بھوکے رہتے تھے۔ پیٹ پر پتھر باندھتے ہوتے تھے۔ خصوصاً نبی کریم ﷺ کے اہل مجلس اصحاب صفہ جن کا ذریعہ معاش کچھ نہ تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اسی وجہ سے فرمایا کہ کھانے کی چیز ملی ہے خوش ہو جاؤ۔

ہدیہ میں دوسروں کو شریک کرنا: تمام صحابہ کرامؓ کو شریک فرما کر نبی کریم ﷺ نے اس بات کی تعلیم بھی دی ہے کہ اگر کسی کے پاس کوئی ہدیہ یا تحفہ وغیرہ آئے تو سارے کا سارا گھر نہ لے جائے بلکہ شاگردوں، دوستوں، اور ہم نشینوں کو بھی اس میں شریک کر لے۔ رسول اللہ ﷺ کے مکارم اخلاق یہی ہیں۔ اگرچہ فقہی اعتبار سے ہم مجلس لوگوں اور دوستوں کا حق تو نہیں ہے لیکن اخلاقی اقدار کی بات اور ہے۔ صوفی اور فقیہ کے مسلک الگ الگ ہیں۔ ایک بزرگ کے ساتھ مرید بیٹھے ہوئے تھے کسی نے ہدیہ پیش کیا۔ مریدوں میں سے کسی نے کہا کہ الہدایا مشترکہ تو انہوں نے سارا ہدیہ مریدوں کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا انا لانحب الشراک کہ ہم موحد ہیں۔ شرک پسند نہیں کرتے۔ دوسری طرف امام ابو یوسفؒ فقیہ ہیں۔ ایک دفعہ شاگردوں کے ساتھ بیٹھے تھے کسی نے ہدیہ پیش کیا۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا الہدایا مشترکہ آپ نے سختی سے منع کیا تا کہ یہ کہیں فقہی قانون نہ بن جائے (۱)۔ بہر حال یہ فقہی مسئلہ

(۱) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے من اللطائف ان الامام ابیوسف اتی بهدية من النقود فقليل له الهدایا مشتركة فقال اللام للهدای الہدایا من الرطب والزبيب وامثالهما (جمع الوسائل ۸۳/۱) اور علامہ بدرالدین العینیؒ نے لکھا ہے ان الرشید اهدى إليه ما لا كثيرا وهو جالس مع أصحابه فقليل له قال رسول اللہ ﷺ جلساؤکم شرکاؤکم فقال أبو یوسف أنه لم یرد فی مثله وإنما رد فیما خفت من الہدایا من الماکل والمشرب ویروی من غیر هذا الوجه أنه کان جالسا وعنده أحمد بن حنبل ویحییٰ بن معین فحضر من عند الرشید طبق وعلیه أنواع من التحف المثلثة (عمدة القاری ۲۳۳/۱) (مختار)

نہیں بلکہ اخلاق حسنہ کی بات ہے۔ عرب کا مقولہ ہے حدیث بھی نہیں ہے (۱)۔

سلمانؓ کا خاتم کا مشاہدہ: ثم نظر الى الخاتم على ظهر رسول الله ﷺ شرح حدیث میں ہے کہ تم کے کلمہ سے تراخی کا قاعدہ مقصود ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ تیسری علامت نبوت کا ظہور اسی موقع پر نہیں ہوا۔ بلکہ اسے دیکھنے کیلئے آپ نے انتظار کیا۔ کچھ عرصہ بعد نبی کریم ﷺ ایک انصاری کے جنازے میں شرکت کیلئے بقیع غرقہ گئے۔ حضرت سلمانؓ بھی حاضر ہو گئے اور نبی کریم ﷺ کی پیٹھ کی جانب بیٹھ گئے۔ نبی کریم ﷺ کو آپ کے ارادہ کا احساس ہو گیا۔ چنانچہ پیٹھ سے چادر ہٹا دی۔ آپ نے تیسری علامت کا مشاہدہ کیا اور اسی موقع پر ایمان لئے آئے۔

اس جملہ سے حدیث کی ترجمہ الباب سے مطابقت بھی واضح ہو گئی۔ وکان لليهود یعنی ایمان لاتے وقت آپ بعض یہودیوں کی ملکیت میں تھے جنہوں نے نبی کلب سے آپ کو خرید لیا تھا۔ حضرت سلمانؓ کی آزادی کیلئے شرائط: فاشتراه اشتراء سے حقیقی خریدنا مقصود نہیں کیونکہ حضرت سلمانؓ غلام ہی نہ تھے بلکہ کتابت مراد ہے یا یہ کہ فدیہ دے کر آزاد کرانا مراد ہے۔

بكذا وكذا درهمان دراهم کی مقدار دوسرے مقامات میں مفصل مذکور ہے۔ بعض روایات میں چالیس اوقیہ سونا ذکر ہے۔ ایک اوقیہ ساڑھے دس تولہ ہوتا ہے۔ اس حساب سے چالیس اوقیہ چار سو بیس تولے سونے کے برابر بنتا ہے۔

(۱) حدیث پاک میں اس قسم کے الفاظ تو نہیں البتہ ایسے الفاظ کتب احادیث میں مرفوعاً و موقوفاً دونوں طرح مروی ہیں جن سے یہی معنی مفہوم ہوتا ہے چنانچہ علامہ بدرالدین عینیؒ نے لکھا ہے ان جلساءہ شرکاءہ روی ہذا عن ابن عباس مرفوعاً و موقوفاً و الموقوف اصح اسناداً من المرفوع أما المرفوع فرواه البيهقي من حديث محمد بن الصلت حدثنا مندل بن علي عن ابن جريج عن عمرو بن دينار عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ من اهديت له هدية وعنده ناس فهم شركاؤه فيها ومندل بن علي ضعيف ورواه عبدالرزاق أيضا عن محمد بن مسلم عن عمرو بن ابن عباس مرفوعاً نحوه وعنده قوم واختلف علي عبدالرزاق عنه في وقفه ورفع المشهور عنه الوقف وهو اصح الروايتين عنه وله شاهد مرفوع من حديث الحسن بن علي في مسند إسحاق بن راهوية وآخر عن عائشة عند العجلي واسنادهما ضعيف أيضاً (عمدة

سلمانؓ کی آزادی یہود کی ساہوکاری: یہود نے بہت اونچے دام بتائے کیونکہ ان کی خواہش یہی تھی کہ سلمان ہماری خدمت کرنا رہے۔ اس میں زیادہ نفع ہے یہود بھی آخر بنیاء قوم ہے کسی کو یک رو پیہہ دیتے ہیں تو دس نچوڑ لیتے ہیں۔ اس وقت بھی یہود کے ساہوکاری نظام نے سارے عالم کو کھنجر میں گس دیا ہے۔ امریکہ میں یہ ظالم قوم بہت تھوڑی ہے لیکن ان کی معاشی گرفت کی وجہ سے امریکہ بے بس اور مجبور ہے تمام اقتصادیات، معاشیات اور بنکوں پر یہود کا قبضہ ہے۔ یہاں بھی وہ اپنے بنیاء پن کا پورا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ قیمت کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی لگاتے ہیں کہ سلمان یہود کیلئے تین سو کھجور کا درخت لگائے گا اور تب تک وہ آزاد نہیں ہو سکتا جب تک ان درختوں میں پھل نہ آئے، کھجور کا درخت بویا جاتا ہے تو بونے والے کے پوتوں کو کہیں اس کا پھل کھانے کو ملتا ہے۔ تیسری نسل میں جا کر یہ ثمر آور ہوتا ہے۔ یہود کب سلمانؓ کی طرح دیانتداری، متقی اور مخلص غلام سے دستبردار ہونے پر راضی تھے۔ وہ تو ہمیشہ کیلئے اسے کھنجر میں رکھ کر اس کا خون چوسنا چاہتے تھے۔ اسلئے قیمت کے ساتھ یہ غیر معقول شرط بھی لگائی کہ وہ مذکورہ تعداد میں کھجور بوئے گا۔ اور تب تک ان کی آبیاری، گوڈی وغیرہ اس کے ذمے ہوگی جب تک یہ بار آور نہ ہوں اور سلمانؓ جب اس پر قادر تھے۔ یہ تو نبی کریم ﷺ کا معجزہ تھا جو ظاہر ہونے والا تھا چنانچہ نبی کریم ﷺ نے سودا قبول کر لیا۔

یغرس: غرس زسری کو کہتے ہیں یعنی پودے لگانا، حدیث مبارک میں ہے کہ لا یزال اللہ یغرس لہذا الدین غرساً یستعملہم فی طاعنہ (۱)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ہر زمانہ میں اس دین کیلئے نئے نئے لوگ تیار کرائے گا جنہیں وہ اپنی اطاعت میں مصروف رکھے گا۔

اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے صحابہؓ کو سلمانؓ سے تعاون کا حکم دیا۔ چنانچہ انہوں نے تین سو پودے جمع کئے اور نبی کریم ﷺ نے خود جا کر پودے لگائے۔ آپ ﷺ کا لگایا ہوا باغ، آپ ﷺ کی نسبت کی وجہ سے آج تک مدینہ میں مشہور ہے۔ حجاج کرام وہاں زیارت کے لیے جاتے ہیں۔ مسجد نبوی ﷺ سے سات اٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ہم بھی گئے تھے اس وقت بھی بعض کھجوریں اس میں باقی تھیں۔

لوگ اس کا پھل محبت سے خریدتے تھے آج کل وہ باغات وغیرہ آبادیوں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ شہر وسیع ہو رہا ہے حتیٰ کہ جبل احد بھی اس میں آرہا ہے۔ شاید کچھ مدت بعد جبل احد کا صرف نام ہی رہ جائے۔

إلّا النخلة واحدة ہو سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عمرؓ کو کہہ دیا ہو کہ کھجور میں خود لگاؤں گا لیکن شاید انہوں نے یہ سوچا ہو کہ نبی کریم ﷺ کو تکلیف ہوگی۔ ان کا کچھ تو ہاتھ بٹانا چاہیے۔ بہر حال ایک پودا ان میں حضرت عمرؓ نے اپنے ہاتھ سے بویا۔

من عامھا یہ نبی کریم ﷺ کا معجزہ تھا کہ کھجور کے درخت صرف ایک سال میں پھل لے آئے لیکن جب ایک درخت پھل نہ لایا تو نبی کریم ﷺ نے پوچھا ما شان هذا النخلة اس کھجور کو کیا ہو گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ تو میں نے بویا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اسی وقت یا کسی دوسرے وقت اسے نکال کر دو بارہ بودیا اور وہ بھی پھل لے آیا۔ یہ شرط تو پوری ہو گئی۔ اور مقررہ قیمت اس طرح ادا ہوئی۔ کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس کچھ سونا لے آیا جو مطلوبہ مقدار سے کم تھا۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت سلمانؓ سے کہہ دیا جاؤ۔ اس مالک کے پاس یہ جاؤ اس نے کہا یہ تو کم ہے آپ ﷺ نے پھر فرمایا کہ تم لے جاؤ وہ لے گیا اور تول کر دیکھا تو پورا چالیس اوقیہ نکلا۔ اور حضرت سلمانؓ سونا دے کر آزاد ہو گئے۔

(۷) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ أَنَا بَشْرُ بْنُ الْوَضَّاحِ أَنَا أَبُو عَقِيلٍ

الدروقيّ عن أبي نصرَةَ العوفيّ قال سألت أبا سعيدٍ الخدريّ عن خاتم

رسول الله ﷺ يعني خاتم النبوة فقال كان في ظهره بضعة ناشرة (۱)۔

ترجمہ: ابو نصرۃ عوفی کہتے ہیں کہ میں نے ابو سعید خدریؓ سے نبی کریم ﷺ کی مہر

نبوت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ آپ ﷺ کی پشت مبارک پر گوشت

کا بھرا ہوا ٹکڑا تھا۔

ابو سعید خدریؓ کا مقام اور فضیلت: ابوسعید خدری الخ آپ کا نام سعد بن مالک بن سنانؓ

ہے۔ خدرہ بنو خزرج کی ایک شاخ ہے جس کی طرف آپؓ منسوب ہیں۔ آپؓ کے والد حضرت مالک بھی

(۱) مسند احمد ۶/۲۹۳ من طریق غیاث الکبریٰ عن ابی سعید (مختار)

انصاری صحابی ہیں۔ احد کے بعد کے غزوات میں شریک رہے۔ ۶۳ھ کو چوراسی سال کی عمر میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

بعضۃ ناشزۃ یہ کان کا خبر ہے جس کا اسم ضمیر خاتم نبوة کی طرف راجع ہے۔ جبکہ فی ظہور پہلی خبر ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ فی ظہور خبر ہو اور بعضۃ ناشزۃ حال ہو۔ بعض روایات میں بعضۃ ناشزۃ مرفوع بھی مروی ہے۔ اس طرح یہ کان کا اسم اور فی ظہور خبر ہوگا اور یہ احتمال بھی ہے کہ کان نامہ ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو۔ بہر حال اس حدیث میں خاتم نبوت کی کیفیت اور مقام کا ذکر ہے (۱)۔

(۸) حدثنا أبو الأشعث أحمد بن المقدم العجلي البصري

أنا حماد بن زيد عن عاصم الأحول عن عبد الله بن سرجس قال أتيت

رسول الله ﷺ وهو في ناس من أصحابه فدرت هكذا من خلفه

لعرف الذي أريد فالتقى الرداء عن ظهره فرأيت موضع الخاتم على

كفيه مثل الجمع حولها خيلان كأنها نائل فرجعت حتى استقبلته،

فقلت غفر الله لك يا رسول الله فقال ولك فقال القوم استغفر لك

رسول الله ﷺ فقال نعم ولكم ثم تلا هذا الآية واستغفر للمنك

وللمؤمنين والمؤمنات (الآية) (۲)

(۱) یہ بات تو مسلم ہے کہ مہر نبوت آنحضرت ﷺ کے دونوں شانوں کے مابین تھی مگر یہ بات اختلافی ہے کہ اس پر کچھ لکھا ہوا تھا یا نہیں؟ تو مستند روایات میں اس کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں ملتی۔ البتہ بعض روایات میں کچھ لکھا ہونے کا ذکر ملتا ہے اس لئے ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ اس مہر نبوت پر محمد، رسول، اللہ لکھا ہوا تھا اور بعض کا کہنا ہے کہ اس پر یا سر بانک المنصور لکھا ہوا تھا۔ دلائل النبوة میں ہے کہ حاکم نے تاریخ غیثا پوری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ اس پر گوشت سے محمد، رسول، اللہ لکھا ہوا تھا۔ اور محدث ابو نعیم نے حضرت سلمانؓ سے نقل کیا ہے اس کے اندرونی حصے پر اللہ وحدہ لا شریک له محمدرسول اللہ اور اوپر کے حصہ پر توجہ حیث شئت فانک المنصور لکھا ہوا تھا۔ (آفتاب نبوت کی کرنیں ص ۱۳۹) (مختار)

(۲) صحیح مسلم ۲/۲۵۹ کتاب الفضائل باب فی البات خاتم النبوة الخ بمسند احمد ۵/۸۴ (مختار)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن سرجس کہتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ نبی کریم ﷺ اس وقت صحابہؓ کی ایک جماعت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اس طرح آپ کی پشت کی جانب چکر لگایا۔ نبی کریم ﷺ میرا منشاء سمجھ گئے اور پشت مبارک سے چادر اتار دی۔ میں نے آپ ﷺ کے کندھوں کے درمیان مہر نبوت کی جگہ کو مٹھی کے ہم شکل دیکھا۔ جس کے ارد گرد تل تھے جو مسوں کے برابر دکھائی دیتے تھے۔ پھر میں واپس ہو کر نبی کریم ﷺ کے سامنے آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا، اور اللہ تیری مغفرت بھی فرمائے۔ لوگوں نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے تیرے لیے دعا مغفرت فرمائی۔ میں نے کہا۔ ہاں اور تم سب کے لیے بھی دعا کی۔ پھر حضرت عبداللہ نے یا نبی کریم ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ”اے رسول تم مغفرت کی دعا کرو۔ اپنے لئے بھی اور مؤمن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی۔“

عبداللہ بن سرجس: سرجس نرگس کی طرح جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے یہ حرنی (بنو حزن) صحابی ہیں۔ بنو مخزوم کی طرف بھی آپ کی نسبت ہوتی ہے۔ جو غالباً ان کا حلیف ہونے کی وجہ سے ہے۔ بصرہ میں رہا کرتے تھے۔ اس لئے بصری صحابہ میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

قدرت ہکذا من خلفہ دارید وردوران سے ہے اور ہکذا میں اس کیفیت کو بیان کرتے ہیں جس کیفیت سے راوی چکر لگا کر آئے تھے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ راوی حضرت عبداللہ ابن سرجس یہ حدیث مسجد نبوی ﷺ میں بیان کرتے ہوئے اس مکان کو اشارہ کر چکے ہوں۔ جہاں پر چکر کاٹ کر وہ نبی کریم ﷺ کی پشت مبارک تک پہنچے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ میں پیچھے سے آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے میرے تجسس کو محسوس کیا کہ میں خاتم نبوت دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ سامنے جگہ ہو اور پھر بھی کوئی قصد اچھے بیٹھے تو یہ تو یا ادا ہوتا ہے یا پھر کوئی خاص مقصد ہوتا ہے۔ علیٰ کفیفہ یعنی مہر کندھوں پر نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔ مثل الجمع اس روایت میں مہر کی مقدار اور کمیت بہت زیادتی لگتی ہے۔ کیونکہ مکا بڑا ہوتا

ہے لیکن درحقیقت یہ تحدید نہیں بلکہ تخمینی اور تقریبی اندازے ہیں۔ یا پھر مقصد یہ ہے کہ اس مہر کی بناوٹ اور کیفیت ممکنہ کی طرح تھی (۱)۔ حولہا خیلاں یعنی اس کے ارد گرد تل بھی تھے۔ خیلاں خال کی جمع ہے۔ پچھلے زمانہ میں ان کا رواج تھا سوئی چھو چھو کر جلد کے کسی حصہ کو زخمی کیا جاتا ہے پھر اس میں رنگ بھر دیا جاتا ہے۔ زخم ٹھیک ہو جانے پر نیلے اور سیاہ نشان بن جاتے ہیں ان نشانات کو خیلاں کہا جاتا ہے۔ لیکن مہر نبوت کے ارد گرد جو خال نما نشانات تھے وہ مصنوعی نہ تھے بلکہ قدرتی تھے۔ ثانیاً یہ ٹولول کی جمع ہے کبھی کبھی بدن کے بعض حصوں پر چھوٹے چھوٹے دانوں کی طرح چیزیں نکل آتی ہیں جو دائمی ہوتی ہیں، اسے ٹولول کہتے ہیں۔ اردو میں اسے مس یا بھٹنی کہا جاتا ہے۔ اس حدیث میں جو کیفیت مہر نبوت کی بیان ہوئی ہے وہ بھی دوسری روایتوں سے قدرے مختلف ہے جو کہ یا تو زمانہ کی تبدیلیوں کا اثر ہے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ کل شبہ بما سنع له فی رايہ تخمیناً لا تحلیداً یعنی جس کسی نے مہر نبوت دیکھی تو اسے جیسے نظر آیا بیان کر دیا۔ ان کا یہ قول تحدید نہ تھا بلکہ تخمین اور اندازے سے جو رائے قائم کی تھی وہی بیان کر دی ہے۔

نبی کریم ﷺ کے لیے دعائے مغفرت کیوں: فقلت غفر الله لك: خوشی، جذبات اور اظہار محبت میں دعا کی کہ اللہ تعالیٰ حیری مغفرت فرمائے۔ اپنے شیخ اور استاذ وغیرہ کو عموماً ایسے مواقع پر اس قسم کے الفاظ کہے جاتے ہیں۔ اور نبی کریم ﷺ کا یہ محض احسان تھا کہ جو مہر نبوت بڑی بڑی کتابوں میں مذکور تھی آپ ﷺ نے علامت کی زیارت کا موقع دیا تو اس احسان کا شکریہ ادا کرنے کیلئے صحابی دعا کرتے ہیں۔ ورنہ نبی کریم ﷺ تو بخشے بخشائے ہیں۔ لیغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر ويتم نعمته عليك (فتح. ۲)

”تا کہ اللہ تعالیٰ تیرے اگلے اور پچھلے سب گناہ معاف کر دے اور تم پر اپنی نعمت پوری فرمائے“ آیات اور نصوص اس پر ناطق ہیں کہ نبی کریم ﷺ معصوم اور مغفور ہیں۔ تو یہ دعائیہ کریم ﷺ کو بخشوانے (۱) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے قال حماد جمع الكف وجمع حماد كفہ وضم اصابعہم (جمع الوسائل ۸۸/۱) اب سوال یہ ہے کہ یہ تشبیہ کس لئے ہے۔ تو بعض کا کہنا ہے کہ یہ تشبیہ بیانِ نبوت کیلئے ہے اور بعض نے فرمایا ہے کہ یہ تشبیہ بیانِ مقدار کیلئے ہے۔ ملا علی قاریؒ نے زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ ويحتمل ان يكون تشبيهاً به في المقدار وان يكون تشبيهاً في الهيئة المجموعة وهو أنسب (جمع الوسائل ۸۸/۱) (مختار)

کے لئے نہیں بلکہ تشکر و امتنان کا اظہار ہے (۱)۔ اور جس طرح کہ ہم درود و سلام بھیجتے ہیں تو نبی کریم ﷺ کے درجات بلند ہوتے جاتے ہیں۔ اسی طرح ان دعاؤں سے آپ ﷺ کے درجات بلند ہوتے جاتے ہیں۔ نیز دعا کرنے والے کو اس کا اجر ملتا ہے جس طرح کہ صلوٰۃ و سلام کے اثرات واپس درود بھیجنے والے کو آتے ہیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک شخص لاکھوں ووٹ لے کر بظاہر منتخب ہو چکا ہے اس کے بعد کوئی اسے ووٹ دے یا نہ دے اس کی کامیابی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن بایں ہمہ ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ میرا ووٹ بھی اس کے ووٹوں میں شامل ہو اور اس کی حمایت کی سعادت مجھے بھی حاصل ہو جائے۔ اسی طرح اگر اس شخص کے ووٹ دس لاکھ کی بجائے گیارہ لاکھ ہو جائیں تو اس کی وقعت و مقبولیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ تو نبی کریم ﷺ پر روزانہ کروڑوں لوگ جو درود بھیجتے رہتے ہیں اس سے آپ ﷺ کے درجات بلند ہوتے ہیں اور آپ ﷺ کو جو دعائیں دی جاتی ہیں وہ بھی رفع درجات کا سبب بنتی ہیں۔

عصمتِ انبیاء: انبیاء تو معصوم ہیں اور اگرچہ ان کے بعض اعمال کو ذنوب کا نام دیا جاتا ہے لیکن وہ بھی حقیقتاً گناہ نہیں بلکہ محض مجازی طور پر ترکِ اولیٰ کو ذنب کہا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نہایت قرب کی وجہ سے انبیاء کے لئے ترکِ اولیٰ بھی عیب سمجھا جاتا ہے۔ حسنات الابرار سیئات المقربین

مقرب جتنا قریب ہوتا ہے اتنی ہی اس کی ذمہ داری بھی بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔

نزدیک کے لوگوں کی معمولی نافرمانی شاق گزرتی ہے اور اگر کوئی سرکش و نافرمان ہے تو اس کی نافرمانی پر اتنا دکھ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کے مقرب ترین بندے چونکہ انبیاء ہیں۔ لہذا ان سے خلافِ اولیٰ کام (۱) بعض نے یہ کہا ہے کہ نبی سے کبھی کبھار خلافِ اولیٰ کام اور اجتہادی خطا ہو جاتی ہے تو اس پر استغفار کرنے کو کہا گیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ نبی کا استغفار کرنا امت کی تعلیم کیلئے ہوتا ہے کہ جب نبی معصوم ہے تو وہ استغفار کرتے ہیں تو امت تو خطاؤں کا پتلا ہے تو اس کا زیادہ حق ہے کہ وہ اللہ کے دربار میں اپنے گناہوں کی معافی مانگے۔ اور بعضوں کا کہنا ہے کہ نبی طاعت اور نیکیوں پر استغفار کرتے تھے کہ جو اللہ تعالیٰ کا حق اطاعت ہے اور نیکی کا وہ اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان ادا نہ ہو سکا۔ (مختار)

یا زلہ و لغزش سرزد ہو تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس پر ذنب کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن اس ذلت میں دوام نہیں ہوتا، لغزش کا معنی یہی ہے کہ آدمی جب گرنے لگتا ہے تو فوراً اپنے نفس کی جانب سے اس کی تنبیہ ہوتی ہے اور اس حالت پر استقرار نہیں رہتا۔ جسم کا اعصابی نظام نہایت تیز ہے معمولی بے قاعدگی پر ہزاروں اعصاب بیدار ہو جاتے ہیں اور بجلی کی کرنٹ کی طرح جسم کا ہر حصہ چوکنا ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر کہیں جلد کے کسی حصے میں سوئی چبھ جائے تو دماغ فوراً دفاعی اقدام کا بندوبست کرتا ہے۔ ٹھوکر کھاتے ہی آدمی فوراً منجھلنے کا بندوبست کرتا ہے۔ اسی طرح نبی کا خلاف اولیٰ کام بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ ہوتی ہے تو توبہ کا حکم اور فوراً ہی بخشش کا اعلان بھی ہوتا ہے۔

یہ تشریح اس احتمال پر ہے کہ جملہ دعائیں ہو۔ اور یہ بھی محتمل ہے کہ یہ جملہ خبریہ ہو۔ اور معنی یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی بخشش فرما چکے ہیں۔ جس طرح نصوص اس پر شاہد ہیں۔ لیکن پہلا احتمال راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ بعد کا کلام ”ولک“ یقیناً دعائیہ کلمہ ہے جو کہ راوی کے لیے نبی کریم ﷺ نے ادا فرمایا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی دعائے استغفار کرنے پر صحابہ کو رشک: فقال ولک یہ خوش قسمت صحابی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے جن کے لئے مغفرت کی دعا نکلتی ہے۔ اس نے بھی نبی کریم ﷺ کو دعا دی تھی۔ اور نبی کریم ﷺ نے احسان کا بدلہ احسان سے دیا۔ اھل جزاء الاحسان الا احسان بلکہ نبی کریم ﷺ نے بہتر بدلہ دیا۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کی دعا سے بڑی نعمت کوئی نہیں۔ گویا نبی کریم ﷺ نے دعا کا جواب دے کر اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو بھی ملحوظ رکھا۔

واذا حییتکم بتحیة فحیوا باحسن منها اور کدھا (نساء ۵۷)

فقال القوم: نبی کریم ﷺ کی معمولی توجہ اور عنایت بڑی سعادت ہے اس لئے سب لوگوں نے حضرت عبداللہ بن سرجس کو مبارکباد دیں۔ کہ تم خوش قسمت ہو کہ پیغمبر ﷺ نے آپ کے حق میں استغفار کیا۔ یا معنی یہ ہے کہ بعد میں حضرت عبداللہ جن لوگوں کو یہ واقعہ بیان کر رہے تھے انہوں نے یہ سوال کیا تو آپ نے فرمایا نعم ولکم صحابی نے جواب میں کہا کہ ہاں میرے لئے تو دعا ہوئی لیکن مایوس نہ ہونا تمہارے لیے مغفرت کی دعا کی ہے۔ بلکہ ہر وقت کرتے رہتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاسْتَغْفِرْ لِلنَّبِيِّ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ (محمد ۱۹)

ترجمہ: پس جان لو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنے گناہوں کی بخشش طلب کر اور مومن مردوں اور عورتوں کے لئے بخشش طلب کر۔

ایک اور مقام پر فرمایا کہ فاعف عنهم واستغفر لهم وشاورهم فی الامر (آل عمران ۵۹)

دوسری جگہ ارشاد ہے کہ واستغفر لهم اللہ اِنَّ اللہ غفور رحیم (نور ۶۲)

ترجمہ: اور ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ بہت مغفرت اور رحم کرنے والا ہے۔

نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ وہ اپنے ساتھ مومنین اور مومنات کے لئے بھی دعائیں اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے امر ہے تو آپ ﷺ ضرور اس پر عمل بھی کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ شانہ ان يستغفر لی ولکم نبی کریم ﷺ کا مقام یہی ہے کہ وہ میرے لئے اور تمہارے لئے دعا کریں گے۔ وہ اس سعادت سے کسی کو محروم نہیں کرتے۔

معراج میں مکالمہ کا کلمات تشہد میں اعادۃ: تمام امت کے لئے آپ ﷺ کی غم خواری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ معراج کے موقع پر جب دربار رب العزت میں پیش ہوئے نہایت جامع انداز میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی فرمایا: التحیات لله والصلوات والطیبات تمام لسانی بدنی اور مالی عبادتیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔

اللہ نے جواب دیا السلام علیک ورحمة اللہ وبرکاتہ

یعنی اے پیغمبر اللہ تعالیٰ کی سلامتی رحمت اور برکتیں تجھ پر ہوں۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے خطاب خاص یعنی علیک کا صیغہ لایا لیکن آپ کی شان کریم نے یہ

برداشت نہ کیا کہ اس سعادت سے دوسرے بندے محروم رہیں۔ لہذا فرمایا کہ

السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین

مجھ پر اور اللہ تعالیٰ کے تمام نیک بندوں پر سلامتی ہو۔

عباد اللہ الصالحین میں دوسرے انبیاء کرام اور فرشتے بھی داخل ہو جاتے ہیں چنانچہ جب انہوں نے آپ ﷺ کی یہ رحمت و شفقت دیکھی تو وہ سب یک زبان ہو کر بولے،
 اشهد أن لا اله الا الله واشهد أن محمداً عبده ورسوله
 سب نے اعتراف کیا کہ عہدیت و رسالت کے اہل اور اس منصب جلیلہ اور فضیلت کے لائق شخصیت نبی کریم ﷺ کی ہے۔ یہ یادگار مکالمہ تشہد کے طور پر محفوظ ہو کر جزو نماز بن گیا اور قیامت تک دہرایا جائے گا۔

بہر حال صحابی کا مقصد یہاں بھی یہی ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی امت کو دعائے مغفرت سے محروم نہیں کرتے۔

ثم تلا هذه الآية یعنی جب صحابی نے نعم ولكم کہہ کر حاضرین کے لئے نبی کریم ﷺ کے استغفار کا دعویٰ کیا تو استشہاد کے لئے یہ آیت پیش کر دی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خود اس آیت کو پیش کر کے صحابی کے اس دعوے کی تصدیق کر دی ہو۔ واللہ اعلم

۳: باب ماجاء فی شعر رسول اللہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے بالوں کا بیان

شعر اور شعرة (۱) یعنی سکون عین فتح عین دونوں درست ہیں اس کا واحد شعرة آتا ہے۔ گزشتہ ابواب میں نبی کریم ﷺ کے بالوں کے بارے میں ضمناً کافی بحث ہو چکی ہے اب اس سلسلے میں امام ترمذی مستقل باب لا رہے ہیں۔ اس باب میں دراصل بالوں کی مقدار، کثرت و طول کا بیان مقصود ہے۔ علامہ ابن عربی نے بال بڑھانے کو سنت اور منڈھانے کو بدعت کہا ہے (۲) لیکن جمہور کے نزدیک سر کے بال منڈھوانا بھی جائز ہے۔ جس طرح کہ صحابہ سے منقول ہے۔ اس باب میں آٹھ احادیث کا ذکر ہے۔

(۱) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ حَجْرٍ أَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ عَنْ حَمِيدٍ عَنْ

أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ شَعْرُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ إِلَى نِصْفِ أُذُنِهِ (۳)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے بال مبارک کانوں کے

نصف تک تھے۔

بالوں کی مقدار میں اختلاف: الی نصف اذنیہ اس حدیث میں کانوں کی نصف تک کا ذکر

ہے۔ بعض دوسری روایات میں ”شحمة اذنیہ“ یعنی کانوں کی لوٹک، بعض میں وفرة اور جمہ کے درمیان اور بعض میں حتمہ کی تصریح ہے۔ پہلے مرحلہ پر وفرة دوسرے میں لمة اور تیسرے میں جمہ کہلاتے ہیں اور اس کی ترتیب لفظ و ج کے مطابق ہے۔ بظاہر ان احادیث میں تعارض معلوم ہو رہا ہے لیکن ان میں تطبیق ممکن

(۱) شعر بفتح الشین جس کی جمع شعرات آتی ہے جس کا معنی ہے بال اور یکسر الشین سمجھ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی سے شاعر ہے اسلئے کہ شاعر میں عام لوگوں کے مقابل احساس زیادہ ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے وما یبشعرون کہ ان میں شعور نہیں (مختار)

(۲) قال ابن العربی والشعر فی الرأس زينة وتروكه سنة وحلقه بدعة وحالة مذمومة جعلها المصطفى شعار الخوارج ففی الصحيح عن ابی سعید أن النبی ﷺ ذکر قوماً یكونون فی ائنه ینخرجون فی فرقة سیماھا التحقیق (شرح الشمائل للمناوی علی هامش جمع الوسائل ج ۱ ص ۹۰) (مختار)

(۳) صحيح مسلم ۲/۲۵۸ باب صفة شعر النبی ﷺ کتاب الفضائل و سنن ابی

داؤد ۲/۲۲۰ کتاب الترجل باب ماجاء فی الشعر (مختار)

ہے۔ اس طرح کہ نبی کریم ﷺ نے زندگی میں کئی بار سرمندھوایا ہے۔ مثلاً صلح حدیبیہ، عمرۃ القضاء، اور حجۃ الوداع میں تو آپ ﷺ سے حلق ثابت ہے۔ بخاری اور مسلم کی روایات کے مطابق صرف ایک دفعہ آپ ﷺ سے قصر بھی ثابت ہے۔ پھر آپ ﷺ احرام سے نکلتے وقت حلق کو پسند بھی فرماتے تھے۔ اسی لئے سرمندھانے والوں کو آپ ﷺ نے دعا فرمائی۔

رحم اللہ المحلقین (۱) اللہ تعالیٰ بال موٹھ ہنے والوں پر رحم فرمائے۔

لہذا قاضی عیاضؒ اور امام نوویؒ وغیرہ محققین کی رائے کے مطابق یہ اختلاف دراصل اختلاف زمانہ پر مبنی ہے۔ اور ”کُلُّ رَوٰی حَسْبَ رَوٰیہِمْ“ یعنی ہر راوی نے روایت اپنے مشاہدہ کے مطابق کی ہے۔ جس نے جس حالت میں نبی کریم ﷺ کی بالوں کو دیکھا اسی مقدار میں بیان کیا۔ مثلاً حلق الواس کے کچھ مدت کے بعد بال کانوں تک بڑھے۔ کسی نے دیکھ کر اس حالت کی روایت کی۔ پھر کچھ مدت بعد کانوں کے درمیان تک بڑھے۔ تو بعض صحابہ نے اس کو دیکھا اور اس کو روایت کیا۔ اسی طرح بعد میں بال بڑھتے رہے۔ تو کسی نے بالوں کو کانوں کی لوڈوں تک بڑھنے کا مشاہدہ کیا۔ کسی نے لمہ کو دیکھا اور کسی کو جھہ نظر آیا (۲)۔ اور جو دیکھا وہی بیان کیا۔ لہذا اور حقیقت یہاں کوئی تعارض نہیں۔ بلکہ آپ ﷺ کے بال ان تمام کیفیات سے گزر چکے ہیں (۳)۔

(۱) جامع ترمذی ۱ / ابواب الحج۔ باب ماجاء فی الحلق والتقصیر ۱۱۱۔

(۲) اور ملا علی قاریؒ نے قاضی عیاض کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ کے سر کے اگلے حصے کے بال نصف کان تک پہنچتے تھے اور وسط سر کے بال اس سے نیچے اور آخر حصے کے بال اس کے نیچے پہنچ جاتے تھے (آفتاب نبوت کی کرنیں ص ۱۳۳) (مختار)

(۳) مگر کندھوں سے بال بڑھانا منع ہے اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خرمیؓ کے بارے میں فرمایا کہ خرمی کیا ہی اچھا آدمی ہے کاش اس کے بال لمبے اور ازار نہ لگتے جب حضرت خرمیؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے بالوں کو کاٹ کر کان کی لو تک کر لیا اور ازار کو نصف پنڈلیوں تک کر لیا (ابن سعد بحوالہ آفتاب نبوت کی کرنیں ص ۱۵۲) اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا معمول تھا کہ وہ جھہ کے دن محافظین کو مساجد کے دروازوں پر متعین کیا کرتے تھے کہ وہ لوگوں کے لمبے لمبے بال کاٹ دیں عن اسامة قال کان عمر بن عبدالعزیز اذا کان یوم الجمعة بعث الاحرام فیاخلون بابواب المسجد ولا یجدون رجلاً موقراً الشعر یعنی مبلر الشعر الاجزواہ (مصنف ابن ابی شیبہ ۶۰/۶) (مختار)

(۲) حدثنا هناد بن السرى انا عبد الرحمن بن أبى الزنا دعن هشام بن عروة عن ابيه عن عائشة رضى الله عنها قالت كنت اغتسل انا ورسول الله ﷺ من اناء واحد وكان له شعر فوق الجمرة و دون الوفرة (۱)۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں اور نبی کریم ﷺ ایک ہی برتن میں سے غسل کیا کرتے تھے اور نبی کریم ﷺ کے بال جمہ سے اوپر اور وفرة سے کم تھے۔

حضرت عائشہؓ: أم المؤمنين حضرت عائشة صدیقة بنت ابی بکر الصدیق کی والدہ کا نام ام رومان تھا۔ ۴ نبوی کو مکہ میں ولادت ہوئی۔ اور ہجرت سے تین سال قبل شوال ۱۰ نبوی کو نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آئیں۔ اور نو سال کی عمر میں شوال ۳ھ کو نبی کریم ﷺ کے گھر منتقل ہو گئیں۔ نبی کریم ﷺ کے پاس نو سال تک رہیں۔ آپؐ کے سوا کوئی کنواری عورت نبی کریم ﷺ کے نکاح میں نہیں آئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو علم و فضل، تفقہ اور فراست سے نوازا تھا۔ عرب کے بہت سے واقعات اور اشعار بھی یاد تھے۔ مطلق مسائل میں فقہاء صحابہ کرام عموماً آپؐ سے رجوع فرماتے تھے (۲)۔ نبی کریم ﷺ کو آپؐ سے بہت محبت تھی۔ اور آپ ﷺ پیار سے حمیرا کے نام سے آپؐ کو یاد فرماتے۔ اور دوسری بیویوں پر آپؐ کی فضیلت کا کئی بار ذکر کیا تھا واقعہ افک میں اللہ تعالیٰ نے خود آپؐ کی برآمدت کا اعلان فرمایا۔ اور اس طرح آپؐ کی پاکدامنی کا تذکرہ قیامت تک جاری رہے گا۔ آپؐ کے مناقب کا سلسلہ بہت طویل ہے۔ صحابہؓ اور تابعینؓ نے آپؐ سے ۲۴۱۰ احادیث روایت کی ہیں (۳)۔ مدینہ طیبہ میں سترہ رمضان المبارک ۵۷ھ کو وفات پائی بعض روایات میں ۵۶ھ اور بعض میں ۵۸ھ کا ذکر ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے نماز جناہ پڑھائی اور آپؐ کی وصیت کے مطابق رات کے وقت جنت البقیع میں آپؐ کی تدفین عمل میں آئی۔

(۱) جامع ترمذی ۳۰۳/۱ کتاب اللباس باب ماجاء فی الجمرة واتخاذ الشعر وابوداؤد ۲۲۰/۲

کتاب الترجل باب ماجاء فی الشعر (مختار)

(۲) کان فقہاء اصحاب رسول اللہ ﷺ يرجعون إلیہا (تذکرة الحفاظ ۲۷۱/۲) (مختار)

(۳) اور صرف بخاری شریف میں آپؐ سے ۱۲۴۲ احادیث مروی ہیں۔ (مختار)

ان کی سوانح کے لئے مؤرخ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی کی تصنیف سیرۃ عائشہ کا مطالعہ بہت مفید رہے گا (۱)۔

ایک برتن سے غسل: قالت كنت اغتسل أنا و رسول اللہ ﷺ من اناء واحد ام المؤمنين حضرت عائشہ کا مقصد اس جملہ سے دراصل قرب کا اظہار ہے (۲) اور اس بات پر تنبیہ ہے کہ میں قریب سے مشاہدہ کرنے کے بعد نبی کریم ﷺ کے بالوں کی کیفیت بیان کرنے والی ہوں۔

اس زمانہ میں یہ غسل خانہ، ٹب، سبیل اور نلکے وغیرہ نہیں تھے بلکہ آج کل بھی بعض پسماندہ علاقوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہی حالت ہے۔ ایک بڑا برتن پانی سے بھر دیا جاتا ہے۔ اسی سے وضو، غسل اور دھونے دھلانے کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے بھی ایک برتن سے حضرت عائشہ کے ساتھ غسل کیا۔

ضرورت اور حیا کی پاسداری: منکرین حدیث اگرچہ خود تو بے حیائی کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن حدیث میں جب کوئی معمولی سی بے تکلفی کی بات دیکھتے ہیں۔ زبانیں کھول دیتے ہیں کہتے ہیں کہ اس قسم کی بے حیائی نبی کریم ﷺ کی شان کے منافی ہے۔ لہذا ایسی احادیث قابل قبول نہیں۔ حالانکہ مذکورہ اور اس قسم کی احادیث میں عیب کی کوئی بات نہیں۔ خاوند اور بیوی میں کیا پردہ ہوتا ہے؟ ان کے لیے ایک جگہ کھانا، پیٹا، سونا، نہانا کوئی عیب نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ هن لباس لكم وانتم لباس لهن (بیویاں تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کیلئے لباس ہو) ایک ہی برتن سے دونوں کا نہانا اجماعاً جائز ہے۔ اگر ایک ہی کپڑے میں برہنہ ہو کر سونا جائز ہے تو ایک جگہ نہانے کی اجازت کیوں نہیں۔ مزید یہ کہ نبی کریم ﷺ نے کمال حیا کی جو مثالیں قائم کی ہیں اس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ حتیٰ کہ خود حضرت عائشہ فرماتی ہیں ما رأیت من رسول اللہ ولا رأی منی۔ یعنی کمال اختلاط کے باوجود کبھی بھی ہم میں

(۱) حضرت عروہ بن زبیر نے کہا ہے ما رأیت احداً من الناس أعلم بالقرآن ولا بفرضية ولا بحلال وحرام ولا بشعرو ولا بحديث العرب ولا انساب من عائشة (تذکرة الحفاظ ۲۸/۱) (مختار)

(۲) اسلئے ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے افادت الحکایة الماضية بصیغة المضارع استحضاراً للصورة المتقدمة وإشارة الى تکراره واستمراره ای اغتسلت مکرراً (جمع الوسائل ۹۱/۱) (مختار)

سے کسی نے دوسرے کی شرمگاہ نہیں دیکھی۔ حالانکہ میاں بیوی کیلئے ان امور سے بچنا مشکل ہوتا ہے۔ لہذا آپ کی عادت شریفہ کو ملحوظ رکھ کر یہ کہنا قرین قیاس ہے کہ یہاں بھی دونوں کوئی کپڑا باندھ کر نہا رہے ہونگے یا پھر دونوں کے درمیان پردہ حائل ہوگا۔ آجکل بھی یہ رواج ہے کہ جہاں غسل خانہ میسر نہیں تو غسل کی فوری ضرورت پورا کرنے کیلئے کوئی کپڑا وغیرہ لگا کر پردہ بنایا جاتا ہے۔ اور اگر چہ ہنہ حالت میں بھی میاں بیوی کیلئے اکٹھے نہانا کوئی شرعی عیب نہیں۔ لیکن مجسمہ حیاء نبی کریم ﷺ کی ذات ہے جو کہ عزیمت اور استحباب کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ یہ بعید ہے بہر حال اکٹھا نہانے کے باوجود بے پردگی کا احتمال نہیں ہے۔

اکٹھے اور یکے بعد دیگرے نہانے کا حکم: فقہی لحاظ سے بھی دونوں میاں بیوی کا

اکٹھے نہانا بالاجماع جائز ہے۔ ہاں تقدیم و تاخیر کی صورت فقہاء کے نزدیک محل بحث ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے ہاں بیوی پہلے نہائے اور خاوند بعد میں یہ بھی جائز ہے (۱)۔ اور بیوی بعد میں نہائے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ ہاں کسی غیر محرم عورت کے تنہا نہانے کے بعد اس کے باقی ماندہ پانی سے احتیاطاً احتراز کرے۔ جبکہ امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک یہ صورت جائز نہیں۔ کیونکہ اس طرح غلط خیالات کا احتمال پیدا ہوتا ہے اور عورت سے بچے ہوئے پانی سے نہانے کی صورت میں خیالات و تصورات میں ہیجان پیدا ہوتا ہے جو کہ خطرناک ہے یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایسی عورت پر جو خوشبو لگا کر گھر سے نکلی ہو زانیہ کا حکم لگایا ہے (۲)۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ اس عورت کے پیچھے شیطان لگا ہوا ہوتا ہے۔ استعشر فہا الشیطان (الحديث) بہر حال سد ذرائع معصیت کیلئے اس قسم کا احتیاط فقہاء سے منقول ہے کہ مرد کسی غیر عورت کے باقی ماندہ پانی سے غسل نہ کرے۔

جمہ اور وفرہ کا معنی: فوق الجمعة و دون الوضوء نبی کریم ﷺ کے ہالوں میں تین قسم کی

روایات منقول ہیں۔ بعض میں وفرہ بعض میں لمہ اور بعض میں جمہ کا ذکر ہے۔ مذکورہ الفاظ کے بارے میں

(۱) امام مالک اور امام شافعی بھی امام صاحب کے ساتھ ہیں اور اس صورت کو جائز سمجھتے ہیں (حاشیہ السنن ۲/۲۸۲) مختار

(۲) عن أبي موسى الأشعري أنما امرأة استعطرت فمرت على قوم ليجدوا من ريحها فهي زانية.

(سنن نسائی ۲/۲۸۶ کتاب الزينة باب ما يكره للنساء من الطيب) (مختار)

جمہور اہل لغت کا قول یہ ہے کہ وفرہ وہ بال ہیں جو کانوں کی لوؤں تک پہنچیں۔ اس سے کچھ نیچے ہوں تو اسے لمحہ کہتے ہیں اور کندھوں تک بڑھ کر پہنچ جائیں تو جمعة کہا جاتا ہے۔ بعض نے کانوں سے بڑھے ہوئے بالوں کو جمہ اور کندھوں کو چھونے والے بالوں کو لمحہ کہا ہے مگر صحیح قول جمہور اہل لغت کا ہے۔

اس حدیث میں ”فوق الجمعة و دون الوفرة“ کا ذکر ہے (۱) اس جملے کا ایک معنی تو یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ کے بال جمہ سے اوپر یعنی اس سے لمبے اور وفرة سے کم یعنی چھوٹے تھے۔ مگر جمہ اور وفرہ کے مذکورہ معانی کو مد نظر رکھا جائے تو یہ تشریح درست معلوم نہیں ہوتی۔ لہذا اس مقام پر مقدار میں فوقیت یعنی لمبا ہونا مراد نہیں۔ بلکہ ”فوق الجمعة“ سے مراد محل کے اعتبار سے فوقیت یعنی اونچا ہونا مراد ہے۔ جبکہ ”دون الوفرة“ کا معنی انزل من الوفرة یعنی وفرہ سے لمبا ہونا مراد ہے اس طرح حضرت عائشہ کے اس جملے کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ آپ ﷺ کے بال جمہ سے اونچے یعنی چھوٹے تھے۔ اور وفرہ سے نیچے یعنی لمبے تھے۔ گویا اس وقت آپ ﷺ کے بال لمہ کی حالت میں تھے۔

ابوداؤد اور ابن ماجہ کی ایک روایت میں اس کی تصریح موجود ہے۔ چنانچہ وہاں الفاظ اس طرح

(۱) جبکہ ابوداؤد شریف میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کان شعر رسول اللہ ﷺ فوق الوفرة دون الجمعة (سنن ابی داؤد ۲/۲۲۰ کتاب الترجل باب ماجاء فی الشعر) تو ان دونوں روایات میں بظاہر تعارض ہے اس تعارض کو حل کرنے کیلئے علامہ احمد عبد الجواد الدونی لکھتے ہیں وهذه الرواية تخالف رواية ابی داؤد (فوق الوفرة دون الجمعة) لعل الجمع بينهما ان تقول ان رواية ابی داؤد بالنسبة لكثرة الشعر و رواية الترمذی بالنسبة لوصول الشعر قال ابن حجر وهو جمع جيد (الاحتفالات ص ۶۵)

اور ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ فوق اور دون دونوں کے معنی دونوں میں الگ الگ لے جائیں ابوداؤد کی روایت میں فوق کے معنی زائد اور دون کے معنی کم یعنی ناقص لئے جائیں۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ وفرہ سے زائد اور جمہ سے کم ان دونوں کے درمیانی درجہ تھا۔ یعنی لمہ اور ترمذی کی روایت میں فوق کے معنی اوپر لئے جائیں اور دون کے معنی اسفل لئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کے بال جمہ سے ذرا اونچے اور وفرہ سے ذرا نیچے تھے۔ تو اس کا مصداق بھی لمہ ہے (الدر المنصور شرح ابی داؤد ۶/۲۱۲) اس لئے کہ فوق اور دون اضداد میں سے ہیں تو گویا دونوں روایات کا معنی ہے

کان شعره متوسطاً بین الجمعة والوفرة (المواهب الللیة ۴۶) (مختار)

ہیں ”فوق الوفرة دون الجمعة“ جن کا معنی یہ ہے کہ وفرہ سے بڑھے ہوئے اور جمہ سے چھوٹے تھے۔ چنانچہ وہاں پر فوق الوفرة کا معنی اکبر من الوفرة اور دون الجمعة کا معنی اقل من الجمعة ہوگا۔ پھر یہ مقدار بھی بعض احوال پر محمول ہوگی کیونکہ روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ کے بال کندھوں تک پہنچ جاتے تھے۔ یعنی بعض حالات میں بال کنگھی کرنے کی وجہ سے یا ویسے وقت گزر جانے کے سبب لمبے ہو کر کندھوں کو چھونے لگتے تھے۔

(۳) حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مَنِيعٍ أَنَا أَبُو قَطْنٍ أَنَا شُعْبَةُ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ عَنْ

الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَرْبُوعًا بَعِيدَ مَا بَيْنَ

الْمَنْكِبَيْنِ وَكَانَتْ جُمَّتُهُ تَضْرِبُ شَحْمَةَ أُذُنَيْهِ (۱)

ترجمہ: حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ میانہ قد آدمی تھے۔

آپ ﷺ کے دونوں کندھوں کے درمیان وسعت تھی۔ آپ ﷺ کے بال کانوں

تک ہوتے تھے۔

كانت جُمَّتُهُ تَضْرِبُ شَحْمَةَ أُذُنَيْهِ: حمہ سے اگر وہ عربی معنی مراد ہو جو پہلے گزر چکا ہے تو

مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کے جمہ کا بڑا حصہ کانوں تک پہنچتا تھا۔ اور کچھ بال کندھوں تک بڑھے ہوئے

ہوتے تھے۔ اور اگر صرف کانوں تک پہنچنا مراد ہو تو پھر جمہ اس مقام پر وفرة کے معنی میں مستعمل ہے۔ لہذا

کوئی اشکال نہیں ہوگا جبکہ بعض لوگوں نے جمہ کو مطلق بالوں کے معنی میں بھی لیا ہے۔ پھر معنی یہ ہوگا کہ آپ

ﷺ کے بال کانوں کی لوت تک پہنچتے تھے۔ پہلے باب میں اس کے بارے میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔

حدیث کے بقیہ حصوں کی تشریح بھی پہلے باب میں گزر چکی ہے۔

(۴) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ أَنَا وَهَبُ بْنُ جَرِيرٍ بْنُ حَازِمٍ ثَنِي أَبِي عَنْ

قَتَادَةَ قَالَ قُلْتُ لِأَنْسٍ كَيْفَ كَانَ شَعْرُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَمْ يَكُنْ

(۱) سنن ابی داؤد ۲۵۰/۲۲۰ باب ماجاء فی الشعر کتاب الترجل، صحیح ابن حبان ۲۸/۸ باب

صفته ﷺ و أخبان شرح السنة للبغوی ۱۳/۲۲۲ باب صفة النبی ﷺ (مختار)

بالجعد ولا بالسبط كان يبلغ شعره شحمة اذنيه (۱)

ترجمہ: حضرت قتادہؓ کہتے ہیں میں نے حضرت انسؓ سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کے بال کیسے تھے۔ انہوں نے فرمایا نہ بالکل گھنگریالے تھے اور نہ بالکل ہموار۔ آپ ﷺ کے بال کانوں کی لو تک پہنچتے تھے۔
اس حدیث کی تشریح بھی باب اول میں گزر چکی ہے۔

(۵) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَى بْنُ أَبِي عَمْرٍو الْمَكِّي أَنَا سَفِيَانُ بْنُ

عِيْنَةَ عَنْ ابْنِ أَبِي نَجِيحٍ عَنْ مُجَاهِدٍ (۲) عَنْ أُمِّ هَانِيٍّ بِنْتِ أَبِي طَالِبٍ

قَالَتْ قَدِمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَيْنَا بِمَكَّةَ قَدْعَةً وَلَهُ أَرْبَعُ غَدَائِرَ (۳)

ترجمہ: حضرت ام ہانیؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ مکہ مکرمہ تشریف لائے تو آپ ﷺ کے بال مبارک چار حصوں میں گندھے ہوئے تھے۔

امّ ہانیؓ: آپ کا نام فاختہ، عاتکہ یا ہند تھا۔ ابو طالب کی بیٹی اور نبی کریم ﷺ کی چچا زاد بہن

تھیں فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئیں۔ مسجد حرام کے قریب ہی گھر تھا۔ نبی کریم ﷺ ان کا بڑا احترام کیا

(۱) ابوداؤد ۲۵۰/۲۲۰ باب فی الرجل یعقص شعره کتاب الترجل، سنن ابن ماجہ ص ۲۵۸ کتاب اللباس باب اتخاذ الجعّة والذوائب، مصنف ابن ابی شیبہ ۵۸/۶ باب فی اتخاذ الجعّة والشعر کتاب اللباس والزینة (مختار)

(۲) اس روایت کو حضرت مجاہد بن جبر نے ام ہانیؓ سے روایت کیا ہے جب کہ امام بخاریؒ فرماتے ہیں لا نعرف لمجاهد سماعاً من امّ ہانی البتہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فتح الباری باب الجعد میں فرماتے ہیں رجال هذا الحديث ثقات واخرجه ابوداؤد ايضا وقال في موضع اخرجه ابوداؤد الترمذی بسند حسن۔ تو ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں القول ولا منافاة اذا العلة التي ذكرها البخاري انما تمنع الصحة عنده (جمع النوازل ۹۵/۱) (مختار)

(۳) ابوداؤد کے کتاب الترجل باب فی الرجل یعقص شعره رقم حدیث ۳۱۸۵ میں بھی روایت کچھ اضافی کلمات کے ساتھ مروی ہے عن مجاهد قال قالت امّ ہانیؓ قدم النبی ﷺ الی مکة وله اربع غدائر تعنی عقائص ۵۱۔ مگر علامہ ابی طیب محمد بن الحق عظیم آبادیؒ نے تعنی عقائص کے اضافہ کے بارے میں لکھا ہے وهو تفسیر من بعض الرواة یہ حدیث مصنف ابن ابی شیبہ ۵۷/۶ کتاب اللباس والزینة باب فی اتخاذ الجعّة والشعر میں بھی موجود ہے (مختار)

کرتے تھے۔ فتح مکہ کے دن نبی کریم ﷺ نے اعلان کیا تھا کہ ام ہانی کے گھر میں پناہ لینے والوں کیلئے بھی امن ہے نبی کریم ﷺ نے انہیں نکاح کا پیغام بھی دیا تھا مگر انہوں نے معذرت ظاہر کر دی (۱) کل چونسٹھ احادیث آپ سے روایت کی گئی ہیں۔ حضرت معاویہ کی خلافت کے زمانہ میں وفات پائیں۔

قدم رسول اللہ ﷺ الخ نبی کریم ﷺ ہجرت کے بعد چار بار مکہ آئے۔ اول عمرۃ القضاء کے موقع پر۔ دوم فتح مکہ کے موقع پر۔ سوم عمرۃ البحرانہ کیلئے۔ اور آخری بار حجۃ الوداع کے موقع پر۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نبی کریم ﷺ کی یہ آمد عمرہ کی غرض سے تھی لیکن رائج خیال یہ ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر جب نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو مسجد حرام آ کر خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کیا۔ اور جب حالات معمول پر آئے تو تھوڑی دیر سستانے کی نیت سے حرم کے قریب ام ہانی کے گھر تشریف لے گئے۔ وضو کر کے نماز پڑھی اور جو کچھ تیار تھا ام ہانی نے کھانے کو پیش کیا۔ علامہ بیجوری نے بھی اسی قول کو ترجیح دی ہے کہ آپ ﷺ کی یہ آمد فتح مکہ کے موقع پر تھی۔

غداً ز اور اس کا حکم: لہ اربع غدائر غدائر غدیرۃ کی جمع ہے۔ اصل میں غدیر ترک کو کہتے ہیں۔ تالاب کو غدیر اس لئے کہتے ہیں کہ پانی اس میں چھوڑ کر جمع کیا جاتا ہے۔ اس طرح اگر بال چھوڑ کر بڑھا دیئے جائیں اور پھر اس سے منڈھیاں بنادی جائیں تو انہیں غدیرہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اسے ذولبۃ اور خفیرۃ بھی کہتے ہیں۔

امرؤ القیس کا یہ شعر تم نے پڑھا ہے۔

غدائرہا مستشزرات الی العلیٰ تفضل العقاص فی مثنیٰ و مرسل۔

(۱) رسول اللہ ﷺ آپ ہی کے گھر سے معراج تشریف لے گئے تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے نکاح کرنے کا ارادہ بھی فرمایا تھا۔ مگر قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ان خواتین سے نکاح کریں جو آپ کے ساتھ ہجرت کریں۔ اور یہ آیت نازل ہوئی (ہاجرون معک) یعنی آپ ﷺ ان خواتین سے نکاح کریں جو آپ ﷺ کے ساتھ ہجرت کی ہو۔ چونکہ حضرت ام ہانی نے مکہ سے ہجرت نہیں کی تھی بلکہ مکہ معظمہ ہی میں رہی۔ اس لئے آپ ﷺ سے نکاح نہیں فرمایا۔ اور ہجرت کی نوبت حضرت ام ہانی کو اس لئے نہیں آئی کیونکہ آپ نے اسلام ہی فتح مکہ کے بعد قبول کیا تھا (بخاری)

عام حالات میں بالوں کا عورتوں کی طرح مینڈھیاں بنانا جائز ہے۔ کیونکہ اس میں تشبیہ بالنساء آتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ سفر اور جہاد کی حالت ہے۔ اور سفر بھی مہینوں کا تھا۔ صفائی اور کنگھی کرنے کو فرصت نہیں ملتی تھی۔

لہذا گرد و غبار سے بچانے کے لیے بالوں سے مینڈھیاں بنانا ہوتی تھی۔ خصوصاً جہاد کے لئے تو بالوں کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ اور انتشار اور پریشانی سے بچانے کے لئے اضطراب ان سے مینڈھیاں بنانی پڑھتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ نبی کریم ﷺ نے بالوں کو تقسیم کر کے چار مینڈھیاں بنائی تھیں (۱)۔ مگر یہ آنحضرت ﷺ کا معمول نہ تھا ایسا کرنا ضرورۃً تھا تا کہ سفر کی وجہ سے بال گرد و غبار سے بچ جائیں۔

(۶) حَدَّثَنَا سُوَيْدُ بْنُ نَصْرٍ أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ الْمُبَارَكِ عَنْ مَعْمَرٍ عَنْ ثَابِتٍ عَنْ أَنَسٍ أَنَّ شِعْرَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ كَانَ إِلَى الْإِصْصَافِ أَذْيَنَهُ (۲)۔
ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بال مبارک نصف کانوں تک ہوتے تھے۔

انصاف اذنیہ انصاف نصف کی جمع ہے اور اس سے مافوق الواحد مراد ہے یا عین نصف کے قریب قریب دیگر مقدار میں بھی ساتھ مراد ہیں۔ لہذا انصاف تحقق ہو جاتی ہیں۔

(۷) حَدَّثَنَا سُوَيْدُ بْنُ نَصْرٍ أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ الْمُبَارَكِ عَنْ يُونُسَ بْنِ يَزِيدٍ عَنْ الزُّهْرِيِّ أَنَا عُبَيْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَتَبَةَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يَسْدِلُ شَعْرَهُ وَكَانَ الْمَشْرُكُونَ تَفْرِقُونَ رُؤُوسَهُمْ وَكَانَ أَهْلُ الْكِتَابِ يَسْدِلُونَ رُؤُوسَهُمْ وَكَانَ يَحِبُّ مُوَافَقَةَ

(۱) مگر شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ نے فرمایا ہے کہ یہ ٹیس اس طرح نہیں تھیں جیسے عورتوں کی ہوتی ہیں۔ (خصائل نبوی ۳۲)

کیونکہ خواتین کی طرح چوٹیاں بنانا مردوں کیلئے منع ہے۔ (بخاری)

(۲) سنن ابی داؤد ۲۵۰/۲ باب ماجاء فی الشعر کتاب الترجل، سنن النسائی ۲/۵۷۲ کتاب الزینۃ

باب اتخاذ الشعر۔ (مختار)

اہل کتاب فیما لم یؤمر فیہ بشئ ثم فرق رسول اللہ ﷺ واسوا۔
ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ اولاً بالوں کو مانگ
نکالے بغیر چھوڑ دیتے تھے۔ جبکہ مشرکین مانگ نکالا کرتے تھے۔ اور اہل کتاب نہیں
نکالتے تھے۔ اور نبی کریم ﷺ ان امور میں اہل کتاب کی موافقت پسند کیا کرتے
تھے جن کے بارے میں آپ ﷺ پر کوئی حکم نازل نہیں ہوتا تھا۔ پھر بعد میں نبی
کریم ﷺ نے مانگ نکالنا شروع فرمایا۔

بالوں کے سدل اور فرق میں نبی کریم ﷺ کا رجحان: کان یسدل شعرہ، سدل کے معنی ہیں
بالوں میں مانگ بنائے بغیر ان کو کھلا چھوڑ دینا۔ ارسال کا بھی یہی مفہوم ہے۔ اس کے برعکس کنگھی کر کے
مانگ نکالنے کو فرق کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کو طبعی لحاظ سے فرق پسند تھا۔ لیکن چونکہ یہ عرب مشرکین کی
تہذیب تھی۔ اور آپ ﷺ کو ان کی اقتدا قطعاً پسند نہ تھی۔ لہذا آپ ﷺ اس سے کتراتے تھے تو فرق کو چھوڑ
کر ارسال اختیار کیا۔ کیونکہ اہل کتاب ایک دین ساوی، کتاب اور عنبر کا اقرار کرتے تھے۔ چنانچہ مشرکین
کی نسبت ان کی حالت مذہبی لحاظ سے بہتر تھی۔ علاوہ ازیں فرق کی بجائے ارسال کو اختیار کرنے میں نبی
کریم ﷺ کا مقصد یہود و نصاریٰ کی تالیف قلبی تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی تالیف قلب کیلئے
آپ ﷺ کو نماز میں بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا تھا۔ بعد میں جب اسلام کو قوت و غلبہ
حاصل ہوا اور اہل کتاب کی طرف سے بھی نہ تعاون کی توقع رہی نہ مقابلے کا خطرہ، تو تالیف قلب کا سلسلہ
بھی ختم ہو گیا۔ اور آپ ﷺ پھر سے فرق کرنے لگے جس طرح آپ ﷺ کو بیت اللہ کی طرف رخ کرنے
کا حکم دیا گیا۔

تشبہ بالغیر کا حکم: جو کام کفار کے شعائر یعنی امتیازی نشانوں میں سے تھے اس میں تشبہ جائز
نہیں۔ اسی طرح بعض امور ایسے بھی ہیں جن میں تشبہ بالنساء بھی آتا ہے۔ اصولی طور پر رسول اللہ ﷺ نے

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ ۵۸/۲ کتاب اللباس والزینۃ باب فی اتخاذا الجمہ والشعر، صحیح

بخاری ۷۷/۲ باب الفرق کتاب اللباس، صحیح مسلم ۲۵۷/۲ کتاب الفضائل باب فی سدل

النبی ﷺ، ابو داؤد ۴۲۰/۲ باب ماجاء فی الفرق کتاب الترجل۔ (مختار)

ہمیشہ تکتہ بالکفار اور تکتہ بالانساء سے منع فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان مردوں پر لعنت فرمائے جو عورتیں بننے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان عورتوں پر لعنت فرمائے جو مرد بننے کی کوشش کرتی ہیں (۱)۔ آج کل تو تہذیب اتنی گندی ہو رہی ہے کہ مرد اور عورت میں تمیز مشکل ہو گئی ہے۔ سامنے سے آنے والے مرد عورتوں کی طرح اور عورتیں مردوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ ایک ہی طرح کا لباس ایک ہی طرح کا وضع قطع ہے۔ مرد عنٹ بننے جا رہے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت شدہ مردانگی کی تمام علامات مردوں نے ہٹا دی ہیں۔

ثم فرق رسول الله الخ۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے فرق یعنی مانگ بتانا شروع کیا کیونکہ مشرکین کے غلبہ کا خوف اور ان کی تہذیب و تمدن سے خطرہ نہ رہا۔ اس کے بعد اہل کتاب کی تہذیب سے ٹکر لیتی تھی۔ جو مانگ نکالنے کی صورت میں آپ ﷺ نے پورا کیا۔ یہ بات کہ فرق اور سدل دونوں میں سے کون سا رائج ہے؟ تو علماء نے اس کی تصریح کی ہے کہ دونوں جائز ہیں۔ لیکن فرق مستحب ہے (۲)۔ کیونکہ بعض روایات میں ”ثم امر بالفرق و كان الفرق آخر الامرين“ (۳) کے الفاظ مروی ہیں۔ جس سے کم از کم فرق کی ترجیح معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ بعض صحابہ آپ ﷺ کے زمانے کے بعد تک سدل بھی کیا کرتے تھے۔

(۱) جامع ترمذی ج ۲ ابواب الادب باب ما جاء فی المشبهات بالرجال من النساء ۱۰۲ (اصلاح الدين)
(۲) اور ملا علی قاریؒ نے مانگ کو سنت کہا ہے اور قاضی عیاضؒ اسے ضروری سمجھتے ہیں۔ حضرات صحابہ کرامؓ کا دونوں پر عمل تھا۔ تاہم بالوں میں مانگ نکالنا سنت اور ویسے بال چھوڑنا جائز ہے۔ علامہ نوویؒ کے ہاں دونوں برابر ہیں۔ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے والفرق سنة لأنه رجع إليه رسول الله ﷺ والظاهر أنه انما رجع اليه بروحي لقوله مالم يؤمر فيه بشئ وقال القاضي عياض نسخ السدل فلا يجوز فعله اه، (جمع الوسائل ۱/ ۹۷) وفي المطالع الحديث يدل على جواز الأمرين والأمر فيه واسع لكن الفرق الفضل لكون النبي رجع اليه آخراً وليس بواجب فقد نقل أن من الصحابة من سدل بعلو لو كان الفرق واجباً لما سدلوا (المواهب اللدنية ص ۴۲) اور علامہ بیہقیؒ نے لکھا ہے والصحيح أن الفرق مستحب لا واجب وهو قول الجمهور ورويه قال مالك وقال النووي الصحيح جواز السدل والفرق (عمدة القاري ۲۲/ ۸۷) (مختار)

(۳) معتب عبد الرزاق۔ جمع الوسائل ج ۱ ص ۹۸

۸. حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ أَنَا عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ مَهْدِيٍّ عَنْ إِبْرَاهِيمَ
 بْنِ نَافِعٍ الْمَكِّيِّ عَنْ ابْنِ أَبِي نَجِيحٍ عَنْ مُجَاهِدٍ عَنْ أُمِّ هَانِيٍّ قَالَتْ رَأَيْتُ
 رَسُولَ اللَّهِ ﷺ ذَا ضَفَانٍ أَرْبَعِ.
 ترجمہ: حضرت ام ہانیؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو چار
 گیسوؤں والا دیکھا۔
 اس حدیث کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔

۴. باب ما جاء في ترجل رسول الله ﷺ

بالوں کی دیکھ بھال کا بیان

گزشتہ باب میں بالوں کا بیان ہے۔ بال رکھنے کے بعد ان کی صفائی اور حفاظت کرنا بھی لازمی امر ہے۔ بال گندے ہوں، میل، گرد و غبار اور جوڑوں سے بھرے ہوں، کنگھی اور صفائی کا بندوبست نہ ہو تو انسان جانوروں کی طرح لگتا ہے۔

ترجل اور ترجیل بالوں کو صاف رکھنے اور ان میں تیل اور کنگھی کے اہتمام کو کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ انتہائی درجہ کے نظافت پسند اور نفیس طبیعت کے مالک تھے۔ نظافت کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ ”النظافة من الایمان“ نیز فرمایا کہ ”من كان له شعر فليكرمه“ (۱) آپ ﷺ نے بال رکھے تھے تو ان کی خوب حفاظت اور صفائی بھی کیا کرتے تھے۔

بالوں کی حفاظت سنت ہے: آج کل تو بالوں کو بنانے اور سنوارنے کے بڑے بڑے سٹم بنائے جاتے ہیں۔ ان کو ترتیب و ترتین کے لئے مشینوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ان کو ٹنگریا بنانے اور ان کے رنگ بدلنے کے لیے بھی آلات و اوزار کا استعمال ہوتا ہے۔ شہر شہر گلی گلی میں بیوٹی پارلر ہیں۔ لیکن یہ بھی محض تکلف اور تصنع ہے کیونکہ بالوں کو ستھرا رکھنا اور ان میں تیل اور کنگھی کا اہتمام کرنا کسی حد تک مسنون امر ہے۔ جس طرح کہ اس باب میں احادیث سے ظاہر ہوتا ہے۔ مگر اس میں مبالغہ کرنے سے احتراز کرنا بھی ضروری ہے۔ بعض دوسری احادیث میں اس کی تصریح ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ ارفاق سے منع کیا کرتے تھے (۲)۔ جس سے مراد یہ ہے کہ کنگھی وغیرہ میں اس قسم کے تکلفات سے احتراز کیا جائے جس قسم کی تکلفات عورتیں اپنے بالوں میں کرتی ہیں۔ تو اعتدال کے ساتھ بالوں کی خدمت کرنے سے متعلق اس باب میں احادیث لائی گئی ہیں۔

(۱) سنن ابی داؤد ۲/ کتاب الترجل باب ما جاء في اصلاح الشعر

(۲) سنن ابی داؤد ۲/ کتاب الترجل باب اصلاح الشعر

(۱) حَدَّثَنَا اسحاق بن موسى الأنصاري ثنا معن بن عيسى ثنا

مالك بن أنس عن هشام بن عروة عن أبيه عن عائشة قالت كنت

أرجل رأس رسول الله ﷺ وأنا حائض (۱)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں حیض کی حالت میں نبی

کریم ﷺ کے سر مبارک پر کنگھی کرتی تھی۔

حالت حیض میں بیوی سے تعلق: كنت أرجل رأس رسول الله ﷺ وأنا

حائض۔ حضرت عائشہ کی اس حدیث میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ حالت حیض میں زوجین کے درمیان

جماع کے سوا باقی کاموں میں اختلاط ناجائز نہیں ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ عورتوں سے حیض کی حالت میں کنارہ کش رہو۔

نیز فرمایا کہ ولا تقربوہن حتی یطہرن جب تک وہ پاک نہ ہوں ان کے قریب نہ جانا۔

ان آیتوں سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حیض کے وقت بیوی سے مکمل قطع تعلق ہو۔ یہی جاہلیت

کے زمانے کا رواج بھی تھا۔ حائضہ کو کتیا کا درجہ حاصل تھا۔ اسے گھر کے ایک کونے میں علیحدہ بٹھا دیا جاتا

تھا۔ اور دور سے اسے کھانا دلایا جاتا تھا۔ یہی حالت نفاس اور عدتِ وفات میں بھی تھی۔

لیکن درحقیقت اعتزال اور منع قرب سے مراد جماع سے احتراز ہے۔ جماع کے بغیر حیض و نفاس

کی حالت میں میاں بیوی کا ایک جگہ رہنا، کھانا، سونا اور مکمل مخالطت جائز ہے۔ اس حدیث میں بھی اس

کے جواز کی تصریح ہے۔ اس لئے یہ حدیث ان قرآنی آیتوں کی تفسیر کر رہی ہے کہ وہاں ہر قسم کے اختلاط کی

ممانعت مقصود نہیں ہے۔

میاں بیوی کے باہمی حقوق: نیز حدیث مذکور میں اس بات پر بھی تنبیہ ہے کہ بیوی کو شوہر کی

خدمت کرنی چاہیے اگرچہ اس میں لزوم نہیں بلکہ یہ استحباب کے درجہ میں ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے ہاں

(۱) صحیح بخاری ۴۳/۱ کتاب الحيض باب غسل الحائض رأس زوجها سنن

نسائی ۶۸/۱ کتاب الحيض والاستحاضة باب غسل الحائض رأس زوجها (مختار)

بہت زیادہ بے اعتدالیاں پائی جاتی ہیں۔ پٹھان اور بعض دوسرے قبائل بیوی کو بالکل کنیز کا مرتبہ دیتے ہیں۔ بیوی کا کام ہی گویا کھانا پکانا، دھونا اور پاؤں دبانا وغیرہ امور ہیں۔ اور آئے دن کی مار پیٹ اس پر مستزاد ہوتی ہے۔ حالانکہ شرعی لحاظ سے بیوی پر کسی قسم کی خدمت واجب نہیں۔ بلکہ فقہاء میں امام ابو یوسفؒ تو اس کے لئے دو خادم رکھنے کا حکم دیتے ہیں۔ ایک گھر کے کام کاج کیلئے اور دوسرا باہر کے کاموں کے لئے۔ البتہ امام محمدؒ ایک خادم پر اکتفاء فرماتے ہیں۔ لہذا حق تو یہ ہے کہ بیوی کو کپڑے، اور نان و نفقہ کی پکائی گھر کے اندر ملنی چاہیے۔ ہاں جماع کا جو حق شوہر کا بیوی پر ہے وہاں مرد کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو بیوی کو نفل روزہ رکھنے سے بھی منع کر سکتا ہے۔ لیکن استہدام کا حق مرد کے لیے نہیں ہے۔

حقوق نسواں کے نام پر توہین نسواں: دوسری طرف عورت کو اسلام نے یہ اخلاقی تعلیم دی ہے کہ وہ گھر کی حفاظت اور اس کے اندر کے کام کاج خود کرے۔ نیز حتی الوسع شوہر کی خدمت میں کوتاہی نہ کرے۔ آج کل حقوق نسواں کے نام پر ساری دنیا میں بڑا فتنہ برپا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ عورت بھی آخر انسان ہے۔ اسے انسانوں جتنے حقوق تو ملنے چاہئیں۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ ہم نے کب کہا ہے کہ وہ انسان نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے جو مقاصد، مراتب اور فرائض مقرر کئے ہیں اور جو کہ عین فطرت سے موافق بھی ہیں۔ ان کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ آج جو شخص حقوق نسواں کا نعرہ لگاتا ہے وہ فرائض نسواں سے چشم پوشی کر جاتا ہے۔ بچے کی حفاظت، تربیت، آرام و راحت اور رضاعت کا خیال رکھنا، شوہر کے گھر کی دیکھ بھال کرنا، اور اپنی عصمت کا خیال رکھنا وغیرہ جو فرائض عورت کے ذمے لگائے گئے ہیں۔ نئی روشنی کے دعویدار حضرات وہ پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ بلکہ ان کے بارے میں اسلامی احکام اور قرآن وحدیث کے ساتھ استہزاء کا معاملہ برتا جاتا ہے۔ اور آزادی نسواں کے نام پر گمراہی کی ترغیب و تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

مغربی تہذیب میں تو باقاعدہ بیوی اور شوہر کے درمیان اجنبیوں کی طرح کمائی، خرچ اور رہائش تک کے امور میں علیحدگی رائج ہے۔ مرد عورت کی نجی زندگی سے بے خبر ہے اور عورت کو مرد کی نجی زندگی کا کوئی پتہ نہیں۔ خاوند ایک دفتر میں تو بیوی دوسرے دفتر میں کام کرتی ہے۔

درحقیقت مرد کا عورت پر ایک ظلم یہ بھی ہے کہ اسے مرد کے ساتھ مساوی ہونے کا احساس دلا کر

اسے باہر نکالنے کی ہمد دیتا ہے۔ مغرب کا بواہوس مرد اپنی عیش و عشرت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے عورت کو چار دیواری سے باہر نکال رہا ہے۔ حقیر سے حقیر چیز کا اشتہار کیوں نہ ہو، عورت کی تصویر سے خالی نہیں۔ عورت ان کے ہاں جنسی تسکین کے لئے محض ایک آلہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہاں کے مرد نے عورت سے بڑی زیادتی کی ہے۔ عورت پریشان ہے کہ وہ بچوں کی حفاظت کرے، کارخانہ اور دفتر جائے، یا پھر اپنی حفاظت کرے۔ اس صریح ظلم کی آگ میں مغربی عورت ہر وقت جلتی رہتی ہے۔

دیت کس کی آدمی؟ اسلام نے عورت کو بڑی عزت، احترام اور تقدس سے نوازا۔ اسے گھر بٹھا کر مرد کو حکم دیا کہ جہاں سے بھی ہو، کھاؤ اور بیوی کو کھلاؤ۔ خورد و نوش، رہائش اور لباس کا بندوبست کرو، اسلام نے ہر جگہ عورت کی رعایت کی ہے۔ لیکن آج کی عورت سمجھائے نہیں سمجھتی۔ دیت کے مسئلہ میں آجکل دنیا میں ایک ہنگامہ برپا ہے۔ وہ اعتراض کرتے ہیں کہ عورت کی دیت آدمی کیوں ہے۔ کیا وہ نصف انسان ہے۔ لیکن دراصل اس میں بھی عورت ہی کی رعایت کی گئی ہے۔ شریعت بل کے ہنگامہ میں عورتیں میرے پیچھے بھی پڑی تھیں۔ کہ تم کیوں عورت کے نصف دیت پر مصر ہو۔ میں نے ان سے کہا کہ دیکھیں اگر میاں بیوی میں کسی ایک کو قتل کر دیا جائے تو دیت تو مرنے والے کو نہیں، بلکہ دوسرے کو ملے گی۔ اب اگر مرد مر گیا، تو بیوی کو مثلاً اپنا حصہ ایک لاکھ روپے ملیں گے اور عورت مر گئی تو مرد کو ملنے والی دیت پچاس ہزار روپے ہوگی۔ لہذا اگر نعوذ باللہ شریعت نے ظلم کیا ہے تو مرد پر کیا ہے عورت پر نہیں کیونکہ مرد نے اپنی شادی وغیرہ پر لاکھوں روپے بھی خرچ کئے، اور دیت آدمی ملی۔ جبکہ عورت نے شادی کے موقع پر بھی بڑی مقدار میں رقم لے لی اور دیت بھی دگنی ملی۔ بہر حال دراصل دیت مرد کی آدمی ہے عورت کی پوری ہے۔

نصف دیت کی حکمت: درحقیقت اس میں بھی بڑی حکمت پوشیدہ ہے وہ یہ کہ دیت کا فائدہ چونکہ وارث کو ملتا ہے اور بیوی کے اخراجات خاوند کی زندگی میں اس کے ذمے تھے۔ خاوند کے مرنے کے بعد اسے بچوں کی پرورش اور خود اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے مال کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس کے برعکس بیوی کی موت پر سارا گھر نہیں اجڑتا۔ کیونکہ اخراجات اور نفقہ پہلے سے مرد کے ذمے ہیں۔ اب مرنے کے بعد بھی اس کی ذمہ داریوں میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں ہوا۔ لہذا از روئے عقل اسے بیوی کی نسبت کم رقم ملنی

چاہیے۔ بہر حال مرد کا بیوی پر استحقاق کا حق تو نہیں۔ لیکن مکارم اخلاق کا تقاضا ہے کہ بیوی محبت و شرافت سے خاوند کی خدمت کرتی رہے۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے عملاً ہمیں بتلایا کہ عورت کو مرد کی خدمت کرنی چاہیے۔

(۲) حَدَّثَنَا يَوْسُفُ بْنُ عِيسَىٰ أَنَا وَكَيْعُ بْنُ الرَّبِيعِ عَنْ صَبِيحٍ عَنْ
يَزِيدَ بْنِ أَبَانَ هُوَ الرِّقَاشِيُّ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ
اللَّهِ ﷺ يَكْشُرُ دَهْنَ رَأْسِهِ وَتَسْرِيحَ لَحْيَتِهِ وَيَكْثُرُ الْقَنَاعُ حَتَّىٰ كَانَ
ثَوْبُهُ ثَوْبَ زَيْنَاتٍ (۱)۔

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کثرت سے سر میں
تیل لگایا کرتے تھے اور بکثرت داڑھی میں کنگھی کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ آپ ﷺ کا
کپڑا کسی تیلی کا کپڑا معلوم ہوتا تھا۔

بالوں میں تیل اور کنگھی کا استعمال: دھن رائسہ: دھن کا دال مفتوح اور بامساکن ہے۔ یہ مصدر ہے
اور معنی یہ کہ آپ ﷺ تیل کا استعمال بہت زیادہ کرتے تھے (۲)۔ و تسريح لحية دہن رائسہ پر عطف
ہے، یعنی آپ ﷺ داڑھی میں کنگھی بھی زیادہ کرتے تھے۔ احادیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ سفر و حضر
میں اپنے ساتھ مسواک، کنگھی، آئینہ، سرمہ دانی، تیل کی شیشی اور کینچی وغیرہ رکھا کرتے تھے (۳)۔ و یكثر
القناع قناع قاف مسورہ کے ساتھ ما یتقنع بہ کو کہتے ہیں۔ یعنی وہ چھوٹا سا کپڑا جو ٹوپی یا پگڑی کے نیچے
سر پر باندھتے ہیں۔ تاکہ تیل کے اثر سے ٹوپی یا عمامہ محفوظ رہے۔ نبی کریم ﷺ کی طبیعت میں بہت
نفاست تھی۔ آپ ﷺ کے کپڑے تیل وغیرہ کے داغوں سے محفوظ ہوتے تھے۔ اس لئے سر پر تیل لگانے

(۱) الشرح السنة ۲/۸۲ باب ترجیل العروت لہیہ، مشکوٰۃ المصابیح ۲/۳۸۱ باب
الترجل (مختار)

(۲) موجودہ زمانے کے سائنس دان بھی کہتے ہیں کہ سر پر تیل لگانا یہ ذہنی دباؤ اعصابی کچاؤ، سر درد کے پرانے مریض، گرد
پیشوں کے درد، شانوں کے درد، کچاؤ نگاہ کی کمزوری اور چہرے کی سرجری کیلئے بہت مفید ہے (آفتاب نبوت کی
کرنیں ص ۱۵۶) (مختار)

(۳) ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کبھی کبھار دن میں دو مرتبہ بھی تیل استعمال فرما لیتے تھے (مختار)

کے بعد ٹوپی یا پگڑی پہننے سے قبل سر پر کپڑا ڈال دیتے تھے۔ کان ٹوبہ ٹوب زیات ٹوبہ سے آپ ﷺ کے بدن کا کپڑا امراد نہیں کیونکہ اس کا میلا اور تیل سے آلودہ ہونا نفاقت کے خلاف ہے۔ بلکہ ٹوبہ سے مراد ہی قناع ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے اور قناع کا تیل سے آلودہ ہونا قبیح بات بھی نہیں ہے بعض روایات کے مطابق ”حتی کان ملحفته ملحفة زیات“ کے الفاظ مروی ہیں۔

(۳) حَدَّثَنَا هَنَادِبْنُ السَّرِيِّ أَنَا أَبُو الْأَحْوَصِ عَنْ أَشْعَثِ بْنِ أَبِي الشَّعْثَاءِ عَنْ أَبِيهِ عَنْ مَسْرُوقٍ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِيَحِبَّ التَّيْمَنَ فِي طَهْوَرِهِ إِذَا تَطَهَّرَ وَفِي تَرْجَلِهِ إِذَا تَرَجَّلَ وَفِي انْتَعَالِهِ إِذَا انْتَعَلَ (۱)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ طہارت کے وقت پانی کے استعمال میں کنگھی کرتے وقت کنگھی کرنے میں اور جوتے پہنتے وقت جوتیاں پہننے میں دائیں طرف سے شروع کرنا پسند فرماتے تھے۔

کان رسول اللہ ﷺ الخ إن مخفف من الممحل ہے۔ اسم مخدوف ہے اور تقدیر انہ کان الخ ہے۔ اور لیحب کا لازم اس کا قرینہ ہے۔ کیونکہ ان قافیہ ہونے کی صورت میں خبر پر لام داخل نہیں ہوتا۔ لیحب التیمن فی طہورہ الخ طہور کی طاء مفتوح ہو تو اس پانی کو کہتے ہیں جس سے طہارت حاصل کی جائے اس صورت میں مضاف مقدر ہوگا یعنی ”فی استعمال طہورہ“ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں پر مصدری معنی مراد ہو۔ اور طاء مضموم ہو گیا وضوء کرنے میں پہلے دائیں اعضاء سے ابتداء کرتے۔ اس صورت میں تقدیر کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

اسی طرح کنگھی کرنے اور جوتا پہننے میں بھی تیامن کی عادت تھی۔

تیامن اور تیاسر کے اصول: بلکہ ہر اچھے کام میں تیامن ملحوظ رکھتے تھے۔ ضابطہ یہ ہے کہ جو کام

کرم، مشرف اور خیرین کا ہو تو وہاں تیامن مسنون ہے اور جس کام میں شرف و کرامت اور خیرین نہ ہو تو اس

(۱) صحیح بخاری ۲۸/۱ کتاب الوضوء باب التیمن فی الوضوء، سنن نسائی ۲۹۲/۲ کتاب

الزینة باب التیامن فی الترجل (منحار)

میں تیار چاہئے۔ مثلاً مسجد میں داخل ہوتے وقت دایاں پاؤں اور نکلتے وقت بایاں پاؤں آگے کرنا چاہیے۔ جبکہ بیت الحلاء میں اس کے برعکس ہونا چاہیے۔ اسی طرح کپڑا پہننے میں دائیں جانب سے اور اتارنے میں بائیں جانب سے نکالنا بہتر ہے۔ کیونکہ سترزینت اور کثامت ہے اور عریانی اس کے برعکس ہے۔

بخاری اور مسلم کی حدیث میں اس روایت کے آخر میں ”وفی شأنہ کلمہ“ کے الفاظ کا اضافہ ہے۔ یہاں شاید راوی کو یہ عبارت متحضر نہیں تھی۔ اس لئے اسے نہیں لایا۔ درحقیقت تمام افعال خیر میں آپ ﷺ تیا من پسند فرماتے تھے۔

اتباع سنت کے اہتمام کی عجیب مثالیں: بزرگوں کے ہاں سنت کا بہت زیادہ پاس ہوتا تھا۔ المدخل میں ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ اس نے بے دھیانی سے پہلے اپنا بایاں جراب پہنایا، بائیں پاؤں کی جوتی پہنی۔ بعد میں خیال آیا تو کفارہ کے طور پر 36 من کا غلہ صدقہ دیا۔ نبی کریم ﷺ سے محبت کرنے والوں کو معلوم ہوتا ہے کہ اتباع سنت کے کتنے دینی اور دنیوی برکات ہیں۔ زعمی کے تمام معمولات اور عادات میں بھی اتباع سنت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔

ایک بزرگ جس کا نام غالباً محمد بن اسلم ہے نے ساری عمر تربوز نہیں کھائی اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے تربوز کیسے کھایا ہے۔ چھلکے اتار کر یا تاشیں بنا کر یا گودا نکال کر۔ اس لئے میں سنت کے خلاف نہ کر بیٹھوں۔ بہر حال وہ لوگ لاعلمی میں بھی خلاف سنت کا ارتکاب برداشت نہیں کرتے تھے۔

حضرت حسن بصریؒ نے جب پہلی مرتبہ ایک شخص کو بدعت میں مبتلا دیکھا۔ تو آپ کو اتنا دکھ ہوا کہ جب پیشاب کرنے بیٹھے تو پیشاب کی جگہ خون نکل آیا۔ اتباع سنت سے لاپرواہی کے سبب آج ہم سے فرائض بھی چھوٹ گئے ہیں۔ کیونکہ جو شخص مستحبات میں مکمل برتا ہے وہ سنن سے محروم ہو جاتا ہے۔ جو شخص سنن سے بے پرواہ ہوتا ہے۔ اسے واجبات کی توفیق نہیں ہوتی۔ اور واجبات سے جو شخص لاپرواہی برتا ہے اسے فرائض سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ مشہور بزرگ حضرت ثمالیؒ نے اپنی موت کے وقت شاگردوں سے فرمایا کہ مجھے وضو کراؤ۔ نزع کی حالت تھی سکران موت میں مبتلا تھے۔ شاگردوں نے بڑی تکلیف سے وضوء

کروایا۔ لیکن وضوء کے بعد آپ نے شاگردوں سے کہا۔ کہ تم نے تو مجھے خلال نہیں کروایا۔ اس لئے دوبارہ وضوء کراؤ۔ انہوں نے کہا کہ خلال سنت یا مستحب چیز ہے۔ ادھر تمہیں شدید تکلیف ہے۔ اس لئے رہنے دیں اس نے کہا کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایسی حالت میں ملاقات نہیں کرنا چاہتا کہ میں نے ان کی ایک سنت کو ترک کر دیا ہو۔ لہذا آپ نے دوبارہ وضوء کروایا تا کہ خلال بھی ہو جائے وضوء کے ختم ہوتے ہوتے آپ کی روح بھی پرواز کر گئی۔

(۳) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ أَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ حَسَنٍ

عَنِ الْحَسَنِ الْبَصْرِيِّ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَغْفَلٍ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ

عَنِ التَّرَجُّلِ الْإِعْبَاءُ (۱)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مغفلؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کنگھی کو منع فرماتے مگر

گا ہے گا ہے۔

عن عبداللہ بن مغفل: عبداللہ بن مغفل مرنے صحابی ہیں۔ بیعت رضوان سے مشرف ہوئے تھے اور فتح مکہ کے دن سب سے پہلے مکہ میں داخل ہونے والے شخص تھے۔ بصرہ میں ۵۷ھ یا ۶۰ھ کو وفات پائی۔ بالوں کے بناؤ سنگھار میں اعتدال: إِلَّاغْبَاءُ الْخِطَامِ اعتدال کا درس دیتا ہے۔ وہ ہر وقت قیام، تزیین اور بناؤ سنگھار میں لگے رہنے سے منع کرتا ہے۔ جس طرح کے بعض طلبہ درس میں بھی کنگھی آئینہ کا اہتمام کرتے ہیں۔ تو اگرچہ اسلام ایک طرف معافی اور لطافت کا حکم دیتا ہے۔ اور میلے رہنے کو ناپسند کرتا ہے۔ لیکن عورتوں اور مترفین کی طرح ہر وقت بناؤ سنگھار کے اہتمام کو بھی پسند نہیں کرتا۔

لفظ غب: غب کا اصلی معنی ہے ورود الابل الماء يوماً و ترکہ اخری یعنی اونٹ کا ایک

دن پانی پینے کے لئے آنا اور دوسرے دن چھوڑنا۔ پرانے زمانے میں صحرائی علاقوں میں پانی کی دوری اور قلت کے سبب روزانہ اونٹوں کو پانی پلانا مشکل تھا۔ اس لئے ایک دن انہیں پانی پلاتے تھے اور دوسرے دن ناعہ ہوتا تھا۔

(۱) سنن ابی داؤد ۲۱۷۲/۲ کتاب الترجل، سنن نسائی ۲۷۵/۲، کتاب الزینۃ باب الترجل

غبا، جامع ترمذی ۳۰۵/۱ کتاب اللباس باب ماجاء فی النهی عن الترجل الاغبا (مختار)

اونٹ کو اللہ تعالیٰ نے یہ طاقت دی ہے کہ وہ کئی کئی دن تک بغیر پانی پیئے گزارہ کر سکتا ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں اونٹ کے پیٹ میں پانی کو ذخیرہ کرنے کیلئے الگ جگہ ہوتی ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اونٹ کو صحرائی علاقوں سے بہت مناسب فطرت دی ہے۔ اونٹ کے کوہان میں چربی ہوتی ہے، جو پیاس کی صورت میں پگھل پگھل کر پیاس بجھاتی رہتی ہے۔ لہذا وہ کئی کئی دن تک بغیر پانی کے گزارہ کر سکتا ہے۔ اور اسی وجہ سے جس شخص کا پیٹ بڑھ جائے اسے ڈاکٹر پانی نہ پینے یا کم پینے کا مشورہ دیتے ہیں۔ بہر حال پیاس کی کمی کے باعث اونٹ کو ہمیشہ پلانے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ کبھی کبھی پلاتے ہیں۔ اسی کو غب کہتے ہیں عرب کا مشہور مقولہ ہے زرعاً تزدد حباً۔ کبھی کبھی ملاقات کرنے جاؤ محبت بڑھتی جائے گی۔ یہاں بھی غب ناغہ کے معنی پر مستعمل ہے۔ ہر وقت کسی دوست کے پیچھے پڑے رہو گے تو بیزاری آئے گی۔

اور چونکہ ہر وقت کنگھی کرنا عیش پرستوں اور عورتوں کا کام ہے اس لئے کنگھی بھی کبھی کبھار ہونی چاہیے۔ علامہ ابن عربیؒ نے کنگھی کے بارے میں کیا خوب فرمایا ہے کہ موالا تہ تصنع و ترکہ تلدنس و اغبابہ تسنن۔ اس میں ہر وقت لگے رہنا، تصنع اور تکلف ہے۔ اس کا بالکل چھوڑ دینا میلہ پن ہے۔ اور اسے کبھی کبھی کرنا سنت ہے (۱)۔

(۵) حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ عُرْفَةَ قَالَ لَنَا عَبْدُ السَّلَامِ بْنُ حَرْبٍ عَنْ يَزِيدَ

بْنِ أَبِي خَالِدٍ عَنْ أَبِي الْعَلَاءِ الْأَوْدِيِّ عَنْ حَمِيدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ عَنْ

رَجُلٍ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَتَوَجَّلُ غُباً (۲)۔

ترجمہ: ایک صحابیؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی عادت مبارک کبھی کبھی کنگھی کرنے کی تھی۔

(۱) قال ملا علی قاری و قيل هو ان يقل يوماً و يترك يوماً و نقل عن الحسن في كل السبع قال

القاضي والمراد النهي عن المواظبة عليه والاهتمام به لأنه مبالغة في التزين تهالك به

(جمع الوسائل ۱/ ۱۰۷) (مختار)

(۲) تفرده الترمذی:

عن یزید بن ابی خالد اس راوی کے بارے میں تحقیق یہ ہے کہ یہ یزید بن ابی خالد نہیں بلکہ یزید بن خالد ہیں۔ بہت متقی اور پرہیزگار تھے۔ عن رجل الخ صحابی مجہول ہے لیکن چونکہ تمام صحابہ عدول ہیں۔ اس لئے یہ جہالت معترض نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اس صحابی کی تعین کی ہے۔ کسی نے حکم بن عمرو کا نام لیا ہے۔ کسی نے عبداللہ بن سرجس کا نام لیا ہے اور بعض لوگوں کے خیال میں یہ صحابی عبداللہ بن مفضل ہیں۔ جو سابقہ حدیث کے راوی ہیں البتہ یہ حدیث فعلی ہے اور گزشتہ حدیث میں نبی کریم ﷺ کا قول حکم بیان کیا گیا تھا (۱)۔

(۱) علامہ ابن عربی نے فرمایا ہے کہ بار بار کنگھی کرنا یہ تصحیح اور بناوٹ میں داخل ہے اور کنگھی بالکل یہ ترک کرنا بالوں میں میل و پچیل جمع ہونے کا باعث بنتا ہے جو باعث ضرر و نقصان ہے اس لئے اعتدال سے کام لینا چاہئے۔

کنگھی اور جدید سائنس: آج کل سائنس کی تحقیق یہ ہے کہ کنگھی سے ایک حرارت اور انرجی بدن میں پیدا ہوتی ہے جو بالوں کے ذریعے جسم انسانی کی طرف منتقل ہوتی ہے اور اعصابی نظام میں قوت پیدا کرتی ہے اور اگر کنگھی نہ کی جائے تو پھر بالوں میں جراثیم اکٹم جاتے ہیں۔ اور بدن انسانی میں منتقل ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات خطرناک بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ (مخار)

۵۔ باب ماجاء فی شیب رسول اللہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے بالوں کی سفیدی کا بیان

اس سے قبل بالوں کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ اور چونکہ عمر کے آخر میں بالوں کو سفیدی عارض ہو جاتی ہے۔ اس لئے اب اس باب میں نبی کریم ﷺ کے بالوں کی سفیدی کا بیان ہے۔ شیب شاب و شیب کا مصدر ہے جس کے معنی سیاہ بالوں کا سفید ہونا ہے۔ اسی طرح اس کا اطلاق اس حالت پر بھی ہوتا ہے جس میں بال سفید ہو جاتے ہیں۔ عمر کی زیادتی کی وجہ سے قوی مضحل ہو جاتے ہیں، طاقت چلی جاتی ہے بڑھا پا آ جاتا ہے۔ تو اسے بھی شیبہ اور شیب کہتے ہیں۔

(۱) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ أَنَا أَبُو دَاوُدَ أَنَا هَمَّامٌ عَنْ قَتَادَةَ قَالَ

قُلْتُ لَأَنَسِ بْنِ مَالِكٍ هَلْ خَضِبَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَمْ يَبْلُغْ ذَلِكَ

إِنَّمَا كَانَ شَيْبًا فِي صَدْغِهِ وَلَكِنْ أَبُو بَكْرٍ خَضِبَ بِالْحَنَاءِ وَالْكُتَمِ (۱)۔

ترجمہ: حضرت قتادہؓ کہتے ہیں میں نے حضرت انسؓ سے پوچھا کہ حضور اقدس

ﷺ خضاب لگایا کرتے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے بالوں کی سفیدی

خضاب کی حد کو نہیں پہنچی تھی۔ سفیدی نبی کریم ﷺ کی دو کنپٹیوں میں تھوڑی سی تھی۔

ابو بکرؓ ہندی اور کتم کا خضاب لگایا کرتے تھے۔

ابوداؤد: ائمہ حدیث میں سے یہ کثرت دو افراد کے لئے بولی جاتی ہے ایک ابوداؤد سلیمان بن داؤد طرابلسی ہیں دوسرے ابوداؤد مصاطیٰ اور چونکہ ابوداؤد مصاطیٰ کا حمام سے سماع ثابت نہیں اس لئے یہاں پر اول الذکر ہی مراد ہونگے۔

لم یبلغ ذالک: لم یبلغ کی ضمیر مستتر میں تین احتمال ہیں۔ اول یہ کہ ضمیر نبی کریم ﷺ کو راجع ہو اور ذالک سے حد الخضاب کو اشارہ ہو۔ جس پر قرینہ حضرت قتادہؓ کا سوال ”هل خضب“ ہے۔

(۱) صحیح بخاری ۱/۵۰۱ باب صفة النبی ﷺ کتاب المناقب، سنن نسائی ۲/۷۸ کتاب الزینۃ باب

الخضاب بالعصرة (مختار)

(۱) تقدیر یوں ہوگی کہ ”لم يبلغ رسول الله ﷺ حد الخضاب“ یعنی بالوں کو خضاب لگانے کی نوبت نہیں آئی۔ (۲) دوم یہ کہ ضمیر شیب کو راجع ہو تو عبارت کی تقدیر یوں ہوگی کہ ”لم يبلغ الشيب حد الخضاب“ یعنی آپ کے بال اتنے سفید ہی نہیں تھے کہ خضاب کی ضرورت پڑے۔ (۳) سوم یہ کہ ضمیر شعر النبی ﷺ کو راجع ہو تو تقدیر یوں ہو کہ ”لم يبلغ شعره ﷺ حد الخضاب“ یعنی آپ ﷺ کے بال مبارک خضاب کی حد تک سفید نہیں ہوئے تھے۔

بہر حال اس جملے کا مقصد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بالوں میں محدودے چند بال سفید تھے۔ اس لئے آپ ﷺ کو خضاب لگانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ اگلے باب میں یہ بات تفصیل سے آجائے گی کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب کا استعمال کیا ہے یا نہیں۔

انما كان شيبا في صدغ الخ: صدغ آنکھ کے گوشے اور کان کے درمیان کے حصے کو کہتے ہیں لیکن اس حصے پر موجود بالوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں پر اس کی مراد میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ هو الشعر المتدلى بين الاذن والعين یعنی آنکھ اور کان کے درمیان بالوں کی پٹی۔ جسے اردو میں کنپٹی کہتے ہیں۔ بالوں میں سفیدی کی ابتداء کن پٹی سے ہوتی ہے نبی کریم ﷺ کی کن پٹیوں میں چند سفید بال ظاہر ہو گئے تھے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کا خضاب (۱): ولكن ابا بكر الخ حضرت انسؓ کے بیان کے مطابق نبی کریم ﷺ نے خضاب کا استعمال نہیں کیا تھا۔ جس سے معلوم ہوا کہ خضاب لگانا جائز نہ تھا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے خضاب نہیں لگایا تو آپ ﷺ کے قریب ترین دوست سب سے بڑے اور بزرگ صحابی حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کیوں لگایا تھا؟ اس وہم کے دفعیہ کے لئے حضرت انسؓ نے اس جملہ کا اضافہ کر دیا کہ اگرچہ ابو بکر صدیقؓ نے خضاب لگایا تھا لیکن وہ بھی خالص خضاب نہ تھا بلکہ درحقیقت وہ سیاحی مائل مہندی استعمال کرتے تھے۔ اور کتم کی سیاحی کو ختم کرنے کے لئے اس میں مہندی (۱) خضاب یعنی بالوں کو رنگنے کا رواج ہونے کے زمانے سے ہے۔ پہلے ادوار میں عام طور پر مہندی یا وسمہ یا کسم (ایک قسم کا بوٹا ہے) استعمال کیا جاتا تھا، البتہ اس وقت بہت سارے ہیر کلرز بازاروں میں ملتے ہیں اس میں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ (مختار)

ڈالتے تھے۔ اسی لئے تو ابو بکر صدیقؓ نے اسے استعمال کیا تھا ورنہ ابو بکر صدیقؓ خلاف سنت کام کبھی بھی نہیں کرتے تھے۔ اس تشریح کے مطابق حضرت انسؓ کی اس حدیث سے خضاب کے جواز کی نفی ہوتی ہے۔

ایک دوسری تشریح کے مطابق اس حدیث میں دراصل خضاب لگانے کو جائز کہا گیا ہے اور خضاب کے عدم جواز کیلئے حدیث بیان نہیں ہوئی بلکہ دراصل یہ بات اس لئے کی گئی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے خضاب لگا کر کوئی جرم نہیں کیا۔ رہی یہ بات کہ ان کا عمل نبی کریم ﷺ کے عمل کے خلاف تھا تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ آپ ﷺ کے نزدیک خضاب ناجائز تھا بلکہ دراصل نبی کریم ﷺ حد خضاب کو نہیں پہنچے تھے۔ اگر ابو بکر صدیقؓ کی طرح آپ ﷺ کے بال بھی سفید ہو جاتے تو آپ ﷺ بھی استعمال کرتے۔

تیسری توجیہ یہ ہے کہ یہاں پر سائل نے نبی کریم ﷺ کے عمل کے بارے میں استفسار کیا ہے۔ لیکن حضرت انسؓ نے جواب میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کا عمل ذکر کیا۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کے بعد امت میں آپؐ ہی کا نمبر آتا ہے۔ تو گویا حضرت انسؓ کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ نبی کریم ﷺ نے خضاب نہیں لگایا۔ لیکن امت کی تائسی اور اقتداء کے لئے حضرت ابو بکر صدیقؓ کا عمل موجود ہے جنہوں نے خضاب لگایا تھا۔ اس سے صحابہؓ کے نزدیک صدیق اکبرؓ کا مرتبہ اور مقام بھی بخوبی معلوم ہوتا ہے۔

کتم: اس حدیث میں حکم (۱) کا ذکر ہے جس کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں۔ صحیح قول کے مطابق ایک پودا ہے جو میدانی علاقوں میں ہوتا ہے۔ اس کا قد انسان جتنا ہوتا ہے زیتون کی طرح پتلے پتلے پتے ہوتے ہیں مرچ کے دانوں کی طرح دانے اس میں آتے ہیں۔ جس کو کوٹ کر ہالا جاتا ہے۔ اور سیاہ رنگ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لکھنے کی سیاہی بنانے کے کام بھی آتا ہے۔ ہندی سے مل کر اس کا رنگ سرخی مائل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اس حدیث میں درحقیقت خضاب کا بیان ہے۔ اس لئے شرح نے لکھا ہے کہ یہ حدیث اس باب کی نسبت اگلے باب سے زیادہ مناسب ہے۔

(۱) بعض اہل علم فرماتے ہیں کتم رنگ کے اعتبار سے کالا ہوتا ہے جب اس کو ہندی کے ساتھ ملایا جائے تو سرخ بن جاتا ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ کتم کا رنگ سبز ہوتا ہے لیکن جب ہندی سے ملایا جائے تو سیاہ بن جاتا ہے مگر غلبہ کے اعتبار سے ہو یعنی اگر ہندی غالب ہو تو سرخ بن جاتا ہے اور اگر کتم غالب ہو تو سیاہ بن جاتا ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے فرمایا ہے الکتم الصرغ یوجب سواداً مائللاً إلى الحمرة والحناء توجب الحمرة فاستعمالهما یوجب ما بین السواد والحمرة (۱۰/۱) (مختار)

خضاب کا حکم: بعض لوگوں کے خیال میں نبی کریم ﷺ نے خضاب کبھی نہیں لگایا۔ اور ان کا اعتقاد ان روایات پر ہے جن میں نبی کریم ﷺ سے خضاب کی نفی ثابت ہے۔ لیکن صحیح روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب استعمال کیا ہے۔ اور چونکہ مثبت روایت ثانی روایت سے فی ذاتہ راجح ہوتی ہے کیونکہ ایک علم اور دوسری عدم علم پر مبنی ہوتی ہے۔ اس لئے بہت سے لوگوں نے جن میں امام احمد بن حنبل بھی شامل ہیں خضاب کو جائز کہا ہے۔ جبکہ بعض روایات میں نبی کریم ﷺ نے مشروط اجازت دی ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کے والد ابی قحظہ بن کاسر اور داڑھی بالکل سفید ہو چکے تھے۔ نبی کریم ﷺ کے پاس فتح مکہ کے روز آئے۔ رسول اللہ ﷺ آپ کا سر دیکھ کر فرمایا۔ غیر واہذا بشئی واجتنبوا السواد (۱) یعنی اس کے بالوں کا رنگ بدل دو لیکن سیاہ رنگ سے اجتناب کرو۔

اس طرح دیگر احادیث میں بھی خضاب کے جواز کی تصریح موجود ہے۔ البتہ سیاہ خضاب کے بارے میں نہیں بھی وارد ہے۔ احادیث کے درمیان تطبیق کیلئے علماء کے دو طبقے ہیں۔ بعض علماء سیاہ خضاب کے جواز کے بھی قائل ہیں۔ ہاں ممانعت صرف اس صورت پر حمل کرتے ہیں۔ جس میں مدلیس کا شبہ ہو۔ اسلام تینین و تحسین کے خلاف نہیں۔ لیکن بعض اوقات دھوکہ اور فریب کیلئے بالوں کو سیاہ کیا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اسلام خضاب کو ممنوع قرار دیتا ہے تاکہ دھوکہ کا انداد ہو سکے۔ کیونکہ مدلیس اور فریب میں دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر ایک شخص کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ کوئی رشتہ نہیں ملتا جس سے رشتہ طلب کرتا ہے، وہ سفید بال دیکھ کر بوڑھا سمجھ لیتا ہے۔ اور رشتہ سے انکار کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ خضاب کا سہارا لیتا ہے اور لوگ اسے جوان سمجھ کر رشتہ دے دیتے ہیں۔ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ تو بوڑھا ہے۔ اسی طرح وہ عورت بھی کبھی کبھی دھوکہ دے سکتی ہے جس کی عمر زیادہ ہے بال سفید ہیں۔ لیکن وہ بیوٹی کلینک سے بن سنور کر نکلی کسی کی نظر پڑی۔ اور اسے جوان سمجھ کر شادی رچائی۔ بعد میں معلوم ہوا تو بچھتا رہا۔ اسی طرح پرانے زمانے میں عموماً غلاموں اور کنیزوں کی فروخت کے وقت بھی مدلیس سے کام لیا جاتا تھا۔ مالک اپنے غلام یا کنیز کی

قیمت بڑھانے کے لئے ان کو خضاب لگا کر اور میک اپ کروا کر نوجوان ظاہر کرتے۔ تاکہ خریدار لوگ دھوکہ کھا کر خرید لیں۔ ان صورتوں میں چونکہ دھوکہ فریب اور دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اس لئے خضاب لگانا ممنوع ہے۔ لیکن اگر دھوکہ فریب نہ ہو۔ مثال کے طور پر میاں بیوی میں سے کسی کے بال سفید ہیں اور دوسرے کو اس کے بڑھاپے کا خوب پتہ ہے۔ بلکہ خود کہہ دیتا ہے کہ سفید بالوں کو خضاب لگا دیا جائے تو ایسے موقع پر خضاب خواہ وہ خالص سیاہ کیوں نہ ہو۔ لگانے میں کوئی حرج نہیں۔ علامہ ابن قیمؒ نے بھی اس کی تصریح کر دی ہے۔

بعض دوسرے علماء کا خیال ہے کہ اگر خضاب خالص سیاہ نہ ہو۔ بلکہ کوئی دوسرا رنگ مثلاً سرخ مہندی وغیرہ اس میں ملا دیا جائے تو سرخی مائل خضاب کے لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور نبی کریم ﷺ نے بھی اگر خضاب استعمال کیا ہے تو وہ بھی خالص سیاہ نہ تھا۔ بلکہ یہی مخلوط خضاب تھا۔ بلکہ بعض علماء نے خضاب لگانے کو مستحب قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس میں اہل کتاب کی مخالفت ہے۔ اور جہاں ممانعت کا ذکر ہے تو سواد بخت یعنی خالص سیاہ خضاب مراد ہے۔ علامہ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں بڑے اکابر صحابہ کے نام بھی لکھے ہیں جنہوں نے خضاب کا استعمال کیا تھا۔ ان میں حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت حسنؓ اور حسینؓ کے نام بھی شامل ہیں۔ اور ایک بڑی تعداد کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ سیاہ خضاب استعمال کیا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں بھی یہی توجیہ کی جائے گی کہ انہوں نے مدلیس کے لئے نہیں کیا تھا۔ نیز جو خضاب لگایا تھا وہ بھی خالص سیاہ نہیں تھا۔ بلکہ مہندی سے مخلوط تھا۔

(۲) حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ مَنْصُورٍ وَيَحْيَى بْنُ مُوسَى قَالَا نَا

عَبْدُ الرَّزَّاقِ عَنْ مَعْمَرٍ عَنْ ثَابِتٍ عَنْ أَنَسٍ قَالَ مَا عُدَّتْ فِي رَأْسِ

رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَلَحِيَّتِهِ إِلَّا أَرْبَعُ عَشْرَةَ شَعْرَةً بَيْضَاءُ (۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے سر

مبارک اور داڑھی مبارک میں چودہ سے زائد بال نہیں گنے۔

(۱) صحیح ابن حبان ۷۰/۸ باب من صفته ﷺ وأخباره شرح السنة ۱۳/۲۲۸ باب شبة

وخضابه ﷺ (مختار)

بالوں میں موجود سفید بالوں کا تخمینہ: **إلا أربع عشرة شعرة** اس حدیث میں چودہ بال مذکور ہیں۔ آگے ایک اور حدیث میں تقریباً بیس اور حضرت انسؓ کی ایک حدیث میں سترہ اور اٹھارہ بالوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اور اگرچہ مذکورہ روایات میں اعداد مختلف ہیں۔ لیکن ان احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ کیونکہ اختلاف زمانہ کی وجہ سے سفید بالوں کے عدد میں کمی بیشی آتی رہتی ہے علاوہ ازیں ایک شخص کا گنا دوسرے شخص کے گننے سے مختلف ہوتا ہے۔ ہر کوئی توجہوں کی طرح تلاش کر کے ایک ایک بال نہیں گنتا۔ پھر نبی کریم ﷺ کی عظمت و ہیبت کی وجہ سے ہر شخص اتنی گہرائی سے آپ ﷺ کے چہرہ انور کو کب دیکھ سکتا تھا۔ بس دور سے تخمینہ لگا کر صحابہ نے اعداد بتائے ہیں۔ چنانچہ کسی نے چودہ تک گن لئے۔ کسی نے سترہ کسی نے اٹھارہ اور کسی نے بیس تک گنے ہیں۔ ممکن ہے کہ بال اور بھی ہوں لیکن شمار میں نہ آئے ہوں۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب سفید بالوں کا عدد چودہ ہو کر دوسرے عشرہ میں داخل ہوا تو بیس کا نصف سے بڑھ کر بیس سے قریب ہو گیا۔ اس لئے اگلی روایت میں نحواً من عشورین کا قول تقریبی ہے۔ لیکن بہتر تو جیہ یہی ہے کہ یہ سب اقوال تخمین پر مبنی ہیں۔ یا پھر اختلاف زمانہ کی وجہ سے عدد میں اختلاف آیا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت انسؓ کی دونوں حدیثوں میں تطابق کی ایک توجیہ یہ بھی ہے کہ یہاں پر انہوں نے ”ما عددت فی رأس الخ“ کا لفظ کہا ہے۔ جس کا معنی ہے کہ میں نے چودہ گنے تھے۔ اب درحقیقت بال چودہ سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں تو دوسری روایات میں سترہ اٹھارہ کا جو ذکر ہے وہ دوسرے موقع پر گننے کے مطابق ہوگا۔

(۳) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى أَنَا أَبُو دَاوُدَ أَنَا شُعْبَةُ عَنْ سَمَاقِ بْنِ

حَرْبٍ قَالَ سَمِعْتُ جَاهِرَ بْنَ سَمُرَةَ يَسْتَلُ عَنْ شَيْبِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ

لَقَالَ كَانَ إِذَا أَقْبَنَ رَأْسَهُ لَمْ يَرْمِهِ شَيْبٌ فَإِذَا لَمْ يَلْهَنْ رَوَى مِنْهُ (۱)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے نبی کریم ﷺ کے سفید بالوں کے بارے میں پوچھا گیا تو

انہوں نے فرمایا کہ جب نبی کریم ﷺ تیل کا استعمال فرماتے تھے تو بالوں کی سفیدی

دکھائی نہیں دیتی تھی اور جب تیل استعمال نہیں فرماتے تھے تو کچھ سفیدی دکھائی دیتی

تھی۔

اذا دهن راسه: دھن ثلاثی مجرد کے صیغے سے بھی مروی ہے۔ اور ادهن افعال کے صیغے کے ساتھ بھی مروی ہے۔ جو کہ اصل میں ادهن تھا۔ تاء کو وال سے بدل کر وال کو وال میں غم کیا گیا۔ دونوں کا معنی ایک ہے۔ لم یر منه شئی اس کی وجہ یہ تھی کہ بالوں میں تیل لگانے سے چمک آ جاتی ہے جس کی وجہ سے سفیدی مغلوب ہو جاتی ہے اور دکھائی نہیں دیتی۔ فاذا لم یدھن یہاں پر بھی باب افعال اور ثلاثی مجرد دونوں طرح مروی ہے۔ پہلی صورت میں دال مشدود اور دوسری صورت میں غیر مشدود ہوگا۔ روى منه جب بال خشک اور پریشان ہوں تو سفید بال نمایاں نظر آتے ہیں بہر حال اس حدیث سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے بالوں میں سفید بال بہت کم تعداد میں تھے۔

(۴) حدثنا محمد بن عمر بن الوليد الكندي الكوفي أنا يحيى بن

ادم عن شريك عن عبد الله بن عمر عن نافع عن ابن عمر قال إنما

كان شيب رسول الله ﷺ نحوا من عشرين شعرة بيضاء (۱)

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے سفید بال تقریباً بیس تھے۔

عن عبد الله بن عمر یہ صحیح تابعی ہیں اور مشہور صحابی حضرت ابن عمرؓ کے بھتیجے حص بن عاصمؓ

کے پوتے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ: عن ابن عمر بن الخطاب یہ مشہور صحابی ہیں۔۔ نبی کریم ﷺ کی

بعثت کے کچھ عرصہ بعد پیدا ہوئے نام عبد اللہ تھا۔ والد کے ساتھ ہجرت کی۔ بعض علماء کے خیال میں جنگ

احد میں شریک ہوئے جبکہ بعض کے خیال میں جنگ احد میں صغریٰ کی وجہ سے آپ کو شرکت کی اجازت نہیں

ملی۔ البتہ بعد کے تمام غزوات نیز بیعت رضوان میں شریک رہے۔ نبی کریم ﷺ سے ایک ہزار چھ سو تین

احادیث روایت کی ہیں۔ اتباع سنت اور کثرت صدقہ کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ ۳۷ھ یا ۳۸ھ میں

وفات پائی۔

(۱) سنن ابن ماجہ ۲۵۸ کتاب اللباس من ترک الخضاب، صحیح ابن حبان ۸/۷۰ باب صفة

النبي ﷺ وواخباره (مختار)

نحواً من عشرين الخ اس حدیث میں میں کے قریب بالوں کا ذکر ہے۔ اور پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ حضرت انسؓ کی حدیث سے اس کا کوئی تعارض نہیں ہے۔

(۵) حدثنا ابو كريب محمد بن العلاء أنا معاوية بن هشام عن
شيبان عن ابي اسحاق عن عكرمة عن ابن عباس قال قال أبو بكر يا
رسول الله ﷺ قد ثبت قال شيبتي هود والواقعة والمرسلات و
عم يتساءلون واذا الشمس كورت (۱)۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ تو بوڑھے ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے سورۃ ہود، سورۃ واقعہ، سورۃ مرسلات، عم يتساءلون اور سورۃ اذا الشمس كورت نے بوڑھا کر دیا۔

یا رسول اللہ ﷺ قد ثبت حضرت ابو بکر صدیقؓ کو نبی کریم ﷺ سے انتہائی درجہ کا عشق تھا۔ ہر وقت یہ غم ہوتا کہ کہیں جدائی نہ آجائے۔ چنانچہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جب نبی کریم ﷺ کے بالوں میں سفید بال دیکھے۔ چہرۂ انور پر کمزوری اور جسمانی قوتوں میں اضمحلال محسوس ہوا تو کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ تو بوڑھے ہو گئے ہیں۔

احساس ذمہ داری کی انتہا: شیبتنی ہود نبی کریم ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ مجھے سورۃ ہود نے بوڑھا کر دیا۔ مطلب یہ کہ وحی اور قرآن کے احکام، فریضہ نبوت کی ذمہ داریوں اور اللہ تعالیٰ کے براہ راست خطاب کے بوجھ اور تقاضوں نے فکر مند کر دیا ہے۔ کہ یہ ذمہ داریاں پوری بھی ہو سکیں یا نہیں اور یہ فرض ادا کرنے کی توفیق بھی ملے گی یا نہیں۔ اور فکروں کی زیادتی اور احساس کی دامنگیری بڑھاپے کا سبب بنی۔ کیونکہ افکار انسان کو کمزور و لاغر اور بوڑھا کر دیتے ہیں۔ جتنی کہتا ہے ۔

والهم يخترم الجسيم نحافة و ليشيب ناصية الصبي و يخرم

(۱) مستدرک للحاکم ۲/۳۴۳ کتاب التفسیر تفسیر سورۃ ہود، جامع الترمذی ۲/۱۴۴ کتاب

التعبير باب ومن سورة الواقعة (مختار)

اور قرآن مجید تو ہر قدم پر ذمہ داری کا احساس دلاتا ہے۔ پھر بعض سورتوں میں تو وعیدیں اور جہنم و آخرت کے احوال و شدائد بکثرت مذکور ہیں۔ دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کا یقین اور عالم آخرت پر پختہ ایمان سونے پر سہاگہ تھا۔

سورة هود میں استقامت کا حکم: خصوصاً سورة هود کا حکم کہ ”فاستقم كما امرت“ بہت بھاری حکم تھا کیونکہ اس میں ثابت قدمی اور قواعد و ضوابط کی پابندی کی تاکید ہے۔ ویسے بھی استقامت بڑا مشکل کام ہے۔ اسی لئے تو کہتے ہیں الاستقامة خير من ألف كرامة استقامت ہزار کرامتوں سے افضل ہے۔ اور یہ اس لئے کہ اس میں تکلیف زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص ایک دو روز عشاء کے بعد دس گھنٹے تک مطالعہ بھی آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں لیکن اگر وہ عزم کرے کہ وہ ہمیشہ کیلئے عشاء کے بعد صرف ایک گھنٹہ تسلسل اور پابندی سے مطالعہ کرے گا۔ چاہے اس وقت اس کا باپ یا عزیز دوست اس کا منتظر کیوں نہ ہو۔ جلسہ، جلوس یا کوئی دوسرا پروگرام کیوں نہ ہو۔ وہ ایک گھنٹہ ضرور مطالعہ میں صرف کرے گا۔ تو یہ استقامت مشکل کام ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ اس انضباط اوقات اور پابندی میں بڑی کامیابی بھی مضمر ہیں۔

شرح السنہ میں لکھا ہے کہ کسی نے نبی کریم ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ اس نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے کہ سورہ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس میں ایک آیت ہے۔ کہ واستقم كما امرت کہ استقامت خود بھی مشکل کام ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ امر کے موافق ہونا بھی شرط ہے۔ انسان ہزار بار کوشش کرے۔ لیکن بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کما حقہ نہ ہو سکے۔ خود نبی کریم ﷺ کو بھی اس بات کا اعتراف و احساس تھا۔ چنانچہ فرمایا کرتے تھے کہ ما عبدناک حق عبادتک یعنی اے اللہ ہم نے تیری عبادت کا حق ادا نہیں کیا۔

نبی کریم ﷺ نے اس مقام پر سورہ ہود کی آیت کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ سورہ شوریٰ میں بھی بالکل اسی قسم کی آیت موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ فَلْيَدْعُ الْكَافِرَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ۔ اسی دین کی طرف بلاؤ اور جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ ویسے ثابت قدم رہو۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سورہ ہود میں

”فلاستقم كما امرت“ کے ساتھ ”ومن قاب معك“ کا اضافہ بھی آیا ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ کو علم ہے کہ وہ خود بھی ضوابط کے مطابق رہیں۔ اور مومنین کو بھی استقامت پر رکھنا تھا۔ نبی کریم ﷺ کو یہ فکر زیادہ دامن گیر تھا کہ میں تو توفیق الہی سے استقامت پر رہ سکوں گا۔ لیکن امت سے اس میں کوتاہی ہوئی تو اس کا جواب کون دے گا۔ اگر اس کا محاسبہ بھی مجھ ہی سے ہوا تو یہ مشکل ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے یہ امر سورۃ ہود میں نازل ہوا ہولہذا شورئ کے امر کا اعتبار نہیں کیا گیا۔

والواقعة والمرسلات: ان تمام سورتوں میں حضرت شاہ ولی اللہ کی اصطلاح کے مطابق تذکیر بآلاء اللہ، تذکیر بما بعد الموت اور تذکیر بایام اللہ تینوں مضامین بکثرت آئے ہیں۔ اور بعض روایات میں سورۃ الحاقۃ، سورۃ القارعة اور سورۃ الغاشیہ کا ذکر بھی ملا ہے۔ ان تمام سورتوں میں قیامت، جہنم اور آخرت کی دہشت اور هول کا بیان ہے۔

(۶) حدثنا سفیان بن وکیع أنا محمد بن بشر عن علی بن صالح عن أبي إسحاق عن أبي جحيفة قال قالوا يا رسول الله نراك قد شئت قال شيتني هو دواخوانها (۱)۔

ترجمہ: حضرت ابو جحیفہ کہتے ہیں کہ صحابہؓ نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ بوڑھے ہو چکے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے سورۃ ہود اور اس کے مثل سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔

عن أبي جحيفة الخ جحيفة تفسیر کے وزن پر ہے ان کا نام وہب بن عامر بن صحصہ سوانی کوئی تھا۔ حضرت علیؓ آپؐ سے محبت کرتے تھے اور آپؐ کو وہب الخیر کہا کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت آپؐ نابالغ تھے۔ آپؐ سے کل پچاس حدیثیں مروی ہیں ۴۷۷ حدیثیں کو وفات پائی۔

قد شئت الخ۔ صرف بالوں کی سفیدی مراد نہیں کیونکہ روایات کے مطابق وہ تو برائے نام تھی بلکہ مراد یہ ہے کہ بدن بھاری اور مضحل ہو گیا ہے اور اٹھنے کے لئے بھی سہارے کی ضرورت ہوتی تھی۔

شیبتنی ہود الخ۔ جس میں قیامت و جہنم کے مصائب کا ذکر اور استقامت کا حکم ہے علامہ زحشری کا بیان ہے کہ ایک شخص نے خواب میں جہنم اور قیامت کا منظر دیکھا۔ صبح ہوئی تو راتوں رات سیاہ داڑھی بالکل سفید ہو چکی تھی۔ تو نبی کریم ﷺ کو بھی جہنم اور اس کے عذاب پر یقین بلکہ مشاہدہ تھا لہذا آپ ﷺ کے بڑھاپے کا سبب بھی عذابوں کا ذکر بن سکتا ہے۔

بعض دیگر روایات میں سورۃ واقعة، سورۃ الحاقة، سورۃ سائل، سورۃ الفترت الساعة کا ذکر بھی آیا ہے جن میں قیامت اور اس کے عذابوں کا امتیازی ذکر ہے (۱)۔

(۷) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ حَجْرٍ قَالَ أُنَبِّئُكَ عَنْ شُعَيْبِ بْنِ صَفْوَانَ عَنْ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ عَمِيرٍ عَنْ أَيَادٍ بْنِ لَقِيطِ الْعَجَلِيِّ عَنْ أَبِي رَمْثَةَ التِّيمِيِّ تِيمِ الرَّبَابِ قَالَ أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ وَمَعِيَ ابْنُ لَيْ قَالَ فَأَرَيْتُهُ فَقُلْتُ لَمَّا رَأَيْتُهُ هَذَا نَبِيُّ اللَّهِ وَعَلَيْهِ ثَوْبَانِ أَخْضِرَانِ وَلَهُ شَعْرٌ قَدْ عَلَاهُ الشَّيْبُ وَشَبَّهَ أَحْمَرُ (۲)۔

ترجمہ: حضرت ابو رمثہ التیمیؓ فرماتے ہیں کہ میں اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے نبی کریم ﷺ دکھائے گئے۔ میں نے دیکھا تو مجھے بے اختیار فوراً یہ کہنا پڑا کہ واقعی یہ اللہ کے سچے نبی ہیں۔ اس وقت نبی کریم ﷺ سبز کپڑوں میں ملبوس تھے۔ اور آپ ﷺ کے چند بالوں پر بڑھاپے کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ لیکن وہ سرخ تھے۔

تیم الرباب: عن أبي رمثة التيممي تيم الرباب۔ رمثہ کا راء مکسور ہے۔ مشہور صحابی ہیں آپؐ کے نام میں اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں چار نام خواب (۳)، رفاعہ، جندب، اور خشخاش مروی ہیں۔ (۱) اس لئے مفسرین حضرات نے لکھا ہے کہ اخوات سے مراد وہ سورتیں جس میں آخرت کی عذاب، قیامت اور جہنم کے عذاب کا ذکر ہوا قبل حدیث میں ذکر شدہ سورتوں میں انحصار نہیں۔ (مختار)

(۲) ابو داؤد ۲۵۲۲/۲۴۲ کتاب الترجل باب فی الخضاب (مختار)

(۳) علامہ بیہقیؒ نے خواب کی جگہ حیان لکھا ہے (اصلاح الدین)

تیم عرب کا ایک بڑا قبیلہ ہے اس میں پانچ شاخیں ہیں۔ ضبہ، ثور، عکل، تیم اور عدی ان لوگوں نے کسی موقع پر تیل کی تلچٹ میں ہاتھ ڈبو ڈبو کر آپس میں مدد کی قسمیں کھائیں۔ چونکہ تلچٹ کو رباب کہتے ہیں اسلئے ان کو تیم الرباب کہا جانے لگا۔ بنو بکر کا بھی ایک قبیلہ تیم ہے جس کو تیم قریش کہتے ہیں اور چونکہ مراد اول الذکر قبیلہ تھا اس لئے انہی کے بعد تیم الرباب کا لفظ بڑھا دیا۔

فادیتہ مجھول کا صیغہ ہے غالباً صحابی نے اہل مجلس میں سے کسی سے پوچھا ہو جس کے بعد کسی نے اشارہ کر دیا ہو کہ نبی کریم ﷺ وہ ہیں۔

هذا نبی اللہ مطلب یہ ہے کہ میں نے جان لیا کہ واقعی یہ شخص اللہ کے نبی ہیں۔ گویا نور نبوت اس قدر واضح تھا کہ دیکھتے ہی یقین ہو گیا۔

وعلیہ ثوبان أخضران۔ یعنی آپ سبز چادروں کا جوڑا زیب تن کئے ہوئے تھے۔
بالوں میں سرخی کیوں تھی: ولہ شعر قد علاہ الشیب۔ شعر میں تھوین تقلیل کیلئے ہے یعنی معدودے چند بالوں پر سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ وشبہ احمر یعنی جن بالوں کا رنگ متغیر ہو چکا تھا۔ وہ سرخ تھے۔ شراح میں سے بعض کا خیال ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب لگایا تھا۔ لیکن یہ مہندی کا سرخی مائل خضاب تھا جبکہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ سرخی خضاب یا مہندی کی سبب نہ تھی بلکہ ذاتی سرخی تھی۔ کیونکہ بال مکمل سفید ہونے سے پہلے سرخ ہو جاتے ہیں۔ تو یہ نبی کریم ﷺ کے بالوں میں سفیدی آنے کی ابتدائی حالت تھی۔

(۸) حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مَنِيعٍ أَنَا سَرِيحُ بْنُ النُّعْمَانِ أَنَا حَمَادُ بْنُ سَلَمَةَ عَنْ سَمَاقٍ بْنِ حَرْبٍ قَالَ قِيلَ لِحَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ أَمَا كَانَ فِي رَأْسِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ شَيْبٌ قَالَ لَمْ يَكُنْ فِي رَأْسِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ شَيْبٌ إِلَّا شَعْرَاتٌ فِي مَفْرَقِ رَأْسِهِ إِذَا دَهَنَ وَأَرَاهَنَ الدَّهْنَ (۱)۔

ترجمہ: سماک بن حرب کہتے ہیں کہ حضرت جابر بن سمرہ سے کسی نے پوچھا کہ کیا نبی کریم ﷺ کے سر کے بالوں میں سفیدی نہیں تھی تو انہوں نے کہا کہ آپ ﷺ کے

سر مبارک میں صرف چند بال مانگ پر سفید تھے۔ جب آپ ﷺ تیل لگا لیتے تھے تو تیل ان کو چھپا دیتا تھا۔

الاشعرات فی مفرق رأسه الخ مانگ پر جہاں بال جدا ہوں کچھ سفید بال تھے مگر یہ بال تھوڑے تھے کیونکہ شعرات کی توین تقلیل کے لئے ہیں۔

واراهن الدھن مواراة سے ماضی کا صیغہ ہے۔ چھپانے میں مبالغہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں ہے کہ فإودى سورة اخى (تاکہ میں اپنے بھائی کی لاش چھپالوں) مطلب یہ کہ بالوں میں تیل لگنے کی وجہ سے چمک آ جاتی ہے۔ اور وہ جم جاتے ہیں۔ تو سفید بال بھی غائب ہو جاتے تھے۔

۶۔ باب ما جاء في خضاب رسول الله ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے خضاب لگانے کے بیان میں

خضاب کا معنی: خضاب لغت میں مایہ خضب بہ کو کہتے ہیں یعنی وہ چیز جس سے بالوں کو رنگا جاتا ہے اور عموماً وہ مہندی اور کتم ہوا کرتا ہے۔ جس طرح کہ حضرت ابو ذرؓ کی ایک حدیث میں اس کی طرف اشارہ ہے فرماتے ہیں۔ أحسن ما غیر بہ هذا الشیب الحناء والکتم (۱)۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خضاب خضب بخضب سے مصدر ہے۔ بالوں کو رنگ دینے کے معنی میں مستعمل ہے اور چونکہ دیگر ابواب میں بھی الفاظ مصدری معانی پر محمول ہیں اس لیے اس مقام پر مؤخر الذکر معنی رائج بھی ہے۔ اس باب میں امام ترمذیؒ نے چار احادیث لائے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے خضاب لگایا نہیں؟ روایات اس سلسلے میں مختلف ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے

خضاب کا استعمال کیا ہے یا نہیں۔ بعض روایات سے اثبات معلوم ہوتا ہے اور بعض روایات سے خضاب لگانے کی نفی ہوتی ہے۔ مسلمؒ اور بخاریؒ کی ایک حدیث میں خضاب کا حکم بھی آتا ہے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ أن اليهود والنصارى لا یصبغون فخالقوا هم (۲)۔ کہ بیشک یہود اور نصاریٰ بالوں کو نہیں رنگتے۔ لہذا تم ان کی مخالفت کرو۔

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ أن رسول الله ﷺ کان یصبغ بالصفرة (۳)۔ اسی طرح اس باب کی دوسری حدیث سے بھی رسول اللہ ﷺ کے عمل کی تصریح موجود ہے۔

جبکہ جامع ترمذیؒ میں امام ترمذیؒ نے کعب بن مرہؓ کی حدیث ذکر کی ہے جس سے خضاب کی مخالفت معلوم ہوتی ہے۔

(۱) ابو داؤد جلد ۲ ص ۲۲۲، کتاب الترجل باب فی الخضاب، ترمذی جلد ۱ ص ۲۰۸، ابواب اللباس باب ما جاء فی الخضاب ص ۳۰۵ (مختار)

(۲) بخاری جلد ۲ ص ۸۷۵، کتاب اللباس باب الخضاب، ابو داؤد جلد ۲ ص ۲۲۲، کتاب الترجل باب فی الخضاب (مختار)

(۳) بخاری جلد ۲ ص ۸۷۰، باب النعال السبتیة وغیرہا کتاب اللباس (مختار)

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ من شاب شیبۃ فی الاسلام کانت له نوراً یوم القیامۃ (۱) جس شخص کے بال اسلام کی حالت میں سفید ہو گئے۔ تو یہ سفیدی قیامت کے روز اس کیلئے نور ہوگی۔

اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کان یکره تغییره الشیب (۲)۔ نبی کریم ﷺ سفید بالوں کا رنگ بدلنے کو برا مانتے تھے۔

شرح کہتے ہیں کہ امام ترمذیؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب کا استعمال نہیں کیا۔ جیسا کہ پہلی حدیث میں امام ترمذیؒ نے اپنی رائے خوب واضح طور پر دیدی ہے۔ اور پچھلے باب کی تقریباً تمام احادیث بھی اس کی دلیل ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب نہیں لگایا۔ صحابہ میں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کا خضاب لگانا ثابت ہے۔ جبکہ حضرت علیؓ، حضرت سلمۃ بن الاکوعؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ سے خضاب نہ لگانا ثابت ہے۔

علماء احناف کا بھی اسی طرف میلان ہے۔ درمختار میں اس بات کی تصریح ہے کہ وہ روایات زیادہ صحیح ہیں جو نبی کریم ﷺ کے خضاب نہ لگانے پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں مفصل بحث ہم پچھلے باب میں کر چکے ہیں۔ اور جن روایات میں خضاب لگانے کا بیان ہے تو ان کا مختلف طریقوں سے جواب دیا جاتا ہے۔

(۱) یہ کہ نبی کریم ﷺ کے بالوں میں سیاہی کے بعد سرخی نمودار ہو چکی تھی۔ جس طرح کہ عموماً بالوں میں سفیدی آنے سے قبل سرخی آتی ہے۔ اس فطری سرخی کو مجازاً خضاب سے تعبیر کیا گیا تھا۔ دراصل یہ خضاب نہ تھا بلکہ وہ ذاتی سرخی تھی جو سفیدی آنے سے قبل بالوں کو لگتی ہے۔ اورایت شعر رسول اللہ ﷺ مخصوصاً کا یہی معنی ہے کہ وہ رنگ شدہ دکھائی دے رہے تھے دراصل اس کو خضاب لگانا تھا۔

(۲) بعض لوگوں نے اختلاف روایات کو اختلاف اوقات پر حمل کیا ہے۔ گویا نبی کریم ﷺ کبھی کبھی خضاب لگاتے تھے لیکن اکثر خضاب نہیں لگاتے تھے۔ چنانچہ بعض صحابہ نے خضاب کی حالت میں

(۱) جامع ترمذی جلد ۱ ص ۹۷ ومثلہ السنن النسائی ۲/۲۲۵ کتاب اللباس باب فی نشف

الشیب، کنز العمال ۱۵/۶۶۶ رقم الحدیث ۳۲۶۴ (مختار)

(۲) ومثلہ فی السنن النسائی ۲/۲۲۶ کتاب اللباس باب ماجاء فی خضاب السواد (مختار)

آپ ﷺ کو دیکھا اور بعض دوسرے صحابہ نے آپ ﷺ کے خضاب کو نہیں دیکھا تھا۔ لہذا اس کی خبر دی۔ علامہ ابن حجرؒ نے بھی اس اختلاف کو اختلاف زمانہ پر حمل کیا ہے۔

(۳) بعض لوگوں نے خضاب نہ لگانے کی تاویل کی ہے وہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اگرچہ بعض اوقات کتم یا مہندی سے خضاب لگایا ہے لیکن وہ دراصل بالوں کو رنگنے کی نیت سے نہ تھی۔ بلکہ بالوں کے آخر عمر تک سیاہ ہونے کے سبب آپ کو تلوین الشعر کی ضرورت ہی پیش نہ آئی اور اگر کبھی نبی کریم ﷺ سے خضاب لگانا ثابت بھی ہے تو وہ گرمی کی شدت کو کم کرنے یا کسی دوسری تکلیف کی وجہ سے بطور دواء آپ ﷺ نے کیا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر حمید کے لئے ہاتھ پاؤں پر بھی مہندی لگاتے ہیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے سردی یا مرض کے علاج اور مداوی کیلئے مہندی لگائی ہوگی۔ بالوں کو رنگنے کی غرض سے نہیں گویا آپ ﷺ نے خضاب کے اصل مقصد سے خضاب نہیں لگایا۔ لہذا دونوں قسم کی روایات میں کوئی تعارض نہیں۔

بہر حال امام ترمذیؒ کے نزدیک زیادہ رائج یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب استعمال نہیں کیا۔ اور آگے اس کی وجہ کی طرف بھی ”لم يبلغ الشيب“ میں اشارہ کر دیا کہ آپ ﷺ کے بال سیاہ ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کو خضاب کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی۔

(۱) حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مَنِعٍ أَنَا هَشِيمٌ أَنَا عَبْدُ الْمَلِكِ بْنُ عَمِيرٍ عَنْ

أَبِي دَاوُدَ بْنِ لَقِيطٍ قَالَ أَخْبَرَنِي أَبُو رُمَّةٍ قَالَ أَتَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مَعَ ابْنِ

لِي فَقَالَ ابْنُكَ هَذَا فَقُلْتُ نَعَمْ أَشْهَدُ بِهِ قَالَ لَا يَجْنِي عَلَيْكَ وَلَا

تَجْنِي عَلَيْهِ قَالَ وَرَأَيْتَ الشَّيْبَ أَحْمَرُ قَالَ أَبُو عَيْسَى هَذَا أَحْسَنُ شَيْءٍ

رَوَى فِي هَذَا الْبَابِ وَافْسَرَهُ لِأَنَّ الرِّوَايَاتِ الصَّحِيحَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ

لَمْ يَبْلُغِ الشَّيْبَ وَأَبُو رُمَّةٍ إِسْمُهُ رِفَاعَةُ بْنُ يَثْرِبَةَ التَّيْمِيُّ (۱)۔

ترجمہ: حضرت ابو رُمثہؒ کہتے ہیں کہ میں اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر نبی کریم ﷺ کی

خدمت میں حاضر ہوا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کیا تیرا بیٹا یہ ہے میں نے کہا۔ ہاں

(۱) سنن ابی داؤد ۲۵۷/۲۲۶ باب الخضاب کتاب الترجل، سنن نسائی باب الخضاب بالحناء

یہ میرا بیٹا ہے۔ آپ اس کے گواہ رہئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس کی جنایت کا بدلہ تجھ پر نہیں اور تیری جنایت کا بدلہ اس پر نہیں۔ ابورمہ کہتے ہیں کہ اس وقت میں نے آپ ﷺ کے بعض بالوں کو سرخ دیکھا۔

ابنک هذا الخ یہاں پر حمزہ استفہام مخدوف ہے ابنک مبتدا اور هذا اس کی خبر ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو پہلے سے حضرت ابورمہ کے بیٹے کے بارے میں اجمالی پتہ چلا ہو۔ اب دیکھا تو پوچھا کہ کیا تیرا بیٹا یہی ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ ہذا مبتداء مؤخر ہو اور ابنک خبر ہو۔ پھر سوال یوں ہوگا کہ کیا یہ تیرا بیٹا ہے۔ فقلت نعم اشہد عام شراح کے نزدیک یہ امر کے صیغے سے مروی ہے۔ گویا حضرت ابورمہؓ نبی کریم ﷺ کو اس بات پر گواہ بنانا چاہتے ہیں کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ تاکہ اگر کبھی کسی ایک کا دوسرے کی جگہ مواخذے کی ضرورت پڑی تو میرا یہ اقرار بالنسب معلوم ہو۔ نبی کریم ﷺ کا جواب بھی اس تشریح سے مناسبت رکھتا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ مضارع سے شکم کا صیغہ ہو۔ اور اخبار ہو۔ اس صورت میں یہ نعم کی تاکید ہوگی۔ اور مقصود وہی ہوگا کہ جاہلیت کے رسم کے مطابق ہم ایک دوسرے کی جگہ مواخذے کے لئے تیار ہیں۔ اور اخبار ہو یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ میرا بیٹا ہے۔

ایک کے بدلے دوسرے کا مواخذہ رسم جاہلیت: قال لا یجنى علیک الخ اس جملہ کے تین مطلب بیان کئے جاتے ہیں۔

(۱) اول یہ کہ یہ قول نبی کریم ﷺ کی طرف سے حضرت ابورمہؓ کو دعا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لئے عافیت و سلامتی کا باعث بنو۔ باپ پر بیٹے کی وجہ سے اور بیٹے پر باپ کی وجہ سے جرمانہ نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ تم میں سے ہر ایک کو جرائم و جنایات سے محفوظ رکھے۔ تاکہ وہ دوسرے کے لئے تکلیف اور پریشانی کا سبب نہ بنے۔

(۲) دوم یہ کہ یہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے پیش گوئی ہے کہ مستقبل میں نہ تم جرم کرو گے۔ جس کی سزا تیرا بیٹا بھگتے اور نہ تیرا بیٹا ارتکاب جرم کرے گا کہ جس کی سزا تم کو بھگتنا پڑے۔

(۳) تیسری اور سب سے واضح تشریح یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اس صحابی کے قول سے جاہلیت کے

فرسودہ رسم کی ہو آئی۔ وہ یہ کہ دراصل یہ صحابی اپنے نسب پر نبی کریم ﷺ کو اس لئے گواہ بنانا چاہتے تھے کہ اس کا بیٹا آئندہ کیلئے اس سے سرزد جرائم میں اس کی جگہ ماخوذ ہو سکے۔ کیونکہ اس وقت کے رواج کے مطابق باپ جرم کرتا تو بیٹا پکڑا جاتا تھا۔ اور اگر بیٹا جرم کرتا تو باپ پکڑا جاتا۔ باپ کے جرم میں بیٹے کو قتل بھی کیا جاسکتا تھا۔ جیسا کہ بیٹے کے جرم میں باپ کو قتل کیا جاسکتا تھا۔ مالی جرائم کی حالت بھی یہی تھی کہ ایک کی جگہ دوسرے سے وصول کئے جاسکتے تھے۔ اسلام نے آکر جاہلیت کی یہ رسم مٹادی۔ دنیا کے معاملات میں بھی یہی حکم ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کیلئے جوابدہ ہے۔ دنیا کا معاملہ ہو یا آخرت کا معاملہ۔ بہر صورت ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوگا۔ ایک شخص دوسرے کی جگہ ماخوذ نہیں ہوگا۔ اس توجیہ کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے۔ کہ ابو داؤد کی ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابو رمثہؓ کو یہ بھی فرمایا کہ لَا تَسْرِدُوا زِدَّةَ وَزِدَاخُوئِي (اکوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور یہی فطری ضابطہ اسلام کا مستقل قانون بن گیا۔ بہر حال نبی کریم ﷺ نے اس صحابی کے اس خیال کی تردید کے لئے یہ جملہ کہا کہ قال ورايت الشيب احمر ابو رمثہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے وہ بال جن کا رنگ بدل چکا تھا سرخ دیکھے۔ اس میں دو احتمال ہیں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ آپ ﷺ کے بال خصلۃ سرخ تھے۔ اور یہ مصنوعی رنگ نہ تھا۔ بلکہ قدرتی طور پر آپ ﷺ کے بالوں میں سرخی آگئی تھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ راوی کا مقصد یہ ہو کہ آپ ﷺ نے خضاب لگا کر بالوں کو سرخ کر دیا تھا۔ مؤخر الذکر احتمال کی تائید حضرت ابو رمثہؓ ہی کی ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں آپ نے تصریح فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حنا اور کتم سے خضاب لگایا کرتے تھے (۲)۔ دونوں صورتوں میں تطبیق کی تفصیل ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔

امام ترمذی نے یہی حدیث پچھلے باب میں بھی ذکر کی ہے۔ اور اس باب میں بھی لے آئے۔ اس کی توجیہ بعض لوگوں نے یہ کی ہے کہ پچھلے باب میں اس حدیث کا مطلب یہ تھا کہ حضرت ابو رمثہؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے بالوں کو تغیر دیکھا تھا۔ جو کہ سیاہی سے سرخ رنگ کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ وہاں خضاب لگانے یا نہ لگانے کی بات مقصود نہیں جبکہ یہاں حضرت ابو رمثہؓ کے قول کا مطلب یہ ہوگا کہ

(۱) جمع الوسائل جلد ۱ ص ۱۱۶ اور ص ۱۱۹

(۲) عن ابی رمثہ قال کان رسول اللہ ﷺ یخضب بالحناء والکتم (کتاب الرقاء لابن الجوزی) (مختار)

آپ ﷺ کے بالوں کے رنگ کا سرخ ہونا خضاب کی وجہ سے تھا۔ جس طرح کہ ہم پہلے اس کیلئے مؤید بھی لا چکے ہیں اور امام ترمذی کا حدیث کو اس باب میں ذکر کرنا بھی اس کی دلیل ہے۔

قال ابو عيسى هذا احسن شئ الخ. امام ترمذی کہتے ہیں کہ خضاب کے اثبات کے باب میں جو احادیث مروی ہیں ان سب میں رائج اور واضح ترین حدیث یہی ہے کیونکہ دوسری صحیح روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے خضاب نہیں لگایا۔ کیونکہ آپ ﷺ کو اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ امام ترمذی کے ہاں دوسری احادیث صحیحہ کو ملحوظ رکھ کر اس حدیث میں تاویل کی جائے گی۔ کہ خلقی سرخی کو دیکھ کر حضرت ابو رمثہ کو خضاب کا شبہ ہوا۔ گویا رائج یہ ہے کہ آپ ﷺ نے خضاب کبھی نہیں لگایا (۱)۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دوسری صحیح احادیث کے اس جملے کا مقصد کہ ”ان النبی ﷺ لم يبلغ الشيب“ کا معنی یہ لیا جائے کہ آپ ﷺ کے سفید بال بہت کم تعداد میں تھے اور یہ بات خضاب لگانے کے متافی نہیں ہے۔

اور اگر یہ مان لیا جائے تو پھر امام ترمذی کا مقصد یہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ نے خضاب استعمال فرمایا تھا۔ البتہ بالوں کو رنگنے کی ضرورت پیش نظر نہیں بلکہ کسی اور مقصد کے لئے ہوگا۔ جیسے کہ پہلے گزر چکا ہے۔ (۱) اور یہی رائے علماء احناف کی ہے کہ آپ ﷺ نے بھی خضاب نہیں لگایا تھا وہ قدرتی سرخ تھے۔ والاصح انه عليه السلام لم يفعله قال ابن عابدين فانه لم يحتج اليه لانه توفى ولم يبلغ شيبه عشرين شعرة في راسه ولحيته بل كان سبع عشرة كما في البخاري وغيره (رد المحتار ۶/۴۲۲) اگرچہ علامہ زبیدی حنفی نے شرح احياء میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بعض مواقع پر خضاب کا استعمال فرمایا ہے اور یہی مختار ہے (اتحاف السادة المتقين) اور یہی بات علامہ بخاری نے بھی لکھی ہے۔ البتہ حضرات صحابہ کرام سے مثلاً ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ وغیرہ نے سفید بالوں پر خضاب لگائیں ہیں۔ اس لئے علماء احناف کے ہاں بغیر لڑائی کے بھی خضاب لگانا نہ صرف جائز ہے بلکہ مستحب ہے۔ ويستحب للرجل خضاب شعره ولحيته ولو في غير حرب في الاصح وقال ابن عابدين أن ابا بكر خضب بالحناء والكم (رد المحتار ودر مختار ۶/۴۲۲) (مختار)

اور شوافع کے ہاں سیاہ خضاب کے علاوہ دوسرے خضاب لگانا سنت ہے اور سیاہ خضاب حرام ہے۔ علامہ بخاری فرماتے ہیں وہو عن خلفاء معاشر الشافعية بغیر السواد سنة وبالسواد حرام يدل لنا على الصحيحين لما جئ بابي فحالة يوم الفتح للنبي ﷺ ولحيته ورأسه كالضامة بياضاً فقال غيروا هذا الشيب واجتنبوا السواد (المواهب اللدنية ص ۵۰) (مختار)

لان الروایات الخ یہ دراصل ماسبق کی علت نہیں بن سکتا بلکہ یہاں معلول محذوف ہوگا۔ خلاصہ عبارت یہ ہوگا کہ یہ حدیث احسن اور زیادہ واضح تو ہے لیکن اس کے مقابلے میں زیادہ صحیح روایات خضاب کی عدم ضرورت پر دلالت کرتی ہیں۔ لہذا مقصد کے لحاظ سے یہ اصح نہیں ہے۔ علامہ بیجوریؒ نے تقدیر عبارت یہ نکالی ہے کہ ”هذا احسن شئى روى فى هذا الباب و افسر و انما لم يكن صحيحا لان الرويات الخ“ (۱)

و ابو رمثہ اسمہ الخ امام ترمذیؒ صحابی کا تعارف کراتے ہیں لیکن ان کے نام میں اختلاف منقول ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے تفصیل سے عرض کر چکے ہیں۔

(۲) حدثنا سفین بن وکیع قال أنا أبی عن شریک عن عثمان ابن موهب قال سئل أبو هريرة هل خضب رسول الله ﷺ قال نعم قال أبو عيسى وروى أبو عوانة هذا الحديث عن عثمان بن عبد الله ابن موهب فقال عن أم سلمة (۲)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے پوچھا گیا کہ کیا نبی کریم ﷺ خضاب لگایا کرتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں۔ هل خضب رسول الله ﷺ کا سائل غیر معلوم ہے لیکن عثمان بن عبد اللہ بن موهب تبی کی ملاقات حضرت ابو ہریرہؓ سے ثابت ہے۔ قال نعم اس میں نبی کریم ﷺ کے خضاب لگانے کی تصریح ہے۔ گویا کبھی آپ ﷺ نے خضاب لگایا تھا۔ لیکن یہ بال رنگنے کے لئے نہ تھا کیونکہ آپ ﷺ کے بالوں میں محدودے چند بال سفید تھے۔ بلکہ شاید دوسرے اغراض سے آپ ﷺ نے خضاب استعمال فرمایا تھا۔

(۱) المواهب اللدنیہ ص ۵۹

(۲) صحیح البخاری جلد ثانی کتاب اللباس باب الخضاب ص ۸۷۵، وابن ماجہ کتاب اللباس باب

الخضاب ص ۲۵۸ (مختار)

قال ابو عيسى (۱) وروى ابو عوانة الخ اس سند کے لحاظ سے یہ حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کی جگہ حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے۔ امام ترمذیؒ کی غرض یا تو پہلے سند کی تقویت اور اثبات ہے۔ اور یا اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مذکورہ سند میں شریک کو وہم ہوا ہے۔ جبکہ حقیقت میں یہ حدیث ابو ہریرہؓ کی بجائے حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے۔ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ ”بل لم یر دعن ابی ہریرۃ فی هذا الباب شئ فدل علی أن مراد المصنف بإيراد طریق ابی عوانة الاشارة إلى أن رواية شریک شاذة بل منكرة۔ نیز اس طریق کے بیان میں یہ فائدہ بھی حاصل ہوا کہ موصیٰ عثمان کے دادا کا نام ہے والد کا نہیں۔

(۳) حدثنا إبراهيم بن هارون قال أنبأنا النضر بن زرارۃ عن أبي جناب عن أیاد بن لقیط عن الجهمۃ امرأة بشیر بن الخصاصیۃ قالت أنا رأیت رسول الله ﷺ یخرج من بیتہ ینفض رأسه وقد اغتسل وبراہ ردع او قال ردغ من حناء شک فی هذا الشیخ (۲)۔

ترجمہ: بشیر بن الخصاصیۃ کی بیوی جهمۃؓ سے روایت ہے۔ فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو مکان سے باہر تشریف لاتے ہوئے دیکھا کہ آپ ﷺ نے غسل فرمایا تھا چنانچہ آپ ﷺ سر مبارک کے بال جھاڑ رہے تھے اور آپ ﷺ کے سر پر حناء کا اثر تھا۔

جهمۃ رضی اللہ عنہا: الجهمۃ حلیل القدر صحابیہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کا نام تبدیل کر کے لیلیٰ رکھا تھا۔ جبکہ ان کے خاوند کا نام زحم تھا۔ اسے بھی رسول اللہ ﷺ نے بدل کر بشیر نام رکھ دیا تھا۔ ابن الخصاصیۃ علانیہ کے وزن پر یہ کبھ نامی عورت کا لقب ہے جو کہ بشیر کے جدات میں سے ہے اور خصاصۃ بن عمرو بن کعب کی طرف منسوب ہے۔

(۱) قال ابو عیسیٰ میں دو احتمال ہیں (۱) یہ علامہ کا اضافہ ہے (۲) مصنف کا اپنا کلام ہے۔ اس لئے کہ آپؐ کی کنیت آپ کے اسم (نام) پر غالب ہے۔ علامہ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے بناء علی غلبۃ کنیتہ علی اسمہ وهو فی ذلک تبع لشیخہ ومقتداه وهو الامام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاریؒ حیث عبر فی صحیحہ وسائر تصانیفہ ایضاً عن نفسه بأبی عبد اللہ (جمع الوسائل ۱/ ۱۱۹) (مختار)

(۲) تفرد به الامام الترمذی بهذا الحدیث

برأسه ردع: علامہ ابن حجر کہتے ہیں کہ ردع کے معنی رنگ کے ہوتے ہیں۔ جبکہ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ کے نزدیک درس یا زعفران سے لتھیزنے کو کہتے ہیں۔ یعنی زعفران کو پانی میں ملا کر گھاڑا کیا گیا تھا اور اسے سرمبارک پر مہندی کی طرح لگایا تھا۔

جبکہ دوسرے محققین کہتے ہیں کہ ردع خود زعفران کو کہتے ہیں۔ تو گویا نبی کریم ﷺ نے سر پر مہندی کی طرح لگایا تھا۔ اوقال ردغ امام ترمذی کے استاد ابراہیم بن ہارون کو شک ہوا ہے کہ نصر نے ردع کہا تھا یا ردغ۔ ردغ اور ردغہ کچھ کو کہتے ہیں لیکن مجازاً اس سے مراد زعفران ہی ہوگا جسے کچھ کی طرح گاڑا جاتا کر سر پر لگایا گیا تھا۔ بعض نسخوں میں او ردغ من حناء مذکور ہے۔ بہر حال پہلی روایت راجح ہے۔

(۳) حدثنا عبد الله بن عبد الرحمن أنا عمرو بن عاصم أنا حماد

بن سلمة أنا حميد عن أنس قال رأيت شعر رسول الله ﷺ مخضوباً

قال حماد و أخبرنا عبد الله بن محمد بن عقيل قال رأيت شعر رسول

الله ﷺ عند أنس بن مالك مخضوباً (۱)

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے بالوں کو خضاب لگا

ہوا دیکھا۔

رأيت شعر الخ اس سے قبل خود انسؓ سے نبی کریم ﷺ سے خضاب کی نفی منقول تھی۔ لہذا اس حدیث کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ بعض احوال میں نبی کریم ﷺ نے خضاب لگایا بھی تھا۔ جبکہ اکثر نہیں لگاتے تھے۔ یا پھر خلقہ سرخی کو خضاب کہا گیا ہے۔ گویا کہ کلام تشبیہ پر مبنی ہوگا۔ تقدیر یہ ہوگی کہ رأيت شعر رسول الله ﷺ أحمر كالمنخضوب۔

قال حماد و أخبرنا عبد الله الخ کچھلی سند میں مذکور حماد بن سلمہ ہی مراد ہیں۔ وہ اپنے استاد عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت انسؓ کے ہاں نبی کریم ﷺ کے خضاب لگائے بال دیکھے۔

تبرکات نبوی ﷺ سے عشق: عند أنس مخضوباً حجة الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ

نے سرمبارک کے بال موٹھ لئے تھے اور بال صحابہ میں تقسیم فرمائے تھے۔ اب بھی اگر کہیں وہ موجود

ہوں تو اگرچہ ثبوت قطعی نہ بھی ہو۔ لیکن محض نسبت کی وجہ سے بھی ہمارے لئے قابل احترام اور واجب التعظیم ہیں۔ اور کچھ بعید بھی نہیں کہ یقیناً وہ موجود ہوں۔ کیونکہ صحابہ آپ ﷺ کے تبرکات کی حفاظت کا اہتمام بھی فرماتے تھے۔ حضرت امیر معاویہؓ نے آپ ﷺ کا ایک کٹورا کئی لاکھ درہم میں خریدا تھا۔ اسی طرح کئی لاکھ درہم دے کر آپ ﷺ کے ناخن مبارک خرید لئے تھے۔ اور مرتے وقت وصیت فرمائی تھی کہ مجھے دفن کرتے وقت یہ ناخن میری آنکھوں میں ڈال دو۔ صحابہؓ کے عشق کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے وضوء کا پانی بلکہ تھوک بھی زمین پر گرنے نہیں دیتے تھے۔ حضرت انسؓ تو آپ ﷺ کے خاص خادم تھے۔ ان کے پاس نبی کریم ﷺ کے بال موجود تھے اور تابعین گاہے گاہے ان کی زیارت سے مشرف ہوتے تھے۔

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کے خضاب لگانے کا ذکر نہیں۔ ہاں بالوں کا ذکر ہے کہ وہ رنگے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ شاید یہ وہی قدرتی سرخی ہو جو سفیدی آنے سے قبل بالوں میں لگتی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خضاب سے ان کا رنگ بدلا ہو۔ بعض شراح نے یہ احتمال بھی لکھا ہے کہ حضرت انسؓ نے رسول اللہ ﷺ کی موت کے بعد از خود بالوں پر مہندی یا کتم لگائی ہو کہ یہ تادیر محفوظ رہیں۔ بہر حال اس روایت سے رسول اللہ ﷺ کا خضاب لگانا یقینی طور پر معلوم نہیں ہوتا۔

۷۔ باب ما جاء في كحل رسول الله ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے سرمہ لگانے کے بیان میں

زینت، تطیب اور تطہر کے سلسلہ ابواب میں ترجمہ اور خضاب کے بعد سرمہ کے استعمال کا باب منعقد کر رہے ہیں۔ پچھلے باب سے مناسبت یوں ہے کہ پچھلے باب میں تلوین شعر سے بحث کی۔ اس باب میں تلوین العیون سے بحث ہو رہی ہے۔ سرمہ کا استعمال تین کیلئے بھی ہوتا ہے اور دوا کے طور پر استشفاء کیلئے بھی سرمہ کا استعمال مروج ہے۔ اس باب میں مصنفؒ نبی کریم ﷺ کے زیر استعمال سرمہ کی ماہیت اور کیفیت استعمال کے بارے میں احادیث لاتے ہیں۔ کل فتح کاف سے ہو تو مصدر ہے۔ آنکھوں میں سرمہ ڈالنے کو کہتے ہیں اور ضم کاف سے کل ما یوضع فی العین کو کہتے ہیں۔ یعنی ہر اس چیز کا نام ہے جو کہ آنکھوں میں ڈالی جاتی ہے۔

سرمہ کا حکم اور فوائد: سرمہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا قول و عمل اس بات پر دلیل ہے کہ یہ جائز ہے۔ لیکن چونکہ یہ تزئین اور دوا دونوں کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور دونوں منافع دنیوی سے ہیں۔ اس لئے علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ سرمہ کے استعمال کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا امر ندب اور ارشاد پر محمول ہوگا (۱)۔ جبکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سرمہ اور خصوصاً اشہد لگانا سنت (۲) ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے اسکے بارے میں امر کے علاوہ آپ ﷺ کی مواظبت بھی مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس جو اسکندرانی ڈبہ

(۱) علامہ مرغینانی فرماتے ہیں ولا یأس بالاکتحال للرجال إذا قصد به الدواوی دون الزینة (الہدایۃ ۱/۳۰۳ کتاب الصوم باب یوجب القضاء الخ) اور اسی کے تحت مولانا عبدالحی الکنہویؒ نے لکھا ہے قوله بالاکتحال الخ قال الأتزازی یعنی اکتحال الرجل بالکحل الأسود مباح إذا قصد به الدواء فأما الزینة فلا قال العینی معترضاً علیہ لأدوی ما فائدة تقييد الکحل الأسود (باب ما یوجب القضاء الخ الہدایۃ ۱/۳۰۳) فإن الکحل لا یكون إلا الأسود أقول لیس كذلك فإن الکحل یكون أسوداً أبيضاً وأحمر وقد شاهدنا هذه الأقسام فأما الأحمر والأبيض فلیسا للزینة وإنما هو الأسود فلذا أقید الاترازی به یتعلق قوله إذا لم یکن من قصده الزینة لأن غیر الأسود ینفع العین وغیره فهو کان دواء الرمد وغیره ولیس للزینة اه

(حاشیۃ الہدایۃ ۱/۳۰۳ کتاب الصوم باب ما یوجب القضاء والكفارة) (مختار)

(۲) والاکتحال عندنا معاصر الشافعیۃ سنةً للأحادیث الواردة فیہ ۱۲ المواہب اللندیۃ ۶۲ (مختار)

تھا اس میں شیشہ، ہاتھی دانت کی کنگھی، قہنجی اور مسواک کے علاوہ سرمہ دانی بھی تھی۔ امام مالکؒ اسے امراض میں دواء کے طور پر مردوں کیلئے جائز سمجھتے ہیں۔ البتہ زینت کیلئے سرمہ کا استعمال ان کے ہاں مکروہ ہے۔ لیکن علامہ ابن عربیؒ کہتے ہیں کہ زینت کے لئے بھی ہو تب بھی یہ ممنوع تصنع کے زمرہ میں نہیں آتا۔ بہر حال سنت کی نیت سے یا آنکھوں کی حفاظت کے لئے سرمہ کا استعمال بالاتفاق جائز بلکہ مندوب ہے۔

(۱) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ حَمِيدٍ الرَّازِيُّ أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا دَاوُدَ الطَّيَالِسِيَّ عَنْ عُبَادِ بْنِ مَنْصُورٍ عَنْ عِكْرَمَةَ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ اكْتَحِلُوا بِالْأَمَدِ فَإِنَّهُ يَجْلُو الْبَصْرَ وَيَنْتِ الشَّعْرُ وَزَعَمَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَتْ لَهُ مَكْحَلَةٌ يَكْتَحِلُ مِنْهَا كُلَّ لَيْلَةٍ ثَلَاثَةً فِي هَذِهِ وَثَلَاثَةً فِي هَذِهِ (۱)۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اشد کا سرمہ آنکھوں میں ڈالا کرو۔ اس لئے کہ وہ نظر کو تیز کرتا ہے۔ اور بالکیں بھی زیادہ اگاتا ہے نیز ان کو یقین تھا کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک سرمہ دانی تھی جس سے دونوں آنکھوں میں ہر رات تین تین سلائی کا سرمہ لگایا کرتے تھے۔

اکتحلوا بالامد: یہاں امر عذب اور استحباب کے لئے ہے۔ وجوب کے لئے نہیں ہے۔ اشد میں دو لغت ہیں اول ہمزہ اور میم دونوں کے کسرہ کے ساتھ دوسرا ہمزہ کے کسرہ اور میم کے ضمہ کے ساتھ۔ اشد کیا ہے؟ امد شرح کے اقوال کے مطابق سرخی مائل سیاہ سرمہ ہوتا ہے بعض اسے اصفہانی سرمہ کہتے ہیں اور بعض تو تیا (۲) بتاتے ہیں۔ طبی لحاظ سے نبی کریم ﷺ نے کئی باتوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس

(۱) جامع ترمذی جلد ۷ ص ۳۰۵، کتاب اللباس باب ماجاء فی الاکتحال جلد ۱ ص ۳۰۵، سنن ابن ماجہ ص ۲۵۰، کتاب الطب باب من الکحل ص ۲۵۰، وتراً شرح السنة للبغوی کتاب اللباس باب الاکتحال ۱۱۶/۱۲ (مختار)

(۲) علامہ ذہبیؒ امد کے بارے میں فرماتے ہیں الحمد للکحل الاصبہانی باردیابس یقوی عصب العین و یحفظ صحتها وقولہ إن خیرا کحالکم الا امدای فی حفظ صحتها لا فی امرها ضہا (الطب النبوی علی هامش تسہیل المنافع ص ۴۰) (مختار) صاحب منجد نے انتہو ان کو اشد بتایا ہے جس کا کیمیکل کوڈ (SB) ہے۔ (اصلاح الدین)

سلسلے میں امام ترمذی مستقل ابواب بھی لائے ہیں۔ آنکھوں کے بارے میں بھی نبی کریم ﷺ نے متعدد قسم کے علاج بتائے ہیں۔

آج تک حکماء اور ڈاکٹر بڑی تحقیق کے بعد نبی کریم ﷺ کے اقوال کی تائید کرتے ہیں۔ اور قیامت تک کرتے رہیں گے۔ اشد بھی آنکھوں کی حفاظت اور تقویت کیلئے ایک مفید سرمہ ہے۔ بالخصوص جب اس میں مشک کی تھوڑی مقدار ملا دی جائے۔ آنکھوں کے امراض میں یہ مضر بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے اگرچہ آنکھوں کی بیماریوں کے دیگر متعدد علاج بتائے ہیں لیکن بیمار آنکھوں کو اشد کا محل استعمال نہیں بتایا کیونکہ یہ تندرست آنکھوں کے لئے مفید ہے (۱)۔

فإنه يجلّوا البصر یعنی آنکھوں کے نور کو بڑھاتا ہے۔ ويُنْبِثُ الشعر شعر سے پلکیں مراد ہیں جن کے بڑھانے کے لئے اشد مفید ہے۔

زعم کی حقیقت اور مراد: زعم یعنی ابن عباس کا زعم تھا۔ زعم گمان کے معنی میں آتا ہے لیکن اس مقام پر قول محقق مراد ہے یعنی ابن عباس یقین کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک سرمہ دانی رکھی تھی۔ آج کل تو گمان اور زعم جھوٹ تراشنے کا بہانہ ہے۔ اخبار والے ہر قسم کا جھوٹ چھاپ کر قانون سے بچتے کیلئے، خیال کیا جاتا ہے اور گمان کیا جاتا ہے کے الفاظ لکھ دیتے ہیں۔ لوگ بھی آپس میں باتیں کرتے ہوئے جھوٹ بولنے کے لئے ان جملوں سے مدد لیتے ہیں۔ اسی لئے تو حدیث میں آیا ہے کہ ہنس مطیۃ الرجال زعموا یعنی زعموا کا کلمہ آدمی کیلئے بری سواری ہے۔

حدیث میں قول محقق مراد ہے۔ محض احتیاط کیلئے جزی بات کو زعم کہا ہے۔ بعض شراح نے زعم کا قائل ترمذی کا شیخ محمد بن حمید بتایا ہے۔ علامہ مناوی نے اسے ترجیح دی ہے۔ مگر علامہ بیجوری اور دیگر شراح

(۱) اور خصوصاً بچوں اور عمر رسیدہ افراد کیلئے زیادہ مفید ہے۔ رات کے وقت سرمہ لگانے سے یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ سرمہ اچھی طرح آنکھوں کے کونوں میں سرایت کر جاتا ہے اور دیر تک آنکھوں میں باقی رہتا ہے جو طبی لحاظ سے مفید ہے۔

(جمع الوسائل ۲/۱۷۷ مختار)

زعم کو حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب کرتے ہیں (۱)۔

مکحلة ضم میم کے ساتھ سرمہ دانی کو کہتے ہیں۔ قیاساً میم کا گسرہ ہونا چاہیے تھا۔ خلاف

القیاس ضمہ آیا ہے۔

کل لیلة نبی کریم ﷺ رات کو سرمہ استعمال کرتے تھے۔ جس میں حکمت یہ ہے کہ رات کو آدمی

سوتا ہے تو سرمہ آنکھوں میں خوب نفوذ کرتا ہے۔ اور گندہ مواد بھی باہر لا کر زیادہ فائدہ دیتا ہے۔ جبکہ دن کو

آنکھیں کھلے رہنے اور بار بار دھونے کی وجہ سے سرمہ آنکھوں میں سرایت نہیں کر سکتا۔

سرمہ کے استعمال کا طریقہ: ثلاثة فی هذه وثلاثة فی هذه ہر ایک آنکھ میں حسب روایت تین تین

دفعہ سرمہ لگایا ہے۔ اس طرح ہر آنکھ میں طاق دفعہ سرمہ ڈالا ہے۔ جس کا حکم نبی کریم ﷺ نے ایک اور

حدیث میں بھی دیا ہے فرماتے ہیں کہ من اکحل فلیتو (۲)۔ جو شخص سرمہ لگائے تو طاق مرتبہ لگائے۔

بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ دائیں آنکھ میں تین دفعہ اور بائیں میں دو دفعہ سرمہ لگانا چاہیے۔

طبرانی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نبی کریم ﷺ کے سرمہ لگانے کا یہی طریقہ نقل کیا ہے تاکہ

دائیں آنکھ سے یہ عمل شروع ہو اور اسی پر ختم بھی ہو۔ اسی صورت میں ایثار من حیث المجموع آیا

ہے۔ بہر حال سرمہ لگانے میں ایثار مستحب ہے۔ فردا فردا ہوا من حیث المجموع لیکن علامہ ابن حجرؒ

نے قول الاول کو ترجیح دی ہے۔ یعنی پہلے دائیں آنکھ میں تین بار سرمہ ڈالے اور پھر بائیں آنکھ میں تین بار

(۱) اب سوال یہ ہے کہ جب قال کا فاعل بھی عبداللہ بن عباسؓ ہیں اور زعم کا فاعل بھی آپؐ ہی ہیں تو پھر وہاں قال اور

یہاں زعم کو کیوں استعمال کیا گیا ہے؟ ازالہ اس اشکال اور شبہ کا جواب بعض حضرات نے یہ دیا ہے کہ قال اور زعم کا

فاعل اگرچہ عبداللہ بن عباسؓ ہی ہے مگر دونوں کا معنی الگ الگ ہے۔ یعنی یہاں عبداللہ بن عباسؓ کو کچھ معمولی سا شک و شبہ

ہوا ہو گا۔ اس لئے آپؐ نے یہاں زعم کا لفظ استعمال کیا۔ جبکہ بعض اعلیٰ علم نے یہ جواب دیا ہے کہ یہاں عبداللہ بن عباسؓ

کی قولی حدیث و فعلی حدیث دونوں ذکر ہیں اسلئے دونوں میں امتیاز پیدا کرنے کیلئے قال اور زعم کے الفاظ استعمال کئے

گئے۔ ایماہ الی ان الاول حدیث مرفوعہ والثانی موقوف او الاول قولی والثانی فعلی (جمع

الموائل ۱۲۶/۱) (مختار)

(۲) ابن ماجہ ۲۵۰ ابواب الطب باب من اکحل وتراً (مختار)

ڈالے۔ مذکورہ حدیث میں بھی اسی طرف اشارہ ملتا ہے (۱)۔

(۲) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ الصَّبَّاحِ الْهَاشِمِيُّ الْبَصْرِيُّ أَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ

مُوسَى أَنَا إِسْرَائِيلُ عَنْ عَبَادِ بْنِ مَنْصُورٍ وَحَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ حَجْرٍ ثَنَا

يَزِيدُ بْنُ هَارُونَ أَنَا عَبَادُ بْنُ مَنْصُورٍ عَنْ عِكْرَمَةَ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ

كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَكْتَحِلُ قَبْلَ أَنْ يَنَامَ بِالثَّلَاثِ فِي كُلِّ عَيْنٍ وَقَالَ

يَزِيدُ بْنُ هَارُونَ فِي حَدِيثِهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَتْ لَهُ مَكْحَلَةٌ يَكْتَحِلُ مِنْهَا

عِنْدَ النَّوْمِ ثَلَاثًا فِي كُلِّ عَيْنٍ (۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سونے سے قبل ہر

آنکھ میں اٹھ کے سرمہ سے تین سلائی سرمہ ڈالا کرتے تھے۔ اور یزید بن ہارونؓ

اسی حدیث میں (حضرت عبداللہ بن عباسؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ

کے پاس ایک سرمہ دانی تھی جس سے سونے کے وقت تین تین سلائی آنکھ میں ڈالا

کرتے تھے۔

تحویل کی حقیقت اور اس مقام پر اس کی ضرورت: ح و حَدَّثَنَا تحویل من اسناد الی

آخر کا مخفف ہے مصنف جب دوسری سند بیان کرتا ہے اور متن ایک ہو تو صرف سند لاتا ہے اور ”ح“ کے

حرف سے تحویل سند پر تنبیہ کرتا ہے۔

اس باب کی پہلی حدیث میں حضرت ابن عباسؓ کی حدیث دو واسطوں سے امام ترمذیؒ عباد بن

منصورؒ سے روایت کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے پہلی سند عالی اور دوسری سند سافل معلوم ہوتی ہیں لیکن ملا علی

(۱) اور ایک صورت یہ بھی ہے کہ ہر آنکھ میں دو دو سلائی ڈالیں اور پھر ایک سلائی دونوں آنکھوں میں ڈالیں۔ ملا علی قاریؒ

نے فرمایا ہے کہ پہلا طریقہ رائج ہے وأرجعها الاوّل لحصول الوتر ففعلم انّه يتوصل ان يكتحل في كل

عين واحدة ثم ولم يزل امره الى الوترين بالنسبة الى العضوين. (جمع الوسائل ۱/۲۷۱) (مختار)

(۲) شرح السنة ۱۲/۱۱۷ باب الاكحال كتاب اللباس المعجم الكبير للطبرانی ۱۱۹/۳ (مختار)

قاری کہتے ہیں کہ معنوی اعتبار سے پہلی سند کی نسبت دوسری سند قوی ہے۔ کیونکہ محمد بن حمید الرازی کو بعض محدثین ضعیف کہتے ہیں جبکہ عبد اللہ بن الصبار قوی روای ہے۔ اسی لئے اول الذکر سے شیخین روایت نہیں کرتے جبکہ مؤخر الذکر شیخین کے راوی ہیں۔ اور شاید تقویت کے حصول کیلئے مصنف نے تحویل کے ذریعے اس سند کو عالی کر دیا ہے۔ سند کے علاوہ متن کے الفاظ میں جو اختلاف ہے وہ خود امام ترمذی بیان کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک وہ صحت اسناد کی علامت ہے۔ اور ”صح هذا الاسناد“ یا ”هذا الاسناد صحيح“ سے کنایہ ہے اور تیسرا قول اس میں الی مغرب کا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ ”الحديث“ سے مخفف ہے۔ جبکہ بعض لوگ اسے حیولۃ یا حائل سے عبارت سمجھتے ہیں۔ لیکن سب سے پہلا قول سب سے رائج ہے۔ اس کلمہ پر تلفظ میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کے خیال میں اس پر تلفظ نہیں ہوتا بعض لوگ اس کی جگہ ”الحديث“ کا لفظ بولتے ہیں۔ لیکن جمہور کے نزدیک رائج یہ ہے کہ اس کلمہ کو اسی طرح ادا کیا جائے گا جس طرح یہ لکھا جاتا ہے یعنی ”حاء“ بولا جائے گا۔

وقال یزید بن ہارون: پہلی سند کی خصوصیت کا بیان ہے۔ اس میں سابق حدیث کی تائید بھی ہوتی ہیں اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ وہاں زعم سے گمان نہیں بلکہ قول محقق مراد ہے۔ کیونکہ یہاں مقصود یہ ہے کہ یزید بن ہارون حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے جو روایت کرتے ہیں اس میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک سرمہ دانی تھی جس سے سوتے وقت تین تین سلائی ہر آنکھ میں ڈالا کرتے تھے۔ نیز اس میں اس بات پر بھی حبیہ ہے کہ اسرائیل اور یزید کی روایتوں میں معنوی اتحاد ہے لیکن لفظی مغایرت ہے۔

(۳) حدثنا أحمد بن منيع أنبأنا محمد بن يزيد عن محمد ابن

إسحاق عن محمد ابن المنكدر عن جابر قال قال رسول الله ﷺ

عليكم بالإنم عند النوم فإنه يجلو البصر وينبت الشعر (۱)۔

ترجمہ: حضرت جابر فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اشد کا سرمہ نیند سے

پہلے آنکھوں میں ضرور ڈالا کرو۔ کیونکہ یہ نظر کو بھی روشن کرتا ہے اور پلکیں بھی خوب اُگاتا ہے۔

بشر بن الفضل: یہ مشہور زاہد و عابد ولی تھے۔ چار سو رکعات نفل ہر رات پڑھتے تھے اور صوم داؤدی علیہ السلام بھی معمول تھا۔

تصحیح نیت: عند النوم یعنی نیند سے قبل اٹھ کا سرمہ لگایا کرو۔ یہ حکم تندرست آنکھوں کے لئے ہے۔ بیمار آنکھوں کے لئے اٹھ مضر بھی ہو سکتا ہے۔ اور اس حدیث میں اس پر تنبیہ ہے کہ سرمہ کا اصل مذکورہ دو امور ہیں اور اسی نیت سے استعمال ہونا چاہیے۔ اگر چہ زینت بھی ضمناً حاصل ہوگی بلکہ رات کے وقت استعمال میں شاید تزئین سے اجتناب کی جہت بھی ملحوظ ہے۔

(۴) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ قَالَ أَنَا بِبُشَيْرِ بْنِ الْمُفَضَّلِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ ابْنِ

عُثْمَانَ بْنِ خَثِيمٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ

اللَّهِ ﷺ إِنَّ خَيْرَ أَكْحَالِكُمُ الْاِثْمَدُ يَجْلُو الْبَصَرَ وَيَنْبِتُ الشَّعْرَ (۱)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے

سرموں میں سے اٹھ بہترین سرمہ ہے۔ یہ نظر کو تیز کرتا ہے اور پلکیں خوب اُگاتا ہے۔

إِنَّ خَيْرَ أَكْحَالِكُمُ الْاِثْمَدُ الْخِی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی پہلی روایت اور اس روایت میں معنوی

لحاظ سے مناسبت خوب واضح ہے۔

(۵) حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ الْمُسْتَمِرِّ الْبَصْرِيُّ ثَنَا أَبُو عَاصِمٍ عَنْ عُثْمَانَ

ابْنِ عَبْدِ الْمَلِكِ عَنْ سَالِمٍ عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ

عَلَيْكُمْ بِالْاِثْمَدِ فَإِنَّهُ يَجْلُو الْبَصَرَ وَيَنْبِتُ الشَّعْرَ (۲)۔

(۱) سنن نسائی ص ۲/۲۸۱، کتاب الزینة باب الکحل، سنن ابن ماجہ ۲۵۰، کتاب اللب باب

الکحل بالاثمد المستدرک للحاکم ۴/۸۰۸ (مختار)

(۲) ابن ماجہ ص ۲۵۰ کتاب الطب باب الکحل بالاثمد (مختار)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم اشہد کا سرمہ ضرور استعمال کیا کرو۔ کیونکہ یہ آنکھوں کے نور کو تیز کرتا ہے (۱) اور پلکیں خوب اُگاتا ہے۔ مصنفؒ نے اس حدیث کو متعدد اسانید کے ساتھ مکرر اس لئے ذکر کیا کہ اس طرح مذکورہ حدیث کو تقویت ملتی ہے۔

سرمہ اور جدید سائنس:

- (۱) جدید سائنس نے بھی سرمہ لگانے کے بہت سارے فوائد بیان کئے ہیں مثلاً
- (۱) سرمہ میں اعلیٰ درجہ کا دافع لہفن یعنی انٹی سپٹک (Anti Septic) ہوتا ہے۔
- (۲) سرمہ سے آنکھوں کے اوپر پھنسی انفکشن (Lead Infection) اور کمرے بالکل نہیں ہوتے۔
- (۳) سورج کی تیز شعاعیں آنکھوں کی پتلی (Reting) کو نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔
- (۴) آشوب چشم کیلئے سرمہ لگانا بہت ہی زیادہ مفید ہے۔
- (۵) ان امراض سے اللہ تعالیٰ حفاظت رکھتے ہیں جو لا علاج سمجھے جاتے ہیں۔
- (۶) آنکھوں کے زخم پر خراش اور سوزش کیلئے سرمہ بہت مفید ہے نیز یہ کہ ہر قسم کے چھوٹے جراثیم Contagious germs کو ختم کر دیتا ہے۔ (آفتاب نبوت کی کرنیں ص ۱۸۴) (مختار)

۸. باب ماجاء فی لباس رسول اللہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے لباس کا بیان

لباس ”ما یلبسه الانسان“ کو کہتے ہیں۔ پردہ، تن بدن اور سر یا پاؤں کو چھپانے کیلئے جو قمیض، شلوار، چادر، چغہ اور واسکٹ وغیرہ پہنے جاتے ہیں سب لباس ہیں۔ اسے ملبس اور لبوس بھی کہتے ہیں۔ ایک چیز کو دوسری چیز میں لپیٹنے کو لبس کہا جاتا ہے جس سے تلبیس بنا ہے۔ لباس سے بھی انسان کے ظاہری اعضاء چھپ جاتے ہیں۔ جسمانی عیوب بھی مثلاً داغ، دھبے، سفیدی اور سیاہی وغیرہ مستور ہو جاتے ہیں۔ ما قبل ابواب سے مناسبت یہ ہے کہ اس سے قبل مختلف قسم کی زینتوں کا بیان تھا اور لباس بھی بدن کیلئے زینت ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے اس کی تعبیر زینت کے لفظ سے کی ہے۔ اس سے پردہ پوشی ہوتی ہے اور اس کے بغیر انسان حیوانات سے بھی زیادہ قبیح المنظر دکھائی دیتا ہے۔ اسلئے زینت کے ابواب کے سیاق میں لباس کے باب کا بیان زیادہ مناسب ہے۔

نبی کریم ﷺ نے جو کچھ بھی پہنا تھا امام ترمذی اس باب میں بیان فرمائیں گے اگرچہ وہ محض اتفاقاً اور صرف ایک بار کیوں نہ ہو۔ اس سلسلے میں امام ترمذی سولہ احادیث لائے ہیں۔

لباس کا حکم: لباس کے پہننے کے مختلف احکام ہیں (۱) کبھی کبھی یہ واجب ہوتا ہے۔ مثلاً مرد کیلئے ناف سے گھٹنوں تک اور عورت کا سوائے بعض اعضاء کے تمام بدن کو ڈھانپنے کے لئے کپڑا پہننا واجب ہے۔ (۲) کبھی کبھی یہ مندوب ہوتا ہے۔ مثلاً سفید کپڑے، حید و جود کیلئے بہترین کپڑے اور عمامہ پہننا مستحب ہے (۳) بعض صورتوں میں لباس حرام بھی ہوتا ہے مثلاً مردوں کیلئے ریشمی لباس پہننا (۴) کبھی کبھی یہ مکروہ بھی ہوتا ہے۔ مثلاً مرد کے لئے ایسا لباس جو ٹخنوں سے نیچے ہو، پہننا۔ اور غنی کے لئے دھما بوسیدہ لباس پہننا جس میں وہ محتاج نظر آئے (۵) ان کے علاوہ عام طور پر جو لباس پہنے جاتے ہیں وہ مباح ہیں (۱)۔

(۱) حضرت عمرؓ کا فرمان ہے کہ وہ قسم کی لباس سے پرہیز کرو (۱) شہرت کے لباس سے (۲) خمار کے لباس سے (۳) عمار

لباس میں نبی کریم ﷺ کا معمول: نبی کریم ﷺ نے دیگر امور کی طرح لباس میں بھی اعتدال کو معمول بنایا تھا۔ نہ زیادہ مشہور اور بیش قیمت لباس کے استعمال کی عادت تھی۔ نہ نہایت گرا ہوا اور حقیر کپڑا پہنتے تھے۔ عموماً قیمتی کپڑا ہاتھ لگتا تو ایسا کر کے احباب کو دے دیتے تھے۔ ایک عظیم سلطنت کے امیر ہونے کے باوجود بھی آپ ﷺ کی زندگی فقر سے زیادہ قریب تھی۔ لباس فاخرہ سے احتراز کرتے تھے۔ اور یہی رنگ آپ ﷺ کے صحابہ میں بھی پایا جاتا ہے۔

(۱) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ حَمِيدٍ الرَّازِيُّ أَنبَانَا الْفَضْلُ بْنُ مُوسَى وَأَبُو

ثَمِيلَةَ وَزَيْدُ بْنُ حَبَابٍ عَنْ عَبْدِ الْمُؤْمِنِ بْنِ خَالِدٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ بَرِيدَةَ

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ كَانَ أَحَبَّ الثِّيَابِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ الْقَمِيصُ (۱)

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کو قمیص سب کپڑوں سے

زیادہ پسندیدہ لباس تھا۔

اُمّ سلمہؓ: عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ أُمِّ سَلَمَةَ كَانَتْ حَذِيقَةً تَحْتَهُ إِنْ كَانَ يَخْزُومُ مِنْ تَلْقُوقِ

تھا۔ حضرت ابوسلمہؓ کی وفات کے بعد نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آئیں۔ حضرت ابوسلمہؓ کی معیت میں حبشہ

کی طرف سب سے پہلے ہجرت آپؐ نے کی۔ رسول اللہ ﷺ کی ۸۷۳۷۸ احادیث آپؐ کے واسطے سے مروی

ہیں۔ ۶۲ھ میں وفات پائیں اور امہات المؤمنین میں سب سے آخری موت آپؐ کی واقع ہوئی۔ آپؐ سے

پے در پے تین احادیث مروی ہیں۔

أَحَبُّ الثِّيَابِ... الْقَمِيصُ: قمیص کی تعریف کرتے ہوئے شراح کہتے ہیں کہ هو اسم

لما يلبس من المخيط له كمان وجيب ولا يكون من صوف. یعنی قمیص پہننے کے لئے سلا ہوا

کپڑا ہوتا ہے جس کے دو آستین ہوں اور ایک گریبان لیکن وہ اون کا نہ ہو۔ بلکہ روئی کا کتان کا ہو۔ یہ نام یا

توققص سے ماخوذ ہے جس کے معنی ثقلب یعنی بدلنا ہے۔ کیونکہ انسان اس میں ایک جگہ سے دوسری جگہ

(۱) سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۲۰۲، کتاب اللباس باب ماجاء فی القميص ج ۲ ص ۲۰۲، سنن نسائی

ج ۲ ص ۲۰۲، کتاب الزينة، ابن ماجه ص ۲۵۵ کتاب اللباس باب لبس القميص (مختار)

کو خٹل ہوتا رہتا ہے۔ نیز قمیص اچھلنے کودنے کو بھی کہتے ہیں اور قمیص بھی جسم کی حرکت کے ساتھ حرکت کرتی ہے۔ یا پھر یہ لفظ قمیص الجنین اور قمیص القلب سے ماخوذ ہے جن کے معنی بچے کے اوپر کی جھلی اور دل کے غلاف کے ہوتے ہیں۔ قمیص بھی بدن پر جھلی کی طرح محیط ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کی قمیص کی ساخت کے بارے میں کچھ باتیں اگلی حدیثوں میں آئیں گی۔ لیکن مذکورۃ الصدر تینوں حدیثوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قمیص آپ ﷺ کا محبوب ترین لباس تھا۔

قمیص کی پسندیدگی کی وجہ: اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں ستر بدن اچھی طرح اور آسانی سے ہو سکتا ہے۔ اسے پہن کر آدمی بے فکر ہو جاتا ہے جبکہ رداء وغیرہ کو باندھنا پڑتا ہے۔ نیز ہوا، بارش اور چلنے پھرنے سے اس کے کھلنے اور گرنے کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ اور اگرچہ بالائی بدن کی ستر ضروری نہیں پھر بھی گرمی اور سردی کی تکلیف تو ہوتی ہے۔ اس کے برعکس قمیص میں انسان گرمی اور سردی سے محفوظ رہتا ہے۔ نیز اگر ازار کھل جائے تو بھی قمیص ستر عورت کیلئے کافی ہوتی ہے۔ اس کا استعمال بھی دوسرے لباسوں کی نسبت آسان ہے اور بعض لوگوں کے ہاں اس میں حکیر سے بھی آدمی محفوظ ہوتا ہے۔ ان امور کے ساتھ ساتھ عرب کی قدیم تاریخ بھی قمیص سے مربوط ہے قرآن نے حضرت یوسفؑ کی زبان سے یہ بھی کہا ہے کہ اذهبوا بقمیصی هذا فالقوه علی وجه ابی میری قمیص لے کر میرے باپ کے چہرے پر ڈالنا مفسرین کے ہاں یہ قمیص حضرت یوسفؑ کے اجداد کی قمیص تھی۔ جو ان کو والد کی طرف سے ملی تھی آج کل بھی عرب کے قومی لباس میں ایک لمبے قمیص کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ آپ ﷺ کی قمیص کی تفصیل دوسری کتابوں میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ کا ایک کرنا تھا، یا متعدد۔ حضرت عائشہؓ آپ ﷺ کی وفات کے بعد ایک ایک کر کے قمیص نکالتی تھی اور صحابہؓ کو بتاتی تھیں کہ یہ نبی کریم ﷺ کی قمیص تھی۔

(۲) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ حَجْرٍ ثَنَا الْفَضْلُ بْنُ مُوسَى عَنْ عَبْدِ الْمُؤْمِنِ ابْنِ

خَالِدٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ ابْنِ بَرِيدَةَ عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ كَانَ أَحَبَّ الثِّيَابِ إِلَيَّ

رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْقَمِيصُ (۱)

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سب کپڑوں میں قمیص کو زیادہ پسند کرتے تھے۔

حدثنا علی الخ: یہ حدیث پہلے حدیث سے متن میں مختلف نہیں ہے البتہ سند دوسری ہے لیکن اس سند میں بھی عبداللہ بن بریدہ کی ماں کا ذکر نہیں جس کا ذکر اگلی سند میں ہے۔ نبی کریم ﷺ کی قمیص کے بارے میں جو روایات مذکور ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوتی کپڑے سے بنا ہوتا تھا۔ زیادہ لمبا نہیں تھا آستینیں بھی لمبی نہیں تھیں کشادہ بھی تھا (۱)۔

(۳) حدثنا زیاد بن ایوب البغدادی ثنا أبو تمیلة عن عبدالمؤمن ابن خالد عن عبد اللہ بن بریدة عن أمه عن أم سلمة قالت کان أحب الثياب إلی رسول اللہ ﷺ یلبسه القميص قال أبو عیسیٰ ہکذا قال زیاد بن ایوب فی حدیثہ عن عبد اللہ بن بریدة عن أمه عن أم سلمة و ہکذا روی غیر واحد عن أبي تمیلة مثل رواية زیاد بن ایوب و ابو تمیلة یزید فی هذا الحدیث عن أمه و هو أصح (۲)۔

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو پہننے کے لئے سب کپڑوں میں کرتہ زیادہ پسند تھا۔

قال أبو عیسیٰ الخ: مصنف کی غرض اس عبارت سے آخری سند کی ترجیح ہے۔ گویا یہ روایت پہلی دو روایتوں کی نسبت اصح ہے۔ کیونکہ سابقہ دو روایتوں کی سندوں میں عبداللہ بن بریدہ کی ماں کا ذکر نہیں ہے جبکہ زیاد بن ایوب کے واسطے سے ابو تمیلة کی سند میں یہ کمی پوری کی گئی ہے۔ اور زیاد بن ایوب اس زیادہ میں منفرد بھی نہیں بلکہ امام ترمذی کے بقول یہ زیادہ اس کے کئی دیگر شیوخ سے بھی ثابت ہے۔

(۱) علامہ عراقی نے فرمایا ہے کہ گرتا پہننا مندوب و مستحب ہے اس لئے کہ آنحضرت ﷺ کو پسندیدہ تھا اور یہ اس لئے کہ اس میں ستر پوشی زیادہ ہے۔ ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے کہ گرتا بدن پر ہلکا ہوتا ہے اور اس میں تواضع بھی ہوتی ہے۔

(جمع الوسائل ۱۰۷/۱) (عقار)

(۲) جامع ترمذی ج ۲ ص ۷۲۵ کتاب اللباس (مختار)

وہو اصح: اس میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ابو تمیلہ کا قول ہو اور اس کی زیادہ کا حصہ ہو یعنی ابو تمیلہ نے ”عن امہ و ہواصح“ کی زیادت کی ہو اور دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ امام ترمذی کا قول ہو پھر معنی یہ ہوتا کہ ابو تمیلہ نے عن امہ کا اضافہ سند میں ذکر کیا ہے اور امام ترمذی نے اسی وجہ سے ابو تمیلہ کی اس روایت کو اصح کہا ہے علاوہ ازیں اس روایت کے متن میں ”یلبسہ“ کا لفظ بھی زائد مذکور ہے جو کہ دوسری روایتوں میں نہیں ہے۔

(۳) حدثنا عبد اللہ بن محمد بن الحجاج ثنا معاذ بن هشام

حدثنی ابی عن بدیل العقبلی عن شہر بن حوشب عن أسماء بنت

یزید قالت کان کم قمیص رسول اللہ ﷺ إلی الرسغ (۱)۔

ترجمہ: اسماء بنت یزید فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی قمیص کی آستین پہنچنے تک ہوتی تھی۔

اسماء بنت یزید: عن أسماء بنت یزید، علامہ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ یزید بن سکن انصاریؒ کی بیٹی اور حضرت معاذ جبلؓ کی پھوپھی زاد بہن ہیں۔ بہت دلیر صحابیہ تھی۔ یرموک کی لڑائی میں خیمہ کا بانس لے کر نورومی فوجیوں کو ہلاک کر ڈالا۔ علامہ بخاریؒ کہتے ہیں کہ کچھ اور لوگوں کو بھی نقصان پہنچایا۔ نبی کریم ﷺ سے اکیاسی احادیث روایت کر چکی ہیں۔

آستینوں کی لمبائی اور اختلاف کی توجیہات: إلی الرسغ کلائی کے جوڑ کو کہتے ہیں۔ اور ایک روایت میں کلائی تک قمیص کی آستینوں کا بیان ہے جبکہ بعض روایات میں اسفل من الرسغ کا لفظ آتا ہے۔ بلکہ بعض میں یہ بھی آیا ہے کہ ان الکُم کان یصل إلی الأصابع یعنی آستین انگلیوں تک پہنچتی تھی۔ بظاہر یہ تعارض معلوم ہوتا ہے۔

(۱) لیکن اس کا جواب ممکن ہے کیونکہ یہ تعدد اقصاء پر حمل ہے، یعنی آپ ﷺ کی متعدد قمیص تھیں جن میں سے اکثر قمیصوں کی آستینیں کلائی تک ہوتی تھیں جبکہ بعض کی اس سے لمبی بھی ہوا کرتی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس بادشاہوں اور امراء کی طرف سے بطور ہدیہ لباس بھی آیا کرتے تھے۔ اس لئے

(۱) سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۲۰۳، کتاب اللباس ماجاء فی القمیص، جامع ترمذی کتاب اللباس

- قیصوں کا تعدد محتمل ہے۔ اور ان کی آستینوں میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔
- (۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ کلائی تک کا قول تحمین واندزہ پر مبنی ہے۔ آستینیں اس سے لمبی یا چھوٹی بھی ہو سکتی ہیں۔ جیسا بعض جہوں کی آستینیں بہت لمبی ہوا کرتی ہیں۔
- (۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ آستینیں کلائی تک ہوتی تھیں اور سفر کی حالت میں ایسی قیص ہوتی تھی کہ آستینوں سے ہاتھ چھپ جاتے تھے تاکہ گرمی اور سردی سے حفاظت ہو سکے۔
- (۴) چوتھا جواب یہ ہے کہ شاید جب پہلی دفعہ قیص نئی نئی پہنی ہو تو آستینیں لمبی ہوں بعد میں دھونے کی وجہ سے یہ چھوٹی ہو چکی ہوں جس طرح کہ سوتی کپڑے میں ہوتا رہتا ہے۔
- (۵) پانچواں جواب یہ ہے کہ یہ اختلاف ہاتھ کی وضع پر مبنی ہے۔ کبھی ہاتھ لمبا ہوتا تھا تو آستین کلائی تک پہنچتی تھی اور اگر ہاتھوں کو کھینچ لیتے تھے تو آستین لمبی ہو کر سارا ہاتھ ڈھانپ لیتی تھی۔
- (۶) چھٹا جواب یہ کہ وضوء وغیرہ سے جب آستین کا کپڑا گیلیا ہو جاتا تھا تو سکر جاتا تھا اور کلائی تک پہنچ جاتا تھا۔ ورنہ عام حالت میں یہ قدرے لمبا ہوتا تھا۔ بہر حال یہ اختلاف زیادہ اہم اختلاف نہیں۔

(۵) حَدَّثَنَا أَبُو عَمَارٍ الْحُسَيْنُ بْنُ حَرْيْثٍ أَنَا أَبُو نَعِيمٍ أَنَا زُهَيْرٌ عَنْ

عُرْوَةَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ قُشَيْرٍ عَنْ مَعَاوِيَةَ بْنِ قُرَّةَ عَنْ أَبِيهِ قَالَ أَتَيْتُ رَسُولَ

اللَّهِ ﷺ فِي رَهْطٍ مِنْ مَزِينَةِ لِنَبَايَعِهِ وَإِنْ قَمِيصَهُ لَمَطْلُوقٍ أَوْ قَالَ زُرْ

قَمِيصَهُ مَطْلُوقٌ قَالَ فَأَدْخَلَتْ يَدِي فِي جَيْبِ قَمِيصِهِ فَمَسَسْتُ الْخَاتَمَ (۱)

ترجمہ: قرۃ بن اریاس سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ میں نبی کریم ﷺ کی

خدمت میں قبیلہ مزینہ کی ایک جماعت کے ساتھ حاضر ہوا تاکہ ہم آپ ﷺ سے

بیعت کریں۔ آپ ﷺ کی قیص کھلی ہوئی تھی (یا یوں کہا کہ) آپ ﷺ کی قیص کی

گھنڈی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے آپ ﷺ کے گریبان کے اندر ہاتھ ڈالا

اور (تیمر کا) مہر نبوت کو چھوا۔

(۱) سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۲۰۹ باب ماجاء فی حل الازار، ابن ماجہ ص ۲۵۶ کتاب اللباس باب

عن ابیہ حضرت معاویہؓ کے والد کا نام قرۃ بن ایاس بن ہلال مزینی ہے۔ مشہور صحابی ہیں۔ ۶۳ھ کو بصرہ میں وفات پائی۔

رہط: فی دھط الخ رھط میں ہاء کا سکون اور فتح دونوں صحیح ہیں۔ تین سے دس تک آدمیوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ بشرطیہ کہ ان میں عورت نہ ہو۔ بعض کے مطابق چالیس تک کے مردوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسلام لانے کی غرض سے مزینہ قبیلہ کے چار سوا افراد وفد کی صورت میں نبی کریم ﷺ کے پاس آئے تھے۔ لہذا ان پر دھط کا اطلاق یا تو مجازاً ہے یا پھر سارے کے سارے نبی کریم ﷺ کے پاس کیجا نہیں آئے تھے بلکہ مجلس میں حاضر ہوتے وقت چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔

وان قمیصہ لمطلق او قال زر قمیصہ لمطلق: امام ترمذیؒ کے استاد کوفہک ہے کہ راوی نے زر یعنی گھنڈی کا لفظ ذکر کیا تھا یا نہیں۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ بٹن بند نہ تھے۔ گریبان کھلا ہوا تھا (۱)۔ عظیم ذمہ دار یوں کے فکر کے سبب اتنا خیال نہ رہا کہ بٹن بند کئے جائیں۔ گویا مقصد سے عشق اور لگاؤ یا کیفیت جذب و محبت نے گریبان بند کرنے کا موقع نہ دیا۔ ویسے بھی نبی کریم ﷺ کو تکلف کے ساتھ بیٹھنے کی عادت نہ تھی (۲)۔

(۱) یہ آنحضرت ﷺ کی سنت مستمرہ نہ تھی بلکہ کبھی آپ ﷺ کے قمیص کے بٹن کبھی بند رہتے تھے تو کبھی کھلے رہتے تھے چونکہ آپ ﷺ سادہ اور بے تکلف زندگی بسر کرتے تھے۔ اس لئے کبھی کھلے گریبان بھی اپنے ساتھیوں میں بیٹھتے تھے۔ مگر اس وقت گریبان کھلا رکھنا بد معاش، اور آوارہ لوگوں کا شعار بن چکا ہے۔ اور ہمارے معاشرے میں کھلے گریبان کو خلاف مروت سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں کھلے گریبان سے پرہیز کرنا ہی مناسب ہے اور ویسے بھی بند گریبان سنت ہے۔ (بخاری)

مرد اور عورت کے گریبان میں فرق: علامہ ابن نجیمؒ نے لکھا ہے مرد کے کرتے کو قمیص اور عورت کے کرتے کو درع کہا جاتا ہے کیونکہ مرد کے قمیص کا گریبان سینے پر ہوتا ہے اور عورتوں کے کرتے کا گریبان ستر کی وجہ سے جنگی زدہ کی طرح موڑھے پر ہوتا ہے۔ (المحرر الرائق ۱/۲۶۲) (بخاری)

(۲) حضرت عروہؓ جو اس حدیث کو معاویہ بن قرظؓ سے روایت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں نے معاویہؓ اور اس کے باپ قرظؓ کو جس موسم میں بھی دیکھا۔ ان کے گریبان کھلے رہتے تھے یہ عشق و محبت کی انتہاء ہے کیونکہ محبوب کی ہر ادا محبوب ہوتی ہے ایک عربی شاعر کہتا ہے کہ وکل ما یفعل الحبيب حبيب (اصلاح الدین)

ہمارے شیخ الشیوخ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ اکثر یہ شعر گنگتاتے تھے جس میں اس صورت حال کی طرف اشارہ ہے ۔

ہم نے تو اپنے آپ گریبان کیا ہے چاک اس کو سیا، سیا، نہ سیا پھر کسی کو کیا؟
ادخلت یدی فی جیب الخ مہربوت کی شہرت اور کچھ اپنی تجسس کی وجہ سے گریبان سے ہاتھ اندر داخل کیا یا پھر تہرک یا مزید طمانیت اور علامت حقانیت کے مشاہدے کے لئے ہاتھ ڈالا (۱)۔ یہاں جیب سے گریبان مراد ہے اور آج کل کا مروج گریبان سامنے یا اس کے ایک طرف یا پھر پیچھے کی طرف ہوتا ہے لیکن اس جگہ شراح کے نزدیک وہی گریبان مراد ہے جو سینے پر ہوتا ہے۔

(۲) حدثنا عبد بن حمید ثنا محمد بن الفضل أنا حماد بن سلمة

عن حبيب بن الشهيد عن الحسن بن أنس بن مالك أن النبي ﷺ

خرج وهو متكى على أسامة بن زيد عليه ثوب قطري قد توشح به

فصلى بهم وقال عبد بن حميد قال محمد بن الفضل سألتني يحيى ابن

معين عن هذا الحديث أول ما جلس إلي فقلت ثنا حماد بن سلمة

لقال لو كان من كتابك فقمتم لاخرج كتابي فقبض على ثوبي ثم

قال امله علي فاني أخاف ان لا ألقاك قال فامليته عليه ثم اخرجت

كتابي فقرأت عليه (۳)۔

خرج و هو متكى على اسامة یعنی بوجہ ضعف آپ ﷺ نے گھر سے نکلتے ہوئے

حضرت اسامہؓ پر ہاتھ رکھ کر ان کا سہارا لیا تھا یہ مرض الوفا کا واقعہ ہے کیونکہ دوسری روایات میں تصریح

(۱) شرعی مسئلہ یہ ہے کہ کسی کے گریبان میں ہاتھ ڈالنا بغیر اجازت کے جائز نہیں۔ اور یہاں حدیث پاک میں

آنحضرت ﷺ کے گریبان میں ہاتھ ڈالنے کی اجازت کا ذکر بھی نہیں۔ تو ایک صحابی رسول ﷺ نے کیسے اس بے ادبی کا

ارتکاب کیا تو اس شبہ کا ازالہ یہ ہے کہ کسی صحابی سے بے ادبی کی توقع بھی ممکن نہیں۔ لازماً انہوں نے آپ ﷺ سے اجازت

طلب کی ہوگی۔ اور آپ ﷺ نے اجازت دی ہوگی۔ یا آنحضرت ﷺ اس کے انداز سے سمجھ چکے ہوں گے۔ تو آپ ﷺ

نے خود بخود اجازت مرحمت فرمائی ہوگی۔ (بخاری)

(۲) جامع الترمذی ج ۲ ص ۲۵ کتاب اللباس باب ماجاء فی القميص (مختار)

ہے کہ مرض وفات میں آپ ﷺ فضل بن عباسؓ اور اسامہ بن زیدؓ پر نکیہ کر کے گھر سے نکلتے تھے۔

اور ممکن ہے کہ کوئی دوسرا مرض ہو۔ قطرئی قاف کی مکسور اور طاء کو ساکن پڑھا جاتا ہے۔ یہ بیش قیمت چادریں ہوتی تھیں جن کی نسبت علاقہ کی طرح کی جاتی تھی۔ یعنی قطر اور اس کے قرب وجوار میں یہ کپڑا بنایا جاتا تھا۔ اور ان میں سرخ لکیریں ہوتی تھیں۔ قدتو ضح بہ: آپ ﷺ نے چادریوں کندھوں کے اوپر ڈال کر دونوں طرف لٹکائی تھی جیسے ہار گلے میں ڈالا جاتا ہے۔ یا پھر توشخ اضطباع مراد ہے یعنی جس طرح محرم دائیں بٹل کے نیچے سے چادر کا ایک طرف نکال کر بائیں کندھے پر ڈالتا ہے۔ لیکن عام طور پر شراح پہلا معنی لیتے ہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قمیص کے علاوہ دوسرے کپڑے بھی بطور تئین یا گرمی سردی سے بچنے کے لئے کبھی کبھی استعمال فرمائے ہیں۔ فصلی بہم اگر یہ مرض الموت کا واقعہ ہو تو پھر معنی یہ ہوگا کہ فصلی معہم یعنی نبی کریم ﷺ نے صحابہؓ کے ساتھ نماز پڑھی۔ کیونکہ روایات کے مطابق آپ ﷺ نے مرض الوفا میں صحابہؓ کے ساتھ جو نماز پڑھی تھی اس میں آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو پیچھے آنے سے منع فرمایا تھا اور امامت ان ہی سے کروائی تھی۔

سبحی بن معینؒ اور حرص طلب علم: قال محمد بن فضل سانی یحییٰ بن معینؒ: سبھی عظیم محدث، اور جرح و تعدیل کے امام ہیں۔ حفاظ حدیث میں بڑا درجہ رکھتے تھے۔ لاکھوں احادیث یاد تھیں دس لاکھ تو اپنے ہاتھ سے لکھی تھی امام احمدؒ فرماتے ہیں کل حدیث لا یعرفہ یحییٰ فلیس بحديث سبھی کو جو حدیث معلوم نہ ہو وہ حدیث ہی نہیں۔ نیز فرمایا کہ السماع من یحییٰ شفاء لما فی الصدور سبھی سے حدیث سننا دل کا علاج ہے۔

۳۸۲ھ کو مدینہ میں وفات پائی۔ اور نبی کریم ﷺ کو جس تختہ پر غسل دیا گیا تھا اسی پر آپ کو بھی غسل دیا گیا۔ ان کے استاد محمد بن فضل فرماتے ہیں کہ سبھی پہلی دفعہ آکر میری مجلس میں بیٹھے۔ تو اس حدیث کے بارے میں پوچھا۔ دراصل یہ لوگ مسند کو متصل کرنے کے لیے مشقتیں برداشت کرتے۔ اور بڑے بڑے سفر کیا کرتے تھے۔ کبھی تو متعدد طرق سے حدیث معلوم بھی ہوتی۔ لیکن کسی اچھے شیخ سے سماع مقصود ہوتا یا پھر مسند کے اختصار کی غرض سے اتنے لمبے سفروں کا اہتمام کیا جاتا۔ آج کل کی طرح احادیث کا تیار

مجموعہ ملنے کا رواج نہ تھا بلکہ بعض اوقات تو محض ایک حدیث کے لئے ہزاروں میل کا فاصلہ طے کیا جاتا تھا۔ ایک شخص مدینہ سے شام تک کا سفر کرتا ہے میزبان اس کی آمد سے خوش ہوتا ہے لیکن مہمان بیٹھتا بھی نہیں۔ حدیث کھڑے کھڑے بیان کرنے کا مطالبہ کرتا ہے اور حدیث سننے کے بعد واپس ہو جاتا ہے۔ یحییٰ بن معین کو بھی حدیث معلوم تھی لیکن صرف سند کے اتصال کی خاطر محمد بن فضل کے پاس آئے تھے۔

لو کان من کتابک: یحییٰ بن معین کو استاد کے حافظہ پر اعتماد ہے اور حافظہ سے حدیث سنانا جائز ہے۔ لیکن احتیاط اس میں تھی کہ کتاب سے پڑھے تاکہ خطا کا احتمال ہی نہ ہو۔ اس لئے انہوں نے استاد کو کتاب سے حدیث بیان کرنے کا التماس کیا۔

لقبض علی ثوبی۔ محمد بن فضل کہتے ہیں کہ جب میں اٹھنے لگا کہ کتاب لاؤں تو یحییٰ نے مجھے پکڑا کہ حدیث کا معاملہ ہے اور غم عشق است و ہزار بدگمانی۔

اس لئے درخواست کی کہ کتاب لانے سے پہلے حدیث بیان کر دیں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ یہاں سے نکلتے ہی ہم دونوں میں کسی کی موت آئے اور حدیث سننے سنانے کا موقع نہ ملے۔ اس لئے علم کی عظیم نعمت سے محرومی سے بچنے کی خاطر پہلے زبانی حدیث بیان کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے پہلے زبانی بیان کرنے کے بعد کتاب لا کر دوبارہ کتاب سے بھی بیان کی۔

اسلاف اور وقت کی قدر و قیمت کی چند مثالیں: شمائل ترمذی میں تحصیل علم کے سلسلے میں کوشش، تڑپ اور جذبہ عشق سے بھرپور اس مقام پر جب بھی میں نے غور کیا۔ تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ موت کے ڈر سے بھی حدیث کا درس ضائع نہیں ہونے دیتے۔ کتنی نزاکت سے اہتمام ہے تحصیل علم کا۔ اس کے برعکس ہمارے اوقات کس طرح ضائع ہوتے ہیں اور ہمیں احساس تک نہیں ہوتا۔ طلبہ فضول مشاغل کے لئے درس حدیث کو قربان کرتے ہیں۔ ہمارے اسلاف کو وقت کے لحاظ کا شدت سے احساس تھا۔

غالباً حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ میری زندگی میں روٹی کھانے اور قضاے حاجت کے اوقات میرے ہاتھ سے فضول نکل گئے ہیں۔ جن میں علم کے مشغلہ سے کٹ جاتا ہوں۔ وہ طبیعی ضروریات پر بھی وقت لگانے کے لئے کف افسوس ملتے ہیں۔

امام ابو یوسف کا مشہور واقعہ ہے۔ حضرت ابراہیم بن الجراحؒ کی روایت ہے کہ امام یوسفؒ بیمار ہوئے تو میں ان کی عیادت کیلئے حاضر ہوا۔ تو سکرات الموت کی حالت تھی آپ بیہوش تھے۔ کچھ افاقہ ہوا تو نزع کی حالت ہی میں مجھ سے دریافت فرمایا کہ ابراہیم بتاؤ رومی جہاز پیدل کرنا افضل ہے یا سوار ہو کر۔ ہمیں سخت تعجب ہوا کہ حالت نزع میں بھی علم سے یہ شغف ہے۔ میں نے منع کیا تو انہوں نے فرمایا کہ بتاؤ کہ میں اس مسئلہ میں عالم مروں یہ بہتر ہے یا جاہل؟ چنانچہ مسئلہ کے بارے میں ابھی بحث و تنقیح ہو رہی تھی کہ میں اٹھ کر جانے لگا اور ابھی مشکل سے دروازے تک پہنچا تھا کہ گھر سے عورتوں کے رونے کی آواز آئی۔ میں پلٹا تو معلوم ہوا کہ امام صاحب انتقال فرما چکے ہیں۔

ان لوگوں کے دلوں میں کبھی خیال بھی نہ گزرا کہ بس کافی ہے۔ ہم علامہ بن گئے بلکہ حصول علم کا جذبہ ہوتا تھا اور ہر وقت اس کی تڑپ اور پیاس لگی رہتی۔ حدیث میں آیا ہے کہ منہو مان لا یشبعان منہوم فی العلم لا یشبیع منہ و منہوم فی الدنیا لا یشبیع منہا (۱)۔ کہ دو حریص کبھی بھی سیر نہیں ہوتے۔ ایک علم کا حریص جو اس سے سیر نہیں ہوتا۔ دوسرا دنیا کا حریص جو اس سے سیر نہیں ہوتا۔

ایک مستشرق پروفیسر کا جذبہ حصول علم: مولانا سید سلیمان ندویؒ نے حیات شبلیؒ میں ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ وہ حضرت شبلیؒ سے روایت کرتے ہوئے ان کے ایک سفر نامے کے بارے میں لکھتے ہیں یا علامہ شبلیؒ نے خود اپنے سفر نامے ”سفر نامہ مصر و شام“ میں لکھا ہے کہ جس بحری جہاز میں ہم سوار تھے۔ اس میں ہمارا استاد پروفیسر آرنلڈ بھی سوار تھا۔ یہ علی گڑھ یونیورسٹی کا مشہور مستشرق پروفیسر تھا۔ جس نے مشہور کتاب دعوت اسلام (Preaching of Islam) لکھی۔

علامہ لکھتے ہیں کہ دوران سفر اچانک جہاز کو طوفان نے آگھیرا۔ شوراٹھا کہ جہاز ڈوب رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت انسان سب کچھ بھول جاتا ہے۔ سمندری جہاز ڈوبنے کا منظر بڑا ہولناک ہوتا ہے۔ ہر کوئی اپنے لئے حفاظتی کشتی کی تلاش میں ہے۔ خطرے کا سائرن بجا۔ اس حالت میں مجھے یاد آیا کہ پروفیسر آرنلڈ ہر وقت کتاب مطالعہ میں ڈوبا رہتا ہے۔ دیکھوں تو اسکی کیا حالت ہے۔ میں دوڑ کر گیا اور کمین کا دروازہ کھولا دیکھا کہ وہ کتاب پڑھ رہا ہے۔ میں چیخا کہ سر! جہاز ڈوب رہا ہے۔ اس نے اچھا کہہ کر مجھے ٹال دیا۔ اور مزید استغراق سے

کتاب پڑھنے لگا۔ میں نے پھر کہا تو اس نے کہا کہ اگر جہاز ڈوب رہا ہے اور موت آنے والی ہے تو مجھے چھوڑ دو کہ یہ صفحہ ختم کر دوں۔ صفحہ چھوڑ کر مروں تو کیا فائدہ۔ کافروں میں بھی ایسے لوگ ہیں جنہیں تحصیل علم میں اتنا انہماک ہوتا ہے۔

امام مالک اور یحییٰ مصمودیؒ: امام مالکؒ کے ساتھ طلبہ بیٹھے تھے۔ درس حدیث شروع تھا۔ موطا امام مالکؒ کے راوی حضرت یحییٰ بن یحییٰ مصمودیؒ بھی بیٹھے تھے۔ کسی نے کہا کہ مدینہ میں ہاتھی لایا گیا ہے۔ ہاتھی کو دیکھنے کے لئے سارے طلبہ امام مالکؒ کو چھوڑ کر دوڑے۔ کیونکہ ہاتھی عجیب جانور ہے اور اہل مدینہ نے اسے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ صرف یحییٰ بن یحییٰ مصمودیؒ تھے جو نہ اٹھے۔ امام مالکؒ نے اس کے بارے میں فرمایا کہ ”هذا عاقل“ یہی عقلمند ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت یحییٰ بن یحییٰ مصمودیؒ کی روایت کردہ موطا کو شہرت حاصل ہوئی۔ سترہ یا اٹھارہ نسخے موطا کے دنیا میں بیان کئے گئے ہیں (۱)۔ لیکن سوائے آپ کے نسخے کے دوسرے نسخے متداول نہیں ہو سکے۔

حقوق الاوقات کی تلافی ممکن نہیں: ہمارے شیخ حضرت مولانا عبدالغفور مدنیؒ نے ایک بار یہاں دارالعلوم میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک حقوق اللہ فی الاوقات ہیں اور ایک حقوق الاوقات ہیں۔ مثلاً نماز کسی سے قضاء ہوئی یا روزہ توڑ دیا تو قضاء یا کفارہ سے اس کی تلافی ممکن ہے لیکن حق الوقت یہ ہے کہ وقت بے مقصد خرچ نہ ہو، صحیح طریقہ پر صرف ہو۔ اگر یہ وقت ضائع ہوا تو قیامت تک اس کی تلافی ممکن نہیں کیونکہ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ قیامت کے روز وقت کے ضیاع پر پچھتانا پڑے گا۔ اسی لئے تو قیامت کے دن کو یوم الحسرة بھی کہا جاتا ہے۔ مشہور مقولہ ہے کہ الوقت سیف قاطع إمتانقطعه وإما یقطعک وقت تیز تلوار ہے یا تو اسے استعمال کر کے صرف کر دے گا۔ یا وہ تجھے کاٹ کر رکھ دے گا۔ بہر حال یہاں بھی حضرت محمد بن فضلؒ نے پہلے زبانی اور بعد میں کتاب سے حدیث بیان کر کے حضرت یحییٰ بن معینؒ کی تفہیگی کا مواد کیا۔ اور امام ترمذیؒ نے یہ حکایت صرف اس لئے بیان کی کہ اس میں مذکورہ سند کی مزید تقویت ہے۔

(۱) بلکہ موطا کے رواۃ کی تعداد پچاس سے بھی زائد بیان کی جاتی ہے۔ (اصلاح الدین)

(۷) حَدَّثَنَا سُوَيْدُ بْنُ نَصْرَانَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ الْمُبَارَكِ عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي نَضْرَةَ عَنْ أَبِي نَضْرَةَ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخَدْرِيِّ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا اسْتَجَدَّ ثَوْبًا بِاسْمِهِ بِاسْمِهِ عِمَامَةً أَوْ قَمِيصًا أَوْ رِدَاءً ثُمَّ يَقُولُ اللَّهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا كَسَوْتَنِيهِ أَسْأَلُكَ خَيْرَهُ وَخَيْرَ مَا صَنَعَ لَهُ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّهِ وَشَرِّ مَا صَنَعَ لَهُ.

حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ يُونُسَ الْكُوفِيُّ أُنْبَاؤُ الْقَاسِمِ بْنِ مَالِكِ الْمَزْنِيِّ عَنْ الْجَوَيْرِيِّ عَنْ أَبِي نَضْرَةَ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخَدْرِيِّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ نَحْوُ (۱)۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب کوئی نیا کپڑا پہنتے تو (اٹھارہ مسرت کے طور پر) اس کا نام لیتے۔ مثلاً فرماتے کہ یہ پگڑی ہے یا قمیص ہے یا چادر پھر دعا فرماتے کہ اے اللہ تیرے ہی لئے تمام تعریفیں ہیں۔ جیسے کہ تو ہی نے مجھے یہ کپڑا پہنایا۔ اے اللہ میں تجھ سے اس کپڑے کی بھلائی چاہتا ہوں۔ اور جن مقاصد کے لئے یہ بنا ہے ان کی بھلائی چاہتا ہوں۔ اور تجھ سے اس کپڑے کی شر سے پناہ مانگتا ہوں اور جن مقاصد کے لئے یہ بنا ہے اس کی شر سے پناہ مانگتا ہوں۔

اذا استجد ثوباً الخ یعنی جب آپ ﷺ کو کہیں سے نیا کپڑا ملتا مثلاً بازار سے لاتے یا کہیں بطور ہدیہ پیش کیا جاتا۔ یا معنی یہ ہے کہ جب بھی آپ ﷺ کوئی نیا کپڑا پہنتے۔

تسمیہ لباس کے مختلف احتمالات: سَمَاءُ بِاسْمِهِ، اس جملے کے مقصد میں مختلف احتمالات ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ کپڑا ملتا تو جو چیز اس سے بیانی مطلوب ہوتی تھی وہ تازہ کر دیتے تھے۔ مثلاً یہ فرماتے کہ اس سے قمیص بنائوں گا، یا اس سے عمامہ بنائوں گا۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اگر قمیص، عمامہ یا

(۱) سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۲۰۲، کتاب اللباس مصنف ابن ابی شیبہ ۱۰/۳۰۳ عمل الیوم واللیلة

لابن السنی ص (مختار)

کوئی دوسرا کپڑا کوئی پیش کرتا تو شکریہ ادا کرتے اور فرماتے کہ اچھی قمیص ہے یا اچھا عمامہ ہے۔ بعض مقامات میں یہ بھی آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بعض لباسوں کے مستقل نام بھی تھے۔ مثلاً آپ ﷺ کی ایک گھڑی کا نام سحاب (بادل) تھا، پھر یہ معنی بھی ممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی طرف سے کپڑے پر مناسب نام رکھ دیتے تھے۔ علامہ بیجوریؒ لکھتے ہیں کہ یہ احتمال بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ اس کپڑے کے مادے کی حیثیت سے اس کی جنس کا نام لیتے تھے۔ مثلاً یہ سوئی کپڑا ہے اونی ہے یا کتان کا ہے۔

الحمد لله كما كسوتنيه الخ (۱): کما تشیہ کے لئے ہے۔ حمد اور تشکر کو اللہ تعالیٰ کی خلعت نوازی سے تشبیہ دی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کسوة یعنی کپڑا پہنانا تیرے ساتھ مختص ہے دنیا کی کوئی قوت مجھے کپڑا نہیں دے سکتی تھی۔ اسی طرح حمد بھی تیرے ساتھ خاص ہے۔ یا پھر یہاں تشبیہ سے مقصود یہ ہے کہ جس طرح کپڑا اللہ تعالیٰ دیتے ہیں اور ہم فقر و احتیاج کی بناء پر اس کے مستحق بن جاتے ہیں۔ اس طرح ہماری حمد کا مستحق فقط اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لحاظ سے تشبیہ محض استحقاق میں ہے (۲)۔

خیبرہ‘ کپڑے کے خیر ہونے کی متعدد صورتیں ہیں مثلاً یہ کہ دیر پا ثابت ہو۔ صاف رہے جس مقصد کیلئے اسے حاصل کیا گیا ہو۔ اسی میں استعمال ہو۔ ثواب کے کاموں میں صرف ہو اور گناہوں میں استعمال نہ ہو۔ اسی طرح شرکی صورت یہ ہوگی۔ کہ جلد بوسیدہ ہو جائے، جل جائے، پھٹ کر بیکار ہو جائے اور سب سے بدترین شریہ ہے کہ انسان میں عجب تکبر اور خود پسندی پیدا ہونے کا سبب بنے۔

حدثنا هشام بن یونس الخ سابقہ متن کو دوسری سند سے ذکر کر رہے ہیں جس سے پہلی سند

کی تائید ہوتی ہے۔

(۱) جب کوئی نیا کپڑا پہنتے تو یہ دعا پڑھے و حدیث معاذ بن انس مرفوعاً من لبس ثوباً جليداً فقال الحمد لله الذي كساني هذا ورزقنيه من غير حول ولا قوة غفر الله له ما تقدم من ذنبه زاد ابو داؤد ج ۲ ص ۲۰۲ فی روايته و ما تآخر (المواهب اللدنية ص ۲۱) (مختار)

(۲) یہ احتمال بھی ہے کہ یہاں کاف لام تعلیل یا علی کے معنی میں ہو دونوں صورتوں میں یہ تعلیل کے معنی میں ہوگا یعنی اے اللہ اس کپڑے کے بخشنے پر ہم تیرا شکر ادا کرتے ہیں۔ (اصلاح الدین)

(۸) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ أَنبَأَنَا مُعَاذُ بْنُ هِشَامٍ ثَنَى أَبِي عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ أَحَبَّ الثِّيَابِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ يَلْبَسُهُ الْحَبْرَةَ (۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو یمنی متش چادر کپڑوں میں زیادہ پسند تھی۔

الحبرہ حاء کے کسرہ اور باء کے فتح کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے پسندیدہ لباس میں سے ایک حبرہ بھی تھا۔ یہ تخمیر سے ماخوذ ہے جو تخمین و ترائین اور متش بنانے کے معنی میں ہے۔ یہاں مراد وہ یمنی چادر ہے جس میں لکیریں ہوتی تھیں۔ دراصل یہ ملائم سوتی چادر ہوتی تھی۔ نبی کریم ﷺ اس لئے بھی اس کو پسند فرماتے تھے کہ اس کی لکیریں عموماً سبز (۲) ہوتی تھیں۔ اور اہل جنت کے کپڑوں کا رنگ بھی سبز ہوگا۔ نیز ملائمت، ساخت کے لحاظ سے نفاست اور میل خوری کی وجہ سے بھی آپ ﷺ کو یہ چادر پسند تھی۔

زیادہ محبوب قمیص یا حبرہ: واضح رہے کہ جن روایات میں قمیص کو زیادہ محبوب کپڑا کہا گیا ہے ان کا حضرت انسؓ کی اس حدیث سے بظاہر تعارض معلوم ہو رہا ہے۔ لیکن اس کی توجیہ یہ ہے کہ دراصل دونوں لباسوں کی حیثیتوں میں فرق ہے۔ چنانچہ چادروں اور ان کے رومالوں میں آپ ﷺ کو حبرہ زیادہ پسند ہوگا، سلعے ہوئے پہننے کے کپڑوں میں قمیص، اور کوٹ کے قسموں میں چغڑا وہ پسند ہوگا۔ یا یہ کہ گھر میں قمیص اور باہر حبرہ پسند تھا۔

(۹) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ غِيلَانَ أَنبَأَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ أَنبَأَنَا سَفِيَّانُ عَنْ عَوْنِ بْنِ أَبِي جَعْفَرٍ عَنْ أَبِيهِ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ حُمْرَاءُ

(۱) صحیح بخاری، کتاب اللباس ص ۸۶۵، باب البروز والحبر والشملة، صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۰۱ کتاب اللباس والزينة باب فضل لباس، سنن نسائی ج ۲ ص ۲۰۳ کتاب الزينة باب الحبرة (مختار)

(۲) بعض روایات کے مطابق اس میں سرخ یا نیلی لکیریں ہوتی تھیں جس طرح اگلی حدیث سے سرخ رنگ میں ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ (مختار)

كانی النظر الی بریق ساقیه قال سفیان أراها حمرة (۱)۔

ترجمہ: حضرت ابو جحیفہ قمر ماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو سرخ جوڑا پہنے

ہوئے دیکھا۔ حضور ﷺ کی پنڈلیوں کی چمک گویا اب بھی میرے سامنے ہے۔ راوی

حدیث سفیان کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ یہ حمراء تھا۔

سرخ لباس استعمال کرنے کی وجوہات: وعلیہ حلۃ حمراء حضرت ابو جحیفہ کی یہ ملاقات

نبی کریم ﷺ کے ساتھ حجۃ الوداع کے موقع پر بطحاء مکہ میں ہوئی تھی۔ جس کی تائید بخاری شریف کی روایت

سے ہوتی ہے۔ اس روز آپ ﷺ سرخ چادر اور ازار پر مشتمل جوڑا پہنے ہوئے تھے (۲)۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ احادیث میں سرخ رنگ کے کپڑے کے استعمال کی ممانعت آئی ہے

تو نبی کریم ﷺ نے خود کیسے استعمال فرمایا۔ اس کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں۔

(۱) اول یہ کہ ممکن ہے آپ ﷺ کا یہ عمل تحریم سے پہلے کا ہو۔ یعنی ابھی تک سرخ کپڑے کے استعمال

کی ممانعت نہ ہوئی ہو۔

(۲) دوم یہ کہ یہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیت ہو کہ ان کے لئے مباح ہو۔ دوسرے لوگوں کے لئے نہ

ہو۔ اور اس سے تکبر اور خود پسندی کی بیماری پیدا ہونے کا اندیشہ نہ تھا۔ جبکہ دوسرے لوگ شاذ و نادر ہی اس

مرض سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

(۱) صحیح مسلم ص ۹۵ کتاب الصلوۃ باب ستر المصلی، ابوداؤد ج ۱ ص ۸۲ کتاب الصلوۃ

باب فی المؤذن یستدیر فی آذانه، سنن نسائی ج ۲ ص ۲۵۸ کتاب الزینۃ باب اتخاذ القاب

الحمراء (مختار)

(۲) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے والمراد بالجملة الحمراء بردان یمانیان منسوجان بخطوط حمراء مع

سود کسائر البرود الیمینۃ وہی معروف بهذا الاسم باعتبار ما فیہا من الخطوط الحمراء والافلااحمر

البحث منہی عنہ ومکروه لبسہ لحديث أخرجه أبو داؤد عن حديث عبد اللہ بن عمرو قال

مریائتہی ﷺ رجل وعلیہ حلّتان حمرا وان فسّلم علیہ فلم یرد علیہ وحملہ الیہیقی علی ماصبغ بعد

النسج وإما صبغ غزلہ ثم نسج فلا کراهۃ فیہ والظاهر أنّه لا فرق بینہما لأنّہ زینۃ الشیطان وموجب

للخیلاء والطغیان وقد روی الحسن عن النبی ﷺ أنّ الحمرة من زینۃ الشیطان. (جمع الوسائل

(۳) سوم یہ کہ یہ کپڑا خالص سرخ نہ تھا بلکہ سرخ لکیروں پر مشتمل تھا۔ جس کی طرف امام ترمذیؒ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ سفیانؒ کے خیال میں یہ حمرہ تھا۔ اور تحریم و کراہت خالص سرخ کپڑے میں ہوگی لکیر دار ہو تو مضائقہ نہیں۔

(۴) چہارم یہ کہ ممکن ہے کہ سرخی سیاہی مائل ہو۔ جس کی وجہ سے اس میں اباحت کی جہت پیدا ہو چکی ہو۔

(۵) پنجم یہ کہ ممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ بیان جواز کے لئے کیا ہو۔ جیسا کہ بعض فقہاء کی رائے ہے۔ بلکہ بعض نے تو سرخ لباس کو مستحب قرار دیا ہے۔

فقہاء کی آراء: بہر حال اس سلسلے میں فقہاء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض تو تحریم کے قائل ہیں۔ بعض کراہت تحریمی اور کچھ تنزیہی کے قائل ہیں۔ اور کچھ لوگ اباحت کا قول بھی کرتے ہیں۔ ملا علی قاریؒ نے شمائل شرح جمع الوسائل میں تمام اقوال نقل کئے ہیں۔ علامہ گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ ایک فتویٰ ہے اور ایک فتویٰ ہے۔ فتویٰ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کی اجازت نہیں دی تو اس کے استعمال سے رک جانا چاہیے۔ اور اگر فتوے کی بات ہو تو اس میں جواز کا ثبوت بھی موجود ہے۔

کانتی انظر الی ہریق ساقیہ صحابی فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی پنڈلیاں اس وقت جس خوبصورتی کے ساتھ چمک رہی تھیں گویا اب بھی وہ چمک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

نبی کریم ﷺ اس روز اونٹنی پر سوار تھے۔ پاؤں مبارک ازار سے کھلے ہوئے تھے۔ بریق کا لفظ برق سے ہے جو اگر نصرہ سے آئے تو لمعان اور چمکنے کے معنی میں مستعمل ہے اور سمع سے ہو تو پھر چمک کی وجہ سے آنکھیں چندھیا نے کو کہتے ہیں جس طرح عموماً سورج کی طرف دیکھنے سے ہوتا ہے۔

(۱) اس لئے مردوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنا ازار ٹخنوں سے اونچا رکھیں اور نصف ساق تک رکھنا مستحب ہے۔ علامہ مناویؒ نے لکھا ہے لیسن للرجل الی نصف ساقیہ ویجوز الی کعبیہ وما زاد حرم ان قصد الخیلا ولا کبرہ (مناوی شرح شمائل علی هامش جمع الوسائل ۱/۱۴۲) ولھی الفتاویٰ الہندیہ ینبغی ان یکون الازار فوق الکعبین الی نصف الساق وهذا فی حق الرجال واما النساء فیرغبن ازارهنّ اسفل من کعب یمسّ ظہر قدمھنّ. (مختار)

ارہا حبرة حمرة کا ضمہ اور فتحہ دونوں منقول ہیں لیکن ضمہ رائج ہے۔ یعنی میرا خیال ہے کہ یہ سرخ کپڑا جس کا ذکر ہو رہا ہے حمرة تھا۔

(۱۰) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ خَشْرَمٍ أَنَا عِيسَى بْنُ يُونُسَ عَنْ إِسْرَائِيلَ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ عَنْ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ مَا رَأَيْتُ أَحَدًا مِنَ النَّاسِ أَحْسَنَ فِي حِلَّةِ حُمْرَاءَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ إِنْ كَانَتْ جَمَعَتْهُ لَعَضْرِبٍ قَرِيبًا مِنْ مَنْكِبَيْهِ (۱)۔

ترجمہ: حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی کسی سرخ جوڑے والے کو نبی کریم ﷺ سے زیادہ حسین نہیں دیکھا آپ ﷺ کے بال آپ ﷺ کے مونڈھوں کے قریب پہنچ رہے تھے۔

فی حلة حمراء سرخ جوڑے کے ذکر کی وجہ سے یہ حدیث یہاں دوبارہ لائے۔ ورنہ یہ حدیث پہلے باب میں گزر چکی ہے۔

(۱۱) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ ثنا عبد الرحمن بن مهدي أنبأنا عبيد الله بن إيباد عن أبيه عن أبي رمة قال رأيت النبي ﷺ وعليه بردان أخضران (۲)۔

ترجمہ: حضرت ابو رومہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دو ہنر چادریں اوڑھے ہوئے دیکھا۔

رأيت النبي ﷺ الخ یہ حدیث اس سے قبل باب ماجاء فی خلق الرسول اللہ ﷺ میں بالتفصیل گزر چکی ہے۔

وعليه بردان أخضران بردان برد کا تثنیہ ہے جس کی جمع بردا آتی ہے۔ یہ لکیر دار کپڑا ہوتا

(۱) صحیح بخاری ۸۷۹/۲ کتاب اللباس باب الثوب الأحمر، سنن نسائی ج ۲ ص ۲۳۸ کتاب الزينة باب إتخاذ الشعر. (مختار)

(۲) ابوداؤد ج ۲ ص ۲۰۷، کتاب اللباس باب فی الخضرة، سنن نسائی ۱/۲۳۳ کتاب الصلوة والعیدین باب الزينة للخطبة العیدین. (مختار)

ہے۔ کبھی اس پر نقوش بھی ہوتے ہیں جبکہ بعض لوگوں کے خیال میں بردیہ چارخانہ دار کپڑا ہوتا ہے۔ لیکن یہاں پر اس کا رنگ سبز بتایا گیا ہے (۱)۔ آپ ﷺ کو سبز لباس بھی سفید لباس کی طرح پسند تھا کیونکہ اہل جنت کے کپڑوں کا رنگ ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ حبرہ ہو کیونکہ حبرہ بیش قیمت منقش لکیردار چادر کا نام ہے۔ رنگ کوئی بھی ہو۔

نبی کریم ﷺ کی چادریں: حضرت عروہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی وہ چادر جس میں آپ ﷺ وفود سے ملتے تھے چار ذراع لمبی اور دو ذراع اور ایک بالشت چوڑی تھی۔ آپ ﷺ وفات کے بعد دو چادریں چھوڑ گئے تھے۔

چونکہ نبی کریم ﷺ کو چادر پسند تھی اس لئے اموی اور عباسی خلفاء جمعوں اور عیدوں میں چادر کو بطور شعار استعمال کرتے تھے۔ بعض روایات کے مطابق یہ وہی چادریں تھیں جو نبی کریم ﷺ چھوڑ گئے تھے۔ چنانچہ علامہ ماوردیؒ کے مطابق حضرت ابان بن ثعلبؓ سے روایت ہے کہ حضرت کعب بن زبیرؓ نے اپنا مشہور قصیدہ ”بانت سعاد الخ“ نبی کریم ﷺ کو سنایا۔ تو جب اس شعر پر پہنچے

ان الرسول لسيف يستضاء به مهند من سيف الله مسلول

تو نبی کریم ﷺ نے ان کو ایک چادر مرحمت فرمائی۔

امراء بنی عباس و بنو امیہ کے پاس حضور اقدس ﷺ کی چادریں: حضرت معاویہؓ نے اپنی امارت کے زمانہ میں حضرت کعبؓ کو اس چادر کے لئے دس ہزار درہم کی پیش کش کی۔ تو حضرت کعبؓ نے جواب دیا کہ نبی کریم ﷺ کے کپڑے کے بارے میں میں اپنے سوا کسی دوسرے شخص کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ لیکن حضرت کعبؓ کی وفات کے بعد حضرت معاویہؓ نے وہ چادر بیس ہزار درہم دے کر خرید لی۔ یہ چادر بعض اقوال کے مطابق حضرت معاویہؓ کے کفن میں شامل کی گئی اور بعض اقوال کے مطابق بعد میں بنی امیہ کے زوال کے بعد لاپتہ ہو گئی۔

عباسی خلفاء کے پاس بھی نبی کریم ﷺ کی ایک چادر کا ذکر ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ چادر دراصل

(۲) ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے سبز سے مراد مکمل سبز نہیں بلکہ اس میں سبز رنگ کی دھاریاں تھیں (جمع الوسائل ۱۴۴۱ھ) (معارف)

نبی کریم ﷺ نے اہل ایلہ کو امان دیتے ہوئے بطور نشانی دی تھی۔ بعد میں والی ایلہ سعید بن خالد نے یہ چادر حاصل کر کے خلیفہ کے پاس بھیج دی۔

بہر حال عباسی خلفاء بھی امویوں کی طرح بڑے اہتمام سے نبی کریم ﷺ کی چادر کو اہم مواقع میں استعمال کرتے رہے۔ علامہ کرمائی لکھتے ہیں کہ یہ چادر سقوط بغداد کے بعد ہلاک کے ہاتھ لگی۔ اس نے اسے جلا کر اس کی راکھ دریائے دجلہ میں بہا دی۔

(۱۲) حدثنا عبد بن حمید أنا عفان بن مسلم قال أنبأنا عبد اللہ ابن حسان العنبری عن جلدتہ دحیبة و علیبة عن قیلۃ بنت مخرمۃ قالت رأیت النبی ﷺ و علیہ اسمال ملتین کانتا بز عفراں وقد نفضتہ و فی الحدیث قصۃ طویلۃ (۱)۔

ترجمہ: حضرت قیلۃ بنت مخرمۃ کہتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو اس حال میں دیکھا کہ آپ ﷺ پر دو پھٹی پرانی چادریں تھیں۔ جو زعفران میں رنگی ہوئی تھیں لیکن ان سے زعفران کا اثر جا چکا تھا۔ اور اس حدیث میں ایک طویل قصہ بھی ہے۔

قیلۃ اور دحیبة و علیبة کا تعارف: عن جلدتہ دحیبة و علیبة۔ دحیبة اور علیبة دونوں تصغیر کے صیغہ سے مروی ہیں۔ اس حدیث کی سند کے بیان میں مؤلف سے غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ کیونکہ دراصل علیبة دحیبة کا باپ ہے (۲)۔ جس کی دوسری بیٹی کا نام صفیہ ہے۔ دحیبة اور صفیہ کے والد علیبة بن حرملہ کی نانی کا نام قیلۃ بنت مخرمۃ ہے۔ علامہ بیجوری کہتے ہیں وہی جدۃ ابیہما لانہما امۃ الخ جو صحابیہ ہیں۔ حضرت قیلۃ نے اپنے نواسے علیبة کی ان دونوں بیٹیوں کی پرورش کی تھی۔ اور ان دونوں سے عبداللہ بن حسان روایت کرتے ہیں۔ ملا علی قاریؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ صفیہ اور دحیبة میں سے ایک عبداللہ کی داوی اور دوسری نانی ہے۔ امام ترمذیؒ نے جامع ترمذی میں اور امام ابوداؤدؒ نے مندرجہ بالا صحیح طریق سے (۱) ابوداؤد کصاب الخراج والامارۃ باب فی اقطاع الارضین، الادب المفرد للامام البخاری رقم حدیث ۱۷۸۱، (مختار)

(۲) علامہ مناویؒ نے علامہ سیوطی سے نقل کرتے ہوئے علیبة کو دحیبة اور صفیہ کی ماں بتایا ہے۔ مگر ملا علی قاریؒ نے مضبوط شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ یہ ان کے والد کا نام ہے۔ نیز علامہ بیجوریؒ نے بھی یہی تحریر کیا ہے۔ (اصلاح الدین)

اسی سند کو ذکر بھی کیا ہے۔ لہذا صحیح عبارت یوں ہونی چاہیے کہ ”عبد اللہ بن حسان العنبری عن جدتیہ دحیتہ و صفیہ بنتا علیہ عن قیلۃ بنت مخرمۃ الخ“

قیلۃ بنت مخرمۃ الخ یہ صحابیہ ہیں بعض نے عزیر، بعض نے عنبر یہ اور بعض لوگوں نے تمیم یہ کہا ہے امام بخاریؒ اور امام ابو داؤدؒ نے بھی امام ترمذیؒ کی طرح ان کی روایت کو نقل کیا ہے۔

وعلیہ اسمال ملتین اسمال سمل (۱) کی جمع ہے پرانے کپڑے یعنی چھیتڑے کو کہتے ہیں۔

یہ صفت ہے اس کے جمع سے مفرد بھی موصوف ہو سکتا ہے اور جمع بھی۔ ثوب اسمال بھی کہتے ہیں۔

ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ اس وقت یہ جمع کے وزن پر مفرد کا صیغہ ہوتا ہے اور اثواب اسمال بھی کہا جاتا ہے۔

ملاءۃ کا مطلب: ملتین ملاءۃ کی تصغیر ملیۃ کا حثنیہ ہے۔ ملاءۃ وہ کپڑا ہے جس کے حصوں کو دھاگے کے

ذریعے سیا نہ گیا ہو۔ بلکہ ایک ہی تانے کا بنا ہوتا ہے۔ جو چادر درمیان میں سلی ہوتی ہے وہ ملاءۃ کی تعریف

میں داخل نہیں ہوگی۔ تو ملاءۃ کھدر قسم کی موٹی اور بڑی چادر کو کہتے ہیں۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ ملاء سے

ہے جو بھرنے کے معنی میں ہے۔ یہ فراخ چادر سر سے پاؤں تک بدن کو ڈھانپ لیتی ہے اس لئے اسے ملاءۃ

کہتے ہیں۔ یہاں پر اسمال کی اضافت حثنیہ کی طرف ہوئی ہے جو اضافۃ الصفۃ الی الموصوف کے قبیل سے

ہے۔ یعنی یہ ملتین تھے جو کہ اسمال یعنی پٹے پرانے چھیتڑے تھے۔ اور چونکہ جمع سے مافوق الواحد بھی مراد

ہو سکتا ہے۔ لہذا حثنیہ کی صفت اسمال سے صحیح ہوگی۔ یا پھر حثنیہ کو اس لئے جمع سے موصوف کیا گیا ہے کہ

دونوں کپڑوں میں سے ہر ایک مختلف اجزاء پر مشتمل تھا۔ اس اعتبار سے ان میں تکرر آیا ہے۔ نیز یہ احتمال بھی

ہے کہ یہ اضافت بیانی ہو یعنی وہ اسمال ملتین تھے۔ بہر حال حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ آپ ﷺ دو لمبی

چوڑی پرانی چادریں اوڑھے ہوئے تھے جو بوسیدہ اور پٹے پرانی تھیں۔

زعفرانی لباس: بز عفوان عبارت میں تقدیر ہے یعنی کانتا مصبو غتین بز عفوان۔ مطلب یہ

(۱) سمل کا لفظ صاحب منجد نے صرف ہم کے کسرہ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ جبکہ اس کا ایک ہم معنی لفظ سملۃ بھی منجد میں ذکر

ہے جو میم مفتوحہ اور آخر میں تاء کے ساتھ ہے۔ لیکن سمل کا فتح بھی منقول ہے۔ ثمال ترمذی کے شرح نے تصریح کی ہے کہ

الاسمال جمع سمل ہے۔ صاحب مقامات حریری تیرویٰ مقامہ میں لکھتے ہیں اخذ وقف بنا شخص علیہ سمل و فی

مشیتہ قول (اصلاح الدین)

ہے کہ دونوں کپڑے زعفران سے رنگے ہوئے تھے (۱)۔ قد نفضتہ الخ۔ فاعل کا ضمیر اسماں کوراج ہے۔ اور بعض روایات میں نفقتا حثنیہ کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ پھر فاعل کا ضمیر ملتصق کوراج ہوگا۔ جس کپڑے پر زعفران لگا ہوا ہو۔ ایسے حر عفر کپڑے سے چونکہ نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ اس لئے اس توہم کو دفع کرنے کے لئے کہ نبی کریم ﷺ نے حر عفر کپڑا کیسے استعمال فرمایا؟ قلیلہ نے یہ کہا کہ زعفران کا بہت تھوڑا اثر باقی تھا۔ دھونے سے اس کا غالب اثر چلا گیا ہے اور رنگ پھیکا پڑ چکا تھا (۲)۔

لباس فاخرہ کا استعمال: لباس فاخرہ کے استعمال میں ضابطہ یہ ہے کہ اگر تکبر اور غرور کا اندیشہ ہو تو استعمال ناجائز ہے ورنہ جائز ہے۔ بلکہ تحدیثِ نعمت کے طور پر لباس فاخرہ کا استعمال مستحب ہوگا۔ خود نبی ﷺ کو ایک بار ایک جوڑا ہدیہ کیا گیا جو کہ تینتیس اونٹوں یا اونٹنیوں کے عوض خریدا گیا تھا۔ آپ ﷺ نے بہن کر اسے زینت بخشی۔

نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جو پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ آپ ﷺ نے اس سے دریافت فرمایا کہ کیا اس کے پاس کوئی مال ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کس قسم کا مال ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی دولت میں اونٹ اور بھیڑ بکریاں ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ فلیبر النعمة اللہ علیک و کرامتہ (۳)۔ یعنی پس اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام کا اثر تم پر نظر آنا چاہیے۔

لیکن یہ تب جائز ہوگا کہ ترقہ اور خود پسندی سے خالی ہو۔ خود آپ ﷺ نے بالخصوص کسی خاص نوعیت کے کپڑوں کے استعمال پر اصرار نہیں کیا۔ نہ استعمال میں تکلفات سے کام لیا۔ بلکہ حسب ضرورت آپ ﷺ نے مختلف قسم کا لباس استعمال و پسند فرمایا۔ از اور رداء عمومی لباس تھا۔ لیکن قمیص کا استعمال بھی

(۱) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کانتلبز عفران ای مصبوغین بہ او اما قول الحنفی ای مخلوطین فقیہ تسماع لا یخفی (جمع الوسائل ۱/۱۲۵) (مختار)

(۲) اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے یہ زعفرانی رنگ کا کپڑا نبی سے قبل استعمال کیا ہو ویدل علیہ مافی القصة الطویلة الهاکانت فی اول الاسلام (جمع الوسائل ۱/۵۶) (مختار)

(۳) المواہب اللدنیہ ص ۷۵

مذکور ہے۔ پاجامہ کا اگر چہ آپ ﷺ سے استعمال تو ثابت نہیں لیکن آپ ﷺ کے ترکہ میں پایا گیا تھا۔ (۱)
 پھر قیمت کے لحاظ سے خوش پوشی کوئی عیب نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ آپ ﷺ نے اغنیاء کو اس کی ترغیب دی ہے۔ اور اسی وجہ سے بعض ائمہ کرام اور بزرگوں نے اسی جہت کو اختیار کر کے نبی کریم ﷺ کے مرغوب لباس کا استعمال کیا ہے اور بلا ضرورت رہبانیت اور تصنع کو ناپسند فرمایا ہے۔
لباس اور اکابر کا طرز عمل: حضرت شاذلیؒ بھی انہی بزرگوں میں سے ہیں ایک دفعہ ایک شخص نے آپؒ کی خوش پوشی کو ناپسندیدہ کہا۔ تو آپؒ نے فرمایا کہ یا ہذا ہیئتہ ہذہ تقول الحمد للہ ہیئتک ہذہ تقول اعطونی۔ ارے بھائی! میرا لباس زبان حال سے خدا کا شکر ادا کر رہا ہے اور تیرا لباس زبان حال سے تیری گداگری کی ترجمانی کر رہا ہے۔

بہر حال لباس اپنی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔ لیکن صوفیاء کرام اور اہل اللہ کا عمومی شیوہ یہی ہے کہ وہ اس سلسلے میں ترفہ اور عیاشی سے دور رہتے تھے۔ طلبہ کو بھی زیادہ تکلفات سے دور رہنا چاہیے۔
 حضرت علامہ گنگوہیؒ ایک بار بیت اللہ کے طواف میں مصروف تھے۔ دیکھا کہ ایک اندھا شخص مطاف میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اندھا ہونے کے باوجود جب علامہ گنگوہیؒ پاس سے گزرتے تو وہ سمجھ لیتے کہ حضرت گزر رہے ہیں۔ شاید کوئی اللہ تعالیٰ کے ولی تھے۔ فرماتے ہیں کہ ایک بار جب علامہ گنگوہیؒ پاس سے گزرے، تو انہوں نے کہا کہ البس لباس الصالحین نیک لوگوں کا لباس پہنا کرو۔ دوسری بار جب آپ ان کے پاس گزرے، تو اس شخص نے پھر یہی کہا۔ تیسری بار بھی یہی کہا۔ تو حضرت گنگوہیؒ نے پوچھا کہ صالحین کا لباس کیسے ہوتا ہے؟ اس نے کہا خشن خشن یعنی کھر در کھر در۔ بہر حال طلبہ کو بھی اپنے آپ کو بدھٹیوں کی طرح قبر نہیں بنانی چاہیے۔ جو کہ ریشمی رومالوں اور متش چادروں سے ڈھکی ہوئی ہوتی ہے۔ ابھی سے محنت اور جفاکشی کی عادت ڈالنی چاہیے۔ بعد میں یہ کام آئے گی۔

نبی کریم ﷺ کی ہیئت: وفي الحديث قصة چونکہ اس قصہ کا تعلق لباس سے نہ تھا۔ اس لئے اسے یہاں ذکر نہیں کیا۔

طبرانی میں تھیلاً وہ قصہ مذکور ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس آیا سلام عرض کیا۔ آپ ﷺ نے جواب دیا۔ قصہ کی روایت کرنے والی حضرت قیلہ بنت خرمہ ثمراتی ہیں کہ اس وقت آپ ﷺ دو پٹری پرانی چادروں میں ملبوس تھے۔ ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی جو پتوں سے خالی تھی۔ نبی کریم ﷺ اکڑوں بیٹھے تھے۔ فرماتی ہیں کہ میں نے جب نبی کریم ﷺ کو اس حالت میں دیکھا (اور سوچا کہ اللہ تعالیٰ کے عظیم پیغمبر اور اتنی تواضع کہ فناءیت طاری ہے۔ مسکنت کا لباس، مسکینوں جیسی نشست، غریبوں جیسی ہیئت جبکہ اللہ تعالیٰ کے بعد کوئی عظمت میں آپ ﷺ کے ہمسر نہیں) تو رعب اور خوف کی وجہ سے مجھ پر عرش چھا گیا۔ نبی کریم ﷺ کے ایک ہمنشین نے آپ ﷺ سے کہا۔ کہ اس بیچاری کو تو آپ ﷺ نے خوفزدہ کر دیا۔ آپ ﷺ نے میری طرف دیکھا اور فرمایا علیک السکینۃ یعنی اطمینان اور قرار پاؤ۔ اس کے بعد جوہیت اور رعب مجھ پر چھائی ہوئی تھی ختم ہو گئی۔

(۱۳) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ ثَنَا بَشْرُ بْنُ الْمُفَضَّلِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ ابْنِ

عُثْمَانَ بْنِ خَثِيمٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ جَبْرِ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ

اللَّهِ ﷺ عَلَيْكُمْ بِالْبَيَاضِ مِنَ الثِّيَابِ لِيَلْبَسَهَا أَحْيَاءُكُمْ وَتُغْفَرُوا فِيهَا

مَوْتَاكُمْ فَانْهَازَ مِنْ خِيَارِ ثِيَابِكُمْ (۱)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سفید

کپڑوں کو اختیار کرو۔ تمہارے زعموں کو سفید کپڑے پہننا چاہیے اور سفید کپڑوں ہی

میں مردوں کو دفن کرنا چاہیے۔ کیونکہ سفید کپڑے تمہارے بہتر لباسوں میں سے ہیں۔

عَلَيْكُمْ بِالْبَيَاضِ مِنَ الثِّيَابِ الخ اس حدیث میں سفید کپڑے پہننے کا حکم دیا گیا ہے۔ جس کی

وجہ خود نبی کریم ﷺ نے اگلی حدیث میں بیان فرمائی ہے۔ دوسرے مقامات میں نبی کریم ﷺ سے زرد،

سیاہ، سرخ اور بزرنگ کے کپڑوں کا استعمال بھی منقول ہے۔ لیکن وہ نبی کریم ﷺ کا عمل ہے جبکہ سفید لباس

کے بارے میں آپ ﷺ کی طرف سے حکم ہے۔ اور ضابطہ یہ ہے کہ قولی حدیث فعلی حدیث نبی ﷺ پر راجع

(۱) سنن ابن ماجہ ص ۱۰۶ کتاب الجنائز باب ماجاء فیما یستحب من الکفن، جامع ترمذی

۱/۳۱۹ کتاب الجنائز باب ما یستحب من الاکفان، ابوداؤد کتاب اللباس باب فی البیاض (بخاری)

ہوتی ہے کیونکہ عمل کی اطلاع صحابہ کا بیان ہوتا ہے جس میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ خصوصیت یا بعض حالات اور اوقات کے ساتھ خصوصیت کا احتمال ہوتا ہے۔ جبکہ قول امت کے لئے ہدایت ہوتی ہے۔ پھر بخاری شریف میں یہ تصریح (۱) بھی آتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سفید بالوں کو بھی زینت بخشی ہے۔ لہذا عمل کے مقابلے میں عمل بھی مروی ہے۔ بہر حال سفید لباس کی ترجیح میں شک نہیں (۲) اور یہاں اسی ترجیح کو مد نظر رکھ کر اس حدیث کو باب میں جگہ دی گئی ہے۔ ورنہ اس میں نبی کریم ﷺ کے پہننے کا ذکر نہیں۔

(۱۲) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا سَلَمَةَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ

عَنْ حَبِيبِ بْنِ أَبِي ثَابِتٍ عَنْ مَيْمُونِ بْنِ أَبِي شَيْبَةَ عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جَنْدَبٍ

قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْبَسُوا الْبَيَاضَ فَإِنَّهَا أَطْهَرُ وَأَطْيَبُ وَكُفُّوا

فِيهَا مَوْتَاكُمْ (۳)

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندب فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سفید

کپڑے پہنا کرو۔ اس لئے کہ وہ زیادہ پاک صاف رہتے ہیں اور اسی میں اپنے

مردوں کو کفن دیا کرو۔

سفید لباس کی افضلیت کی وجہ: فَإِنَّهَا أَطْهَرُ وَأَطْيَبُ الخ یہ دراصل سفید کپڑوں کی ترجیح کی

علت ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ انسان پاک اور صاف کپڑے پہنے۔ اس لحاظ سے سفید رنگ بہت زیادہ مفید

ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ سفید کپڑے پر دوسرے کپڑوں کی نسبت نجاست جلد ظاہر ہوتی ہے۔ رنگدار کپڑے

پر نجاست کا پتہ نہیں چلتا۔ اس لئے سفید کپڑا زیادہ صاف رکھا جائے گا۔ دوسری بات یہ کہ دھوئے وقت

سفید کپڑے کو خوب محنت کے ساتھ دھویا جاتا ہے تاکہ اچھی طرح صاف ہو۔ جبکہ رنگدار کپڑے کو جلد صاف

(۱) عن ابی ذرٍّ قال قمت النبی ﷺ وعلیہ ثوب بیض وھونقم الحلیث (بخاری ج ۲ ص ۸۶۶ کتاب

اللباس باب الثیاب البیض) (مختار)

(۲) سلمیٰ علامہ عبد الجبار دہلوی فرماتے ہیں فی هذا الحلیث یرغب فیما محمد ﷺ فی البیاض ویرجیہ لنا فی الحیاة و

بعلا الممات والعلیل کما جاء فی الحلیث الآتی (الاحتفاظ ص ۱۱۱) (مختار)

(۳) ابن ماجہ ص ۲۵۵ کتاب اللباس باب البیاض من الثیاب، جامع ترمذی ج ۲ ص ۵۶۹ کتاب

الادب باب ماجاء فی لبس البیاض، (مختار)

ہونے کی وجہ سے یارنگ کے جانے کی خوف سے کم دھویا جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ زیادہ دھونے سے نجاست کا ازالہ بھی خوب ہوگا۔ اس لئے سفید کپڑے کو اظہر کہا۔ اور اطمیب اس لئے فرمایا کہ یہ اچھا رنگ ہے اور اطمینان قلب میں بہت عمدہ ہے۔

سیاہ لباس:

(۱۵) حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مَنِيعٍ أَنبَأَنَا يَحْيَى بْنُ زَكَرِيَّا بْنُ أَبِي زَائِدَةَ أَنَا

أَبِي عَنْ مَصْعَبِ بْنِ شَيْبَةَ عَنْ صَفِيَّةَ بِنْتِ شَيْبَةَ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ خَرَجَ

رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ذَاتَ غَدَاةٍ وَعَلَيْهِ مِرْطٌ مِنْ شَعْرٍ أَسْوَدَ (۱)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ صبح کو مکان سے باہر

تشریف لائے تو آپ ﷺ کے بدن پر سیاہ بالوں کی چادر تھی۔

حضرت صفیہ بنت شیبہ یہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتی ہیں۔ بعض لوگ انکی صحابیت

کے منکر ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ صحابیہ ہیں۔ امام بخاریؒ نے تصریح کی ہے کہ نبی کریم ﷺ سے ان کا سماع

بھی ثابت ہے۔ وعلیہ مِرْطٌ مِنْ شَعْرٍ أَسْوَدَ الخ مِرْطٌ اون، ریشم یا بکری کے بالوں سے بنے ہوئے

کمبل کو کہا جاتا ہے۔ سردی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ عموماً ازار کے طور پر مستعمل ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ

نے بھی کبھی کبھی اس سے لٹکی باغی تھی۔ اس میں تکلف و ترفہ نہیں ہوتا بلکہ درحقیقت جفاکشوں کا کپڑا ہے۔

اسود مِرْطٌ کی صفت ہے اور شعر کی صفت بھی ہو سکتی ہے لیکن پھر دال مفتوح پڑھا جائے گا۔ اس حدیث میں

ایک اور رنگ یعنی سیاہ کپڑے کے استعمال کی خبر دی گئی ہے۔ مسلم اور ابوداؤد (۲) کی روایات کے مطابق اس

چادر میں کچھ دوسرے رنگ بھی تھے لیکن چونکہ سیاہ رنگ غالب تھا۔ اسلئے یہاں صرف سیاہ رنگ کا ذکر ہے۔

(۱) صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۰۲ کتاب اللباس والزینۃ باب التواضع فی اللباس الخ، ابوداؤد ج ۲

ص ۲۰۳ کتاب اللباس باب فی لبس الصوف والشعر، ج ۲ ص ۵۷۰ جامع ترمذی کتاب الادب

باب ماجاء فی الثوب الأسود (مختار)

(۲) عن عائشةؓ قالت خرج النبی ذَاتَ غَدَاةٍ وَعَلَيْهِ مِرْطٌ مِنْ شَعْرٍ أَسْوَدَ (ابوداؤد ص ۲۰۳)

کتاب اللباس باب فی لبس الصوف والشعر مسلم ج ۲ کتاب اللباس باب التواضع فی اللباس

(مختار)

(۱۶) حَدَّثَنَا يَوْسُفُ بْنُ عِيسَى، أَنَا وَكَيْعُ بْنُ يُونُسَ، أَنَّ أَبِي إِسْحَاقَ
عَنْ أَبِيهِ عَنْ الشَّعْبِيِّ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الْمَغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ
النَّبِيَّ ﷺ لَبَسَ جُبَّةً رُومِيَّةً ضَيِّقَةَ الْكُمَيْنِ (۱).

ترجمہ: حضرت مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک رومی جبہ زیب
تن فرمایا تھا جس کی آستینیں تنگ تھیں۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ: عن ابیہ عروہ کے باپ مغیرہ بن شعبہ مشہور ثقفی صحابی ہیں۔ نبی کریم
ﷺ کے خدام میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ جنگ خندق کے سال اسلام لائے اور ہجرت کر کے مدینہ آئے۔ بعد
میں کوفہ میں رہائش اختیار کی۔ اور امیر معاویہ کی طرف سے کوفہ کے امیر بھی ہوئے۔ تہذیب میں لکھا ہے کہ
”قیل انه احسن ثلث مائة امرأة فی الاسلام“ ۵۰ھ کو ستر سال کی عمر میں کوفہ ہی میں وفات پائی۔

جبہ، رومی، یا شامی: جبہ رومیہ بعض روایات میں شامی جبہ کا ذکر آیا ہے۔ اب ہو سکتا ہے کہ یہ دو
مواقع ہوں۔ ایک موقع پر رومی اور دوسرے موقع پر شامی جبہ پہنے ہوئے ہوں۔

لیکن غالب خیال یہ ہے کہ یہ ایک ہی واقعہ کی حکایت ہے۔ اور ایک ہی جبہ کو شامی اور رومی کہا گیا ہے۔ اس
کی توجیہ یہ ہے کہ یہ شامی جبہ تھا لیکن اس پر رومی کا اطلاق بھی جائز ہے۔ کیونکہ شام روم کا حصہ تھا۔ اس
وقت کے نوآبادیاتی نظام میں شام پر رومیہ الکبریٰ کا تسلط تھا جس کی حکومت بہت وسیع تھی۔ یہی وجہ تھی کہ
عراق کی جنگ میں شکست کو بھی رومیوں کی شکست تعبیر کیا گیا اور ”الم غلبت الروم“ نازل ہوئی۔ یہ
بالکل اس طرح جیسے ہندوستان کو کبھی برطانوی علاقہ یا رومی تسلط کے بعد افغانستان کو روسی علاقہ کہا جاتا تھا۔
کفار کی مصنوعات کا استعمال: اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کفار

کی مصنوعات استعمال کی ہیں۔ لہذا کفار کی مصنوعات کا استعمال جائز ہوگا (۲)۔ ان کے توپ، مشین اور دیگر

(۱) صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۰۲، جامع ترمذی ص ۲۳۹ کتاب اللباس باب ماجاء فی لبس الجبة
والخفين، ابوداؤد ج ۲ ص ۲۰۳ (مختار)

(۲) ملا علی قاری نے لکھا ہے ومن فوائد الحديث الانتفاع بشباب الكفر حتى يتحقق نجاتها لأنه ﷺ
لبس الجبة الرومية ولم يتفصل (جمع الوسائل ۱/ ۱۵۱) (مختار)

اسلحہ کا استعمال بھی جائز ہیں۔ ان کے بنائے ہوئے کپڑے طہارت کی تحقیق کے بغیر بھی پہننا جائز ہیں۔ جبکہ ان کی نجاست کی یقینی دلیل یا غالب امکان نہ ہو۔ کئی بار نبی کریم ﷺ نے کفار کا بنایا ہوا کپڑا بطور تحفہ قبول کیا ہے اور اسی موقع پر پہنا بھی ہے۔

ہاں وہ لمبوسات جو کافر استعمال کر کے پھینک دیں۔ اور ہمارے ہاں لنڈا بازاروں میں فروخت ہوتے ہیں۔ انہیں استعمال سے قبل دھونا ضروری ہے۔ کیونکہ غالب خیال یہ ہے کہ ان پر نجاست مثلاً شراب وغیرہ گری ہوگی۔ اور ان کی تطہیر کا خاطر خواہ انتظام بھی نہیں ہوتا۔ ضیفۃ الکمین نبی کریم ﷺ عموماً کھلے آستیوں والا کپڑا پہنتے۔ تاکہ وضوء اور دوسرے کاموں کیلئے آستین آسانی کے ساتھ چڑھائے جاسکیں۔ اور اسباغ الوضوء میں فرق نہ آئے۔ اب بھی اگر تک آستیوں کا کپڑا وضوء کے لئے رکاوٹ ہو۔ تو نہیں پہننا چاہیے۔ اور اگر وضوء کی تکمیل میں رکاوٹ نہیں تو حرج نہیں۔ بعض ائمہ حدیث (۱) کا خیال ہے کہ یہ غزوہ تبوک کا موقع ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے شامی جبہ پہنا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ سفر کے دوران تک آستیوں والے کپڑے پہننے میں سہولت ہوتی ہے۔ مجاہد لوگ ویسے بھی ہلکے پھلکے اور تک لباس استعمال کرتے ہیں جس میں تک و دو آسان ہو۔ فوجیوں کیلئے مخصوص وردی بھی اسی لئے بناتے ہیں۔ لہذا آپ ﷺ نے یہ جبہ جنگی مصالح کے تحت پہنا تھا۔ جبکہ اقامت کے دوران کھلے آستیوں کا کپڑا آپ ﷺ کو پسند تھا۔ اور صحابہ کرام کی آستینیں بھی کھلی ہوتی تھیں۔

(۱) ابوداؤد اور امام احمد نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔ جمع الوسائل (اصلاح الدین)

۹۔ باب ماجاء فی عیش النبی ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے گزراوقات کا بیان

عربی میں عیش زندگی گزارنے کو کہتے ہیں۔ یہ عاشِ عیش معیشۃ کا مصدر بھی ہے۔ اور عیش سے ”ما یعاش بہ الرجل“ کا معنی بھی لیا جاتا ہے۔ یعنی زندگی کے وہ لوازم جو زندگی کی بقا کیلئے ضروری ہیں۔ اور روٹی، کپڑا، مکان جیسی بنیادی ضروریات جن پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے۔ ہم جسے گزارہ اور گزراوقات کہتے ہیں عیش کہلاتا ہے۔ تو اس باب میں نبی کریم ﷺ کے گزارے کا بیان ہے۔ یعنی کہ آپ ﷺ کو وقت گزارنے کی چیزیں میسر تھیں یا نہ تھیں۔ پھر عیش کیلئے بالکل بنیادی چیز کھانا ہے کیونکہ اسی پر بدن کا قوام اور دارومدار ہے۔ تو اب اس بات کا بیان ہو گا کہ آپ ﷺ کی روٹی سالن وغیرہ کی کیفیت کیا تھی۔ عیش اڑاتے تھے، یا محض قوت لایموت پر گزارا تھا؟ بہر حال یہاں عیش کو کھانے سے خاص کیا گیا ہے۔ آج کل عرب ملکوں میں روٹی طلب کی جاتی ہے تو کہتے ہیں اعطنی عیش کذا۔ (اتنی روٹی دے دو)

تکرار باب عیش کی وجہ: یہاں ایک سوال اٹھتا ہے کہ یہ باب امام ترمذیؒ بعد میں تفصیل سے لا رہے ہیں۔ تو اس تکرار کی کیا ضرورت تھی۔ وہاں بھی اسی فقرہ وقافہ اور جفا کشی کا بیان مقصود ہے۔ اس کے جواب میں بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ گزشتہ زمانہ تصنیف میں ترتیب ابواب کا اتنا اہتمام نہ تھا۔ تکرار سے احتراز کوئی اہم بات نہ تھی لیکن یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ اسلاف نے اتنی نظم و ضبط، دقیقہ سنجی اور جامعیت کے ساتھ کتابیں لکھی ہیں۔ کہ وہ آج کل کے مصنفین کے لئے چیلنج ہیں۔ لہذا اس مقام پر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام ترمذیؒ نے یہ باب دو جگہ سہو اور ج کیا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ بہتر جواب یہ ہے کہ امام ترمذیؒ نے قصداً ایسا کیا ہے جس میں دراصل اس بات کو اشارہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا اس قسم کا گزارہ اور تنگ و ترش زندگی اختیاری اور دائمی تھی۔ اضطراری نہ تھی تاکہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ نبی کریم ﷺ کو دولت ملتی نہ تھی، اور غربت و تنگدستی کی وجہ سے قوت لایموت پر اضطرار گزارہ کرتے تھے۔ پھر جب مدینہ میں خوشحالی

آئی تو پر تکلف زندگی اپنائی ہوگی۔ تو امام ترمذیؒ اس وہم کا دفعیہ کرتے ہوئے اس بات پر سمجیہ کرنے کیلئے دو باب لائے ہیں۔ کہ آپ ﷺ کی زندگی کی ابتداء اور انتہاء ایک جیسی ہے۔ مکہ میں ہو یا مدینہ میں یہ فاقہ کشی اور زہد و قناعت زندگی کے تمام ادوار پر محیط ہے۔

ملا علی قاریؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس باب میں نبی کریم ﷺ کی اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کی زندگی کے حالات بیان کرنا مقصود ہوں۔ اور آگے جو طویل باب آرہا ہے اس میں نبی کریم ﷺ اور اس کے اہل خانہ کا خصوصی ذکر کرنا مقصود ہو۔ گویا پہلے اس دور کی عمومی غربت بیان ہوئی اور آخر میں خود نبی کریم ﷺ کے زہد و قناعت سے اجتناب کا ذکر ہے۔

جبکہ علامہ بیجوریؒ نے دونوں بابوں میں فرق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دراصل یہاں پر نبی کریم ﷺ کی زندگی کی کیفیت سنگی اور کفاف پر اکتفاء کا بیان مد نظر ہے۔ جبکہ آگے جو باب آرہا ہے اس میں بنیادی طور پر ماکولات و مشروبات کا ذکر ہے جو کہ ناکافی اور غیر معیاری ہونے کے باعث آپ ﷺ کے زہد و فقر اور ترقہ اور تعیش سے اجتناب کو اجاگر کرتی ہیں۔ مگر اس اعتراض کے باوجود ایک ہی عنوان اور تقریباً ایک ہی مقصد کے حامل ہونے کی وجہ سے دونوں بابوں کو الگ الگ لانے کو انہوں نے نامناسب خیال کیا ہے۔

(۱) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ ثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ عَنْ أَيُّوبَ عَنْ مُحَمَّدٍ

ابن سيرين قال كنا عند أبي هريرة و عليه ثوبان ممشقان من كتان

فيعمخطان في أحدهما فقال بخ بخ يتمخطن أبو هريرة في الكتان لقد

رأيتني وأنتي لا أحر فيما بين منبر رسول الله ﷺ و حجرة عائشة

مغشياً علي فيجني الجاني فيضع رجله علي عنقي يؤي أن بهي جنونا و

ما بهي جنون و ما هو إلا الجوع (۱)۔

ترجمہ: ابن سیرینؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس تھے وہ

کتان کی دو چادروں میں ملبوس تھے جو مشق سے رنگی ہوئی تھیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے

(۱) صحیح بخاری ۲/۸۹ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة باب ما ذکر النبی ﷺ و وحض علی انفاق

اہل العلم، جامع ترمذی ۲/۶۱ کتاب الزہد باب ماجاء فی معیشتہ اصحاب النبی ﷺ (مختار)

ان میں سے ایک سے ناک صاف کیا۔ پھر تعجب کے ساتھ فرمایا کہ واہ واہ۔ ابو ہریرہ کمان کے کپڑے سے ناک صاف کرتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں منبر نبوی ﷺ اور حضرت عائشہ کے حجرے کے درمیان بے ہوش ہو کر گر پڑتا۔ پھر کوئی آتا اور مجھے مجنون سمجھ کر میری گردن پر علاج کی نیت سے اپنا پاؤں رکھ دیتا تھا۔ حالانکہ مجھے جنون وغیرہ کچھ نہیں ہوتا تھا۔ یہ حالت تو صرف بھوک کی شدت کے سبب ہو جاتی تھی۔

وعلیہ لبان ممشقان من کمان۔ یعنی مشق سے رنگی ہوئی دو چادریں آپ پہنے ہوئے تھے۔ مشق: مشق ایک خاص قسم کی سرخ خوشبودار مٹی ہے۔ جسے طین احمر بھی کہتے ہیں۔ کپڑے کو اس سے رنگ دیا جاتا ہے تو وہ خوشبودار ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے سرخ کپڑے کو مُشَق کہتے ہیں۔ آج کل بھی بعض خوشبودار صابنوں میں اس مٹی کی اقسام کو شامل کیا جاتا ہے۔ صاحب صحاح کی تحقیق کے مطابق پٹ سن کی قسم کا ایک پودا ہے جسے اردو میں اسی کہتے ہیں۔ اس کی چھال کی تاروں سے بنا ہوا پردہ بہت باریک اور ملائم ہوتا ہے۔ اور اس سے جو کپڑے بنتے ہیں اسے کمان کہتے ہیں۔ یہ اس عہد کا بیش قیمت کپڑا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ مشق بھی تھا۔ ابو ہریرہ ایسے کپڑے سے ناک صاف کرتے ہیں۔ اور تعجب و حیرت کے انداز سے اظہار تشکر کرتے۔ تنگی کا زمانہ یاد کرتے ہیں۔

ابو ہریرہ اور سرخ کپڑے کا استعمال: اب یہ بات کہ یہ تو سرخ کپڑا ہے جس کا استعمال ممنوع ہے اور یہ کہنا بھی درست نہ ہوگا کہ یہ تحریم سے پہلے کی بات ہے۔ کیونکہ یہ وفات النبی ﷺ کے بعد کی بات ہے۔ اس کا جواب یا تو یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے محض بیان جواز کے لئے یہ کپڑا پہنا ہوگا۔ تاکہ اس بات پر تنبیہ ہو کہ اس کا استعمال ناجائز نہیں۔ ملا علی قاریؒ نے بھی اس سلسلے میں جتنے اقوال لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک قول اباحت کا بھی ہے۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ رنگدار اور معطر و منقش کپڑا اس وقت استعمال کرنا ناجائز ہے جب انسان میں غرور اور تنہتر پیدا کرنے کا سبب بنے۔ اور اگر یہ خطرہ نہ ہو تو تحریم بھی نہیں ہوگی۔ اور ابو ہریرہ کے ہاں تکبر کہاں۔ جبکہ بعض حضرات نے اس اعتراض کا ایک اور دقیق جواب دیا ہے۔ وہ یہ کہ یہ چادر مشق کے ساتھ رنگی گئی تھی۔ جو سرخ مٹی ہے اور شیطان لعین کو مٹی سے سخت نفرت ہے۔ انسان کو سجدہ نہ

کرنے کے لئے تو یہی عذر اس نے بیان کیا تھا کہ خلقتی من نار و خلقتہ من طین۔ بہر حال شیطان کو مٹی سے فطری دشمنی ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ رنگے ہوئے کپڑے کے استعمال سے خوش ہونا تو کجا وہ دور بھاگتا ہے جبکہ سرخ رنگ سے ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اس سے شیطان خوش ہوتا ہے۔ اور پھر مٹی سے رنگدار ہونے کے سبب تکبر سے بھی بعید ہے۔

بخاری: باء مفتوحہ اور خاء ساکنہ کے ساتھ عموماً استعمال ہوتا ہے۔ دوسری لغتیں بھی اس میں ہیں۔ کسی بات پر راضی اور خوش ہو کر کسی امر کی تعظیم کے موقع پر یہ کلمہ بولا جاتا ہے۔

ابو ہریرہؓ پرانے وقتوں کو بھلاتا نہیں۔ اور بھلانا مناسب بھی نہیں۔ ہمارے بزرگوں نے طالب علمی میں کتنی تکلیفوں میں وقت گزارا ہے۔ نہ چھت نہ پگھلا، درختوں کے نیچے وقت گزارتے۔ طلبہ گھر گھر روٹی مانگنے جاتے۔ اگر آج ہم اپنی حالت کا ان حالات سے موازنہ کریں تو ہم کتنی عیش و عشرت کی زندگی گزارتے ہیں۔ برکتیں دراصل ان کی زندگی میں تھیں۔ جنہوں نے ان تکالیف و شدائد میں علم حاصل کیا ہے وہی حقیقی علماء تھے۔ ہمیں تو آج اپنی حالت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

ابو ہریرہؓ بھی شکر اور تحذیر بالنعمة کے طور پر خود سے کہتے ہیں۔ کہ واہ واہ اب تو مزے ہیں۔ پہلے کھانے کو کچھ نہ ملتا تھا اور آج بیش قیمت کپڑے سے ناک صاف کرتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آپ ایک علاقے کے گورنر تھے۔

إِنِّي لَا أَخْرُجُ الْخَافِضَ خَوْفَ يَخْوِ بَابِ ضَرْبٍ سَے گرنے کے معنی میں آتا ہے یعنی میں حضرت عائشہؓ کے حجرے اور منبر رسول ﷺ کے درمیان بے ہوش ہو کر گر جاتا۔ اسی جگہ کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا ”مابين قبوري ومنبري روضة من رياض الجنة“ (۱) بعض روایات میں منبر کی بجائے حضرت ام سلمہؓ کا حجرہ مذکور ہے۔ یعنی حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کے حجروں کے درمیان میں گر جاتا تھا۔ لیکن یہ کوئی تعارض نہیں کیونکہ مذکورہ دونوں چھوٹے چھوٹے حجرے قریب قریب تھے۔ اور دونوں کے دروازے مسجد کی جانب کھلتے تھے۔ تو یہ تقریباً ایک ہی جگہ کا نام ہے۔ یا پھر جواب یہ ہے کہ یہ دو

(۱) بخاری جلد ۱ ص ۱۵۹ باب فضل مابين القبور والمنبر، ۲۵۳ باب بلاخرجمة (مختار)

الگ الگ واقعوں کا بیان ہے۔ اور اگر واقعہ ایک ہو تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ بیہوشی کی حالت میں انسان ایک جگہ بیہوش ہو کر گر جاتا ہے۔ لیکن پھر قلابا زیاں کھاتے ہوئے دوسری جگہ تک پہنچ جاتا ہے۔ شاید آپؐ کو بھی کچھ اس قسم کا واقعہ پیش آیا ہے۔ رجُلہ علیٰ عنقی الخ مرگی اور جنات کی وجہ سے جب آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے۔ تو لوگوں کے ہاں اس کے علاج کے لئے مختلف ٹونے ٹونکے کئے جاتے ہیں۔ شاید اس زمانے میں مرگی کے علاج کا یہی طریقہ رائج ہو کہ مریض کی گردن پر پاؤں رکھ دیا جائے۔ جیسا کہ اب بھی بعض لوگ جو تاسو نگھاتے ہیں۔ اس لئے شاید ابو ہریرہؓ کے ساتھ یہ برتاؤ کیا گیا۔ حالانکہ آپؐ کے قول کے مطابق آپ کو مرگی وغیرہ کا عارضہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ بھوک کی شدت ہی اس بیہوشی کا سبب ہوا کرتی تھی۔

صحابہ اور حضور اقدس ﷺ کی فاقہ کشی: اب سوال یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی عیش کا بیان کرنا مقصود ہے۔ لیکن یہاں تو صحابیؓ کے عیش کا بیان ہو چکا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو بہت قریب کے صحابی ہیں نبی کریم ﷺ تو بہت دور کے صحابی کی بھی یہ حالت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کچھ گھر میں موجود ہوتا تو ضرور حضرت ابو ہریرہؓ کو دے دیتے۔ اور ان کی یہ حالت نہ ہوتی۔ لیکن آپ ﷺ کے پاس یقیناً کچھ نہیں تھا ورنہ آپ ﷺ کے مقرب خاص اور محبوب طلبہ کی یہ حالت کیوں ہوتی۔ اس طرح اس روایت سے نبی کریم ﷺ کی فقر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

(۲) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ جَعْفَرٍ عَنْ سُلَيْمَانَ الضَّبْعِيِّ عَنْ مَالِكِ بْنِ دِينَارٍ

قَالَ مَا شَبِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مِنْ خَبْزٍ قَطُّ وَلَا لَحْمٍ الْأَعْلَى ضَفَفَ قَالَ

مَالِكٌ سَأَلْتُ رَجُلًا مِنْ أَهْلِ الْبَادِيَةِ مَا الضَّفَفُ فَقَالَ إِنَّ يَتَنَاولُ مَعَ

النَّاسِ (۱)۔

ترجمہ: مالک بن دینار فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے روٹی یا گوشت سے کبھی بھی سیر ہو کر نہیں کھایا مگر ضفف پر۔ مالکؓ کہتے ہیں میں نے ایک بدوی سے ضفف کے معنی پوچھے تو اس نے کہا کہ ضفف کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کے ساتھ کھانا کھایا جائے۔

مالک بن دینار: مشہور زائد تابعی ہیں۔ بصرہ کے رہنے والے تھے ۱۳۰ھ میں یا اس کے قریب وفات پائی (۱)۔ لہذا یہ حدیث مرسل ہوگی۔ بلکہ بعض اقوال کے مطابق یہ روایت حضرت حسن بصریؒ کے واسطے سے روایت کی گئی ہے جو یہاں سند میں مذکور نہیں۔

ما شبع رسول اللہ ﷺ من خبز الخ (۲) یعنی فاتہ کشی کی یہ حالت تھی کہ نہ کبھی روٹی پیٹ بھر کر کھائی نہ گوشت کبھی پیٹ بھر کر کھانے کو ملا۔

الاعلیٰ ضفف ضفف کا ترجمہ بعد میں خود امام ترمذی ذکر کر رہے ہیں۔ یعنی ”ان یتناول مع الناس“ بعض شراح نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جب آپ کسی کے ہاں مہمان بنے تھے یا دعوت پر جاتے۔ تب کہیں پیٹ بھرنے کے لئے کافی کھانا آپ ﷺ کو ملا۔ لیکن علامہ بیجوریؒ اور علامہ عبدالرؤف مناویؒ شارح شمائل نے اس کو نفیٰ کہہ کر اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ بات جناب رسول اللہ ﷺ کی شان کے مناسب نہیں بلکہ یہ تو ہم اپنے حق میں برداشت نہیں کرتے کہ کوئی ہمارے بارے میں یہ کہے کہ گھر میں تو پیٹ بھر کر نہ کھائیں اور دوسروں کے ہاں پیٹ بھر کر کھائیں۔ کیونکہ یہ تو بخل کی صورت ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آپ ﷺ کے لئے عیب نہیں کیونکہ صحابہؓ آپ ﷺ کو بہت زیادہ محبت اور اصرار کے ساتھ لے جاتے۔ ان کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ آپ ﷺ پیٹ بھر کر کھائیں۔ اس سلسلے میں عموماً میزبان تکلفات سے بھی کام لیتے ہیں۔ اور ضابطہ یہ ہے کہ اگر میزبان مرغ، پلاؤ اور گوشت وغیرہ تکلفات کا انتظام کر کے کھلانے کی خواہش کرے اور مہمان پھر بھی نہ کھائے تو میزبان کو ضرور تکلیف پہنچے گی۔ اس صورت میں مہمان کے زیادہ کھانے سے میزبان کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ بھی ان حضرات کی دلجوئی اور خاطر داری کے لئے ایسا کرتے۔ باقی گھر میں کچھ ہوتا نہ تھا کہ پیٹ بھر کر کھالیں۔

(۱) روی عن أنس مات سنة ثنتين ومائة (منہج منہج علی هامش جمع الوسائل ۱/۱۰۰) کان ابوہ من مبی مجستان وقیل من کابل روی عن أنس بن مالک وابن سیرین وعطاء بن أبی رباح وعنه أبان بن یزید وصلفة بن موسیٰ ذکرہ ابن حبان فی الثقات وقال کان یکتب المصاحف بالاجرة یتقوت باجرة (تہذیب التہذیب ۱۰/۱۳) (مختار)

(۲) بعض نسخوں میں ولالحم کے ساتھ لا ذکر نہیں اس لئے جہاں لا مذکور ہے تو نفی کی تاکید مقصود ہے اور جہاں لا نہیں تو وہ ناقص پر عطف کی وجہ سے نفی کا معنی پایا گیا (مختار)

لیکن اس کلام کا ایک اور معنی بھی ہے جس پر مذکورہ اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ساتھیوں کے ساتھ ہی کھانا کھاتے جو کچھ گھر میں ہوتا مہمانوں یا ساتھیوں کے لئے حاضر کر دیتے تھے۔ ایسے موقع پر جب تک مہمان پیٹ بھر کر نہ کھاتے۔ آپ ﷺ بھی ان کے ساتھ تناول فرمایا کرتے تھے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ آپ ﷺ بھی دو تہائی پیٹ بھر کر کھالیا کرتے تھے (۱)۔

(۱) راقم الحروف کو حقیدہ اسلف حضرت الاستاد سیدی و استاذی حضرت مولانا عبدالحق جھانگیروی (جو صاحب کتاب زین المحافل کے ماموں ہیں) تلمیذ رشید حضرت مدنی نے فرمایا تھا کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی عادت مبارک تھی کہ آخر تک مہمانوں کے ساتھ کھانے میں شریک رہتے تھے۔ اور مہمانوں کے لئے عموماً ایک ہی برتن میں ایک سالن لایا جاتا تھا اور سارے مہمان اسی برتن کے گرد جمع ہو کر اسی برتن میں کھاتے تھے۔ اور اگر کبھی مہمان زیادہ ہوتے تو دو برتنوں میں سالن رکھ کر دیا جاتا تھا۔ اور اپنے ہاتھوں سے مہمانوں میں روٹی تقسیم کرتے تھے اور ساتھ ساتھ تھوڑا تھوڑا خود بھی مہمانوں کے ساتھ کھاتے تھے (مخار)

۱۰۔ باب ماجاء فی خوف رسول اللہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے موزوں کے بیان میں

اس سے قبل لباسوں میں سے بعض کا بیان ہو چکا ہے۔ درمیان میں نبی کریم ﷺ کی عیش کا ذکر آچکا ہے۔ اور اس کی توجیہ بھی ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اب پھر بعض ان اشیاء کا ذکر ہے جو لباس کے قبیلے سے ہیں۔ موزے بھی چونکہ پہنے جاتے ہیں۔ اس لئے اس باب میں اس بات کا بیان ہو گا کہ نبی کریم ﷺ نے موزے استعمال کئے ہیں۔ اور یہ کہ آپ ﷺ کے متعدد موزے تھے۔ چار جوڑے موزے تو آپ ﷺ کو خیر کی قیمت سے ملے تھے۔

موزے پہننے کے آداب: موزے پہننے کے کچھ آداب ہیں۔ مثلاً یہ کہ دوسرے لباس کی طرح ان میں بھی پہلے دایاں موزہ پہنتا چاہیے۔ نیز پہننے سے قبل ان کو جھاڑ دینا چاہیے تاکہ اگر حشرات الارض میں سے کوئی چیز ان میں داخل ہوا ہو وہ نکل جائے۔ بلکہ نبی کریم ﷺ نے اس بات کا حکم دیا ہے۔ طبرانی کی ایک روایت میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ انسانی قحطے کیلئے ایک موقع پر باہر گئے ہوئے تھے۔ وہاں وضوء کی ضرورت ہوئی آپ ﷺ نے وضوء فرمایا اور جب موزے پہننے لگے۔ تو ابھی ایک موزہ ہی پہنتا تھا کہ ایک سبز پرندہ آیا اور دوسرا موزہ اچک کر لے اڑا۔ اور اوپر جا کر وہاں سے موزہ پھینک دیا۔ موزہ زمین پر آیا تو اس سے ایک سیاہ سانپ نکل آیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ تو ایک معجزہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے مسخر مخلوقات سے پناہ کی دعا مانگی۔

واقعی یہ ایک بڑا معجزہ تھا کہ ہوا کے پرندے بھی آپ ﷺ کو تکلیف سے بچانے کی فکر میں تھے۔ ایک اور روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ اس وقت تک موزہ نہ پہنے جب تک اسے جھاڑ نہ لے۔ سچی کام جوتے اور بوٹ وغیرہ پہننے کے وقت کرنا چاہئے۔“

(۱) حَدَّثَنَا هَنَادُ بْنُ السَّرِيِّ ثَنَا وَكَيْعٌ عَنْ دَلْهِمِ بْنِ صَالِحٍ عَنْ

حَجَّيرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ ابْنِ هُرَيْدَةَ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ النَّجَاشِيَّ أَهْدَى لِلنَّبِيِّ ﷺ

خفین أسودین ساذجین فلبسهما ثم توطأ و مسح علیهما (۱)۔

ترجمہ: حضرت بریدہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نجاشی نے نبی کریم ﷺ کے پاس سیاہ رنگ کے دو سادہ موزے بطور ہدیہ بھیجے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو پہنا۔ پھر وضو کیا اور دونوں پر مسح فرمایا۔

شاہ حبشہ نجاشی اور اس کی حکومت: ان النجاشی اھدی نجاشی نون مفتوحہ یا مکسورہ اور تخفیف جیم کے ساتھ حبشہ کے امراء اور بادشاہوں کا لقب تھا۔ جیسے مصر کے قبلی بادشاہوں کا لقب فرعون تھا۔ روم کے بادشاہ کو قیصر اور فارس کے حکمران کو کسریٰ کہا جاتا تھا۔ یمن والے اپنے بادشاہ کو تیج اور شام والے ہرقل کہتے تھے اور ابھی قریب ہی مکہ کے گورنر کو شریف مکہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ نجاشی کا اصل معنی حکم نافذ کرنے والا ہوتا ہے۔ مؤرخین کے مطابق نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں حبشہ پر دو نجاشی گزرے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو اسلام کی دعوت دی تھی۔ ان میں پہلے نجاشی نے بھی نبی کریم ﷺ کے پیغام کا بہت قدر و احترام کیا تھا۔ اگرچہ اس نے بظاہر اسلام قبول نہیں کیا البتہ ابتداء میں مسلمانوں کو پناہ کی ضرورت ہوئی تو حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ اس زمانہ میں یہی اول نجاشی ہی تھے جنہوں نے مسلمانوں کو پناہ دی تھی۔

لیکن یہ تحفے دوسرے نجاشی نے بھیجے تھے۔ ان کا نام اصحمہ بن بحر تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ ۶ھ میں اسلام لایا تھا جب حضرت عمرو بن امیہ ضمیرؓ نبی کریم ﷺ کا خط آپ کے پاس لائے۔ اور ۹ھ کو نبی کریم ﷺ سے ملاقات کرنے کی غرض سے وہ مدینہ آرہے تھے کہ راستے میں وفات پائی۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ان پر غائبانہ نماز جنازہ ادا کی تھی۔ ائمہ کا خیال ہے کہ ان کی لاش نبی کریم ﷺ کو پیش کر کے دکھادی گئی تھی (۲)۔

(۱) سنن ابی داؤد ۳۳/۱ کتاب الطہارۃ باب المسح علی الخفین ۴۲/۱، سنن ابن ماجہ کتاب الطہارۃ باب ماجاء فی المسح علی الخفین، جامع ترمذی کتاب الادب باب ماجاء فی الخف الاسود (مختار)

(۲) غائبانہ نماز جنازہ ائمہ مجتہدین کے ہاں اختلافی چلا آرہا ہے۔ علماء احناف اس کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ اور یہی رائج ہے۔ ذیل میں ایک استفتاء کا جواب جو احقر نے دارالعلوم حقانیہ کے دارالافتاء سے شائع کیا ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ)۔۔۔۔۔ مولانا مفتی عبدالرحیم لاچپوریؒ نے لکھا ہے کہ جب ہیر معونہ کا مشہور حادثہ پیش آیا تو ستر (۷۰) قراء صحابہؓ کو دشمنان اسلام نے دھوکہ سے اپنے ساتھ لے جا کر بڑی بیدردی سے سب کو شہید کر دیا۔ حضور ﷺ کو اس سے بہت ہی صدمہ ہوا۔ ایک مہینہ تک فجر کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھی مگر ان کی غائبانہ نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ غزوہ موتہ میں خود حضور ﷺ نے حضرت زید بن حادہؓ، جعفر بن ابی طالبؓ، عبداللہ بن رواحہؓ کی شہادت کی خبر دی۔ ان کے لئے دعا مغفرت کی۔ مگر غائبانہ نماز نہیں پڑھی۔ اگر غائبانہ نماز جنازہ کا عام حکم ہوتا تو آپ ﷺ ہر ایک کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھتے۔ اور آپ ﷺ کی اتباع کرتے ہوئے خلفائے راشدین اور دیگر صحابہؓ پڑھتے۔ مگر اس کا صحیح طور پر ثبوت نہیں۔ لہذا اب کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ غائبانہ نماز جنازہ پڑھے۔ اگر پڑھے گا تو یہ خلاف سنت ہوگا۔

(فتاویٰ رحمیہ ۴۶/۷)

اسی طرح عمدہ لفظ میں ہے۔ میت کا وہاں موجود ہونا..... پس غائبانہ نماز جنازہ درست نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ نے نجاشی اصمہؓ شاہ حبشہ کی نماز جنازہ غائبانہ پڑھائی ہے۔ یہ حضور ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے کہ آپ ﷺ کے سامنے سے جنازہ کے درمیان کے پردے اللہ تعالیٰ نے ہٹا دیئے۔ اور اس کا جنازہ آپ ﷺ کے سامنے کر دیا۔ دوسرے لوگ اس کو نہیں دیکھ رہے تھے۔ تو آپ ﷺ کا امام ہو کر اس کی نماز جنازہ حاضری پر ہوا اور صحابہؓ کا آپ ﷺ کی اقتداء کرنا اگر چہ وہ میت کو نہ دیکھ رہے ہوں۔ جائز ہوا۔ اس میں کوئی مانع نہیں۔ اگر غیر موجود میت پر نماز جنازہ جائز ہوتی، تو حضور ﷺ ان صحابہ کرامؓ کی نماز جنازہ غائبانہ ضرور پڑھتے۔ جو کثیر تعداد میں آپ ﷺ سے دروفت ہوئے اور دفن ہوئے۔ حالانکہ باوجود آپ ﷺ کے نماز جنازہ پر بہت حرص فرمانے کے اور باوجود حکم الہی کے ان صلوات تک مسکن لہم اور آپ ﷺ نے فرمایا لا یموتن احدکم الا اذ نعمونی بہ فان صلونی علیہ رحمۃ لہ کسی کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا آپ ﷺ سے ثابت نہیں ہوا۔ پس کسی کی نماز جنازہ غائبانہ پڑھنا درست نہیں ہے۔ اور جن لوگوں نے حدیث نماز جنازہ بادشاہ حبشہ نجاشیؓ سے سند پکڑ کر اس کا رواج ڈالا ہے یہ غلط اور غیر مشروع ہے۔ (عمدۃ الفقہ بحوالہ فتاویٰ رحمیہ ۴۷/۷) اور تقریباً یہی بات علامہ زبیدیؒ لکھتے ہیں: ویبدل علی ذلک ان النبی ﷺ لم یصل علی غائب غیرہ وقدمات من الصحابة خلق کثیر وہم غائبون عنہ وسمع بہم فلم یصل علیہم إلا غائباً واحداً (نصب الرایۃ ۲/۲۹۱) اور اسی طرح علامہ عینیؒ نے بھی لکھا ہے ملاحظہ ہو (عمدۃ القاری ۸/۷۲۱) اور شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ نے لکھا ہے کہ ویبدل علی هذا أنه لم۔۔۔۔۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ) اصحابہ الصلوٰۃ علیہ مطلقاً (اوجز المسالك ۲/۲۳۵) اسی طرح علامہ خطابیؒ عابانہ نماز جنازہ کے جواز کی یہ شرط بیان کرتے ہیں کہ عابانہ نماز جنازہ اس پر جائز ہے کہ جس جگہ میت کا انتقال ہوا ہو۔ اور وہاں کوئی اس پر نماز جنازہ پڑھنے والا موجود نہ ہو۔ شافعیہ میں سے علامہ رویائیؒ نے بھی اس قول کو پسند کیا ہے۔ (درس ترمذی ۳/۲۹۹) اور اسی کو علامہ ابن رشد قرطبیؒ اور امام ابو داؤدؒ نے بھی اختیار کیا ہے۔ لایح میں ہے کہ واقعا اختصارہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ من التفصیل بہ جزم الخطابیؒ والیہ مال ابن رشد فی مقلعاتہ والیہ میل الامام ابی داؤد اذا ترجم علی حدیث الصلوٰۃ علی النجاشیؒ باب الصلوٰۃ علی المسلم یموت فی بلاد الشریک

(لامع الدراوی ۲/۱۲۲)

علامہ خطابیؒ ابن تیمیہؒ وغیرہ حضرات کے مذکورہ قول کی تائید مسند ابی داؤد طیالسیؒ سنن ابن ماجہ اور مسند احمد کی ذکر کردہ روایت سے ہوتی ہے کہ عن حذیفہ بن اسیدؒ ان النبی ﷺ قال ان احاکم مات بغیر ارضکم فقوموا فصلوا علیہ اور ابن ماجہ کے الفاظ ہیں۔ عن حذیفہ بن اسیدؒ ان النبی ﷺ عرج لهم فقال صلوا ها اخرجکم مات بغیر ارضکم قالوا من هو؟ قال النجاشیؒ (اعلام السنن ۲/۲۸۵) اور بعض حضرات کے ہاں جائز تو ہے مگر اسی دن یا اس کے قریب قریب وقت میں جس دن میت کا انتقال ہو چکا ہو۔ کما قال العینیؒ واجازة بعضهم اذا كان فی يوم الموت او قریب منه (حاشیہ فیض الباری ۲/۳۷۰)

اور امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں کہ عابانہ نماز جنازہ کے جواز کی شرط یہ ہے کہ معصی کی نسبت سے میت جانب قبلہ ہو لہذا اگر میت کا علاقہ معصی کی نسبت سے قبلہ کی جانب مخالف میں ہو تو عابانہ نماز جنازہ نہ ہوگا۔ (درس ترمذی ۳/۲۹۹) اور شوافع میں علامہ ابن قنطارؒ فرماتے ہیں کہ عابانہ نماز جنازہ پڑھنا تو جائز ہے مگر اس سے فرض کفایہ ساقط نہیں ہوتا چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں ما حکى عن ابن القنطار أحد اصحاب الوجوه من الشافعية أنه قال يجوز ذلك ولا يسقط الفرض (فتح الباری ۲/۱۳۷) مذهب شافعیؒ و احمدؒ کے ارباب علم کے اقوال سے معلوم ہوا کہ یہ جواز مطلق نہیں بلکہ ضرورت کے تحت ہے۔ اور ضرورت کے تحت جو امر ثابت ہو جائے اس کو متعدی نہیں کیا جاسکتا۔

جہاں تک ان ایک دو واقعات کا تعلق ہے جن سے عابانہ نماز جنازہ کا ثبوت بظاہر ملتا ہے۔ وہ روایات درحقیقت معلول ہیں۔ اس لئے کہ جب سنت مستترہ عابانہ نماز جنازہ نہ پڑھنے کا ہے اور اصول یہ ہے کہ ایک دو جزئی واقعات کی وجہ سے سنت مستترہ نہیں چھوڑی جاسکتی ہے اور خصوصاً جب ان واقعات کے وجود اور اسباب بھی معلوم نہ ہوں۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ) کما قال العلامة انور شاہ کشمیری و بالجملۃ لا ترک سنۃ فاشیۃ مستمرة لاجل الوقائع الجزئیۃ التي لم تنكشف وجوهها ولم تدر أسبابها (فیض الباری ۴/۲) لہذا جہاں تک ان دلائل کا تعلق ہے جن کو عاتبانہ نماز جنازہ کے جواز میں پیش کیا جاتا ہے تو ان کے جوابات درج ذیل ہیں۔

مجوزین حضرات کے دلائل: جو حضرات عاتبانہ نماز جائز سمجھتے ہیں ان کی بنیادی دلیل یہ حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حبشہ کے بادشاہ عبدالمحسح اسمرہ شاہ نجاشی پر عاتبانہ نماز جنازہ پڑھایا تھا۔ عن ابی ہریرۃ قال نعی النبی ﷺ إلی أصحابہ النجاشی ثم تقدم فصفوا خلفه فکبر اربعاً (صحیح بخاری ۱۷۶/۱)

عن جابر بن عبد اللہ أن رسول اللہ ﷺ صلی علی النجاشی فکنت فی الصف الثانی او

الثالث (صحیح بخاری ۱۷۶/۱)

الجواب: لیکن اس روایت کے بہت سارے جوابات دئے گئے ہیں۔ اولاً تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حضرت نجاشی کی خصوصیت تھی کہ آنحضرت ﷺ نے ان پر عاتبانہ نماز جنازہ پڑھائی۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے علاوہ کسی اور پر کبھی بھی عاتبانہ نماز جنازہ نہیں پڑھائی۔ جیسا کہ علامہ ظفر احمد عثمانی نے لکھا ہے۔

ومن الاعتذرات ایضاً أن ذلك خاص بالنجاشی لأنه لم یثبت أنه ﷺ صلی علی غائب

غیرہ۔ (اعلاء السنن ۲۸۳/۸) اور علامہ ابن عبدالبرؒ نے لکھا ہے کہ وقال الحنفیۃ والمالکیۃ لا یشرع

وإنهم قالوا ذلك خصوصیتہ ودلائل الخصوصیۃ واضعۃ (اوجز المسالک ۲۳۵/۲) اور علامہ خطابیؒ

نے لکھا ہے کہ وقد ذهب بعض العلماء إلی کراهۃ الصلوة علی المیت الغائب زعموا أن النبی ﷺ

کان مخصوصاً بهذا الفعل (عمدة القاری ۱۷۲/۱)

اور شیخ الحدیثؒ نے لکھا ہے و اجیب ایضاً بأن ذلك خاص بالنجاشی لاشاعة أنه مات مسلماً او

انتلاف قلوب الملوك الذی اسلموا فی حیاته (اوجز المسالک ۳۳۵/۲) اور علامہ بدر الدین العینیؒ

لکھتے ہیں: وقع فی کلام ابن بطل تخصیص ذلك بالنجاشی فقال بدلیل إطباق الأمة علی ترک

العمل بهذا الحدیث قال ولم اجد لأحد من العلماء اجازۃ الصلوة علی الغائب إلا ما ذکرہ ابن زید

عن عبد العزیز بن أبی سلمۃ فإنه قال اذا استردن أنه غرق او قتل او أكله السباع ولم يوجد منه شیء

صلی علیہ کما فعلہ بالنجاشی وبہ قال ابن حبیب وقال ابن عبد البر اکثر (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ)..... اهل العلم يقولون أن ذلك مخصوص به (حاشیہ فیض الباری ۴۷۰/۲)
 (۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ جنازہ غائبانہ نہ تھا بلکہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے سے تمام تجلیات ہٹائے گئے تھے۔ اور پھر آنحضرت ﷺ نے نجاشی پر نماز پڑھائی۔ چنانچہ علامہ الواحدیؒ بلا اسناد حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں۔
 قال كشف للنبي ﷺ سرير النجاشي حتى راه وصلى عليه اور علامہ ابن حبانؒ عمران بن حصینؓ سے روایت کرتے ہیں عن عمران بن حصين فقاموا وصفوا خلفه وهم لا يظنون إلا أن جنازة بين يديه.
 اور ابو حواریہ سے منقول ہے عن عمران بن حصين فصيلنا خلفه ونحن لا نرى إلا أن الجنازة قد امنا اس معلوم ہوا کہ نجاشی پر جنازہ پڑھاتے وقت نجاشی کی نش آحضرت ﷺ کے سامنے تھی۔ اور جواز نماز کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

اعتراض: البتہ اس جواب پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ مجمع بن جاریہ ہجرت میں ہیں لہذا خلفہ صفین و مائویہ شیعہ (فتح الباری ۱۸۹/۳) کہ ہم نے آپ ﷺ کی اقتداء میں دو صف بنائی اور ہم نے کچھ نہیں دیکھا۔ تو عمران بن حصینؓ کیسے کہتے ہیں کہ جنازہ آنحضرت ﷺ کے سامنے تھا۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے ممکن ہے کہ یہ نجاشی کے جنازے سے یہ تجلیات بعض حضرات کے حق میں تو اٹھائے گئے ہوں۔ تو ممکن ہے کہ حضرت مجمع ان حضرات میں سے ہوں جن کے حق میں تجلیات باقی ہوں۔ (کافی عمدۃ القاری) اور علامہ عثمانیؒ نے بھی یہی لکھا ہے والتوفيق كما افاده الشيخ بأنها كشفت لبعض دون بعض (اعلاء السنن ۲۸۳/۲)

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ مائویہ شیعہ کا تعلق مقتدیوں سے ہے کہ ہم مقتدیوں کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس میں آنحضرت ﷺ کی نفی نہیں۔ اور جواز صلوٰۃ جنازہ کیلئے اتنا بھی کافی ہے کہ میت امام کو نظر آئے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں لکن اجاب بعض الحنفية عن ذلك بما تقدم من أنه بصير كالصبي الذي يمشي عليه الامام وهو يراه ولا يراه المأمون فإنه جائز اتفاقاً (فتح الباری ۱۴۷/۲)

(۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے مجبوراً اور ضرورت کے تحت اس کا جنازہ پڑھایا تھا۔ اس لئے کہ آپؐ ایسی جگہ پر تھے کہ وہاں اس پر نماز جنازہ پڑھانے والا موجود نہیں تھا۔ دوم اس نے آخر تک اپنا ایمان بھی چھپائے رکھا تھا۔ تو اس مجبوری کی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے اس پر نماز پڑھی ہے تاکہ اس کے ایمان کی اشاعت ہو جائے۔

كما قال العيني و جواب آخر أنه من باب الضرورة لأنه مات بأرض لم يقم (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ) فیہا علیہ فریضة الصلوة فلتعین فرض الصلوة لعدم من یصلی علیہ ثم (شرح ابی داؤد ۱۵۲/۶) اور عمدۃ القاری میں مزید لکھتے ہیں وقال الخطابی النجاشی رجل مسلم قد امن برسول اللہ ﷺ وصدقه علی نبوته إلا أنه کان یکم ایمانه الخ (عمدۃ القاری ۱۷۲/۸)

(۳) چوتھا جواب: اور ایک جواب یہ بھی ہے نجاشی پر جنازہ سے مراد صلوٰۃ حقیقی نہیں بلکہ دعا ہے۔ کما قال الحصکفی وصلاة النبی ﷺ علی النجاشی لغویۃ قال ابن عابدین قوله لغویۃ ای الدعاء (ردالمحار ۲۱۹/۲) اور علامہ عینی نے مصنف کے حوالہ سے حضرت حسن بصری کا قول نقل کیا ہے۔ وفي المصنف عن الحسن إنما دعائه ولم یصل وعلی هذه فلا اشکال ولا جواب (اوجز المسالک ۴۲۶/۲)

دوسرا استدلال: مجوزین حضرات کا دوسرا استدلال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاویہ بن معاویہ المزنیؓ پر غائبانہ نماز جنازہ پڑھایا ہے۔ چنانچہ علامہ عینی لکھتے ہیں۔ روى الطبرانی فی معجمة الاوسط و کتاب (مسند الشامیین) من حدیث ابی امامۃ قال کنا مع رسول اللہ ﷺ بتبوک فنزل جبریلؑ فقال یا رسول اللہ ان معاویۃ بن معاویۃ المزنی بالمدينة المحب ان تصلى علیہ الخ (عمدۃ القاری)

الجواب (۱) مگر اس روایت سے استدلال کرنا بھی صحیح نہیں۔ اس لئے اس روایت کی سند میں علماء بن زیاد ہے۔ اور اس کے بارے میں علی بن مرثیٰ فرماتے ہیں یہ راوی احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ نے لکھا ہے ولكن لا یصح فإِنَّ فی الاسناد العلاء بن زیاد ویقال یزید قال علی بن الملینی إنه یضع الحدیث۔

قال النووی فی الخلاصة والعلاء هذا ابن زید ویقال ابن یزید اتفقوا علی ضعفه قال البخاری وابن عدی وأبو حاتم هو منکر الحدیث (شرح ابی داؤد للعینی ۵۳/۶) (اوجز المسالک ۴۲۵/۲)

دوسرا جواب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اگرچہ معاویہ بن معاویہ المزنیؓ کی نماز جنازہ پڑھائی ہے لیکن حضرت معاویہؓ کا جنازہ آپ ﷺ کے سامنے تھا۔ اور وہ تمام حجابات ختم ہو چکے تھے جو آپ ﷺ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان تھے۔ چنانچہ علامہ عینی نے لکھا روى حدیث الطبرانی فی معجمة الاوسط و کتاب الشامیین من حدیث ابی امامۃ قال کنا مع رسول اللہ بتبوک فنزل جبریلؑ فقال یا رسول اللہ ان معاویۃ بن معاویۃ المزنی۔

مات بالمدينة المحب ان تطوی لک الارض فتصلى علیہ ؟ قال نعم (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ)۔۔۔ فضرِبَ بِجَنَاحِهِ عَلَى الْأَرْضِ وَرَفَعَ لَهُ سَرِيرَهُ فَصَلَّى عَلَيْهِ وَخَلْفَهُ صَفَانِ مِنَ الْمَلَائِكَةِ
فِي كُلِّ صَفٍّ سَبْعُونَ أَلْفَ مُلْكٍ ثُمَّ رَجَعَ (عمدة القاری ۸/۱۷۳) اور الاصابہ میں حافظ ابن حجر نے
طبرانی، ابن مندہ اور یحییٰ وغیرہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

عن أنس بن مالك قال نزل جبرئيل على النبي ﷺ فقال يا محمد مات معاوية ابن
معاوية المزني أتحب أن تصلي عليه قال نعم فضرِبَ بِجَنَاحِهِ فَلَمْ يَبْقَ أَكْمَةٌ وَلَا شَجَرَةٌ
الان تضععت سريره حتى نظر إليه فصلى عليه وخلفه صفان من الملائكة كل صف سبعون
الف ملك (الاصابة)

اور ایک اور روایت میں ہے فوضع جبرئيل جناحه الايمن على الجبال فتواضعت حتى نظرنا
الى المدينة (اعلاء السنن ۲۸۴) بلکہ ایک اور روایت میں ہے قال جبرئيل فهل لك ان تصلي عليه
فأقبض لك الارض قال نعم فصلى عليه (اعلاء السنن ۲۸۴)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ حضرت معاویہ بن معاویہ المزنی کا جنازہ آپ ﷺ کے سامنے تھا۔ اور جنازہ
کے جواز کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ جنازہ امام کے سامنے ہو۔ مقتدی جنازہ دیکھے یا نہ دیکھے مقتدیوں کا دیکھنا ضروری
نہیں۔ کما قال ابن عابدين "حتى صلى عليه الصلوة والسلام بحضوره فتكون صلوة من خلفه على
ميت يراه الامام و بحضوره دون المامومين وهذا غير مانع من الاقتداء (رد المحتار ۲/۲۰۹)
اور شیخ الحدیث نے لکھا ہے فتكون صلوة كصلوة الامام على ميت راه ولم يره المامون ولا خلاف في
جوازها (اوجز المسالك ۲/۴۴۵)

تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ حضرت معاویہ المزنی کی خصوصیت ہے اور یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے جبرائیل علیہ السلام سے
پوچھا یا جبرائیل بما نال معاوية هذه المنزلة؟ قال يحب قل هو الله احد وقرآنه اياها جاثيا وذاها
وقائما وقاعداً وعلى كل حال (اعلاء السنن ۲۸۴)

اور یہ روایت جو بخورین حضرات پیش کرتے ہیں بذات خود حضرت معاویہ کی خصوصیت پر دال ہے۔ اس لئے
کہ اگر قاتلانہ نماز جنازہ مشروع ہو تو پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام کے سوال اتحب ان تصلي عليه؟ وضربه
بجناحيه بعد قول نعم کا کیا مطلب۔ اس کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت معاویہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ) کی خصوصیت ہے۔ اس لئے یہ روایت ہمارے لئے حجت ہے۔ ہمارے اوپر نہیں۔ (اعلاء السنن ۲۸۴)

اب اس پوری تفصیل سے وضاحت کے ساتھ معلوم ہوا ہوگا کہ غائبانہ نماز جنازہ جائز نہیں۔ جو ایک دو واقعات دور نبوی ﷺ میں رونما ہو چکے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے غائبانہ نماز جنازہ پڑھی ہے۔ اولاً تو چونکہ وہ جزئی واقعات ہیں۔ اس لئے وہ کلی حکم کے لئے استدلال نہیں بن سکتے۔ اگر ایسا ہو سکتا تو پھر ایک آدمی کی گواہی بھی جائز ہونی چاہیے۔ اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت حمزہؓ کے اکیلے گواہی کو حل مقدمہ میں دلیل اور حجت سمجھ کر قبول فرمایا تھا۔

لیکن ان کے علاوہ مقدمہ میں صرف ایک آدمی کی گواہی مقبول نہیں ہوگی۔ اور نہ ایک آدمی کی گواہی پر دعویٰ ثابت ہو سکتا ہے۔ تو جس طرح حضرت حمزہؓ کی ایک فرد کی گواہی دو کے قائم مقام ہے۔ اور یہ اس کی خصوصیت ہے۔ اور یہ حکم دوسروں کی طرف متعدی نہیں ہو سکتا۔ تو اسی طرح غائبانہ جنازہ بھی ان دو حضرات کی خصوصیت ہے۔ اس لئے ان واقعات سے کلی حکم کے لئے استدلال درست نہیں۔ ثانیاً درحقیقت یہ دونوں نماز جنازہ غائبانہ نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ اور بیت کے درمیان حائل تمام حجابات ہٹا دیئے تھے۔ جیسا کہ آنحضرت ﷺ سے جب مکہ مکرمہ میں کفار مکہ نے بیت المقدس کے بارے میں دریافت کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ اور بیت المقدس کے درمیان تمام حجابات ہٹا دیئے۔ اور بیت المقدس کو آپ ﷺ کے سامنے کر دیا۔ اور آپ اس کو دیکھ کر کفار کے تمام سوالات کے جوابات دیتے رہے۔ تو اسی طرح یہاں بھی ہوا کہ میتوں کو آپ ﷺ کے سامنے کر دیا گیا۔ اور آپ ﷺ نے ان پر نماز جنازہ ادا فرمائی۔ جس پر ذکر شدہ روایات دال ہیں۔ اور نماز جنازہ کی صحت کیلئے اتنا ہی کافی ہے۔ مقتدیوں کو جنازہ نظر آنا ضروری نہیں۔ اس لئے یہ حجتاً غائبانہ نماز جنازہ نہیں تھے۔

چلنا اگر غائبانہ نماز جنازہ ہو بھی تب بھی آنحضرت ﷺ نے عذر کی وجہ سے ایسا کیا۔ اس لئے کہ حبشہ میں اس پر نماز جنازہ پڑھانے والا کوئی نہ تھا۔ اس نے اپنا ایمان بھی ظاہر نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے ایمان کی اشاعت اور فرض کلیہ کی تکمیل کے لئے نماز جنازہ پڑھائی۔ تو اس ضرورت کے تحت کئے گئے عمل کو کلی حکم کے لئے استدلال نہیں بنایا جاسکتا۔ اس لئے کہ الضرورة تغیر بقدر الضرورة اور یہاں پر یہ ضرورت بھی نہیں۔ اس لئے کہ شہید عامر عبد الرحمنؓ جیسے صاحب کا جنازہ اس کے آبائی گاؤں میں پڑھایا جا چکا ہے۔ اور وہ فریضہ ادا ہو چکا ہے اس لئے اب اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ بعض لوگ اس کو ایصال ثواب سمجھتے ہیں۔ مگر یہ نظریہ بھی صحیح نہیں۔ اس لئے کہ ایصال ثواب کیلئے اور بھی بہت سارے اعمال موجود ہیں۔ لہذا جو ایصال ثواب (بقیہ اگلے صفحہ پر)

خدمت اسلام کا شمرہ: علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ مذکورہ ہدیہ بھیجے وقت نجاشی مسلمان نہیں ہوا تھا۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ وہ نجاشی تھا جو اسلام لانے سے قبل مر گیا تھا۔ لیکن اسلام اور صحابہؓ کا انہوں نے بھی احترام کیا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کیلئے بھی دعائیں فرمائی تھیں۔ اور اسی کی برکت تھی کہ ان کی حکومت کو سینکڑوں سال تک دوام حاصل ہوا۔ ہمارے والد ماجد حضرت شیخ الحدیثؒ کے بقول حبشہ کا شاہ میل سلامی بھی انہی کے قبیلہ سے تھا۔ جن کا اقتدار ابھی چند سال قبل ایک فوجی انقلاب کے ذریعے ختم ہو گیا تھا۔ یہ لوگ تقریباً تیرہ سو سال سے حضور اکرمؐ کی دعاؤں کی برکت سے حکومت کرتے رہے۔ لیکن جب انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی کو شیوہ بنایا۔ اور سرکشی کو شعار بنایا تو اللہ تعالیٰ نے انکی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اور آج حبشہ میں بہت زیادہ مظالم ہو رہے ہیں۔ کیونست ممالک کے زیر اثر ہیں۔ یہاں مسلمان اقلیتوں پر ظلم ہوتا ہے۔

غیر مسلموں کے ہدایا سے سلوک: بہر حال نبی کریم ﷺ نے یہ ہدیہ قبول کر کے اس بات کی تعلیم دی کہ اگر روابط اور تعلقات اچھے ہوں تو کفار کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے۔ یہاں صرف خفین اسودین ہے۔ دوسری روایات کے مطابق انہوں نے اور بھی ہدایا بھیجے تھے۔ جن میں قیص اور شلوار اور کچھ دیگر چیزیں بھی تھیں۔ لیکن یہاں اس حدیث میں صرف موزوں کا ذکر ہے۔

ساد جین دونوں سادہ تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر کھال ایسی خشک اور صاف کی جائے کہ بال چڑے پر رہیں اور صاف نہ ہو تو اس سے بناء ہوا موزہ سادہ کہلاتا ہے۔ اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ (بقیہ حاشیہ)۔۔۔ کتاب وصنت سے ثابت ہے اس کو اختیار کیا جائے۔ غائبانہ نماز جنازہ کتاب وصنت سے ایصال ثواب کیلئے مشروع نہیں ہے۔ بلکہ جو حضرات اس کے جواز کے قائل ہیں ان کیلئے یہ ایک مسنون عمل ہے۔ صرف ایصال ثواب کے لئے نہیں جس کی وضاحت جواب میں مذکور ہوئی ہے۔ اور اگر اس سے سیاسی مقاصد کا حصول یا عوام الناس کی توجہ حاصل کرنا ہو تو اس کیلئے بھی دیگر ذرائع اور اسباب ہیں۔ جن کو اختیار کرتے ہوئے سیاسی مقاصد اور عوام کی توجہ حاصل کی جاسکتی ہے۔ کسی غیر ثابت شدہ اور غیر مشروع عمل کو لوگوں میں مشہور کر کے شہرت حاصل کرنا اور اختلاف اور بے جا گفتہ و شنید کا دروازہ کھولنا اہل علم کو ذیہب نہیں دیتا۔ اور یہ بات کسی بھی صاحب علم پر غلطی نہیں کہ بلا ضرورت دوسرے مذہب کے قول پر عمل تو کجا اپنے مذہب کے اندر مرجوح قول پر عمل کرنا اس پر فتویٰ دینا ناجائز اور خرق لہا جماع ہے۔ اس لئے اس طرح کے اعمال سے پرہیز کیا جائے۔ واللہ اعلم وعلیہ اتم۔ مختار اللہ حقانی (مختار)

سادہ سے مراد غیر منقش ہے یا یہ کہ ان میں دوسرا رنگ نہ تھا یعنی خالص سیاہ رنگ کے تھے۔

مسح علیہما: یعنی آپ ﷺ نے موزے ملتے ہی پہن کر اس پر مسح فرمائی (۱)۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر کفار کی مصنوعات پر کوئی ظاہری نجاست نہ ہو تو اس کے ساتھ طہارت کا معاملہ ہوگا۔ نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ جو شخص جس مقصد کیلئے ہدیہ دے تو اس ہدیہ کو اس مقصد میں جلدی صرف کر دینا چاہیے۔ اس بات سے ہدیہ دینے والا خوش ہوتا ہے۔

یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسح تو تب ہوتا ہے جب موزہ طہارت کاملہ پر پہنا جائے اور پھر وضو ٹوٹنے کے بعد وضو کیا جائے لہذا یہاں بھی ہم یہی کہیں گے کہ عین اسی وقت مسح نہیں کیا ہوگا۔ بلکہ پہننے کے بعد جو وضو ٹوٹا تو بعد میں وضو کرتے ہوئے مسح کیا ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس حدیث سے مسح علی الخفین کا جواز بھی معلوم ہوتا ہے جو کہ تقریباً متواترۃ المعنی احادیث سے ثابت ہے۔

(۲) حدثنا قتیبہ بن سعید انا یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدة عن الحسن

بن عیاض عن ابی اسحاق عن الشعبي قال قال المغيرة بن شعبه اهدى

دحية للنبي ﷺ خفين فلبسهما وقال اسرائيل عن جابر عن

(۱) احتاف کے ہاں مسح الخفین مطلقاً جائز ہے۔ چاہے موزے پہننے والا سفر میں ہو یا حضر میں۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا ہے ما قلت بالمسح علی الخفین حتی جاءنی مثل هذا النهار، علامہ مناویؒ نے فرمایا ہے کہ وقد روی فی المسح ثمانون صحابياً واحادیثه متواترة ومن ثم قال بعض الحنفية أخشى أن يكون انكاره ای من أصله كفراً (مناوی علی هامش جمع الرسائل ۱/ ۱۵۶) شرح عقائد میں حضرت انس بن مالکؓ کا فرمان مذکور ہے کہ آپؐ اہل السنۃ والجماعہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا ان تحب الشیعین ولا تطعن فی الخفین وتمسح علی الخفین (شرح العقائد ص ۱۱۸) اس لئے حافظ ابن مندہ اصمہائی نے فرمایا ہے کہ مسح علی الخفین افضل ہے اس لئے کہ انہیں اہل بدعت کیساتھ اختلاف ہے اور اس کے علاوہ اس میں اثاب حق اور انہما سنت بھی ہے۔ (احکام الاحکام ۲۰/ ۱) اگرچہ علامہ نوویؒ نے غسل کو ترجیح دی ہے شرح مسلم للنووی (۱۳۲/ ۱) مگر حافظ ابن قیمؒ کی رائے اعدل الاقوال ہے فرماتے ہیں کہ ولم یکن علیہ السلام یتکلف ضد حالة التي علیہا قدماء بل ان كانت فی الخف مسح علیہما ولم یز عہما وان کانتا مکشوفتین غسل القدمین ولم یلبس الخف لیمسح علیہ وهذا اعدل الاقوال فی مسئلة الافضل من المسح والغسل قاله شیخنا (زاد المعاد ۱/ ۲۹) (مختار)

عامر وجبة فلبسهما حتى تخروفا لا يدرى النبي ﷺ أذكى هما ام لا
 قال أبو عيسى هذا هو أبو اسحق الشيباني واسمه سليمان (۱) .
 ترجمہ: مغیرہ بن شعبہ فرماتے ہیں کہ وحیہ کلبیؓ نے دو موزے نبی کریم ﷺ کو بطور
 ہدیہ پیش کئے تو آپ ﷺ نے ان کو پہنا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے
 موزے اور ایک جبہ پیش کیا۔ تو آپ ﷺ نے انہیں پہنا۔ یہاں تک کہ وہ پھٹ
 گئے۔ نبی کریم ﷺ کو یہ علم بھی نہ تھا کہ یہ موزے عربوں کا نور کی کھال کے تھے یا غیر
 مذبوح کے۔

اھدیٰ وحیہ الخ حضرت وحیہؓ وہ صحابی ہیں جن کی صورت میں متشکل ہو کر حضرت جبریلؑ نبی
 کریم ﷺ کے پاس وحی لایا کرتے تھے۔ باب اول کی بارہویں حدیث کے ضمن میں ان کا تذکرہ گزر چکا
 ہے۔ فلبسہما یہیں سے ترجمہ الباب کا اثبات ہوتا ہے۔ وجبة الخ حضرت عامرؓ سے روایت
 کرتے ہوئے اسرائیل نے موزوں کے ساتھ جبہ کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہ شامی جبہ تھا۔ جسے نبی کریم ﷺ
 نے پہنا بھی تھا۔

(۱) جامع ترمذی ۱/ ۳۰۶ کتاب اللباس باب ماجاء فی لبس الجبة والخفين (مختار)

۱۱۔ باب ما جاء في نعل (۱) رسول الله ﷺ

حضور اقدس ﷺ کی جوتی مبارک کے بیان میں

جوتی مبارک کا ذکر: عام طور پر نبی کریم ﷺ کے نعل ایسے ہوتے تھے جیسے کہ پلاسٹک کے بعض چپل ہوتے ہیں۔ اوپر سے دو شراک یعنی پٹیاں ہوتی تھیں (۲)۔ حضرت تھانویؒ وغیرہ علماء نے پاپوش مبارک پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ اور ان میں وہ نقش بھی کھینچا ہے۔ علامہ بیجوریؒ لکھتے ہیں کہ وقد كانت نعله ﷺ مخرصة معقبة ملسنة كما رواه ابن سعد في الطبقات (المواهب الدنية ص ۸۰) یعنی نبی کریم ﷺ کا جوتہ درمیان میں تنگ تھا۔ کچھلی طرف بھی باندھنے کی پٹی تھی اور آگے کی طرف زبان جیسی نوکدار تھی۔ اس کی بہت سی برکتیں ہیں۔ بعض لوگ اسے بطور تعویذ استعمال کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے قدم کی خاک بھی مبارک ہے۔ پاپوش کے تبرک ہونے میں تو بات ہی نہیں۔ بلکہ اس کے نقش میں بھی بڑی برکتیں ہیں۔ حضرت تھانویؒ نے زاد السعید کے نام سے ایک رسالہ تحریر کیا ہے۔ اور اس میں وہ برکات و فیوضات لکھی ہیں جن کا تجربہ مشائخ کو ہوا ہے۔ عموماً اہل اللہ حضرات اس نقش سے توسل کرتے ہیں۔ سر پر رکھ کر دعا کرتے ہیں۔ ایک شاعر شیخ محمد بن محمد الجزریؒ نے بہت خوبصورت انداز میں نعل مبارک کے نقش سے متعلق اشعار کہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ

يا طالباً تمثال نعل نبیہ هاقد وجدت الى اللقاء سبيلا

فاجعله فوق الراس واخضعن له وفتغال فيه واولد التقبيل

(۱) نعل جوئے، اور پاپوش کو کہا جاتا ہے۔ مواہب الدنیہ میں لکھا ہے کل ما وقیت به القلم عن الارض (ص ۶۹)

یہ لفظ مصدر بھی استعمال ہوتا ہے اور اسم بھی اور یہاں دونوں کا احتمال ہے وہی ہنا محتملہ الائن

(الحافات ص ۱۲۱) (مختار)

(۲) رسول اللہ ﷺ کے پاپوش کے بارے میں مواہب ۸۰ میں وقد كانت نعله ﷺ مخرصة معقبة ملسنة کہ آپ ﷺ کی پاپوش کی کمر باریک پشت والے عقب والا تھا (جسکے تہ سے ایڑی باندھی جاتی تھی) اور اس کا اگلا حصہ زبان کی طرح نکلا ہوا تھا یہ تینوں آنحضرت ﷺ کے فطین مبارک کے امتیازی صفات تھیں (مختار)

من يدعى الحب الصحيح فإنه يثبت على ما يدعيه دليلاً (۱)
اس باب میں کل گیارہ احادیث ہیں۔ نعل مبارک کا نقشہ اس باب کی تمام احادیث پڑھ کر ذہن میں نقش ہو جائے گا۔

(۱) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ ثنا أَبُو دَاوُدَ ثنا هَمَّامٌ عَنْ قَتَادَةَ قُلْتُ
لَأَنَسِ بْنِ مَالِكٍ كَيْفَ كَانَ نَعْلُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَهْمَا قَبْلَانِ (۲)۔
ترجمہ: حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انسؓ سے دریافت کیا۔ کہ نبی کریم ﷺ کے نعل مبارک کیسے تھے؟ انہوں نے فرمایا ہر ایک جوتی میں دو دو تھے۔
نعل مؤنث سماعی ہے۔ اس لئے کیف کانت کہنا بھی درست تھا۔ لیکن تانیث غیر حقیقی ہونے کی بناء پر کانت بھی درست ہے۔ جیسے طلوع الشمس اور طلعت الشمس علاوہ ازیں تانیث حقیقی نہ ہونے کی بناء پر اس کی تاویل ملبوس سے ہو سکتی ہے۔ اور اس کے ساتھ مذکر کا معاملہ ہو سکتا ہے۔ لہما قبلان ہر نعل کے دو دو قبائل تھے (۳)۔ قبائل قاف کے کسرہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ اور اس کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ رائج بات یہ ہے کہ قبائل وہ پٹی نما چمڑا ہوتا ہے جو انگلیوں کے درمیان سے گزر کر تلوے کے اگلے حصے کو اوپر کی پٹیوں یعنی شراک سے ملاتی ہے۔ اسے شمع بھی کہا جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے پاؤں مبارک میں دو قبائل تھے۔ جن میں سے ایک انگوٹھے اور ساتھ والی دوسری انگلی کے درمیان سے گزرتا تھا۔ دوسرا درمیانی انگلی اور اس کے ساتھ والی چھوٹی انگلی کے

(۱) اے طلب کرنے والے! نقش نعل شریف اپنے نبی ﷺ کے آگاہ ہو جا۔ تحقیق پالیا تو نے اس کے ملنے کا راستہ۔

پس رکھ اس کو سر پر اور خضوع کر اس کیلئے اور مبالغہ کر خضوع اور پے در پے اس کو بوسے دے۔

جو شخص دعویٰ کرے جی محبت کا پس بے شک وہ قائم کرتا ہے اپنے دعوے پر دلیل کو (مختار)

(۲) صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۷۱ کتاب اللباس باب قبلان فی نعل النخ، سنن ابی داؤد ۲/۲۱۷

کتاب اللباس باب الانتعال، ابن ماجہ ص ۲۶۷ کتاب اللباس باب صفة النعال، جامع ترمذی

۳۰۶/۱ کتاب اللباس باب ما جاء في نعل النبي ﷺ (مختار)

(۳) لہما قبلان کا یہ مطلب ہے کہ لکل واحد منهما قبلان یا تقسیم الاحاد علی الاحاد ہے کہ ہر ایک نعل کیلئے ایک قبائل تھا۔ تو یہاں لغوی لحاظ سے دونوں مطلب مراد ہو سکتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ہر نعل کے دو قبائل تھے (مختار)

درمیان سے گزرتا تھا (۱)۔

(۲) حَدَّثَنَا أَبُو كَرِيبٍ مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ ثَنَا وَكِيعٌ عَنْ سَفْيَانَ عَنْ

خَالِدِ الْحَدَّاءِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الْحَارِثِ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ لِنَعْلِ

رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَبَالَانِ مِثْنِي شَرَاكُهُمَا (۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے نعلین کے بالائی

تسمے دہرے تھے۔

خالد الحداء یہ جلیل القدر تابعی تھا۔ حداء موچی کو کہتے ہیں۔ راوی اور روایت میں اتفاق

موافقت ہے کیونکہ روایت جوتی کے بارے میں ہے اور راوی بھی موچی ہے (۳)۔

پیشہ باعث عار نہیں: گزشتہ زمانے میں یہ کوئی شرم کی بات نہیں تھی کہ کوئی شخص اپنے یا اپنے آبائی پیشے کی

طرف نسبت کرے۔ خواہ وہ کچھ بھی ہو۔ بہت سے فقہاء، محدثین اور مفسرین کے ساتھ آپ کو طوائی، دباغ،

وراق، حداد، اور حداد وغیرہ کے الفاظ ملیں گے۔ جو مذکورہ پیشوں کی طرف ان کی نسبت کو ظاہر کرتے ہیں۔

قبالان مثنیٰ شراکھما پاؤں کے اوپر گزرنے والی پٹی کو شراک کہا جاتا ہے۔ پشت پا کا یہ تسمہ

مثنیٰ دہرائینی دو تہوں والا تھا۔

(۳) حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مَنِيعٍ وَيَعْقُوبُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ ثَنَا أَبُو أَحْمَدَ

الزَّيْبَرِيُّ لَنَا عِيسَى بْنُ طَهْمَانَ قَالَ أَخْرَجَ الْبُخَارِيُّ ابْنُ أَبِي شَيْبَةَ

جَرْدَاوِينَ لَهُمَا قَبَالَانِ قَالَ فَحَدَّثَنِي ثَابِتٌ بَعْدَ عَنْ أَنَسٍ

(۱) شیخ بیہقیؒ نے لکھا ہے کہ کان عبدالمصنع احد القبالین بین الالبہام والتی تلیہا والآخرین الوسطیٰ

والتی تلیہا (المواہب اللدنیہ ص ۷۰) (مختار)

(۲) سنن ابن ماجہ ص ۲۶۷ کتاب اللباس باب صفة النعال، مصنف ابن ابی شیبہ ۳۱ / ۱۸ (مختار)

(۳) علامہ مناویؒ نے لکھا ہے کہ آپؐ نے موجیوں میں شادی کی تھی۔ شیخ عبدالرؤف نے آپؐ کے بارے میں لکھا ہے ثقہ

امام حافظ تابعی جلیل القدر کثیر الحدیث واسع العلم مات سنة احدى واربعين ومائة. اور بعض کا کہنا

ہے کہ چونکہ آپؐ اکثر و بیشتر موجیوں کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے اس لئے آپؐ کو الحداء کہا جاتا ہے۔ (مختار)

أنهما كانتا نعلی رسول الله ﷺ (۱)۔

ترجمہ: عیسیٰ بن طهمان کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ نے ہمیں دو جوتے جن پر بال نہیں تھے۔ نکال کر دکھلائے۔ بعد میں مجھے ثابتؓ نے حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہوئے بتایا کہ یہ نبی کریم ﷺ کی جوتیاں تھیں۔

جودا وین یہ جودا کا حثنیہ ہے اس نعل کا نام ہے جس پر بال نہ ہوں۔ اور بعض کے خیال میں جوداء وہ جوتا ہے جس پر چھوٹے چھوٹے بال ہوں۔ نبی کریم ﷺ اس قسم کے نعل اس لئے پسند فرماتے کہ اس میں نفاست زیادہ ہوتی ہے۔ گرد اور مٹی سے پاک ہوتے ہیں۔ اس کے مقابل میں شعراوین ہوتے ہیں۔ یعنی وہ جوتے جن پر ابھی بال باقی ہوں یا جس پر لمبے بال ہوں۔ یعنی ان کی چمڑے کی دباغت بالوں کے ساتھ ہوئی ہو۔ پرانے زمانے میں لوگ سادگی کے سبب شعراوین کا استعمال کرتے تھے لیکن تہذیب کی فہمری رجعت کی وجہ سے آج یہ فیشن کے طور پر پسند اور استعمال کئے جاتے ہیں (۲)۔

(۴) حدثنا اسحاق بن موسى الانصاري قال معن قال لنا مالک

لنا سعيد بن ابی سعيد المقبت عن عبيد بن جريح انه قال لا بن عمر

رايتك تلبس النعال السبتية قال انی رأيت رسول الله ﷺ يلبس

النعال التي ليس فيها شعرو يتوضأ فيها فانی احب ان البسها (۳)۔

(۱) صحیح بخاری ۴۳۸/۱ کتاب الجہاد باب ما ذکر من درع النبی ﷺ الخ (طبقات ابن سعد ۱/۲۷۷) (مختار)

(۲) تبرک باثار الصالحین کا مسئلہ: اس روایت سے تبرک باثار الصالحین بھی ثابت ہے۔ الاتحافات میں ہے ویوخذ من الحديث نذب حفظ آثار الصالحين، حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس آنحضرت ﷺ کا ایک جپہ تھا جسے وہ بیمار لوگوں کو پہنایا کرتے تھے اور اس کو دھو کر اس کا پانی لوگوں کو بغرض شفاء پلایا کرتے تھے۔ جس سے وہ ٹھیک ہو جاتا۔ ہمارے اکابر علماء دیوبند بھی تبرک باثار الصالحین کے قائل تھے اور ہیں مگر یاد رہے کہ تبرک میں ایسا مال نہ کرنا صحیح نہیں جو شرک کی حدود کو کراس کرے۔ (مختار)

(۳) صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۲۸ کتاب الوضوء باب غسل الرجلین فی النعلین الخ و کتاب اللباس ج ۲ ص ۸۷۰ باب النعال السبتية وغيرها، صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۸۶ باب بیان ان الافضل ان یحدم الخ، کتاب الحج، سنن ابی داؤد ج ۱ ص ۲۶۳ کتاب المناسک باب وقت الاحرام، سنن نسائی ۳۱/۱ کتاب الطہارة باب الوضوء فی النعل (مختار)

ترجمہ: عبید بن جریج سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا کہ آپ بغیر بالوں کے جوتے پہنتے تھے۔ (اس کی کیا وجہ ہے) تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ایسے جوتے پہنتے ہوئے دیکھا تھا جن پر بال نہیں ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ ان میں وضوء بھی فرماتے تھے اس لئے میں ان کو پہننا پسند کرتا ہوں۔

النعال السبئية. سبئية سبت سے ہے جس کے معنی کاٹنے کے ہیں۔ اور سبت سین کے کسرہ کے ساتھ گائے کی اس کھال کو کہتے ہیں جو خوب پاکائی جا چکی ہو کیونکہ اس طرح اس کے بال گر جاتے ہیں۔ ہفتے کے دن کو بھی یوم السبت اس لئے کہتے ہیں کہ اس دن اللہ تعالیٰ تخلیق کائنات سے فارغ ہو چکے تھے۔ نیز یہ یہود کی تعطیل کا دن تھا۔ وہ بھی اس دن پر کام سے کٹ جاتے تھے۔ بہر حال سبئية وہ جوتیاں ہیں جن کے بال چڑے کی دباغت کے وقت صاف کئے گئے ہوں۔ چونکہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں اس قسم کا چڑا عام طور پر استعمال نہیں ہوتا تھا۔ نیز قیمتی ہونے کی وجہ سے ہر کسی کو میسر نہ تھا۔

چنانچہ صحابہ کرام عموماً ایسے جوتے نہیں پہنتے تھے جیسا کہ بخاری شریف کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے غالب خیال یہی تھا کہ نبی کریم ﷺ نے بھی یہ استعمال نہیں کئے ہونگے۔ یہ تو صرف مترفین اور دولت مند لوگوں کو میسر ہو سکتا تھا۔ ادھر حضرت ابن عمرؓ ان کا استعمال کرتے تھے حالانکہ حضرت ابن عمرؓ اتباع سنت میں بہت مشہور تھے۔ بلکہ آپؓ تو اس قدر محو فی السبئية تھے کہ اسی نسبت سے آپؓ کو تمام صحابہ میں شہرت حاصل تھی۔ نبی کریم ﷺ کے پیچھے جاتے تو جہاں نبی کریم ﷺ کا قدم مبارک پڑتا وہیں آپؓ بھی قدم رکھتے تھے۔ حج کے سفر کے دوران راستے میں پوچھتے رہتے کہ نبی کریم ﷺ سفر حج میں کس راستے پر گئے ہیں۔ جہاں نبی کریم ﷺ اتفاقاً بھی بیٹھے تھے آپؓ بھی وہاں بیٹھتے۔ جہاں آپؓ نے قیام کیا وہاں آپؓ نے بھی قیام کیا۔ جہاں آپؓ نے پیشاب کیا وہاں آپؓ بھی پیشاب کرنے بیٹھے۔ ساری عمر ایسی اتباع اور پیروی کرتے رہے۔

سوال کا منشا: لہذا سائل کے سوال کیلئے منشا پیدا ہوا کہ تم نے تو بالوں سے صاف چڑے کی جوتیاں پہنی ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ کو یہ کب میسر تھے۔ لہذا تمہارا یہ عمل خلاف سنت تو نہیں۔ نیز اعتراض کا منشا یہ

بھی ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی جوتیاں پہننا عیش پرستوں کا شیوہ ہے۔ جواب میں حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے سنت کی مخالفت نہیں کی۔ نہ عیش پرستی میں مبتلا ہوں بلکہ میرا یہ عمل بھی اتباع سنت میں داخل ہے۔ کیونکہ میں نے خود نبی کریم ﷺ کو وہ جوتے پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ جس پر بال نہیں تھے۔ اور آپ ﷺ اس میں کبھی کبھی وضوء بھی فرماتے تھے۔ جس طرح کبھی چپل سمیت پاؤں دھوئے جاتے ہیں (۱)۔ اور تنجس اور تلویت کا اندیشہ نہ ہو تو ایسا جائز بھی ہے۔ جس طرح کہ حدیث مذکور سے اشارہ ملتا ہے۔

(۵) حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ مَنْصُورٍ ثَنَا عَبْدِ الرَّزَّاقِ عَنْ مَعْمَرٍ عَنْ ابْنِ أَبِي

ذئبٍ عَنْ صَالِحِ مَوْلَى التَّوَامَةِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ لِنَعْلِ رَسُولِ

اللَّهِ ﷺ قَبْلَانِ (۲)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے نعل مبارک کے دو تھے۔

توامة: مولى التوامه تو امر ربيعه بن اميه بن خلف کی بہن ہیں صحابیہ ہیں۔ چونکہ ولادت

کے وقت دوسری بہن کے ساتھ جڑواں پیدا ہوئی تھی اس لئے ان کو تو امہ کہا جانے لگا۔

(۶) حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مَنِيعٍ ثَنَا أَبُو أَحْمَدَ أَنَا سَفِينٌ عَنِ السَّيِّدِ حَدَّثَنِي

مَنْ سَمِعَ عُمَرَو بْنَ حَرْيْثٍ يَقُولُ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَصْلِي فِي

نَعْلَيْنِ مَخْصُوفَتَيْنِ (۳)۔

(۱) علامہ نوویؒ نے لکھا ہے کہ اس روایت کا معنی یہ بھی ہے کہ اُنہ یثوضاً ویلبسہا بعدد رجلان و طبان فانما احب ان البسہا اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جوتا پہننا چاہئے۔ البتہ مسجد کے احترام اور مقبرہ کے احترام کی وجہ سے احتراماً جوتے باہر اتارنا اصول ہے۔ (مختار)

(۲) جامع ترمذی ۱/۴۲۰ ابواب اللباس باب ما جاء في نعل النبي ﷺ شرح السنة ۲/۱۴۷ باب

النعل، کتاب اللباس (مختار)

(۳) مسند احمد ۴/۳۰۷ و ابوالشیخ ۱۳۵ (مختار)

ترجمہ: عمرو بن حریت کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ایسے جوتوں میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا جن میں دوسرا چمڑا سلا ہوا تھا۔

عن السدی: سڈہ گھر کے دروازے کو کہتے ہیں۔ یہاں مسجد کوفہ کے بڑے دروازے کی طرف نسبت کر کے اسماعیل بن عبدالرحمن کو سدی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ مسجد کے مین گیٹ کے ساتھ بیٹھ کر چہرہ کے آئینہ اور سر کے دوپٹے فروخت کیا کرتا تھا۔ یہ شیعہ راوی ہے لیکن محدثین اس کی توثیق کرتے ہیں۔

عمرو بن حریت: من سمع عمرو بن حریت، عمرو بن حریت غرضی مخزومی صحابی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کو دیکھا سنا۔ اور نبی کریم ﷺ نے ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر ان کے لئے دعا بھی فرمائی۔ نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت ان کی عمر صرف بارہ سال تھی۔ بعد میں کوفہ میں رہائش اختیار کی اور ایک زمانہ میں کوفہ کے امیر بھی رہے۔ یہیں ۸۵ھ میں وفات پائی۔ ان سے ان کے بیٹے کے علاوہ کئی دوسرے تابعین نے بھی روایت کی ہے۔ یہاں پر سدی جس شخص سے روایت کرتے ہیں۔ وہ مجہول ہے شراح نے لکھا ہے کہ یہ راوی غالباً عطاء بن السائب ہو گئے۔

مخصوصتین، یعنی ایسے جوتوں میں جس کے تلوے دو تہوں کے سلعے ہوئے مضبوط تھے۔ نصف کے معنی ”نخیاطۃ الجلد علی الجلد طیباً علی طی“ کہا جاتا ہے۔ یعنی نصف مضبوطی کے لئے ایک چمڑے کو دوسرے چمڑے پر لگانے اور چمڑے کو کہتے ہیں۔ گویا مراد یہ ہے کہ اس کا تلوہ دھرا تھا۔ لیکن چونکہ بعض احادیث میں ایک تلوے کا ذکر ہے۔ اس لئے بعض شراح نے خصوصتین کا معنی مرتعین لیا ہے یعنی آپ ﷺ پیوند لگے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ قرآن کریم میں آدم وحواء کے بارہ میں ہے لطففا یخصفان علیہما من ورق الجنة۔ (الایۃ)

جوتوں میں نماز: یہاں سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جوتوں کی یعنی طہارت کے صورت میں ان کے ساتھ نماز پڑھنا جائز ہے۔ جوتوں کی طہارت ان میں چلنے اور ان کے زمین کے ساتھ رگڑنے کی وجہ سے بھی حاصل ہو جاتی ہے لیکن جوتوں میں نماز ادا کرنا کوئی فرض اور لازم بات بھی نہیں۔ جس طرح کہ بعض

اہل نجد محض ظاہر حدیث کو دیکھ کر اس کا التزام کر لیتے ہیں (۱)۔

(۷) حدثنا إسحاق بن موسى الأنصاري أنا معن أنا مالك عن أبي

الزناد عن الأعرج عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ قال لا يمشين

احدكم في نعل واحد لينعلهما جميعا او ليحفهما جميعا (۲)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے

کوئی ایک جوتی پہن کر نہ چلے یا تو دونوں جوتیاں پہنے یا دونوں نکال دے۔

لينعلهما: یہ لفظ یا تو یائے مضمومہ کے ساتھ باب افعال کا امر غائب ہے۔ اس صورت میں ہما کی

(۱) ۱۳۸۴، ۸۳ھ میں مجھے پہلے حج اور زیارت حرمین کی سعادت حاصل ہوئی۔ رمضان شوال ذی قعدہ مدینہ منورہ میں

قیام کی سعادت نصیب ہوئی۔ ان ایام میں ہمارے کئی اہم پاکستانی دوست جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں زیر تعلیم تھے۔ ان

کی رفاقت میں مجھے بھی رحلات علیہ اور آثار مبارکہ دیکھنے کیلئے سفر کا اتفاق ہوا۔ ایک بار خیر کی طرف رحلت تھا۔ راستہ میں

ایک شب غالباً وادی القرئی میں پڑاؤ ہوا۔ رحلت کے مشرف علامہ ناصر الدین البانی (علم الجرح والتعديل کے معروف عالم

ومصنف) طلبہ سے اپنے مسلک پر سختی سے عمل کرانے پر سختی سے کار بند رہے۔ ساری جماعت کو صف واحد میں کھڑے ہو

کر جوتے پہنے ہوئے نماز کراتے رہے۔ اور کسی کو اس کے خلاف کرنے کی اجازت نہ دی۔ یہی حال درس کے دوران ان

کے تفردات کا رہا۔ میں باضابطہ طالب علم نہیں تھا پاکستانی احباب کے تعلق سے مجھے بھی بعض دروس میں اعزازی شرکت کی

سعادت ملی۔ میری شیخ البانی سے نوک جھونک جاری رہتی۔ محترم کا کاخیل صبح کرتے رہے مگر میں باضابطہ طالب علم نہ

ہونے کی وجہ سے جھجک محسوس نہ کرتا۔ یہ پاکستانی طلبہ جو میرے نہایت تخلص دوست اور مہربان بنے رہے۔ میرے صدیقی

مسم مولانا عبد اللہ کا کاخیل مولانا محمد حسن جان شیخ الحدیث پشاور، مولانا عبد الرزاق سکندر مہتمم جامعۃ العلوم الاسلامیہ

ہنوری ٹاؤن کراچی ان کے علاوہ علامہ احسان الہی ظہیر مرحوم تھے۔ سفر حج کے رفیق خاص محبت کرم حضرت مولانا قاری

سعید الرحمن کاسلپوری راولپنڈی تھے۔ (سمیع الحق)

(۲) صحیح بخاری ۸۷۰/۲ کتاب اللباس باب لا یمشی فی نعل واحد، صحیح مسلم ۲۰۵/۲

کتاب اللباس والزینۃ باب استحباب لبس النعال الخ، فی الیعنی الخ، سنن ابی داؤد ۲۱۷/۲ باب

فی الانتعال کتاب اللباس باب فی الانتعال، مؤطا امام مالک ص ۱۰۵، کتاب الجامع باب ماجاء

فی الانتعال (مختار)

ضمیر قد میں کو راجع ہوگی جن کا ذکر دلالت موجود ہے۔ اور یا پھر یائے مفتوحہ کے ساتھ ثلاثی مجرد سے امر کا صیغہ ہے اس صورت میں ہما کی ضمیر نعتین کو راجع ہونی چاہیے۔ اگرچہ قد میں کو راجع ہونے کا احتمال بھی ہے۔ نعل اور انحال دونوں پاؤں میں جوتی پہننے کو کہتے ہیں اور احفاء اس کی ضد ہے۔ بہر حال مطلب یہ ہے کہ یا تو دونوں پاؤں میں جوتیاں ہوں یا ایک بھی نہ ہو۔ ایک پاؤں پر ہنہ ہونے سے آدمی مسخرہ سا بن جاتا ہے۔

نہی کا راز: نبی کریم ﷺ امت کو بہترین معاشرتی آداب کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ کہ اگر جوتیاں پہننے ہوں تو دونوں پاؤں میں ڈالو ورنہ برہنہ پا ہی بہتر ہے۔ اور یہ تو جہالت اور سفاہت کی نشانی ہے کہ ایک پاؤں میں جوتا ہو اور دوسرا پاؤں پر ہنہ ہو۔ دونوں پاؤں پر ہنہ ہوں تو بھی آدمی کم از کم برا تو نہیں لگتا۔ لیکن فقط ایک پاؤں پر ہنہ ہونے سے آدمی مسخرہ سا بن جاتا ہے۔ جبکہ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں لبس لنا مثل السوء ان نجلس كالکلب (۱)۔

علاوہ ازیں اس قسم کے عمل میں طبی لحاظ سے بھی بڑے نقصان ہیں۔ ایک پاؤں اونچا اور دوسرا نیچے ہو تو اس سے جسم کو بہت زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ جسم تو زنجیر کی طرح کڑیوں کا ایک سلسلہ ہے بڑے باریک اور پیچیدہ پرزے ہیں۔ جو اوپر سے گوشت سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ چلتے اور حرکت کے دوران اعضاء اور اس کے جوڑ تو ازن کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔ اور اگر ایک پاؤں اونچا اور دوسرا نیچے ہو تو چلتے وقت یہ حرکت غیر متوازن ہو جاتی ہے جس سے اعضاء کی فطری وضع کو بہت نقصان پہنچتا ہے (۲)۔ پھر اس صورت میں گرنے کا بھی زیادہ احتمال ہوتا ہے جو کبھی کبھی ہمیشہ کے لئے معذور کر دیتا ہے۔ اطباء کی تحقیق کے مطابق اگر چلتے وقت توازن برقرار نہ ہو تو ریڑھ کی ہڈی اور جسم کے دیگر نظاموں کو نقصان پہنچتا ہے۔ جو

(۱) ایک نسخہ میں لبخفہما کی بجائے لبخلعہما ہے پھر ضمیر صرف نعتین کو راجع ہو سکتی ہے۔ (اصلاح الدین)

(۲) آج کل کے سائنس دان بھی یہی کہتے ہیں کہ ایک جوتا پہن کر چلتا انسانی صحت کیلئے صحیح نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انسانی جسم ایک اعصابی نظام کے تحت چل رہا ہے۔ جس کا مرکز دماغ اور حرام مغز ہے۔ جب آدمی کا ایک پاؤں نیچا اور دوسرا اڑھکا ہوا ہو تو اعصابی نظام کیلئے بہت نقصان دہ ہے۔ اس سے کٹگری کے درد میں (SHYAHTICA) مبتلا ہونے کا خطرہ ہے۔ (مختار)

جسم میں مضر اثرات چھوڑتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اطباء کی اس رائے کو بہت پہلے اپنے مذکورہ ارشاد میں واضح فرمایا ہے۔ فعليه الف حجة و سلام۔ لیکن یہ حکم بھی اس وقت کے لئے ہے جب کوئی عذر نہ ہو۔ اور اگر کسی عذر کی وجہ سے چند قدم ایک ہی جوتے میں چلنا پڑے تو مضا لقمہ نہیں۔ مثلاً ایک جوتا ٹوٹ جائے اور کسی مناسب جگہ تک پہنچنے کے لئے یونہی جانا پڑا تو ناجائز بھی نہیں ہوگا۔ بلکہ خود نبی کریم ﷺ سے بھی اس قسم کا چلنا ایک جوتی میں ثابت ہے (۱)۔ جس کا محمل یہی ہوگا۔

بہر حال اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک جوتی میں نہیں چلتے تھے بلکہ وہ اس عمل سے دوسروں کو بھی منع کرتے تھے اور اس طرح ترجمۃ الباب سے مطابقت حاصل ہوگئی۔

(۸) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ نَحْوَهُ

(۹) حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ مُوسَى أَنَا مَعْنَى أَنَا مَالِكٍ عَنْ أَبِي الزَّبِيرِ عَنْ

جَابِرٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى أَنْ يَأْكُلَ يَعْصِي الرَّجُلُ بِشِمَالِهِ أَوْ يَمْشِي فِي

نَعْلٍ وَاحِدَةٍ (۲)۔

ترجمہ: حضرت جابر فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی

فخص بائیں ہاتھ سے کھائے یا ایک جوتہ پہن کر چلے۔

یعنی الرجل حضرت جابر یا ابوالزبیر کی طرف سے یہ زیادۃ دراصل ”یا کل“ کی ضمیر کی تعیین

ہے تاکہ یہ تو ہم نہ ہو کہ ضمیر جابر گوارا ہوگی۔ اور ”رجل“ سے مراد اس جگہ فخص ہے کیونکہ عورت کے لئے

(۱) عن عائشة قالت ربما مشى النبي ﷺ في نعل واحد (جامع ترمذی ۱/۳۰۷ باب ما جاء في

الرخصة في النعل الواحد) اور خود حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہ سے ایک جوتے میں چلنا ثابت ہے۔ عن

عائشة أنها مشيت بنعل واحد (جامع ترمذی ۱/۳۰۷) رسول اللہ ﷺ کا ایسا کرنا ضرورت کے وقت بیان جواز

کیلئے تھا۔ ورنہ علماء نے لکھا ہے کہ بلا عذر ایک پاؤں میں جوتا پہن کر اور دوسرے کو خالی رکھ کر چلنا مکروہ تہذیبی

ہے۔ (مظاہر حق ۳/۲۰۸) (مختار)

(۲) صحيح مسلم ۲/۲۰۶ كتاب اللباس والزينة باب النهي عن اشتغال الصماء الخ، سنن أبي داود

باب في الانتعال ۲/۲۱ مؤطا امام مالك ص ۱۲ كتاب اللباس باب النهي من الاكل

بالشمال (مختار)

بھی یہی حکم ہے کہ نہ بائیں ہاتھ سے کھائے نہ ایک جوتا پہن کر چلے۔

یہ دونوں امور بلا عذر مکروہ ہیں جس کی وجہ پہلے گزر چکی ہے۔ ترجمۃ الباب سے مناسبت ”او یمشی فی نعل واحدہ“ میں ہے کیونکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایسا کبھی نہیں کیا ہوگا۔

(۱۰) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ عَنْ مَالِكٍ ح وَ أَنَا إِسْحَاقُ بْنُ مُوسَى أَنَا مَعْنُ أَنَا

مَالِكٍ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ إِذَا

انْتَعَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَأْ بِالْيَمِينِ وَإِذَا نَزَعَ فَلْيَبْدَأْ بِالشَّمَالِ فَلْتَكُنِ الْيَمْنَى

أَوَّلَهُمَا تَنْعَلُ وَآخِرُهُمَا تَنْزَعُ (۱)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے

جب کوئی شخص جوتے پہنے تو پہلے دائیں جانب سے ابتداء کرے اور جب نکالے تو

بائیں سے نکالے پس دایاں پاؤں جوتا پہننے میں مقدم اور نکالنے میں مؤخر ہونا چاہیے

دائیں سے ابتداء کیوں؟ فَلْيَبْدَأْ بِالْيَمِينِ الخ اس حدیث میں جوتے پہنتے وقت تیمن کا حکم دیا گیا

ہے۔ نبی کریم ﷺ کا عمل اور سنت نبوی ﷺ کا ضابطہ یہ ہے کہ جو کام تشریف، کرامت اور تزئین کے باب

سے ہے اس کو دائیں جانب سے شروع کرنا چاہیے (کل ما كان من قبل العزيم والعكس

والتشريف) ورنہ بائیں جانب سے ابتداء کرنا مسنون ہوگا۔ کیونکہ دائیں جانب کو عند اللہ بھی شرافت اور

محبوبیت ثابت ہے۔ چنانچہ اہل جنت عرش کے دائیں جانب ہو گئے۔ انہیں اعمالنا سے دائیں ہاتھ میں

دیئے جائیں گے۔ کاتب حسنات دائیں طرف ہوتا ہے۔ پھر حسنات میزان کے دائیں پلڑے میں رکھ کر

تولے جائیں گے (۲)۔

(۱) صحیح بخاری ۸۷۰/۲ کتاب اللباس باب ینزع فعل بالیسوی، سنن ابی داؤد ۲۱۷۲/۲ کتاب

اللباس باب فی الانتعال، جامع ترمذی ۳۰۷۱/۱ کتاب اللباس باب ما جاء بأی رجل یبدأ

إذا انتعل (مختار)

(۲) صاحب مظاہر حق علامہ قطب الدین محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ دایاں پاؤں بائیں پاؤں کے نسبت زیادہ دیر تک

رہے گا۔ گویا یہ دائیں پاؤں کے اعزاز و احترام کا ذریعہ ہے۔ اسی پر مسجد وغیرہ میں داخل ہونے اور نکلنے کو بھی قیاس

کیا جاسکتا ہے۔ (ظاہر حق ۲۷۷/۲) (مختار)

(۱۱) حَدَّثَنَا أَبُو مُوسَى مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى أَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ أَنَا شُعْبَةُ ثَنَا أَشْعَثُ وَهُوَ ابْنُ أَبِي الشَّعَثَاءِ عَنْ أَبِيهِ عَنْ مَسْرُوقٍ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَحِبُّ التِّيَامَنَ مَا اسْتَطَاعَ فِي تَرْجَلِهِ وَتَنَعَلَهُ وَطَهْرَهُ (۱)۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنے بال کنگھی کرنے میں، جوتے پہننے میں اور وضوء میں حتی الوسع دائیں جانب سے ابتداء فرماتے تھے۔

فی تَرْجَلِهِ وَتَنَعَلَهُ۔ اسی میں ترجمہ الباب بھی ہے۔ کیونکہ اس میں پاؤں سے متعلق نبی کریم ﷺ کی عادت مستمرہ کا بیان ہے کہ آپ ﷺ جوتے پہننے وقت بھی دائیں جانب سے ابتداء فرماتے تھے۔ مذکورہ تین چیزوں میں حین مختصر نہیں۔ بلکہ لباس، تہتین، اور دیگر عادات شریفہ میں آپ ﷺ دائیں جانب سے ابتداء فرماتے تھے۔ جس طرح کہ بعض احادیث میں ”وفی شأنہ کلمہ“ کا اضافہ بھی مروی ہے (۲)۔

(۱۲) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مَرْزُوقٍ أَبُو عُبَيْدٍ اللَّهُ ثَنَا عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ قَيْسٍ أَبُو مَعَاوِيَةَ أَنَا هِشَامٌ عَنْ مُحَمَّدٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ لِنَعْلِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَبْلَانِ وَأَبَى بَكْرٍ وَعُمَرُ وَأَوَّلُ مَنْ عَقَدَ عَقْدًا وَاحِدًا عِثْمَانُ (۳)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے نعلین کے دو دو تھے۔ اسی طرح ابو بکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کے جوتوں میں بھی دو تھے اور سب سے پہلے حضرت عثمانؓ نے ایک قبائل کے جوتے بنوائے۔

(۱) مسند احمد ۶/۹۳، طبقات ابن سعد ۲/۱۶۸ (مختار)

(۲) گویا اس حدیث مبارک میں یہ ضابطہ بیان ہوا کہ فضیلت والے کام کو دائیں طرف سے شروع کرنا مندوب ہے مثلاً جوتا پہنا، مسجد میں داخل ہونا، کنگھی کرنا، اور جو عمل ایسا نہ ہو اس کو بائیں طرف سے شروع کیا جائے مثلاً مسجد سے نکلنا، بیت الخلاء میں داخل ہونا، جوتا نکالنا۔ (مختار)

(۳) مجمع الزوائد ۵/۲۴۳ کتاب اللباس باب ما جاء في الخفاف والنعال، طبرانی فی الصغیر ۱/۹۲ (مختار)

اندازِ پاپوشی بدلنے کی وجہ: اَوَّل من عقد عقدا واحدا عثمان۔ چونکہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں فیشن تبدیل ہو چکا تھا۔ ایک قبّال کی جوتیاں بننے اور استعمال ہونے لگی تھیں۔ اس لئے آپؐ نے بھی اسی طرز کی جوتیاں پہنیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپؐ نے یہ کام بطور بدعت کیا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح لباس اور کپڑوں کی ہیئت اور ڈیزائن بدلتے رہتے ہیں جوتوں کے بھی زمانہ قدیم سے سینکڑوں ڈیزائن بدل چکے ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ سے قبل جوتیاں دو قبّالوں کی بنتی تھیں۔ لیکن آپؐ کے زمانہ میں یہ ڈیزائن مقبول ہوا۔ اور ایک قبّال کی ایسی جوتیاں استعمال میں آنے لگیں جن کا قبّال انگوٹھے اور ساتھ کی دوسری انگلی کے درمیان ہوتا تھا۔ اور چونکہ لباس میں توسع ہے۔ اس لئے آپؐ نے بھی تمام لوگوں کی طرح ایک ہی قبّال کے جوتے پہننا شروع کر دیئے۔

علاوہ ازیں آپؐ کے اس عمل سے بیان جواز بھی ہوتا ہے تاکہ یہ تو ہم لوگوں میں پیدا نہ ہو کہ ایک قبّال کی جوتیاں پہننا جائز نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کے عمل کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو آج مختلف قسم کے بوٹ اور چپل وغیرہ پہننا ناجائز ہوتے۔

۱۲۔ باب ما جاء في ذكر خاتم رسول الله ﷺ

نبی کریم ﷺ کے انگٹھی کے بیان میں

اس باب میں مصنف نے خلاف عادت ”ذکر“ کے لفظ کا اضافہ کر دیا ہے۔ اس کے لئے علماء یہ نکتہ بیان فرماتے ہیں کہ چونکہ اس سے قبل باب خاتم النبوة گزر چکا ہے جس میں مہر نبوت کا ذکر تھا۔ اور اس باب سے تمیز کرنا مقصود تھا۔ جس کے لئے یہاں یہ لفظ زیادہ کر دیا گیا۔

مہر کیلئے انگٹھی: خاتم کا لفظ تاء کے فتح اور کسرہ دونوں کے ساتھ مہر کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اور ما یختم بہ یعنی آلہ مہر کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور چونکہ پرانے زمانے میں انگٹھی کے ذریعے مہر لگایا جاتا تھا۔ جس میں مہر کے الفاظ کندہ ہوتے تھے۔ اس لئے مطلقاً اس انگٹھی کو بھی خاتم کہا جانے لگا، جس میں تکینہ لگا ہوتا تھا۔ البتہ صرف حلقہ یعنی چھلے کو عربی میں فتحہ کہتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے مہر کے لئے انگٹھی بنوا کر اس کا استعمال فرمایا ہے (۱) جس طرح کہ اس باب کی

متعدد حدیثوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

(۱) مشاہیر امت کے انگٹھیوں پر نقش کلمات: رسول اللہ ﷺ کی انگٹھی پر محمد رسول اللہ نقش تھا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی انگٹھی پر نعم القادر، حضرت عمر فاروقؓ کی انگٹھی پر کفی بالموت واعطاء، حضرت عثمانؓ کی انگٹھی پر تبصرون اولئین، حضرت علیؓ کی انگٹھی پر لله المملک، حضرت خذیفہؓ کی انگٹھی پر الحمد لله، امام ابو حنیفہؒ کی انگٹھی پر قل خیراً والافسکت، امام ابو یوسفؒ کی انگٹھی پر من عمل برائہ فقلندم، امام محمدؒ کی انگٹھی پر من صبر ظفر، قطب الاقطاب مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی انگٹھی پر رشید احمد، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی انگٹھی پر احمی عاقبت عمدہ گرداں کے الفاظ نقش تھے۔ اور شارحین نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت آدمؑ کی انگٹھی پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی انگٹھی پر انا للہ لا الہ الا انما محمد عبدی ورسولی کے الفاظ کندہ تھے۔ (ما خوذ المواهب اللدنیہ ص ۷۶، ۷۷، شرح مسلم للنووی ۱/۱۹۶، آفتاب نبوت کی کرنیں ص ۲۳۶) علامہ بیجوریؒ مذکورہ تفصیل بیان کرتے ہوئے محکم طبرانی کے حوالہ سے لکھتے ہیں وفي معجم الطبرانی مرفوعاً کان فصی خاتم ملیحان بن داؤد مملوياً ألقى اليه من السماء فأخذه فوضعه في خاتمه فكان نقشه انا لله لا اله الا انما محمد عبدی ورسولی (المواهب اللدنیة ص ۷۶، ۷۷) (مختار)

(۱) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ وَغَيْرُ وَاحِدٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ وَهَبٍ عَنْ
يُونُسَ عَنْ ابْنِ شَهَابٍ عَنْ أَنَسٍ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ خَاتَمُ النَّبِيِّ ﷺ
مِنْ وَرَقٍ وَكَانَ فَصَهُ حَبْشِيًّا (۱) .

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی انگوٹھی چاندی کی تھی اور
اس کا نگینہ حبشی تھا۔

من ورق ورق راء مکسورہ اور راء ساکنہ دونوں کے ساتھ چاندی کو کہتے ہیں۔ اس حدیث سے یہ
بات معلوم ہو رہی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انگوٹھی کا استعمال فرمایا ہے۔ بعض روایات میں یہ بات مذکور ہے
کہ آپ ﷺ انگوٹھی مہر کیلئے استعمال کرتے تھے، پہنتے نہ تھے۔ مگر صحیح احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ
آپ ﷺ انگوٹھی پہنتے بھی تھے مگر کبھی کبھی پہنتے تھے۔ اسی طرح صحابہ کرامؓ نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں
اسے پہنتے تھے۔ اور آپ ﷺ انکار نہیں فرماتے تھے۔ پھر بھی بعض علماء نے یہ تفصیل کی ہے کہ بادشاہ، قاضی
اور مہر کا استعمال کرنے والے دیگر افراد کے لئے انگوٹھی کا استعمال مندوب ہے۔ جبکہ دوسرے لوگوں کے
لئے یہ ناجائز ہے۔ لیکن اکثر ائمہ احناف کی رائے یہ ہے کہ یہ مطلقاً یعنی مہر کے لئے ہو، یا اس کے بغیر ہو
جائز ہے۔ بلکہ بعض کے ہاں مسنون ہے۔ البتہ تکبر کے طور پر یا مردوں کے لئے تزین کی نیت سے مکروہ
ہے۔ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ اگرچہ ضرورت کے وقت یہ مباح ہے مگر اس کا ترک کرنا افضل ہے۔ کیونکہ نبی
کریم ﷺ نے بوقت ضرورت ہوائی تھی۔ جس طرح کہ آگے احادیث میں آتا ہے۔

وكان فصه حبشياً اس جملے کی تفسیر میں شرح حدیث سے متعدد اقوال منقول ہیں جو درج
ذیل ہیں۔

اول: یہ کہ اس کا نگینہ زرع یعنی گونگے سیدوں سے یا عقیق سے بنا ہوا تھا۔ جس کی کانیں یمن
کی طرح حبشہ میں بھی ہوتی ہیں اس وجہ سے اسے حبشی کہا گیا۔

(۱) صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۰۵ کتاب اللباس والزینۃ باب تحریم خاتم اللہب علی الرجل ونسخ
ماکان من اباحتہ فی اول الاسلام، مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۷۹ باب الخاتم شرح السنۃ ۲/۲۵۱
باب فص الخاتم، کتاب اللباس (مختار)

وغیر و احد یہ گزشتہ باب کی کہ چھٹی حدیث کا اعادہ ہے وہاں مصنف نے اپنے شیوخ میں تین روایوں کے نام لئے ہیں۔ (۱) احمد بن عبدہ غنی (۲) علی بن حجر (۳) ابو جعفر محمد بن الحسین اس باب میں اول الذکر دو شیوخ ذکر کرنے کے بعد ”وغیر واحد“ کہا۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مذکورہ دور روایوں کے علاوہ متعدد راوی ہیں ایک نہیں۔ جبکہ گزشتہ باب میں صرف ایک کا ذکر ہے۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے۔ اس حدیث میں مصنف کے شیوخ تین سے زیادہ ہوں اور یہاں پر مذکورہ رواۃ کے علاوہ متعدد رواۃ اور بھی ہوں اس باب میں ان کی طرف اشارہ ہے جبکہ گزشتہ باب میں صرف ذکر کرنے سے زیادہ ہونے کی نفی نہیں ہوتی، لہذا غیر واحد درست ہے، مولیٰ غفرۃ، غفرۃ حضرت بلالؓ کی بہن ہیں۔ راوی ان کا آزاد کردہ غلام ہے۔ اس کی مزید تشریح گزشتہ باب میں گزر چکی ہے (۱)۔

(۵) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ أَنَا أَبُو عَاصِمٍ أَنَا عَلْمَةُ بْنُ ثَابِتٍ حَدَّثَنِي
عَلْبَاءُ بْنُ أَحْمَرَ الْيَشْكُرِيُّ قَالَ أَبُو زَيْدٍ عُمَرُ بْنُ أَكْطَبِ الْأَنْصَارِيِّ قَالَ
قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَا أَبَا زَيْدٍ ادْنِ مِنِّي فَاْمَسَحَ ظَهْرِي فَمَسَحَتْ
ظَهْرَهُ فَوَلَعَتْ أَصَابِعِي عَلَى الْخَاتَمِ قُلْتُ وَمَا الْخَاتَمُ قَالَ شَعْرَاتُ
مَجْتَمَعَاتِ (۲)۔

ترجمہ: علباء بن احمر کہتے ہیں کہ ابو زید عمرو بن اکطب انصاری نے مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ قریب ہو جاؤ اور میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرو میں

(۱) یہ روایت گزشتہ باب میں چھٹے نمبر طویل حدیث ذکر ہے یہاں اس روایت کو دوبارہ لانے کی وجہ باب کو ثابت کرنا ہے۔ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے وقد تقدم الحديث في اول الكتاب في الباب الاول والمقصود من ايراد في هذا الباب قوله بين كفيه خاتم النبوة فانه يدل على وجود الخاتم وتعيين محله من جسده ﷺ (جمع الوسائل ۶/۱) اور علامہ بیہقیؒ نے بھی یہی لکھا ہے قوله فذكر الحديث بطوله أي المقدم في اول الكتاب وإنما أورده هنا جمالا لأجل قوله بين كفيه خاتم النبوة وللك صرح به بقوله وقال بين كفيه الخ (المواهب اللدنية ص ۳۳) (مختار)

(۲) المسحرك للحاكم ۲/۶۰۶، مسند احمد ۵/۷۷ (مختار)

دوم: یہ کہ حبشی سبزی مائل زبرد کی ایک قسم ہے۔ جو بلاد حبش میں پایا جاتا ہے۔ حکیم بن بيطار نے اس کو اپنے مفردات میں ذکر کیا ہے۔ اور اس کے طبی خواص بھی لکھے ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے بھی اسے نقل کیا ہے۔

سوم: یہ کہ اس کے نگینے کا رنگ حبشی یعنی سیاہی مائل سرخ تھا۔
 چہارم: یہ کہ اس کے تراشنے والا اور کندہ کرنے والا شخص حبشی تھا۔
 پنجم: یہ کہ یہ حبشی طرز پر تراشا گیا تھا۔ جس طرح آپ ﷺ کی تلوار کے بارے میں آتا ہے کہ ”وكان حنفياً“ یعنی آپ ﷺ کی تلوار بنو حنفیہ کی تلواروں کی طرح تھی۔
 ششم: یہ کہ یہ حبشہ سے لایا گیا تھا۔ لہذا حبشہ کی طرف منسوب تھا۔

تنبیہ:

چاندی کی انگوٹھی: آگے حضرت انسؓ کی ایک اور روایت میں آتا ہے کہ ”كان خاتم رسول الله ﷺ من فضة فصد منه“ جس سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ آپ ﷺ کی انگوٹھی کا نگینہ بھی انگوٹھی کی طرح چاندی سے تھا۔ ہماری پہلی اور دوسری توجیہ پر یہ کہنا پڑے گا کہ نبی کریم ﷺ کی دو انگوٹھیاں تھیں۔ جبکہ مؤخر الذکر چاروں توجیہات پر سرے سے تعارض ہی نہیں۔
 لیکن امام بیہقیؒ کی رائے ہے کہ جس انگوٹھی کا نگینہ حبشی تھا۔ وہ سونے کی بنی ہوئی تھی۔ اور دوسری انگوٹھی چاندی کی بنی ہوئی تھی۔ جس کا نگینہ بھی اسی چاندی سے تھا۔ واللہ اعلم۔

(۲) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ أَنَا أَبُو عَوَانَةَ عَنْ أَبِي بَشْرٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ ابْنِ عَمْرٍَا

النَّبِيِّ ﷺ اتَّخَذَ خَاتَمًا مِنْ فِضَّةٍ فَكَانَ يَخْتَمُ بِهِ وَلَا يَلْبِسُهُ قَالَ أَبُو

عِيسَى أَبُو بَشْرٍ اسْمُهُ جَعْفَرُ بْنُ أَبِي وَحْشِيَةَ (۱)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی

بنوائی۔ جس سے آپ ﷺ مہر لگوا کر تے تھے اور پہنتے نہ تھے۔

پہنتے یا نہ پہنتے کی تفصیل: فکان یختم بہ ولا یلبسہ یعنی اپنی طرف سے بادشاہوں کے پاس آپ ﷺ جو خطوط بھیجتے تھے۔ ان پر اس انگوٹھی سے مہر لگاتے تھے لیکن اسے پہنتے نہ تھے۔ بظاہر اس حدیث کا بعد کی آنے والی حدیث اور ان روایات سے تعارض معلوم ہوتا ہے جن میں نبی کریم ﷺ کے انگوٹھی پہنتے کا ذکر ہے۔ چنانچہ دونوں روایتوں میں تطبیق کے لئے مختلف اقوال منقول ہے۔

اول: یہ کہ لا یلبسہ کا مطلب یہ ہے کہ دایمًا نہیں پہنتے تھے۔ کبھی بکھار پہنتے تھے۔
دوم: یہ کہ آپ ﷺ کی دو انگوٹھیاں تھیں ایک کو صرف مہر کی غرض سے رکھتے تھے۔ پہنتے نہ تھے۔ اور دوسری انگوٹھی پہنتے تھے۔ تاکہ دوسرے لوگ دیکھ کر آپ ﷺ کی اقتداء کریں۔
سوم: یہ کہ ابتداء صرف مہر کی نیت سے بنوائی تھی۔ پہنتے نہ تھے۔ لیکن بعد میں پہننا بھی شروع کیا۔ تو اس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ نے پہننے کی نیت سے انگوٹھی نہیں بنوائی تھی۔ بلکہ مہر کی غرض سے بنوائی۔ اس کی تائید اگلی احادیث سے بھی ہوتی ہے۔

بہر حال روایات اس بات پر ناطق ہیں کہ نبی کریم ﷺ انگوٹھی پہنتے تھے۔ اسی طرح صحابہ کرام آپ ﷺ کی زندگی میں۔ اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد انگوٹھیاں پہنتے تھے۔ البتہ یہ بات ملحوظ رہے کہ انگوٹھی چاندی کی پہننا چاہیے۔ سونے کا استعمال مردوں کے لئے ناجائز ہے۔ اس طرح لوہے اور تانبے وغیرہ کی انگوٹھیوں سے بھی ممانعت مروی ہے۔ اس لئے علامہ مناویؒ اور ملا علی قاریؒ کے کلام میں اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ ایک روایت میں اگرچہ یہ بات مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ایک انگوٹھی لوہے کی تھی مگر نہیں میں وارد ہونے والی احادیث سے کم از کم کراہت تنزیہی معلوم ہوتی ہے۔

(۳) حدثنا محمود بن غیلان نا حفص بن عمر بن عبیدہ

الطنافسی أنا زہیر عن حمید عن انس قال کان خاتم رسول اللہ ﷺ

من فضة وفصه منه (۱)۔

(۱) سنن ابی داؤد ۲/۲۲۸ کتاب الختم باب ماجاء فی اتخاذ الخاتم، سنن نسائی ۲/۲۵۱ کتاب

الزینة باب صفة خاتم النبی ﷺ، جامع ترمذی ۱/۳۰۳ کتاب اللباس باب ماجاء ما یستحب فی

لص الخاتم، (منتخب)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی انگوٹھی چاندی کی تھی۔ جس کا نگینہ بھی چاندی ہی کا تھا۔

افضہ منہ بعض شراح نے لکھا ہے کہ منہ کی ضمیر فضہ کو راجع ہے۔ لیکن پھر تو منہ نہیں بلکہ منہا ہونا چاہیے تھا۔ الایہ کہ فطنت کی تاویل ورق سے کر کے مذکر کی ضمیر راجع کی جائے۔ اس لئے اکثر شراح نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ منہ کی ضمیر خاتم کو راجع ہو اور اور من تبعیضیہ ہو۔

اہل عجم کے نام مکاتیب کیلئے مہر:

(۴) حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ مَنْصُورٍ أَنَا مَعَاذُ بْنُ هِشَامٍ ثَنَى أَبِي عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ لَمَّا أَرَادَ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَكْتُبَ إِلَى الْعِجَمِ قِيلَ لَهُ إِنَّ الْعِجَمَ لَا يَقْبَلُونَ إِلَّا كِتَاباً عَلَيْهِ خَاتَمٌ لَمْ يَصْطَنِعْ خَاتِماً فَكَانَتِ أَنْظُرُ إِلَى بَيَاضِهِ فِي كَفِّهِ (۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب اہل عجم کو خطوط لکھنے کا ارادہ فرمایا۔ تو ان سے کہا گیا کہ عجم کے لوگ بغیر مہر کے خط قبول نہیں کرتے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے انگوٹھی بنوائی۔ جس کی سفیدی گویا اب بھی میری نظروں کے سامنے ہے۔

ان یکتب إلى العجم الخ ۶ھ کے اواخر میں صلح حدیبیہ کے بعد جب قریش کی جانب سے آپ ﷺ کو اطمینان ہوا۔ تو آپ ﷺ نے اشاعت دین کے فریضے کی طرف خوب توجہ دی۔ اس سلسلے میں نبی کریم ﷺ نے زبانی دعوت کے ساتھ ساتھ اسلام کی طرف تحریری دعوت بھی دی تھی۔ مختلف بادشاہوں کے نام آپ ﷺ نے خطوط لکھ کر محرم ۷ھ میں بھیجے۔ جن میں دین حق کی طرف آنے

(۱) صحیح مسلم ۲/۲۰۴ کتاب اللباس والزینباج تحريم خاتم الذهب على الرجال ونسخ

ماکان من اباحتہ فی اول الاسلام، جامع ترمذی ۲/۱۰۱ کتاب الاستبذان باب ماجاء فی ختم

کی دعوت دی گئی تھی۔ الا کتابا علیہ خاتم مہر کے بغیر خط قبول نہ کرنے کا سبب یا تو یہ تھا کہ اس طرح ان کی تعظیم میں کمی ہو جاتی تھی۔ جو ان کے لئے قابل قبول نہ تھا۔ علاوہ ازیں خط پر اعتماد بھی باقی نہیں رہتا۔ کہ شاید کوئی اپنی طرف سے اس میں کمی یا اضافہ کر دے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان بادشاہوں کی یہ بھی خواہش ہوتی تھی کہ کسی پران کے راز ظاہر نہ ہوں اور مہر زدہ خط میں راز کا انکشاف نہیں ہوا کرتا۔

فاصل طبع خاتماً یعنی آپ ﷺ نے اپنے لئے ایک انگوٹھی بنانے کا حکم دیا۔ علامہ بیجوریؒ اور منادیؒ نے لکھا ہے کہ یہ ذی القعدةؑ کا واقعہ ہے۔ نیز یہ بھی لکھا ہے کہ اس میں دشمنوں کی تالیفِ قلب اور لوگوں کے ساتھ ان کی پسند کے مطابق طرز معاشرت اختیار کرنے کا استنباب معلوم ہو رہا ہے۔ واضح رہے کہ آپ ﷺ کی انگوٹھی حضرت یعلیٰ بن امیہؓ نے آپ ﷺ کے لئے بتائی تھی۔

کانتی انظر إلى بياضه الخ راوی کا اس جملہ سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ یہ انگوٹھی چاندی کی تھی کیونکہ سفیدی چاندی میں ہوتی ہے۔ نیز ممکن ہے راوی کی غرض اپنے اتقان اور کمالِ استخار کی طرف اشارہ ہو کہ گویا ابھی اس کی آنکھوں میں وہ منظر نمایاں ہے۔

کلمات نقش کی ترتیب:

(۵) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَىٰ أَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ الْأَنْصَارِيُّ ثَنِي

أَبِي عَنْ ثَمَامَةَ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ نَقْشُ خَاتَمِ النَّبِيِّ ﷺ

مُحَمَّدٌ سَطْرٌ وَرَسُولٌ سَطْرٌ وَاللَّهُ سَطْرٌ (۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی انگوٹھی کا نقش یوں تھا کہ محمد

ایک سطر، رسول دوسری سطر اور لفظ اللہ تیسری سطر میں تھا۔

محمد سطر الخ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اوپر سے پہلی سطر پر لفظ محمد، دوسری پر لفظ رسول اور

(۱) صحیح بخاری ۱/۳۳۸ کتاب الجہاد باب ما ذکر من دواع النبی ﷺ وعصاه وسيفه وخاتمہ،

جامع ترمذی ۱/۳۰۵ کتاب اللباس باب ما جاء في نقش الخاتم، صحیح ابن حبان ۸/۱۰۳ باب

من صفته ﷺ و اخباره (مختار)

تیسری سطر پر لفظ اللہ کندہ تھا۔ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ پہلی سطر لفظ اللہ، دوسری سطر لفظ رسول اور تیسری سطر لفظ محمد پر مشتمل تھا۔ اور یہ کلمہ نیچے سے پڑھا جاتا تھا۔ اس لئے کہ پہلی صورت میں اللہ تعالیٰ کے نام کی تعظیم میں فرق پڑتا ہے۔ لیکن علامہ ابن حجرؒ نے اس پر اعتراض کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ احادیث میں لفظ اللہ کے اوپر لکھنے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس معمول کے مطابق نقش کا تذکرہ موجود ہے۔ علاوہ ازیں قرآن مجید میں لفظ اللہ کی زبانی تاخیر منقوش مقروء ہے۔ اور مضرب نہیں ہے تو یہاں پر کیوں مضرب ہے۔

اس حدیث میں صرف انہی تین لفظوں کی کتابت کا تذکرہ موجود ہے بعض دوسری روایات میں یہی کلمات بسم اللہ اور بعض میں لا الہ الا اللہ کے اضافے کے ساتھ مروی ہیں مگر ان روایات کی تضعیف کی گئی ہے۔ بہر حال اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کی انگوٹھی کی ساخت اور نقش کی قدرے تفصیل ہے۔ یہ بات کہ یہ خاتم مربع، بیگون، یا گول تھا۔ اس بارے میں احادیث میں کوئی تصریح نہیں ہے۔ علامہ بیہقیؒ نے زین الدین عراقیؒ سے بھی یہی نقل کیا ہے کہ یہ تفصیل منقول و مروی نہیں ہے۔

انگوٹھی پر لفظ اللہ کا حکم: علامہ نوویؒ نے ابن سیرینؒ اور بعض دوسرے علماء سے یہ بات نقل کی ہے کہ انگوٹھی پر اللہ تعالیٰ کا نام کندہ کرنا مکروہ ہے۔ لیکن ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ ابن سیرینؒ سے اس کی اباحت بھی مروی ہے۔ البتہ جہاں پر اللہ تعالیٰ کے مبارک اسم کی بے حرمتی کا خطر ہو مثلاً جب آدمی کو یہ انگوٹھی پہننا پڑے یا اسی ہاتھ سے استنجا کرے جس میں انگوٹھی پہنی ہو۔ اس صورت میں یہ مکروہ ہے۔ ورنہ انگوٹھی پر لفظ اللہ کندہ کرنا یا اپنا نام لکھنا جائز ہوگا۔

کسریٰ قیصر اور نجاشی:

(۶) حَدَّثَنَا نَصْرُ بْنُ عَلِيٍّ الْجَهْضَمِيُّ أَبُو عَمْرٍو أَنبَانَا نُوحُ بْنُ قَيْسٍ

عَنْ خَالِدِ بْنِ قَيْسٍ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَتَبَ إِلَى كَسْرَى

وَقَيْصَرَ وَالنَّجَاشِي فَقِيلَ لَهُ إِنَّهُمْ لَا يَقْبَلُونَ كِتَابَهَا إِلَّا

بِخَاتَمِ فَصَاغِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ خَاتَمًا حَلَقَتْهُ فَضَّةٌ وَنَقَشَ فِيهِ

محَمَّد رسول الله ﷺ (۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کسریٰ اور قیصر اور نجاشی کے پاس تبلیغی خطوط لکھنے کا ارادہ فرمایا۔ کسی نے کہا کہ یہ لوگ بغیر مہر کے خط قبول نہیں کرتے۔ تو نبی کریم ﷺ نے ایک مہر بنوائی۔ جس کا حلقہ چاندی کا تھا اور اس میں محمد رسول اللہ منقوش تھا۔

إلى كسرى وقيصر والنجاشي. كسرى فارسی شہنشاہوں کا لقب تھا۔ جو اصل میں خسرو کا معرب ہے۔ اس وقت کے کسریٰ کا نام پردیز تھا۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن حذافہ کے ذریعے اس کے پاس یہ خط بھیجا۔ اور جب حضرت عبداللہ نے خط اس کے حوالے کیا تو اس نے غصہ میں اسے پھاڑ کر اس کی اہانت کی۔ نبی کریم ﷺ کو پتہ چلا تو آپ ﷺ نے اس کے حق میں بددعا فرمائی۔ اور اس کی سلطنت بھی اسی طرح پاش پاش ہو کر رہ گئی۔

قیصر رومی بادشاہوں کا لقب تھا۔ اس وقت کے بادشاہ کا نام ہرقل تھا۔ اس کے پاس حضرت وحید کلبیؓ نبی کریم ﷺ کا خط لائے تو اس نے خط کی تکریم کی۔ اور اسے اپنے ہاں محفوظ کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی سلطنت بھی محفوظ کر لی۔

نجاشی حبشہ کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی زندگی میں دو نجاشی گزرے ہیں۔ ایک کا نام اصمہ بن بحر تھا۔ جو ۶ھ میں مسلمان ہوئے۔ اور ۹ھ کو وفات پائی۔ یہ ایمان لا چکے تھے۔ اور اس وجہ سے نبی کریم ﷺ نے ان کی نماز جنازہ بھی غائبانہ طور پر پڑھی تھی۔ اسکے بعد جو نجاشی حبشہ کا بادشاہ بنا۔ اسکے نام مذکورہ خط لکھا گیا تھا۔ جو عمرو بن امیہ ضمیرؓ لے کر اس کے پاس لے گئے

(۱) صحیح مسلم ۲۰۴/۲ کتاب اللباس والزینة باب تحریم خاتم الذهب علی الرجال ونسح

ما كان من اباحتہ فی اول الاسلام، مشکوٰۃ ۷۸۷ باب الخاتم شرح السنة ۱۲/۱۱ باب اباحتہ خاتم

الفضة، کتاب اللباس (مختار)

تھے۔ لیکن اس بادشاہ کا نام اور اسلام دونوں پردہ خفاء میں ہیں۔

مختلف علاقوں میں بادشاہوں کے مختلف مگر مخصوص القاب ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ مصر کے بادشاہوں کو فرعون، حمیر کے بادشاہوں کو حجاج اور ترکوں کے بادشاہوں کو خاقان کہا جاتا تھا۔ یہاں پر تین بادشاہوں کے القاب کا تذکرہ ہے (۱)۔

بے ادبی سے احتراز:

(۷) حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ مَنْصُورٍ أَنَّهُ سَمِعَ بَنِي عَامِرٍ وَ الْحِجَاجِ ابْنَ

مَنْهَالٍ عَنْ هَمَّامٍ عَنْ ابْنِ حَرِيْجٍ عَنِ الزَّهْرِيِّ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ

النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا دَخَلَ الْخِلَاءَ نَزَعَ خَاتَمَهُ (۲)۔

(۱) رسول اللہ ﷺ نے جن بادشاہوں کے نام خطوط بھیجے تھے وہ درج ذیل ہیں:

بادشاہ کا نام اور ملک	بادشاہ کا اصلی نام	بھیجے گئے صحابی کا نام
نجاشی شاہ حبشہ	امحہ	عمرو بن امیہ ضمریؓ
مقوقس شاہ مصر	جرج بن فتی	حاطب بن ابی بلتعہؓ
کسریٰ شاہ فارس	خسرو پرویز	عبداللہ بن خراذہؓ
قیصر شاہ روم	ہرقل	حضرت وحیہ کلبیؓ
حاکم بحرین	منذر بن ساوی	حضرت علاء بن الحضرمیؓ
حاکم یمامہ	مبوزہ بن علی	حضرت سلیط بن عمرو عامریؓ
حاکم دمشق	حارث بن ابی شمر غسانی	حضرت شجاع بن وہبؓ
حاکم یمامہ	حضر اور اسکے بھائی	حضرت عمرو بن العاصؓ

رسول اللہ ﷺ کے ان خطوط کے بارے میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب آف فرانس نے بہت ہی بہترین تحقیق کی

ہے تحصیل کے لئے رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی ۱۲۳ تا ۱۸۷ مطالعہ کریں۔ (مختار)

(۲) سنن ابی داؤد ۴/۱ کتاب الطہارۃ باب الخاتم یكون فيه ذکر اللہ تعالیٰ یدخل به الخلاء، سنن

نسائی ۲/۲۴۶ کتاب الزینۃ باب نزع الخاتم عند دخول الخلاء، سنن ابن ماجہ ص ۲۶ کتاب

الطہارۃ باب ذکر اللہ عزوجل علی الخلاء والخاتم فی الخلاء (مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب بیت الخلاء میں داخل ہوتے تو انگوٹھی نکال لیتے تھے۔

نزع خاتمہ اس جملہ سے ایک تو اس بات کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ نبی کریم ﷺ انگوٹھی پہنتے تھے اور بیت الخلاء میں جانے سے پہلے نکال لیتے تھے۔ کیونکہ اس میں محمد اور اللہ کے دو مبارک نام منقوش تھے۔ اور ان ناموں کا بیت الخلاء جیسی گندگی کے مقامات پر لے جانا بعض کے نزدیک مکروہ تزیہی اور بعض کے ہاں مکروہ تحریمی ہے۔

بیراریس کا واقعہ:

(۸) حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ مَنْصُورٍ أَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ نَعْمِرٍ أَنَا عُبَيْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ عَنْ نَافِعٍ عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اتَّخَذَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ خَاتَمًا مِنْ وَرَقٍ لَكَانَ فِي يَدِهِ ثَمَّ كَانَ فِي يَدِ أَبِي بَكْرٍ ثَمَّ كَانَ فِي يَدِ عُمَرَ ثَمَّ كَانَ فِي يَدِ عِثْمَانَ حَتَّى وَقَعَ فِي بَثْرَارِيسَ نَقْشَهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ (۱)۔

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی جو آپ ﷺ کے ہاتھ میں رہی۔ پھر حضرت ابو بکر صدیقؓ اور پھر حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں اور پھر حضرت عثمانؓ کے ہاتھ میں رہی۔ یہاں تک کہ (ان کے زمانے میں) بیراریس میں گر گئی۔ اس انگوٹھی کا نقش محمد رسول اللہ تھا۔

لکان فی یدہ اس جملے سے بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ انگوٹھی پہنتے تھے۔ فی یدابی بکرو و عمر الخ شیخین اور حضرت عثمانؓ میں اس انگوٹھی کو کبھی کبھی پہنتے تھے۔ لیکن عام طور پر یہ انگوٹھی حضرت معقیب کے پاس بطور امانت پڑی رہتی تھی۔ بعض شراح نے ”فی یدابی بکرو“ کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ انگوٹھی حضرت ابو بکرؓ کے قبضہ اور تصرف میں ہوتی تھی۔ نہ یہ کہ وہ اسے پہنتے تھے۔ لیکن سیاق حدیث

(۱) صحیح بخاری ۸۷۳/۲ کتاب اللباس باب نقش الخاتم، صحیح مسلم ۲۰۳/۲ کتاب اللباس والزینۃ باب تحریم خاتم الذهب علی الرجال ونسخ ما کان من اباحتہ فی اول الاسلام، شرح السنۃ ۲/۱۲۲ باب اباحتہ خاتم الفضة، کتاب اللباس (مختار)

سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات اسے یا تو محض تبرک کے لئے یا اپنے خطوط و دستاویزات پر مہر لگانے کے لئے احیاناً پہنتے تھے۔

اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آپ ﷺ کی میراث آپ ﷺ کے بعد وارثوں کو نہیں ملی۔ کیونکہ یہ انگوٹھی ورنہ ان خلفاء کے ہاں رہی۔

آثار سلف صالحین کے برکات: فوق فی بیراریس بیراریس مسجد قبا کے قریب ہی ایک کنواں تھا۔ بعض شراح نے لکھا ہے کہ اریس اس باغ کا نام تھا جس میں کنواں تھا۔ اور علامہ سمودی نے تاریخ مدینہ میں لکھا ہے کہ اریس ایک یہودی تھا جس کے نام سے یہ کنواں مشہور تھا۔ حضرت عثمان نے بعد میں اس کنویں میں انگوٹھی کو خوب تلاش کیا۔ تین دن تک اس کا پانی نکالتے رہے مگر انگوٹھی کا پتہ نہ چلا۔ علماء نے لکھا کہ اس انگوٹھی میں یہ برکت تھی کہ اس کے وجود سے فتنے دبے ہوئے تھے۔ اس کے غائب ہوتے ہی فتنوں نے سر ابھارا۔ حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا۔ اور پھر صحابہؓ کی ایک کثیر تعداد فتنوں میں ضائع ہو گئی۔

جس طرح کہ سلیمانؑ کی انگوٹھی میں یہ حکمت تھی کہ جب تک آپ کے پاس رہی۔ آپ کی حکومت برقرار رہی۔ اور انگوٹھی کے غائب ہونے کے بعد آپ کی حکومت ختم ہو گئی۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس جراب تھا۔ (مکجوروں کا توشہ دان) کبھی ختم نہ ہوا۔ تم گیا تو حضرت ابو ہریرہؓ کو شدید صدمہ ہوا۔ اسی سال حضرت عثمانؓ بھی شہید ہو گئے تھے۔ دونوں حادثوں کا ایک شعر میں اس طرح ذکر کرتے۔

لنناس هم ولي همان بينهم هم الجراب وهم الشيخ عثمانؓ

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ انگوٹھی کس کے ہاتھ سے کنویں میں گر گئی تھی۔ تو امام مسلمؒ کی ایک روایت کے مطابق حضرت معقیبؓ سے گری تھی۔ یہی بات اگلی باب کی ایک حدیث سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جس طرح کی اس حدیث میں ہے اسی طرح بخاری اور مسلمؒ کی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ انگوٹھی حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے کنویں میں گری تھی۔ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ دونوں روایتوں کو اس طرح جمع کیا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے کہ حضرت عثمانؓ حضرت معقیبؓ کے ہاتھ سے انگوٹھی لے رہے ہوں یا

ان کو واپس دے رہے ہوں۔ اور درمیان میں یہ انگٹھی گر گئی ہو۔ اب راوی کو یہ شک ہو کہ انگٹھی کس کے ہاتھ سے گر گئی ہے چنانچہ کبھی حضرت عثمانؓ کو اور کبھی حضرت معقیبؓ کو اس بات کی نسبت کی جاتی ہے۔ نیز یہ بھی لکھا ہے کہ ترجیح کی بات ہو تو اصول حدیث کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ بات رائج نظر آتی ہے کہ انگٹھی حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے گری تھی (۱)۔ واللہ اعلم۔

(۱) علماء کرام فرماتے ہیں کہ یہ کنواں مسجد قباء کے پاس تھا۔ جب یہ انگٹھی گم ہو گئی تو تین دن تک مسلسل اسے تلاش کیا گیا۔ اور کنویں کا سارا پانی نکالا گیا۔ مگر انگٹھی نہ مل سکی۔ علامہ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ انگٹھی کے برکات تھے کہ جب تک وہ انگٹھی موجود تھی، تو کوئی فتنہ کھڑا نہ ہوا تھا۔ مگر جب انگٹھی گم ہو گئی، تو اس کے بعد خوارج کا ایسا فتنہ پیدا ہوا، جنہوں نے حضرت عثمانؓ غنیؓ کو شہید کیا۔ (جمع الوسائل ۱/۱۳۶، ۱۳۷) (بخاری)

۱۳۔ باب ماجاء فی أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَتَخْتَمُ فِي يَمِينِهِ

حضور اقدس ﷺ کی انگوٹھی دائیں ہاتھ میں پہننے کے بیان میں

اس سے قبل انگوٹھی کی بناؤٹ اور کیفیت کا تذکرہ تھا۔ اب اس باب میں مصنفؒ انگوٹھی پہننے کے بارے میں نبی کریم ﷺ کے قول و عمل کو بیان کر رہے ہیں۔ لیکن اس جگہ ترجمۃ الباب ہی میں ”فی یمینہ“ کہہ کر مصنفؒ نے اس بات پر تنبیہ کر دی کہ اس کے نزدیک دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا رائج ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اس باب میں بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے سے متعلق ایک بھی مرفوع حدیث ذکر نہیں کی۔ بلکہ اس بارے میں جامع ترمذی میں حضرت انسؓ کی ایک مرفوع حدیث ذکر کی ہے۔ اور اس کی بھی تصحیف کی ہے۔ اس باب میں مصنفؒ نو احادیث لارہے ہیں۔

(۱) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَهْلٍ عَنْ عَمْرِو بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ

عَبْدِ الرَّحْمَنِ قَالَ أَخْبَرَنَا يَحْيَى بْنُ حَسَّانٍ أَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ بِلَالٍ عَنْ

شَرِيكٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي نَمْرٍ عَنْ أَبِي رَاهِمٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ حَنِينٍ عَنْ

أَبِيهِ عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَلْبَسُ خَاتَمَهُ فِي

يَمِينِهِ (۱)۔

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ انگوٹھی دائیں ہاتھ میں پہنتے تھے۔

انگوٹھی کس ہاتھ میں: یلبس فی یمینہ اس باب کی احادیث میں اس بات کی تصریح ہے کہ نبی

کریم ﷺ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔ اس طرح کی دیگر متعدد روایات میں بھی دائیں ہاتھ کا ذکر

موجود ہے۔ لیکن بعض روایات میں بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے کا ذکر بھی موجود ہے۔ صحابہ کرامؓ میں سے بھی

(۱) منن ابی داؤد ۲۲۹/۲ کتاب الخاتم باب ماجاء فی التختیم فی الیمین، منن

نسائی ۲/۲۳۵، ۲۳۶ کتاب الزینۃ باب موضع الخاتم من الید (منخار)

کچھ لوگ دائیں ہاتھ میں اور کچھ بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔ محدثین حضرات اس بارہ میں دونوں قسم کی روایات کو جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جمع کی متعدد وجوہ میں سے کچھ یہ ہیں۔

اول: یہ کہ نبی کریم ﷺ پہلے ترین کی نیت سے دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔ پھر اس نیت سے انگوٹھی پہننے سے منع فرمایا۔ لیکن ضرورت کی وجہ سے جب دوبارہ پہننا پڑا، تو بائیں ہاتھ میں پہننا پسند کیا۔ جس طرح اس باب کے آخر میں مذکورہ حضرت ابن عمرؓ کی ایک روایت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

دوم: یہ کہ دائیں ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی پہنتے تھے۔ پھر اسے اتار پھینکا۔ اور چاندی کی انگوٹھی بائیں ہاتھ میں پہنتے تھے۔ جو کہ آخر الامورین بھی ہے۔

سوم: یہ کہ اکثر دائیں ہاتھ میں اور کبھی کبھی بائیں ہاتھ میں پہنتے تھے۔ مگر بعض حضرات نے دونوں قسم کی روایتوں میں ترجیح کی کوشش کی ہے۔

چنانچہ امام بخاریؒ، امام ترمذیؒ اور اکثر شوافع حضرات نے دائیں ہاتھ کی روایات کو ترجیح دی ہے۔ اور اس کی عقلی وجہ یہ بیان کی ہے۔ کہ چونکہ انگوٹھی پہننا ترین کے باب سے ہے۔ اس لئے دائیں کو ترجیح ملے گی۔ نیز یہ کہ بائیں ہاتھ سے استنجا کیا جاتا ہے۔ جس سے انگوٹھی کو نجاست پہنچنے کا احتمال ہے۔ رعی یہ بات کہ دائیں ہاتھ میں پہننا روافض یا دیگر باغیوں کا شعار تھا۔ تو وہ ایک زمانے میں ہوتا تھا اب نہیں ہے۔ لہذا اب جائز بلکہ رائج ہوگا۔ علاوہ ازیں علامہ بخاریؒ لکھتے ہیں کہ وكونه صار شعار الروافض لا اصل له (۱)۔ یعنی یہ کہ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا شیعوں کا شعار تھا۔ بے اصل بات ہے (۲)۔

فقہاء کرام میں سے بعض حضرات نے جمع روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے دونوں قسم کی روایات کو برابر اور دونوں ہاتھوں میں پہننے کو یکساں قرار دیا ہے۔ البتہ زینت کیلئے دائیں ہاتھ اور مہر کے لئے بائیں ہاتھ میں

(۱) مگر علامہ حنفیؒ نے لکھا ہے کہ وقيل اليمنى إلا أنه من شعار الروافض فيجب التحرز عنه قهستاني وغيره وقال ابن عابدين (قوله فيجب التحرز عنه) عبارة القهستاني عن المحيط جاز أن يجعله في اليمنى إلا أنه شعار الروافض (رد المحتار ودر مختار ۶ / ۳۶۱) (مختار)

انگوٹھی پہننا زیادہ موزوں ہے (۱)۔ لیکن امام مالکؒ سے یا نہیں ہاتھ میں پہننے کی کراہت بھی مروی ہے۔

احناف کا مسلک: ہمارے احناف میں سے ملا علی قاریؒ نے دائیں ہاتھ کو ترجیح دی ہے۔ لیکن

علامہ شامیؒ کی تحقیق کے مطابق علماء احناف کے ہاں رائج مذہب مساوات یا بائیں ہاتھ کی ترجیح ہے۔ بائیں ہاتھ میں پہننے کو ترجیح دینے والے اس کی عقلی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس طرح ایک تو بائیں ہاتھ کی محرومیت اور ضعف کا قدرے مداوا ہو جائے گا۔ اور اسی وجہ سے شاید اس کے لئے سب سے چھوٹی انگلی کا انتخاب کیا گیا ہے۔ دوسری یہ کہ مہر لگانے کے لئے بائیں ہاتھ سے انگوٹھی اتاری جائے گی۔ تو سیدھی دائیں ہاتھ میں

(۱) اس لئے ملا علی قاریؒ نے شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے ولا تعارض بینہما لجواز انہ فعل الامرین فکان یتختم فی الیمین مرة وفى اليسرى اخرى حسبما اتفق وليس فى شئ منها ما يدل صريحتاً على المداومة والإصرار على واحد منهما قلت قد صرح البيهقي بأن الاول منسوخ وأخرج ابن عدی وغيره أنَّه ﷺ تَخَمَّ فِي يَمِينِهِ ثُمَّ حَوَّلَهُ فِي يَسَارِهِ فكَانَ مِنْ فَعْلٍ خَلَّاهُ لَمْ يَصِلْ إِلَيْهِ النِّسْخُ وَأَقْلَهُ أَنْ يَقَالَ التَّخَمَّ فِي الْيَسْرَى أَفْضَلُ كَمَا هُوَ الصَّحِيحُ مِنْ مَذْهَبِنَا لِأَنَّهُ أَبْعَدُ مِنَ الْإِعْجَابِ وَالزُّهْرِ كَجَعْلِ فَصِهِ مِمَّا يَلِي كَفَّهُ قَالَ النَّوَوِيُّ وَقَدْ أَجْمَعُوا عَلَى جَوَازِ التَّخَمِّ فِي الْيَمِينِ وَعَلَى جَوَازِهِ فِي الْيَسْرَى وَاخْتَلَفُوا فِي أَيُّهُمَا أَفْضَلُ وَالصَّحِيحُ فِي مَذْهَبِنَا أَنَّ الْيَمِينَ أَفْضَلُ لِأَنَّهُ زِينَةُ وَالْيَمِينُ أَشْرَفُ وَأَحَقُّ بِالزَّيْنَةِ وَالْأَكْرَامِ (مرفقات شرح مشکوٰۃ ۸/۱۸۶)

اب مسئلہ یہ ہے کہ انگوٹھی کونسی انگلی میں پہنی جائے۔ تو ملا علی قاریؒ نے شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے وعن علیؑ قال نهانى رسول الله ﷺ أن اتختم أى ألبس الخاتم فى أصبعى هذه أو هذه أولتنويع قال الطيبى أرهذه ليست لترديد الراوى بل للتقسيم... فأوما بهمزة فى آخره وفى نسخة فأوى أى فأشار إلى الوسطى والنسبة إلى المسبحة ولم يثبت فى الإبهام والبنصر رواية عن النَّبِيِّ ﷺ عن الصحابة والتابعين فثبت ندبه فى البنصر وإليه جنح الشافعية والحنفية ذكره ميرك وظاهر القياس أن لبسه فى الإبهام والبنصر منهى بالنسبة إلى الرجال دون النساء وقال النووى يكره للرجل جعل الخاتم فى الوسطى والنسبة إليها كراهة تنزيهة وأما المرأة فلها الخاتم فى الأصابع كلها (مرفقات شرح مشکوٰۃ ۸/۱۸۶) گویا مرد حضرات ہاتھ کے دو چھوٹی انگلیوں میں انگوٹھی استعمال کریں اور خواتین ہاتھوں کے پانچوں انگلیوں میں استعمال کر سکتی ہیں۔ (مختار)

پڑے گی۔ جس کے ذریعے مہر لگائی جاتی ہے۔ بصورت دیگر بائیں ہاتھ میں پڑے گی اور پھر دائیں ہاتھ سے مہر لگانے کے لئے اس کو منتقل کرنا پڑے گا۔ نیز چونکہ روافض اور اہل فہمی کا شعار دائیں ہاتھ میں پہننا ہے۔ اس لئے ان سے ممانعت بھی بائیں ہاتھ میں پہننے کے لئے وجہ ترجیح ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۲) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَىٰ أَنَا أَحْمَدُ بْنُ صَالِحٍ ثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ وَهَبٍ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ بِلَالٍ عَنْ شَرِيكَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي نَمْرٍ وَهَوَ حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مَنِيعٍ أَنَا يَزِيدُ بْنُ هُرُونَ عَنْ حَمَّادِ بْنِ سَلَمَةَ قَالَ رَأَيْتُ ابْنَ أَبِي رَافِعٍ يَتَخْتَمُ فِي يَمِينِهِ فَسَأَلْتُهُ عَنْ ذَلِكَ فَقَالَ رَأَيْتُ عَبْدَ اللَّهِ ابْنَ جَعْفَرٍ يَتَخْتَمُ فِي يَمِينِهِ وَقَالَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ جَعْفَرٍ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتَخْتَمُ فِي يَمِينِهِ (۱)۔

ترجمہ: حماد بن سلمہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن ابی رافع کو دیکھا کہ ہاتھ میں انگلی پہنتے ہوئے دیکھا۔ میں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی؟ تو انہوں نے کہا کہ میں نے عبداللہ بن جعفر کو دائیں ہاتھ میں انگلی پہنتے ہوئے دیکھا۔ اور عبداللہ بن جعفر نے یہ فرمایا کہ نبی کریم ﷺ دائیں ہاتھ میں انگلی پہنتے تھے۔

عبداللہ بن جعفر: رأیت عبداللہ بن جعفر الخ حضرت عبداللہ بن جعفر رحمہما عن صحابہ میں سے ہیں۔ حضرت جعفر بن ابی طالب کے بیٹے ہیں۔ ہجرت کے پہلے سال حبشہ میں ان کی ولادت ہوئی۔ جہاں حضرت جعفر ہجرت کی زندگی گزار رہے تھے۔ ۸۰ھ میں اسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

(۳) حَدَّثَنَا يَحْيَىٰ بْنُ مُوسَىٰ أَنبَانَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ نَمِيرٍ أَنبَانَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ الْفَضْلِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ عَقِيلٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ جَعْفَرٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَتَخْتَمُ فِي يَمِينِهِ (۲)۔

(۱) منن نسائی ۲/۲۸۹ کتاب الزینۃ باب موضع الخاتم من الید، جامع ترمذی ۱/۳۰۴، ۳۰۵ کتاب اللباس باب ما جاء فی لبس الخاتم فی الیمین، شرح السنۃ للبقوی ۲/۱۶۶، ۱۶۷ باب موضع الخاتم، کتاب اللباس (مختار) (۲) تفرد بہذا الحدیث الامام الترمذی بهذا الاسناد شرح السنۃ ۲/۱۶۷ باب موضع الخاتم، کتاب اللباس (مختار)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن جعفرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔

یحییٰ بن موسیٰ بعض نسخوں میں موسیٰ بن سحیٰ لکھا ہے جو غلط ہے۔

کان یتختم فی یمینہ بعض روایات میں یہ اضافہ بھی ہے کہ وقبض ﷺ والخاتم فی یمینہ یعنی وفات کے وقت بھی انگوٹھی آپ ﷺ نے داہنے ہاتھ میں پہنی ہوئی تھی۔ اور بعض روایات میں یہ اضافہ بھی ہے کہ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ الیمین أحق بالزینۃ من الشمال۔ دایاں ہاتھ زینت کا بائیں سے زیادہ حقدار ہے۔

مصنفؒ نے عبداللہ بن جعفرؓ کی حدیث جامع ترمذی میں بھی ذکر کی ہے۔ اور اس کے بارے میں امام بخاریؒ کی یہ رائے بھی لکھ دی ہے کہ اصح شئی ورد فی هذا الباب یعنی دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے کے سلسلے میں یہ حدیث صحیح ترین حدیث ہے۔

(۴) حَدَّثَنَا أَبُو الْخَطَّابِ زِيَادُ بْنُ يَحْيَىٰ أَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَيْمُونٍ عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَتَخَمُّ فِي يَمِينِهِ (۱)۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔

اخبرنا عبداللہ بن ميمون الخ۔ اس روای کے بارے میں ائمہ حدیث نے ذاہب الحدیث، واہی الحدیث اور منکر الحدیث وغیرہ تصحیف کے القاب استعمال کئے ہیں۔ لیکن چونکہ اس روایت کے لئے دوسرے شواہد موجود ہیں۔ لہذا اسے منکر نہیں کہا جاسکتا۔

(۵) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ حَمِيدٍ الرَّازِيُّ ثَنَا جَرِيرٌ عَنْ مُحَمَّدِ ابْنِ

إِسْحَاقَ عَنْ الصَّلْتِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ كَانَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَتَخَمُّ فِي يَمِينِهِ

(۱) سنن ابی داؤد ۲/۲۲۹ کتاب الخاتم باب ماجاء فی التختم فی الیمین والیسار، جامع ترمذی ۳۰۳/۱ کتاب اللباس باب ماجاء فی لبس الخاتم فی الیمین، شرح السنۃ ۱۲/۶۷ باب موضع الخاتم، کتاب اللباس (مختار)

ولا اخاله إلا قال كان رسول الله ﷺ يتختم في يمينه (۱)۔

ترجمہ: صلت بن عبداللہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے یہ کہا کرتے تھے کہ نبی کریم ﷺ بھی داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔

لا اخاله، اخاله ہمزہ کے فتح اور کسرہ دونوں کے ساتھ درست ہے۔ لیکن کسرہ سے پڑھنا فصیح

ہے۔ اس کا معنی ہے ”لا اظنه الا قال“ یعنی میرا خیال صرف یہ ہے کہ انہوں نے فرمایا۔

امام ترمذیؒ نے یہ حدیث اس مقام پر ذرا مختصر ذکر کی۔ امام ابوداؤد نے اس کو تھوڑا مفصل کر کے

ذکر کیا ہے۔ جس میں اس بات کا اضافہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس انگوٹھی کا نگینہ ظاہر الکف یعنی اوپر کی جانب کر رکھا تھا۔

(۶) حَدَّثَنَا ابْنُ عُمَرَ أَنَا سَفِيَانُ عَنْ أَيُّوبَ بْنِ مُوسَى عَنْ نَافِعٍ عَنْ

ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ اتَّخَذَ خَاتَمًا مِنْ فِضَّةٍ وَجَعَلَ فِيهِ مَمَائِلِي

كَفِّهِ وَنَقَشَ فِيهِ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَنَهَى أَنْ يَنْقَشَ أَحَدٌ عَلَيْهِ وَهُوَ الَّذِي

سَقَطَ مِنْ مَعْقِيبِ بَيْرِ أَرِيسَ (۲)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے چاندی کی ایک انگوٹھی

بنوائی۔ اور اس کا نگینہ ہتھیلی کی جانب میں رہتا تھا۔ اس میں محمد رسول اللہؐ کندہ کروایا

تھا۔ اور لوگوں کو اس سے منع فرمایا تھا کہ کوئی اس جیسا نقش کندہ کر دے۔ یہ وہی انگوٹھی

تھی جو حضرت معقیبؓ سے (حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں) بیراریس میں گر گئی تھی۔

(۱) ابوداؤد ج ۲ ص ۲۲۹ کتاب الخاتم باب ماجاء فی التختم فی الیمین والیسار شرح

السنة ۱۲/۶۷ باب موضع الخاتم، کتاب اللباس (مختار)

(۲) سنن ابی داؤد ۲/۲۲۷-۲۲۸ کتاب الخاتم باب ماجاء فی اتخاذ الخاتم، سنن نسائی

۲/۲۳۷ کتاب الزینة باب نزع الخاتم عند دخول الخلاء، ابن ماجہ ص ۲۶۷ کتاب اللباس باب

نقش الخاتم، (مختار)

نگینہ اور پرہویا بیچے: و جعل فضہ الخ کف سے باطن الکف مراد ہے۔ یعنی نگینہ ہتھیلی کی جانب رکھا تھا۔ اس سے قبل جو حدیث گزری ہے۔ اس کی تفصیل میں حضرت عبداللہ ابن عباس کا عمل بلکہ خود نبی کریم ﷺ کا عمل یہ مروی ہے کہ نگینہ اوپر کی جانب کر رکھا تھا۔ جبکہ یہاں باطن الکف کا ذکر ہے۔ اس کی تطبیق میں ائمہ کرام نے یہی کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا عمل اس سلسلے میں مختلف تھا۔ کبھی نگینہ ہتھیلی کی جانب اور کبھی اوپر کی جانب ہوتا تھا۔ جبکہ نبی کریم ﷺ سے قوالا اس سلسلے میں کچھ بھی مروی نہیں ہے۔ اس لئے دونوں روایات اپنی جگہ درست ہیں۔ البتہ امام نووی وغیرہ نے لکھا ہے کہ مردوں کے لئے رائج بات یہ ہے کہ نگینہ ہتھیلی کی جانب رہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ عجب و خود پسندی اور غرور و تکبر سے دور رہے گا۔ دوسری یہ کہ اس طرح نگینہ ٹوٹنے یا رگڑنے سے محفوظ رہتا ہے۔ اور نگینہ کا نقش خراب نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں یہ نقش چھپا رہتا ہے۔ لہذا اس کی نقل بھی آسانی سے نہیں بتائی جاسکتی۔ علماء احناف نے یہ بھی لکھا ہے کہ جائز دونوں صورتیں ہیں۔ البتہ علامہ شامی کی تحقیق کے مطابق مردوں کیلئے بہتر یہ ہے کہ نگینہ ہتھیلی کی جانب رہے۔ لیکن چونکہ عورتیں محض تزین کیلئے انگوٹھی پہنتی ہیں۔ اس لئے ان کو اوپر کی جانب نگینہ رکھنا چاہیے۔

نقش کی نقل کی ممنوعیت: ونہی ان ینقش علیہ احد نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کو اس طرح کے نقش کی انگوٹھی سے اس لئے منع فرمایا تھا کہ اس طرح آپ ﷺ کی مہر دوسرے صحابہ کی مہر سے خلط ہو کر رہ جاتی۔ اور خطوط میں التباس کا خطرہ پیدا ہو جاتا۔ خلفاء راشدین نے بھی ظاہری نبی کا اتباع کرتے ہوئے اس جیسی مہر بنوانے سے مکمل اجتناب کیا۔ اور نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد بھی صرف یہی مہر استعمال کرتے رہے۔ لیکن ایک روایت میں یہ تصریح بھی ہے کہ حضرت معاذ نے اس نقش کی انگوٹھی بنوائی تھی۔ اور نبی کریم ﷺ نے اس پر انکار نہیں فرمایا تھا اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو وہ روایت ثابت نہیں ہے۔ جس طرح کہ علامہ بیجوری نے اور علامہ مناوی نے اس کی تصریح کی ہے۔ اور اگر ثابت ہو تو بھی یہ احتمال ہے کہ حضرت معاذ نے یہ کام نبی کے ورود سے قبل ہی اتباع النبی ﷺ کی نیت سے کیا ہو۔ یا پھر نبی آپ تک نہیں پہنچی ہو۔ یا یہ کہ حضرت معاذ کی خصوصیت ہو۔ مگر بعض علماء نے اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا

ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کی زندگی تک محدود ہوگی۔ کیونکہ التباس کا خطرہ اس وقت تھا۔ لہذا اب اگر کوئی اس نقش کی انگوٹھی بنوائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔

معقیب: وهو الذی سقط من معقیب الخ معقیب بن ابی فاطمة الدوسی حضرت سعید بن العاصؓ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اور بعض کے ہاں ان کے حلیف تھے۔ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں مسلمان ہوئے حبشہ کی طرف ہجرت بھی فرمائی۔ غزوہ بدر میں بھی شریک رہے۔ نبی کریم ﷺ کے انگوٹھی کے امین تھے۔ جب نبی کریم ﷺ انگوٹھی اتار لیتے تھے۔ تو آپؐ کو دے دیتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بیت المال کے متولی تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جذام کے مرض میں مبتلا ہوئے۔ مگر حضرت عمرؓ نے علاج کروایا جس کے بعد صحعیاب ہو گئے۔

۴۰ھ میں اور بعض روایات کے مطابق حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری ایام میں وفات پائی۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ انگوٹھی حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے کنویں میں گر گئی تھی۔ اس تعارض کا جواب گزشتہ باب میں گزر چکا ہے۔

(۷) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ قَالَ أَنَا حَاتِمُ بْنُ اسْمَعِيلَ عَنْ جَعْفَرِ بْنِ

مَحْمُودٍ عَنْ أَبِيهِ قَالَ كَانَ الْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ يَتَخْتَمَانِ فِي يَسَارِهِمَا (۱)۔

ترجمہ: امام محمد باقرؑ کہتے ہیں کہ حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ اپنے بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔

سند حدیث اور ترجمہ الباب سے مطابقت: عن أبيه امام جعفر صادقؑ کے والد محمد باقرؑ کی ملاقات حضرات حسنینؑ سے نہیں ہوئی۔ اس لئے یہ حدیث منقطع ہے۔ امام بیہقیؒ نے ان دونوں کے علاوہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے بارے میں بھی یہ روایت بیان کی ہے کہ وہ بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔ لیکن یہاں یہ اشکال ہے کہ یہ اثر ترجمہ الباب یعنی تختم بالیمن سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ تختم بالیسار کے سلسلے میں یہ اثر مروی ہے۔ لیکن امام ترمذیؒ اس پر تنبیہ کرنا چاہتے ہیں کہ یہ قابل استدلال نہیں۔ کیونکہ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے کے سلسلے میں بہت سی مرفوع روایات مروی ہیں۔ اور اکثر

مواقع میں آپ ﷺ کا عمل بھی وہی تھا۔ اگرچہ مذکورہ حضرات کا عمل اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ کبھی کبھی آپ ﷺ اسے بائیں ہاتھ میں بھی پہنے ہوئے ہونگے۔ ورنہ پھر یہ حضرات بھی ایسا نہ کرتے۔ بعض شراح نے ترجمۃ الباب سے مطابقت کیلئے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ تختم بالیسار کا یہ اثر مرفوع اور موقوف دونوں طرح سے مروی تھا۔ چنانچہ امام بیہقی نے کتاب الادب میں ان الفاظ سے اسے روایت کیا ہے ”کان رسول اللہ ﷺ وأبو بکر و عمر و علی والحسن والحسين يتختمون في اليسار“

لیکن چونکہ مرفوع سند میں امام ترمذی کے نزدیک کلام تھا۔ اس لئے اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے یہ اثر ذکر کیا کہ مرفوع کی نسبت موقوف سند رائج ہے۔ جبکہ تختم بالیمین مرفوعاً ثابت ہے۔ اور بعض شراح نے اشکال کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ ترجمۃ الباب میں ”فی یمینہ“ کا قید صرف اس بات پر تنبیہ کرنے کی غرض سے لایا گیا ہے کہ دائیں ہاتھ میں پہننا افضل ہے۔ جبکہ اس اثر کو بیان جواز کے لئے لایا ہے۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ ترجمۃ الباب کے آخر میں ”فی یمینہ“ کا کلمہ نہیں یا ”ام فی یسارہ“ کا کلمہ محذوف ہے۔ چنانچہ سرے سے اعتراض ہی نہیں ہوتا۔

مصنف نے اس اثر کے بعد دائیں ہاتھ میں انگلی پہننے کے سلسلے میں دو مرفوع حدیث ذکر کی ہیں۔ اس لئے اکثر شراح نے مصنف کے اس اثر کے بارے میں لکھا ہے کہ اس اثر کو درمیان میں لانے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی۔ اگر اسے سب سے آخر میں لاتے تو اچھا ہوتا۔

(۸) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ أَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عِيسَى وَ هُوَ ابْنُ الطَّبَاعِ

ثَنَا عَبْدُ بْنُ الْعَوَّامِ عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي عُرْوَةَ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ

أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَخْتَمُ فِي يَمِينِهِ قَالَ أَبُو عِيسَى هَذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ لَا نَعْرِفُهُ

مِنْ حَدِيثِ سَعِيدِ بْنِ أَبِي عُرْوَةَ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ نَحْوُ

هَذَا إِلَّا مِنْ هَذَا الْوَجْهِ وَرَوَى بَعْضُ أَصْحَابِ قَتَادَةَ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسٍ

أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَخْتَمُ فِي يَسَارِهِ وَ هُوَ حَدِيثٌ لَا يَصَحُّ أَيْضاً (۱)۔

(۱) منن نسائی ۲/۲۸۹ کتاب الزینۃ باب موضع الخاتم شرح السنۃ ۱۲/۶۸ باب موضع الخاتم

ترجمہ: حضرت قتادہؓ حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنی تھی۔ اور حضرت قتادہؓ کے بعض شاگرد اسی سند کے ذریعے حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔

امام ترمذیؒ کی کمال دیانت: قال ابو عیسیٰ النخعیہ عبارت شمائل کے صحیح نسخوں میں موجود نہیں ہے۔ بلکہ دراصل مصنف جامع ترمذی میں اس حدیث کو روایت کر کے اس کے بعد یہ عبارت لائے ہیں۔ جمع الوسائل میں ہے کہ علامہ ابن حجرؒ نے جامع ترمذی کی اس عبارت کو شمائل کی عبارت سمجھ لی ہے۔ بہر حال عبارت شمائل کی ہو یا جامع کی۔ اس عبارت سے بظاہر مصنف کی غرض اس بات پر تنبیہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت قتادہؓ کے واسطے سے حضرت انسؓ کی اس حدیث میں یمین یا یسار کی تعیین درست نہیں ہے۔ اگرچہ انگوٹھی بنوانے یا چاندی کی انگوٹھی بنوانے کی حد تک اس کی روایت صحیح ہے۔ البتہ قتادہؓ کے بغیر دوسرے طرق صحیحہ سے حضرت انسؓ کی روایت مروی ہے۔ جہاں بعض طرق میں یمین اور بعض میں یسار کا ذکر ہے۔ امام نوویؒ کہتے ہیں کہ انگوٹھی کے سلسلے میں یمین و یسار دونوں سے متعلق صحیح احادیث موجود ہیں۔ بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے سے متعلق احادیث مسلم اور ابوداؤد میں موجود ہیں۔ اور دائیں ہاتھ سے متعلق احادیث تو یہاں گزر گئیں۔ لیکن چونکہ روایت حدیث کے قواعد کی رو سے اس خاص (یعنی قتادہؓ) کے واسطے سے یہ روایت درست نہیں تھی۔ لہذا مصنف نے کمال دیانت کا ثبوت دیتے ہوئے ایک کو غیر معروف اور دوسرے کو غیر صحیح کہہ دیا۔ فجزاہ اللہ

(۹) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ بْنِ أَبِي حَازِمٍ عَنْ

مُوسَى بْنِ عَقْبَةَ عَنْ نَافِعٍ عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اتَّخَذَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ خَاتَمًا

مِنْ ذَهَبٍ فَكَانَ يَلْبَسُهُ فِي يَمِينِهِ فَاتَّخَذْنَا لِنَاسٍ خَوَاتِيمَ مِنْ ذَهَبٍ فَطَرَحَهُ

رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَقَالَ لَا أَلْبَسُهُ أَبَدًا فَطَرَحَ النَّاسُ خَوَاتِيمَهُمْ (۱)۔

(۱) صحیح مسلم ۲/۴۰۳، ۲۰۴ کتاب اللباس والزینۃ باب تحریم الخاتم الذهب علی الرجال

الخ، جامع ترمذی ۱/۳۰۴ کتاب اللباس باب ماجاء فی لبس خاتم فی الیمین، سنن ابی

داؤد ۲/۲۲۹ کتاب اللباس (مختار)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سونے کی انگوٹھی بنوائی۔ جس کو آپ ﷺ اپنے داہنے ہاتھ میں پہنتے تھے۔ پس لوگوں نے بھی سونے کی انگوٹھیاں بنوائیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے وہ انگوٹھی پھینک دی۔ اور یہ فرمایا کہ میں اسے کبھی بھی نہیں پہنوں گا۔ اس کے بعد لوگوں نے بھی اپنی انگوٹھیاں پھینک دیں۔

سونے کی انگوٹھی ترک کرنے کی وجہ: فطرح الناس خواتیمهم۔ خواتم اور خواتیم دونوں خاتم کی جمع ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے سونے کی انگوٹھی اس لئے اتاری اور اتروائی کہ ایک تو صحابہؓ کی انگوٹھیوں کی وجہ سے التباس کا خطرہ پیدا ہوا۔ اور خصوصاً سونے کی انگوٹھی میں عجب و تکبر کا خدشہ بھی دیکھا۔ یا اس لئے کہ عین اس وقت سونے کے استعمال سے ممانعت نازل ہوئی۔ جبکہ اس سے قبل سونے کا استعمال مردوں کے لئے جائز تھا۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ نے خود اور دوسرے صحابہؓ نے انگوٹھیاں اتروائیں۔

جہاں تک سونے کی انگوٹھی کی بات ہے تو اس پر فقہائے امت کا تقریباً اجماع ہے کہ مردوں کے لئے اس کا پہننا حرام ہے۔ بعض صحابہؓ سے اس کا استعمال بھی مروی ہے مگر وہ یا تو نبی کے ورود سے قبل یا نبی سے عدم علم پر محمول ہوگا۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ انہوں نے نبی کو تنزیہی سمجھ کر یہ عمل کیا ہو۔ مگر تمام ائمہ فقہ نے اس کی تحریم میں شک تک بھی نہیں کیا۔ البتہ عورتوں کے لئے دوسرے زیورات کی طرح سونے کی انگوٹھی کا استعمال بھی جائز ہے۔

اس باب میں اس بات کا بیان نہیں ہے کہ آپ ﷺ کو نسی انگلی میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔ لیکن صحیحین کی ایک روایت میں سب سے چھوٹی انگلی کی تعیین کی روایت موجود ہے۔ جیسے کہ علامہ بیجوریؒ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس لئے انگلیوں میں چھوٹی انگلی اس کے لئے بہتر ہوگی۔

۱۴۔ باب ما جاء في ذكر سيف رسول الله ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے تلوار کے بیان میں

اس سے قبل دو بابوں میں خطوط کا ذکر آیا ہے۔ اسلامی نظام کے نفاذ و اشاعت کا دستور العمل یہ ہے کہ سب سے پہلے دعوت دی جائے، تقریر و تحریر کے ذریعے تبلیغ کی جائے، اگر کفار مان لیں تو بہتر، ورنہ تلوار سے کام لینا پڑتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی زبانی تبلیغ کے ساتھ کافروں کے پاس خود بھیجے، خطوط لکھے، جب کام نہ بنا تو آپ ﷺ کو تلوار اٹھانا پڑی، بہر حال خطوط کے ضمناً تذکرہ کے بعد تبلیغ اسلام کے دوسرے قدم یعنی جہاد سے متعلق امور کا ذکر ہے۔ اور چونکہ تلوار اس زمانے کا اہم ترین اسلحہ تھا اس لئے اسے مقدم ذکر کیا۔

نبی کریم ﷺ کی تلوار: نبی کریم ﷺ کی متعدد تلواres تھیں۔ ان کے الگ الگ نام بھی تھے۔ مثلاً اپنے والد سے میراث میں ملنے والی تلوار کا نام مائور تھا۔ اس طرح آپ ﷺ کی دوسری تلواروں کے نام قَضِيب، بَشَار، الحنف، ذو الفقار، قلعي، مخدّم، رسوب، صمصامہ اور اللّٰحيف منقول ہیں (۱)۔ اس باب میں چار احادیث مذکور ہیں۔

(۱) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ أَنَا وَهَبُ بْنُ جَرِيرٍ أَنَا أَبِي عَنْ قَتَادَةَ عَنْ

أَنَسٍ قَالَ كَانَ قَبِيْعَةُ سَيْفِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ مِنْ فَضَّةٍ (۲)۔

(۱) ان تلواروں کے علاوہ آنحضرت ﷺ کے مزید دو تلواres اور تھیں (۱) ان میں سے ایک کا نام العون تھا۔ اس تلوار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فروہ بدر کے موقع پر حضرت عکاشہؓ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میری تلوار ٹوٹ گئی ہے۔ تو آپ ﷺ نے اس کو ایک خشک ٹہنی عطاء فرمائی۔ اور فرمایا کہ اضرب به جب آپ نے لیا تھا عادی بدہ سیفا صارماً طويلاً أبيض شديد الحنن فقاتل به ثم لم يزل عنده يشهد به المشاهد إلى ان استشهد (المواهب اللدنية ص ۸۳) (۲) اور دوسری کا نام العرجون تھا۔ جنگ احد کے موقع پر حضرت عبداللہ بن جحشؓ کی تلوار ٹوٹ گئی تو آپ ﷺ نے اس کو کھجور کی ایک ٹہنی عطاء فرمائی اور وہ بھی آپ کے ہاتھ میں تلوار بن گئی۔ (المواهب اللدنية ص ۸۳) (بخاری)

(۲) سنن ابی داؤد ۳۵۵/۱ کتاب الجہاد باب فی السیف یحلی، سنن نسائی ۳۰۱/۲ کتاب الزینۃ باب حلّیۃ السیف، سنن الکبریٰ لبہیقی ۱۳۳/۳، سنن دارمی ۱۶۶/۲۔ شرح السنۃ ۳۹۷/۱۰، کتاب السیر و الجہاد باب السیف و حلّیۃ (مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی تلوار کے قبضہ کی ٹوپی چاندی کی تھی۔

کان قبیعة الخ تلوار کے دستے کی آخری سرے پر جو دعوات تلوار کو آگے کی طرف پھسلنے سے بچانے کے لئے لگی ہوئی ہوتی ہے۔ اسے قبیعة کہتے ہیں جبکہ دستہ کے اگلے حصہ کو شارب کہتے ہیں۔ یہاں آپ ﷺ کی مشہور تلوار ذو الفقار کا ذکر ہے (۱)۔ جو فتح مکہ کے روز بھی آپ ﷺ کے ہاتھ میں تھی۔

(۲) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ أَنَا مُعَاذُ بْنُ هِشَامٍ ثَنَى أَبِي عَنْ قَتَادَةَ عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي الْحَسَنِ قَالَ كَانَتْ قَبِيْعَةُ سَيْفِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ مِنْ لُضَّةٍ (۲)۔

ترجمہ: سعید بن ابی الحسنؒ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی تلوار کے قبضہ کی ٹوپی چاندی کی تھی۔

سعید بن ابی الحسنؒ: سعید بن ابی الحسنؒ یہ حضرت حسن بصریؒ کے بھائی ہیں تابعی ہے۔ ان کا نام یسار ہے۔ ۱۱۰ھ اور ایک روایت کے مطابق ۹۹ھ میں وفات پائی۔ لہذا یہ حدیث مرسل ہے لیکن چونکہ اس حدیث کے لئے دوسرے شواہد موجود ہیں جس طرح کے حدیث سابق ہے۔ اس لئے یہ مقبول ہے۔ اس میں بھی تلوار کی قبیعہ کا ذکر ہے۔

(۳) حَدَّثَنَا أَبُو جَعْفَرٍ مُحَمَّدُ بْنُ صَدْرٍ أَنَّ الْبَصْرِيَّ أَنَا طَالِبُ ابْنِ حَجِيرٍ عَنْ هُوْدٍ وَهُوَ ابْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ سَعِيدٍ عَنْ جَدِّهِ قَالَ دَخَلَ

(۱) اس تلوار کے بارے میں ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں واخرج ابن سعد عن ابن عباس أن النبي ﷺ تنقل سيفاً لنفسه يوم بدر يقال له ذو الفقار وهو الذي رأى فيه الرؤيا بواحد (جمع الوسائل ۱/ ۱۹۳) آپ ﷺ نے یہ تلوار حضرت علیؓ کو مرحمت فرمائی تھی۔ اس تلوار کے بارے میں الاتحافات میں ہے ذو الفقار بفتح الفاء وكسرها لان في ظهره فقرات ای حضور صغار كفقرات الظهر (۱۴۴) (مختار)

(۲) سنن ابی داؤد ۱/ ۳۵۵ کتاب الجہاد باب فی السیف بحلی، شرح السنة ۱۰/ ۳۹۷ کتاب السیر والجہاد باب السیف وحلیته، سنن نسائی ۲/ ۳۰۱ کتاب الزینة باب حلیة السیف (مختار)

رسول الله ﷺ مكة يوم الفتح و على سيفه ذهب و فضة قال طالب
لسالت عن الفضة فقال كانت قبعة السيف فضة (۱)۔

ترجمہ: ہود کے نانا کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ فتح مکہ کے دن جب شہر میں داخل ہوئے تو نبی کریم ﷺ کی تلوار پر سونا چاندی تھا۔ طالب کہتے ہیں میں نے ہود سے پوچھا کہ چاندی کس جگہ تھی۔ تو انہوں نے فرمایا کہ قبضہ کی ٹوپی چاندی کی تھی۔

وہو ابن عبد اللہ بن سعید الخ ہود کے نانا کا نام اکثر نسخوں میں سعید لکھا ہے۔ لیکن علامہ قسطلانی کے بقول سحر درست ہے۔

مزید بن جابر: عن جدہ ہود کے نانا کا نام مزید بن جابر ہے۔ بنو عبد القیس قبیلہ کے صحابی ہیں۔ فتح مکہ کے موقع پر عبد القیس کے وفد میں تشریف لائے تھے۔ یہ علامہ ابن حجر کا قول ہے جبکہ علامہ جزیری نے ان کا نام مزیدہ (بوزن مکرمہ) ذکر کیا ہے۔

کیا تلوار پر سونا لگانا جائز ہے؟ و علی سبغہ ذهب و فضة یہ بات قابل ذکر ہے کہ مردوں کیلئے سونے کا استعمال ناجائز ہے۔ اور اس حدیث سے پہلے ہی اس کے استعمال کی حرمت کا حکم آیا ہے۔ جمہور کے نزدیک تلوار، بندوق اور دوسرے آلات حرب میں بھی سونا لگانا جائز نہیں۔ اسلام اس قسم کے تکلفات کو ناپسند کرتا ہے۔ اس وجہ سے سونے کے برتن، اوزار اور اسلحہ کا استعمال ناجائز ہے۔ اور تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ مسلمان جب بھی عیش پرستی میں مبتلا ہوئے ان پر زوال و تباهی آئی۔ جبکہ اس حدیث میں سونے کا استعمال اور تلوار میں اس کی موجودگی مذکور ہے۔ چنانچہ اس حدیث سے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں۔

مثلاً یہ کہ مذکورہ حدیث سند کے لحاظ سے ضعیف بلکہ منکر ہے۔ خود امام ترمذی نے یہ سند جامع ترمذی میں ذکر کر کے فرمایا ہے کہ ہذا حدیث غریب حسن بلکہ ائمہ حدیث میں سے اکثر نے بڑے شد و مد سے اس کی تضعیف کی ہے (۲)۔

(۱) جامع ترمذی ۲۹۸/۱ کتاب الجہاد باب ما جاء في السيوف و حليتها (مختار)

(۲) ملا علی قاری نے علامہ توربشتی کے حوالہ سے لکھا ہے وقال التوربشتي هذا الحديث لا يقوم به حجة اذ ليس له سند يعتمد به (جمع الوسائل ۱۹۳/۱) اور علامہ بیجوری نے لکھا ہے هذا الحديث ضعيف كما قاله القطن بل منكر فلا يقوم به الحجة على حل التحلية بالذهب (المواهب اللئيلة ص ۸۴) (مختار)

اور اگر حدیث کو صحیح تسلیم کیا جائے تو پھر اسے مبالغہ پر محمول کیا جائے گا۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ ایسی تیس تلوار تھی گویا اس پر سونا چاندی لگا ہوا ہو۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ راوی نے چاندی دیکھی ہو۔ جس کا استعمال جائز ہے۔ پھر اس نے سونے کا ذکر جمع کیا ہو۔ اور اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ راوی سے چاندی کے متعلق پوچھا گیا ہے کہ یہ کہاں لگا تھا۔ اب اگر واقعاً سونا بھی ہوتا تو اس کے بارے میں بھی ضرور پوچھا جاتا کہ وہ کہاں لگا تھا کیونکہ چاندی کی نسبت سونا زیادہ اہم اور قیمتی ہے۔

بعض لوگوں نے یہ جواب بھی دیا ہے کہ سونے کا یہ استعمال تحریم سے پہلے تھا۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے کیونکہ اس حدیث میں تصریح ہے کہ فتح مکہ کا موقع تھا اور تحریم کا حکم فتح مکہ مکرّمہ سے یقیناً پہلے تھا۔ اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ راوی نے جس پر سونے کا گمان کیا ہے وہ دراصل تمویہ تھا سونا نہ تھا۔ یعنی اس دسے پر سنہری رنگ چڑھایا گیا تھا۔ اس حدیث سے چاندی کے استعمال کا جواز بھی معلوم ہوتا ہے۔

(۴) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ شِجَاعٍ الْبَغْدَادِيُّ أَنَا أَبُو عُبَيْدَةَ الْحَدَّادِ

عَنْ عَثْمَانَ بْنِ سَعْدٍ عَنْ ابْنِ سِيرِينَ قَالَ صَنَعَتْ سَيْفِي عَلَى سَيْفِ

سَمُرَةَ بْنِ جَنْدَبٍ وَزَعَمَ سَمُرَةُ أَنَّهُ صَنَعَ سَيْفَهُ عَلَى سَيْفِ رَسُولِ

اللَّهِ ﷺ وَكَانَ حَنْفِيًّا (۱)۔

ترجمہ: محمد بن سیرین فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی تلوار حضرت سمرۃ بن جندب کی

تلوار کے موافق بنائی۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ان کی تلوار نبی کریم ﷺ کی تلوار کے موافق

بنی ہوئی تھی اور وہ قبیلہ بنو حنفیہ کی تلواروں کی طرح تھی۔

ابن سیرین (۲) یہ مشہور تابعی اور حدیث کے امام ہیں۔ حسن بصری کے ہم عصر ہیں۔ بصرہ میں

رہتے تھے اور اہل بیت میں وفات پائی۔

(۱) جامع ترمذی ۲۹۷/۱ کتاب الجہاد باب ما جاء في صفة سيف النبي ﷺ شرح السنة

للبيهقي ۳۹۸/۱۰ کتاب السير والجہاد باب السيف و حلیته (مختار)

(۲) آپ کا نام محمد ہے۔ آپ بغیر الرویا کے بھی امام تھے۔ (مختار)

صنعت سیفی اس سے پتہ چلتا ہے کہ بوقت ضرورت علماء کو بھی مسلح رہنا چاہئے تاکہ شر پسندوں اور فتنہ پردازوں سے نمٹا جاسکے۔

علی سیف سمرہ یعنی میں نے اسی مقدار اور اسی ڈیزائن کی تلوار بنائی۔ اور حضرت سمرہؓ کا خیال تھا کہ اس کی تلوار نبی کریم ﷺ کی تلوار جیسی تھی۔ تو گویا حضرت ابن سیرینؒ نے بھی نبی کریم ﷺ کی تقلید میں تلوار بنائی تھی۔

وکان حنفیا یعنی نبی کریم ﷺ کی تلوار بنو حنیفہ کی بنی ہوئی تھی یا تو صانع کی طرف نسبت ہے۔ اور یا محض ڈیزائن کا بیان ہے۔ لیکن اس جملے کا مقصد بہر حال یہ نہیں کہ وہ امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کے موافق تھی۔ اگرچہ یہ لفظی اتفاق مستحسن ہے لیکن یہ ترجمہ کرنا غلط ہے۔

لطیفہ: لفظی اتفاق کے سلسلے میں ایک لطیفہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شیعہ اور ایک سنی کے درمیان مذہب کی بات چل پڑی۔ شیعہ نے کہا کہ قرآن کہتا ہے کہ ابراہیمؑ بھی شیعہ تھے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وان من شیعۃ لا ابراهیم۔ تو سنی نے کہا کہ جھوٹ بولتے ہو۔ شیعہ تو ایک زمانہ بعد فرعون کے بنائے ہوئے ہیں۔ اس نے مصر والوں کو سب سے پہلے شیعہ بنایا۔ قرآن کہتا ہے وان فرعون غلا فی الارض و جعل اهلها شیعا۔

(۵) حَدَّثَنَا عَقْبَةُ بْنُ مَكْرُمٍ الْبَصْرِيُّ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَكْرٍ عَنْ عَثْمَانَ

بْنِ سَعْدٍ بِهَذَا الْإِسْنَادِ نَحْوَهُ.

یہ سند پہلی سند کی تائید کے لئے لائے ہیں۔

۱۵ . باب ما جاء في صفة درع النبي ﷺ

نبی کریم ﷺ کا جنگی لباس زرہ کے بیان میں

فولادی صنعت کی اہمیت: ایک اور جنگی لباس زرہ کا بیان ہے جو فولادی کڑیوں سے بنایا جاتا ہے۔ حضرت داؤدؑ نے فولادی صنعت اور سامان جنگ کی تیاری میں بہت ترقی کی تھی۔ وہ اقتدار و غلبہ اور جنگی مہارت میں بہت آگے تھے۔ آج تو جہاز، ٹینک، بندوق اور توپ وغیرہ جنگی آلات بنانے اور فولادی صنعت میں عالم اسلام بہت پیچھے ہے۔ تیس پینتیس سال کے عرصہ میں تقریباً چالیس مسلمان ملک آزاد ہو چکے ہیں لیکن ہم فولادی مصنوعات میں پھر بھی یورپ اور امریکہ کے محتاج ہیں۔ ہماری معدنیات اور خام مال سے فولاد بنا کر وہ لوگ جہاز، ٹینک وغیرہ بناتے ہیں اور پھر ہم درخواستیں دے دے کر مانگتے ہیں۔ حالانکہ فولادی صنعت دفاع، امن اور خوشحالی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت داؤدؑ لوہے کو ہاتھ لگاتے تو معجزانہ طور پر وہ خود بخود نرم ہو جاتا۔ پھر وہ اس سے پتلی پتلی کڑیاں بنا کر اس سے زرہ بناتے۔ صاحب جلالین نے لکھا ہے کہ وکانت قبل ذالک صفائح یعنی داؤدؑ کے زمانے سے پہلے لڑائی لڑنے والے لوگ اپنے جسموں کے ساتھ تختیاں باندھتے تھے لیکن ان کے ساتھ نقل و حرکت مشکل ہوتی تھی۔ پھر جب کڑیوں والی زرہیں آئیں تو جنگ کے دوران چلنا پھرنا آسان ہو گیا۔ اس باب میں نبی کریم ﷺ کے دروع یعنی زرہوں کا بیان ہے۔

درع کا لفظ جس طرح جنگ میں پہنی جانے والی فولادی قمیص پر بولا جاتا ہے۔ اس طرح عورتیں جو قمیص پہنتی ہیں اس کو بھی درع کہتے ہیں۔ لیکن اس لفظ کی ایک عجیب خوبی یہ ہے کہ جو زرہ جنگ کے دوران مرد پہنتے ہیں اس کیلئے درع کا مستعمل لفظ عموماً مؤنث استعمال ہوتا ہے۔ اور عورت کی قمیص پر بولا جانے والا لفظ درع مذکر مستعمل ہوتا ہے۔

حضور اقدس ﷺ کے زرہ ہیں: نبی کریم ﷺ کی متعدد زرہ ہیں تھیں۔ آپ ﷺ کی سات زرہوں کے نام منقول ہیں جو یہ ہیں۔

ذات الفضول، ذات الحواشی، فضة، مغلیة، بتراء، ذات الوشاح اور الخرنق.

(۱) حَدَّثَنَا أَبُو سَعِيدٍ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ سَعِيدٍ الْأَشَجُّ أَنَا يُونُسُ بْنُ بَكِيرٍ
عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ إِسْحَاقَ عَنْ يَحْيَى بْنِ عُبَادَةَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ أَبِيهِ
عَنْ جَدِّهِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ الزُّبَيْرِ بْنِ الْعَوَّامِ قَالَ كَانَ عَلَى
النَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ أَحَدٍ دِرْعَانٌ فَنَهَضَ إِلَى الصَّخْرَةِ فَلَمْ يَسْتَطِعْ فَاقْعَدَ
طَلْحَةَ تَحْتَهُ فَصَعِدَ النَّبِيُّ ﷺ حَتَّى اسْتَوَى عَلَى الصَّخْرَةِ قَالَ
فَسَمِعَتِ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ أَوْجِبَ طَلْحَةُ (۱)۔

ترجمہ: حضرت زبیر بن العوامؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ پر احد کے روز دو
زر ہیں تھیں۔ آپ ﷺ نے ایک چٹان پر چڑھنے کا ارادہ فرمایا۔ مگر چڑھ نہ سکے۔ تو
آپ ﷺ نے طلحہ کو نیچے بٹھایا اور ان کی مدد سے چٹان پر چڑھے۔ حتیٰ کہ اس پر ٹھیک
طرح سے قیام فرمایا۔ حضرت زبیرؓ کہتے ہیں کہ پھر میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ کہتے
ہوئے سنا کہ طلحہ نے (جنت یا میری شفاعت کو) واجب کر دیا۔

عن الزبير بن العوام بعض نخوں میں حضرت زبیرؓ کا ذکر نہیں ہے۔ اور روایت حضرت
عبداللہؓ کی طرف منسوب ہے۔ مگر یہ غلط ہے کیونکہ جنگ احد کے موقع پر حضرت عبداللہؓ بن الزبیرؓ کی عمر
بمشکل ایک سال بنتی ہے۔ اس لئے پھر حدیث مرسل ہو جائیگی۔ بلکہ ”سمعت النبی ﷺ“ کی تصحیح
مشکل ہوگی۔ علاوہ ازیں مصنفؒ نے جامع میں بھی یہ حدیث حضرت زبیرؓ سے روایت کی ہے۔

زبیر بن العوامؓ: حضرت زبیر بن العوامؓ مشہور صحابی ہیں۔ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ مکہ میں اسلام
لائے اور حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ پھر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ آپؓ پہلے صحابی ہیں جنہوں نے
اسلام اور اللہ کی راہ میں تلوار اٹھائی تھی۔ 16 سال کی عمر میں اسلام لائے اور حجاز کی طرف سے اذیتیں بھی
دی گئیں مگر آپؓ ثابت قدم رہے۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شریک رہے۔ ۳۶ھ کو سفوان

(۱) جامع ترمذی ۲۹۸/۱ کتاب الجہاد باب ما جاء في الدرع، المستدرک للحاکم

کے مقام پر ۶۴ سال کی عمر میں شہید کئے گئے۔ پہلے وادی السباع میں دفن ہوئے۔ بعد میں بصرہ کو منتقل کر دیئے گئے۔

علیہ درعان جنگ احد میں آپ ﷺ نے جوڑ رہی تھیں وہ ذات الفضول اور فضہ تھیں۔ اس جنگ میں مسلمانوں پر بڑا امتحان آیا تھا۔ اور انہیں بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ خود نبی کریم ﷺ اس جنگ میں زخمی ہوئے تھے۔ خود اپنی کڑیاں چہرہ انور میں گھس گئیں۔ دانت مبارک شہید ہوئے اور خون میں لت پت آپ ﷺ ایک گڑھے میں گر پڑے۔ اس وقت ابلیس لعین نے آواز لگائی کہ رسول اللہ ﷺ نعوذ باللہ قتل کر دیئے گئے۔ جس سے مسلمانوں کی رہی سہی قوت اور حوصلہ جواب دے گیا۔ اس حالت کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کیلئے ایک اونچی جگہ پر چڑھنا چاہا تا کہ صحابہ کرامؓ دیکھ لیں کہ رسول اللہ ﷺ زندہ ہیں۔ یہ جگہ جہاں آپ ﷺ چڑھنا چاہتے تھے سطح زمین سے بلند پہاڑی میں ایک غار نما جگہ ہے بلندی کے باعث ویسے بھی اس جگہ پر چھا چڑھنا مشکل ہوتا ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ اس حالت میں دوڑ رہے تھے۔ صحابہ کرامؓ کی حوصلہ افزائی کے علاوہ میدان جنگ کا نقشہ دیکھنے اور تھوڑی دیر سنانے کیلئے بھی اس جگہ پہنچنے کی کوشش کرتے رہے۔

دفاعی صلاحیت کا حصول ضروری ہے: نبی کریم ﷺ کے اس عمل میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ بے مثال قوت کے مالک تھے کیونکہ جہاں ایک زرہ کا سنبھالنا مشکل ہوتا ہے وہاں آپ ﷺ عمر کے آخری دور میں دوڑ رہے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں اس بات کی تعلیم ہے کہ اسلحہ اور دفاعی سامان کا استعمال تو کل کے منافی نہیں جب نبی کریم ﷺ تحفظ کے لئے ایک کے بجائے دوڑ رہے تھے۔ تو امت کے لئے بطریق اولیٰ یہ بات جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان خذوا حذرکم اور اعذوا للہم ما استطعتم میں انہی دفاعی اسباب کے استعمال کی طرف توجہ دلائی ہے۔

فلم یستطع ایک تو جگہ اونچی تھی۔ دوسری بات یہ کہ نبی کریم ﷺ کا خون بہہ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے ضعف پیدا ہو گیا تھا۔ پھر عمر کے آخری حصہ ہونے کی وجہ سے جسم ویسے بھی بوجھل تھا۔ ساتھ دوڑ رہے

اور دیگر اسلحہ بھی ہوگا۔ ان اسباب کی وجہ سے آپ ﷺ کے لئے اس جگہ پر چڑھنا مشکل ہو گیا۔
لقاعد طلحة تحتہ آپ ﷺ نے طلحہ کو بٹھایا اور اس کے سہارے چڑھ گئے۔

قربانی کا صلہ: اوجب طلحة یعنی اوجب طلحة الجنة لنفسه یا اوجب الشفاعة اوالمغفرة والرضوان لنفسه۔ مطلب یہ ہے کہ طلحہ نے اپنے لئے جنت، یا شفاعت، یا مغفرت، یا رضائے الہی واجب کر دیا یہ بڑا مرتبہ ہے۔ جو آپ کو ملا۔ اس جنگ میں آپ کا صرف یہی کارنامہ نہیں بلکہ ساری جنگ احد میں آپ نے عظیم کردار ادا کیا تھا۔ مغازی میں آپ کی قربانیوں کا تفصیل سے تذکرہ موجود ہے۔ حتیٰ کہ ابو بکر صدیق فرماتے تھے کہ احد طلحہ کا ہے۔ یعنی وہ اس جنگ کے ہیرو اور مین آف دی وار (Man of the War) ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے جسم کو نبی کریم ﷺ کے لئے ڈھال بنایا تھا۔ تیر آتا تو خود آگے ہو جاتے۔ تلوار کا وار ہوتا تو ہاتھوں سے روکتے۔ چنانچہ اس طرح آپ کو اتنی (۸۰) سے زیادہ زخم آئے تھے۔ بایاں ہاتھ بالکل شل ہو گیا لیکن اس حالت میں بھی نبی کریم ﷺ کو پہچانتے رہے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ آپ کو چلتا پھرتا شہید کہا کرتے تھے۔

حضرت طلحہ: ابو محمد طلحہ عبید اللہ قرشی مشہور صحابی ہیں۔ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ ابتدائے اسلام میں ایمان لائے۔ غزوہ بدر کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے ان کو اور حضرت سعد بن زید کو قریش کے قافلہ کی خبر گیری کے لئے بھیجا تھا۔ چنانچہ آپ جنگ کے بعد بدر کے مقام پر پہنچے۔ بدر کے علاوہ تمام غزوات میں شریک رہے اور جمادی الاخرہ ۳۶ھ کو جنگ جمل میں چونتھ سال کی عمر میں شہید ہوئے۔ بصرہ میں دفن ہوئے۔

(۲) حدثنا ابن ابی عمر ثنا سفیان بن عیینة عن یزید بن خصیفة
عن السائب بن یزید ان رسول الله ﷺ كان عليه يوم احد درعان قد
ظاهر بينهما (۱)۔

ترجمہ: حضرت سائب بن یزید کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے بدن مبارک پر احد کے روز دو در ہیں تھیں۔ جن کو آپ ﷺ نے اوپر نیچے پہن رکھا تھا۔

(۱) سنن ابن ماجہ ص ۲۰۷ کتاب الجہاد باب السلاح، سنن الکبریٰ للبیہقی ۳۶/۹ کتاب السیر
باب الاختیار فی التحرز (مختار)

سائب بن یزید چونکہ حضرت سائبؓ غزوہ احد کے سال ہی پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے۔ اور صحابی کا مرسل بالائتفاق مقبول ہے۔

قد ظاہر بینہما اوپر پہنے ہوئے کپڑے کو ظہارہ اور نیچے پہنے ہوئے کپڑے کو بطنانہ کہتے ہیں۔ اس لئے بعض شراح نے حدیث کا ترجمہ یوں کیا ہے۔ کہ ایک زرہ پہن کر اس کے اوپر ظہارہ پہنا تھا اور پھر ظہارہ کے اوپر دوسری زرہ پہنی تھی۔ لیکن اکثر شراح نے ترجمہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایک زرہ کو دوسری کے لئے ظہارہ بنا دیا تھا۔ یعنی ایک پہن کر اس کے اوپر دوسری زرہ پہنی تھی۔

۱۶۔ باب ما جاء في صفة مغفر رسول الله ﷺ

نبی کریم ﷺ کے فولادی خود کے بیان میں

اس باب میں ایک اور دفاعی ہتھیار کا ذکر ہے جسے خود کہتے ہیں۔ مغفر غفر سے ہے جس کے لغوی معنی ستر اور چھپانے کے ہیں۔ مغفرة بھی اس سے ہے جس کے معنی گناہ چھپانا اور پردہ ڈالنے کے ہیں۔ مغفر ایک فولادی ٹوپی سی ہوتی ہے جس کا استعمال آج بھی فوجیوں اور مسلح جماعتوں کے لئے معروف ہے۔ اس کے ذریعے تلوار، نیزہ، پتھر وغیرہ سے سر کو بچایا جاتا ہے۔ بعض اہل سیر نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے دو مغفر یعنی خود تھے۔ ایک کا نام موشع اور دوسرے کا نام ذوالسبوع تھا۔ اس باب میں مصنف دو حدیثیں لاتے ہیں۔

(۱) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ مَعْيَدٍ ثَنَا مَالِكُ بْنُ أَنَسٍ عَنْ ابْنِ شَهَابٍ عَنْ

أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَخَلَ مَكَّةَ وَ عَلَيْهِ مَغْفَرٌ فَقِيلَ لَهُ هَذَا ابْنُ

خَطْلٍ مُتَعَلِّقٌ بِأَمْتَارِ الْكَعْبَةِ فَقَالَ اقْتُلُوهُ (۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ

کے سر پر خود تھا۔ کسی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ ابن خطل کعبہ کا پردہ پکڑے

ہوئے ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسے قتل کر دو۔

دخول مکہ یہ فتح مکہ کا واقعہ ہے۔ اس روز آپ ﷺ اونٹنی پر سوار ہو کر مکہ داخل ہوئے تھے۔ دیگر

اسلحہ سے مسلح ہونے کے علاوہ سر پر خود تھا۔ جس کے اوپر سیاہ عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ اسی دن انجیل کی وہ

پٹھن گوئی ثابت ہو گئی جس میں بتایا گیا تھا کہ ”خداوند فاران سے آیا۔ سعیر سے طلوع ہوا اور دس ہزار

قدوسیوں کے ہمراہ گھر میں داخل ہوا۔“

(۱) صحیح بخاری ۲۴۹/۱ کتاب جزاء الصلیب باب دخول الحرم ومكة بغیر احرام ۸۶۳/۲

وکتاب اللباس باب المغفر، صحیح مسلم ۴۳۹/۱ کتاب الحج باب جواز دخول مكة بغیر احرام،

سنن ابی داؤد ۹/۲۴ کتاب الجہاد باب قتل الاسیر الخ۔ (مختار)

فاتحین کے لئے درس: یہی صحابہؓ وہ قدوسی تھے جو آپ ﷺ کے ساتھ تھے جن کی بشارت کتب سماویہ میں دی گئی تھی۔ فتح مکہ بجائے خود ایک مکمل درس حیات اور فاتحین کے لئے ہدایات کا ایک عظیم سرچشمہ ہے۔ ایک کمانڈر جب کسی ملک کو فتح کرتا ہے تو اس کے لئے مفتوحین کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کی عملی تعلیم دی۔ آپ ﷺ نے دشمن کے ساتھ بے مثال رحمت و شفقت کا معاملہ اور احسان اور حسن سلوک کا عظیم مظاہرہ کیا۔ جس میں غرور و تکبر اور تعلی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ اسی تاریخی واقعے کو اللہ تعالیٰ نے فتح مبین کہا ہے۔

مکہ مکرمہ پر حملے کا حکم: یہاں پر یہ اشکال ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مکہ پر حملہ کرنے سے منع فرمایا

چنانچہ فرماتے ہیں کہ لا یحل ل احدکم ان یحمل بمکة السلاح (۱)

تم میں سے کسی مسلمان کے لئے مکہ میں مسلح ہو کر چلنا جائز نہیں۔

گویا خود اللہ تعالیٰ نے اس شہر میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کیا ہے۔ شرعی طور پر یہ امن کی جگہ ہے پھر نبی

کریم ﷺ یہاں مسلح ہو کر کیوں آئے؟ اس اشکال کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں۔

اول: یہ کہ یہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیت ہے اور لوگوں کے لئے یہ پہلے بھی حرام تھا۔ اور اب

بھی حرام ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کے لئے یہ حلت اس لئے تھی کہ خانہ کعبہ پر کافروں کا قبضہ تھا۔ اسے کافروں

کے چنگل سے چھڑانا ضروری تھا۔ اور حرم شریف اس وقت دارالامن نہیں دارالحرب تھا۔ اسے دارالامن

بنانے کے لئے ابتداء میں یہاں اسلحہ اٹھانا پڑا۔ جو جائز ہے۔ اور اب ان شاء اللہ قیامت تک مکہ کے

دارالحرب بننے کی نوبت نہیں آئے گی۔ اسی لئے اب مکہ میں اسلحہ اٹھانا جائز نہیں رہا۔ نیز فقہاء نے یہ بھی لکھا

ہے کہ نعوذ باللہ اگر کعبہ اللہ اور حرم شریف کی حفاظت خطرے میں ہو تو اب بھی دفاعاً مکہ بلکہ کعبہ میں اسلحہ اٹھا

نا جائز ہے۔ اور نعوذ باللہ دشمن اس پر قبضہ کرے تو پھر تو یہ ضروری ہوگا۔

دوسرا جواب: یہ کہ دراصل اسلحہ اٹھانے سے ممانعت مطلقاً نہیں بلکہ محاربة مع

المسلمین کے لئے اسلحہ اٹھانے پر محمول ہے۔ محاربة مع الکفار کے لئے جائز ہے۔

تیسرا جواب: یہ کہ یہ حلت نبی کریم ﷺ کے لئے بھی ایک مخصوص وقت کے لئے تھی۔ بعد

میں یہ منسوخ ہوگئی۔ اور اس پر بخاری شریف کی وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جس میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ فاتھما لا تحل لاحد کان قبلہا اھلت لی ساعة من النھار و اېھا لن تحل لاحد من بعد (الحديث) (۱)

وعلیہ مغفر ترجمۃ الباب سے مطابقت اسی جملہ میں ہے یعنی آپ ﷺ خود پہنے ہوئے تھے۔ حضور ﷺ کی دریاواری: فقیل لہ الخ حضرت سعید بن حریشؓ نے آپ ﷺ کو شامہی کی کہ یہ ابن خطل ہے۔ ہذا ابن خطل الخ نبی کریم ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو تمام کفار جمع تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا کیا خیال ہے؟ آج میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ جس طرح کہ ایک شریف بھائی اپنے بھائی سے معاملہ کرتا ہے۔ ایسی ہی ہماری توقع ہے۔ کونسا ظلم ہے جو ان کافروں نے نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں پر نہیں کیا تھا۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے اس موقع پر فرمایا کہ لا تشرب علیکم الیوم یعنی آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔

تم سب معاف ہو۔ رحمۃ حق کو تو بہانہ چاہیے۔ اس روز بڑے سرکش اور متمرّد لوگ معاف ہوئے۔ اگرچہ لوگوں کا خیال تھا کہ آج مکہ کی گلیوں میں خون کی ندیاں بہیں گی۔ لیکن حضور ﷺ نے تو سب سے بڑے دشمن ابوسفیان کے گھر کو دارالامان بنا دیا۔ کعبہ میں داخل ہونے والے، اور گھر کا دروازہ بند کرنے والے تو دوران حملہ بھی مامون قرار دیئے گئے۔

لیکن بایں ہمہ بعض جرائم ناقابل معافی ہوتے ہیں۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے دن گیارہ آدمیوں اور چھ عورتوں کے بارے میں اعلان فرمایا کہ ان کے لئے معافی نہیں ہے۔

اشاعت اسلام کا اصل سبب: یہ ہے حقیقت اس جھوٹے پروپیگنڈے کی کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ حالانکہ یہ بات کہنے والے لوگ اگر اپنی تاریخ دیکھیں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ایک شہر فتح کرتے ہوئے انہوں نے اتنے قتل کئے کہ نبی کریم ﷺ کی ساری دس سالہ جنگوں میں اتنے قتل نہیں ہوئے۔ یہ تو اسلام کی حقانیت اور نبی کریم ﷺ کی رحمت کاملہ ہونے کا کرشمہ تھا کہ اسلام کی طرف لوگ دوڑنے لگے اور تقریباً دس لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح کر کے بھی مسلمانوں کی لڑی ہوئی۔ جنگوں میں صرف چند آدمی قتل ہوئے۔

بہر حال عام معافی کا اعلان ہوا۔ لیکن 17 افراد کے جرائم ناقابل معافی تھے۔ اس لئے ان کو معافی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ بعد میں سات مردوں اور دو عورتوں کو معافی ملی۔ اور چار عورتوں سمیت آٹھ افراد کو قتل کیا۔ جبکہ بعض روایات میں چار مرد اور دو عورتوں کو قتل کرنے کا ذکر ہے۔ اور وہ بھی دراصل وہی لوگ تھے جن کے جرائم کے ساتھ حقوق العباد وابستہ تھے۔ انہوں نے انسانوں پر ظلم کیا تھا۔ اور ظالم کو معاف کرنا مظلوم کے ساتھ بے انصافی ہے۔

ابن خطل اور اس کا جرم: انہی لوگوں میں ایک ابن خطل بھی تھا۔ یہ شخص اسلام لایا تھا۔ جاہلیت میں اس کا نام عبدالعزیٰ بن ہلال بن خطل تھا۔ اسلام لانے کے بعد اس کا نام عبداللہ یا غالب رکھا گیا۔ خط و کتابت سے واقفیت کے سبب حضور ﷺ نے ان کو بڑا اعزاز دیا تھا۔ حتیٰ کہ وحی کی کتابت کی اجازت بھی دے دی۔ بعد میں ایک غلام حوالہ کر کے نبی کریم ﷺ نے ایک قبیلہ کے پاس عامل بنا کر بھیجا۔ راستے میں اس نے غلام سے کہا کہ میں سوتا ہوں تم جاگتے رہو اور کھانا وغیرہ تیار کرلو۔ پھر مجھے جگا دو۔ وہ جاگا تو دیکھا کہ غلام سویا پڑا ہے۔ کھانا بھی تیار نہیں تھا۔ سخت غصہ میں غلام پر تلوار چلائی اور اسے قتل کر دیا۔ پھر سوچا کہ نبی کریم ﷺ اب مجھ سے ضرور قصاص لیتے۔ اس خوف کی وجہ سے مرتد ہو کر وہ مکہ آیا۔ چونکہ مکہ کے کافر مرتدوں کی بہت عزت افزائی کرتے تھے۔ اس لئے اس نے ارتداد پر اکتفاء نہیں کیا۔ بلکہ دو لوٹیاں اس غرض سے خریدیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ججویہ اشعار کہہ کر لوگوں کو سنائیں۔ یہ گستاخانہ اور گندے اشعار ہوتے تھے۔ جو جگہ جگہ مجلسوں میں گائے جاتے تھے۔ اور چونکہ ادب اور شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ اس لئے یہ اشعار پھیل کر دوست و دشمن سب کی زبانوں سے سنے جانے لگے۔ نبی کریم ﷺ کو اس سے بہت اذیت ہوتی تھی۔ بہر حال اس ظالم نے ایک تو قتل کیا تھا۔ اور ججویہ اشعار کا اہتمام جرم بالائے جرم تھا۔ اس لئے آپ ﷺ نے اس کو واجب القتل قرار دیا تھا۔ متعلق ہا مستار الکعبۃ۔ یعنی کعبہ کے پردوں کو پکڑ کر ابن خطل معافی چاہتا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس زمانے میں بھی خانہ کعبہ کا غلاف ہوتا تھا۔ اقلوہ رحم درخواست رد کردی گئی تو لوگوں نے اسے قتل کر دیا۔

قاتل کون تھا: قاتلین میں چار آدمیوں کے نام ہیں۔ سعید بن زید، سعد بن ابی وقاص، زبیر بن

العوام اور ابو ہریرہؓ اسلمی۔ علامہ قسطلانی نے مؤخر الذکر کو ترجیح دی۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اس کو قتل کرنے کے لئے چاروں نے حملہ کیا ہو۔ اور مؤخر الذکر کے ہاتھوں وہ جہنم رسید ہو چکا ہو۔ واللہ اعلم

حرم میں حدود و قصاص کا حکم: علامہ ابن حجر وغیرہ نے اس حدیث سے اس بات پر استدلال کیا

ہے کہ مسجد حرام میں حدود و قصاص کا اجراء جائز ہے۔ کیونکہ ابن خطل کو بھی قصاصاً حرم ہی میں قتل کیا گیا تھا۔ احناف کے ہاں مسجد حرم کو نجاست سے بچانے کے لئے اس میں حدود و قصاص کا اجراء نہیں ہوگا۔ بلکہ قاتل یا صاحب حد کو بھوکا پیاسا رکھ کر حرم سے باہر نکلنے پر مجبور کیا جائے گا۔ اور باہر ہی حد یا قصاص کا نفاذ ہوگا۔

مذکورہ استدلال سے ملا علی قاریؒ نے یہ جواب دیا ہے کہ اس قتل کو حد یا قصاص کہنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ ابن خطل اس وقت حربی تھا۔ جس پر حدود و قصاص نافذ نہیں ہوتے۔ البتہ وہ معافی کے اعلان میں مستثنیٰ ہونے کی بناء پر قتل کیا گیا تھا۔

(۲) حَدَّثَنَا عِيسَى بْنُ أَحْمَدَ ثنا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ وَهَبٍ ثَنَى مَالِكُ بْنُ

أَنَسٍ عَنْ ابْنِ شَهَابٍ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ دَخَلَ

مَكَّةَ عَامَ الْفَتْحِ وَعَلَى رَأْسِهِ الْمَغْفِرُ قَالَ فَلَمَّا نَزَعَهُ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ

ابْنُ خَطْلٍ مُتَعَلِّقٌ بِأَسْتَارِ الْكَعْبَةِ فَقَالَ أَقْتُلُوهُ قَالَ ابْنُ شَهَابٍ وَبَلَّغْنِي أَنَّ

رَسُولَ اللَّهِ ﷺ لَمْ يَكُنْ يَوْمَئِذٍ مُحَرَّمًا (۲)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فتح مکہ کے وقت جب مکہ

میں داخل ہوئے تو نبی کریم ﷺ کے سر مبارک پر خود تھی۔ جب نبی کریم ﷺ نے

(۱) ملا علی قاریؒ نے اس سلسلہ میں بعض روایات کی مدد سے تین اور صحابہ یعنی سعید بن حریشؓ، عمار بن یاسرؓ، اور شریک بن عبدہ عجمیؓ کا ذکر بھی کیا ہے۔ لیکن اصل قاتل کے سلسلے میں ترجیح ابو ہریرہؓ اسلمیؓ کو دی ہے۔ علامہ بخاریؒ کہتے ہیں کہ پہلے ابو ہریرہؓ اسلمیؓ قتل کرنے آئے بعد میں سعید بن حریشؓ نے بھی اس میں مدد کی ابن ہشامؒ نے سیرت میں اسی کو ترجیح دی۔ (مختار)

(۲) صحیح بخاری ۱/۲۴۹ کتاب جزاء الصيد باب دخول الحرم ومكة بغير احرام ۲/۸۶۴

کتاب اللباس باب المغفر، صحیح مسلم ۱/۴۳۹ کتاب الحج باب جواز دخول مكة بغير احرام،

سنن ابی داؤد ۲/۹ کتاب الجہاد باب قتل الاسیر (مختار)

اسے اتارا۔ تو ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ ابن نطل کعبہ کے پردوں سے لپٹا ہوا ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس کو قتل کر دو۔ ابن شہاب زہریؒ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ نبی کریم ﷺ اس روز محرم نہیں تھے۔

حرم شریف میں داخلہ اور شرط: لم یکن یومئذ محرماً۔ ایک فقہی مسئلہ کی طرف اشارہ ہے وہ یہ کہ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، اور امام احمدؒ کے ہاں بغیر احرام کے حرم میں داخل ہونا ناجائز ہے۔ شوافع کہتے ہیں کہ بغیر احرام باندھے حرم میں داخل ہونا جائز ہے۔ مذکورہ حدیث بظاہر شوافع کا مستدل ہے کہ نبی کریم ﷺ خود مکہ میں احرام باندھے بغیر داخل ہو چکے ہیں۔ جس طرح امام زہریؒ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے جمہور اور امام ابو حنیفہؒ کی طرف سے اس کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں۔

اول: یہ کہ نبی کریم ﷺ اور اس دن کی خصوصیت تھی۔ کہ اس روز مسلح ہو کر داخل ہونا بھی جائز تھا اور مذکورہ فقہی حکم سے بھی یہ دن مستثنیٰ تھا۔ لہذا اس روز بغیر احرام کے مکہ میں داخل ہونا جائز تھا۔

دوم: یہ کہ نبی کریم ﷺ کو یہ علم نہ تھا کہ آئندہ کس طرح کے حالات پیش آنے والے ہیں۔ مکہ فتح ہوگا یا نہیں۔ مقابلہ ہوگا یا نہیں۔ لہذا نبی کریم ﷺ نے اس عذر کی بناء پر احرام نہیں باندھا۔ ورنہ بصورت جنگ احرام سے نکلنا پڑتا۔

سوم: یہ کہ ممکن ہے کہ حضور ﷺ نے پہلے مکہ کے مضافات کی نیت کی ہو۔ اور جنگ کے خطرے کے پیش نظر مکہ کی نیت ہی نہ ہو۔ اور اس صورت میں ہمارے ہاں بھی احرام کی ضرورت نہیں۔

چهارم: یہ کہ امام زہریؒ کا یہ قول کہ ”بلغنی الخ“ بلا سند ہے جو ان مستند احادیث کا مقابلہ نہیں کر سکتا جن میں بغیر احرام کے حرم میں داخل ہونے کی ممانعت مروی ہے۔

۱۷۔ باب ما جاء في عمامة النبي ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے عمامہ کا بیان

عمامہ کی تعریف اور فضیلت: سر پر بندھی ہوئی پگڑی کو عمامہ کہتے ہیں جو کہ نبی کریم ﷺ کا پسندیدہ لباس تھا۔ اور کثرت سے روایات اس بارے میں منقول ہیں۔ اسی وجہ سے پگڑی باندھنا فقہاء کے نزدیک سنت ہے۔ خواہ ٹوپی کے اوپر باندھی جائے یا اس کے بغیر ہو۔ البتہ صرف ٹوپی کے استعمال کو علامہ ابن جوزی وغیرہ نے ذی المشرکین یعنی مشرکوں کا فیشن قرار دیا ہے۔ بلکہ اس مفہوم میں صریح حدیث بھی موجود ہے۔

اس باب میں عمامہ کے ذکر کے ساتھ ساتھ سر پر بندھی ہوئی پٹی کا بھی ذکر ہے۔ تو گویا عنوان میں سر پر بندھے ہوئے ہر قسم کے کپڑے کو عمامہ کہا گیا ہے۔ احادیث میں نبی کریم ﷺ کی متعدد پگڑیوں کا ذکر موجود ہے۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ ان میں سے ایک پگڑی سات ذراع (ساڑھے دس فٹ) لمبی تھی۔ جیسا کہ طبرانی کی ایک روایت میں مذکور ہے۔ جبکہ بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا طول سات ذراع اور عرض ایک ذراع تھا۔ علامہ بخاری شرح شائل میں کہتے ہیں کہ ”لا اصل لہ“ یعنی یہ دونوں باتیں بے بنیاد ہیں۔ لیکن علامہ نوویؒ نے عمامہ رسول ﷺ کی مقدار کے بارے میں یہ بات لکھی ہے کہ آپ ﷺ کی دو پگڑیاں تھیں۔ ایک چھ اور دوسری بارہ ذراع لمبی تھی (۱)۔ بہر حال مقدار میں اختلاف متعدد پگڑیوں کی وجہ

(۱) لكن نقل عن النووي انه كان له ﷺ عمامة قصيرة وكانت ستة اذرع و عمامة طويلة كانت اثني عشر ذراعاً (المواهب اللدنية ص ۹۹) اور شیخ عبدالحق المحمّد الحلویؒ نے اپنے رسالہ آداب اللباس میں لکھا ہے كانت عمامته ﷺ في البيت سبعة اثمانية اذرع وفي وقت الصلوات الخمس اثنا عشر ذراعاً وفي الجمعة اربعة عشر ذراعاً وفي الحروب خمسة عشر ذراعاً اهـ. (آداب اللباس ص ۳ بحوالہ شایب الغمامة ص ۴۳) اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے لکھا ہے كانت عمامته عليه السلام في اكثر الاحيان ثلاثة اذرع شرعية وفي الصلوات الخمس سبعة اذرع وفي الجمع والاعياد اثنا عشر ذراعاً اهـ. (العرف الشذی علی جامع الترمذی ۱/ ۳۰۴) گویا رسول اللہ ﷺ سے مختلف اوقات میں مختلف قسم کے عمامے پہننا ثابت ہے۔ اس لئے مختلف مقدار کے عمامے پہننا جائز ہے۔ (مختار)

سے ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بات ثابت ہے کہ پگڑی باندھنا نبی کریم ﷺ کی سنت مستمرہ ہے۔ آپ ﷺ خود بھی پگڑی باندھا کرتے تھے اور جگہ جگہ اس کا حکم بھی دیا کرتے تھے۔ چنانچہ فعلی احادیث کی طرح قولی احادیث بھی اس سلسلہ میں مروی ہے۔

(۱) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ لَنَا عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنُ مَهْدِيٍّ عَنْ حَمَّادٍ

بْنِ سُلَيْمَةَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ غِيلَانَ لَنَا وَكِيعٌ عَنْ حَمَّادِ بْنِ سُلَيْمَةَ عَنْ

أَبِي الزَّبِيرِ عَنْ جَابِرٍ قَالَ دَخَلَ النَّبِيُّ ﷺ مَكَّةَ يَوْمَ الْفَتْحِ وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ

سَوْدَاءُ (۱)۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب فتح مکہ کے روز شہر میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ کے سر پر سیاہ پگڑی تھی۔

ایک تعارض اور اس کا جواب: وعلیہ عمامة سوداء الخ گزشتہ ابواب میں ہم پڑھ چکے

ہیں کہ ”دخل مكة وعليه مغفر“ یعنی آپ ﷺ خود پہنے ہوئے مکہ میں داخل ہوئے تھے جبکہ اس حدیث میں خود کی بجائے سیاہ پگڑی کا ذکر ہے۔ بظاہر دونوں حدیثوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تعارض نہیں بلکہ نفس الامر میں یہ دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔ اس طرح کہ آپ ﷺ نے خود سر پر رکھا ہو اور اوپر سے پگڑی باندھی ہو کیونکہ خود لوہے کا ہوتا ہے جو ظاہری ہیبت کے لحاظ سے بدنماد کھائی دیتا ہے۔ لہذا نبی کریم ﷺ نے اسے پگڑی سے چھپا دیا ہوگا۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ چونکہ خود بھاری ہوتا ہے۔ برہنہ سر پر اسے رکھنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ لہذا ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے نیچے پگڑی باندھی ہو اور اوپر سے خود رکھا ہو۔ بہر حال دونوں حدیثیں اپنی جگہ درست اور صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں ہو سکتا ہے کہ عین دخول مکہ کے وقت تو سر پر خود ہو۔ پھر کچھ دیر بعد خود رکھ دیا ہو اور سیاہ پگڑی باندھی ہو۔ اور یہ دونوں واقعات تعدد اوقات پر مبنی ہوں۔

(۱) سنن ابی داؤد ۲/۲۰۹ کتاب اللباس باب فی الفئام، سنن ابن ماجہ ص ۲۰۸ کتاب الجہاد

باب لبس العمام فی العرب و کتاب اللباس باب العمامة السوداء، سنن دارمی ۲/۸۴ (مختار)

کیا ذوالحال اور حال کا ایک زمانہ ضروری ہے: اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ ذوالحال کے عامل اور حال کے زمانوں میں اتحاد شرط ہے۔ اس لئے دخول مکہ کے موقع پر مغفر اور عمامہ دونوں کا ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس اعتراض کا علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ مذکورہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے بلکہ کبھی کبھی خارجی تحقق کے اعتبار سے دونوں زمانے مختلف ہو سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں دخول شہر کے بعد بھی کچھ وقت مجاورت کے سبب دخول ہی کی حالت شمار کی جائے گی۔ الغرض یہاں پر وحدت زمانی نہ ہو تو قرب زمانی موجود ہے۔ جو صحتِ حالیت کے لئے کافی ہے۔ جبکہ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ عمامہ سے خود مراد ہے جو صحتِ حالیت کے لئے کافی ہے۔ لہذا تعارض سرے سے موجود نہیں ہے۔

سیاہ پگڑی کا ثبوت: اس حدیث میں سیاہ پگڑی کا ثبوت ہے۔ بعض شراح کا خیال ہے کہ یہ پگڑی دراصل سیاہ نہیں تھی بلکہ زیادہ میلی ہونے کے سبب سیاہ دکھائی دے رہی تھی۔ جس طرح کہ دوسری حدیث میں ”عمامة دسماء“ کے لفظ سے تعبیر کی گئی ہے یا پھر چونکہ اس کے نیچے سیاہ خود سر پر رکھا تھا اور پگڑی کے نیچے سے وہ نظر آ رہا تھا۔ اس لئے یہ عارضی طور پر سیاہ نظر آتی تھی کیونکہ نبی کریم ﷺ سفید لباس پسند فرمایا کرتے تھے۔ لیکن علامہ بیجوری وغیرہ شراح نے اس توجیہ کو خلافِ موطا ہر بتایا ہے۔

رہی یہ بات کہ آپ ﷺ سے روایت مروی ہے کہ سفید پوشاک بہترین لباس ہے (۱)۔ تو اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ سیاہ لباس یا پگڑی ناجائز ہے (۲) یا حضور ﷺ نے اسے استعمال نہیں کیا ہے خصوصاً جب خود نبی کریم ﷺ سے اس کا استعمال مروی ہے۔ جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

(۱) شمائل ترمذی باب لباس رسول اللہ ﷺ ص ۵ قال رسول اللہ ﷺ علیکم بالبیاض من الثیاب الخ
(۲) اس لئے کہ لباس بڑا ممنوع نہیں ہوتا تاہم کسی دوسرے قوم یا فرقہ سے مشابہت کی بناء پر انہیں مکروہ کہا جاتا ہے۔ مثلاً کالی پگڑی یا لباس کا کوئی دوسرا سیاہ کپڑا ممنوع نہیں ہے مگر محرم کے دنوں میں چونکہ شیعہ حضرات خصوصیت کے ساتھ ماتم کے اظہار کے لئے سیاہ لباس پہنتے ہیں۔ لہذا ان مخصوص ایام میں سیاہ لباس یا پگڑی پہننے سے گریز کرنا چاہئے۔ (شمائل ترمذی ۳۳۳ مولا ناصونی عبد الحمید) علامہ شیخ احمد عبد الجواد الروئی نے لکھا ہے والعمامة البیض هی التي تناسب زی العلماء فی هذا الزمان (الاتحاف الربانیہ ص ۱۵۷) اور مابلی قاری نے لکھا ہے فی الحدیث جواز لبس الاسود فی الخطبة ولبس البیاض الفضل (جمع الوسائل ۲۰۵/۱) (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ) رسول اللہ ﷺ کی مختلف الوان کی پگڑیاں: سیاہ پگڑی کے علاوہ دوسرے الوان کی پگڑیاں بھی آنحضرت ﷺ اور سلف صالحین سے استعمال کرنا ثابت ہے۔ مثلاً (۱) سرخ رنگ کی پگڑی عن انس بن مالک قال رأيت رسول الله ﷺ يتوضأ وعليه عمامة قطرية فأدخل يده من تحت العمامة فمسح مقدم رأسه ولم ينقض العمامة سنن أبي داود كتاب الطهارة باب المسح على العمامة صاحب عون المعبود نے اس حدیث کے ذیل میں لکھا ہے استدلال به على التعميم بالحمرة وهو استدلال صحيح لو كان في الحديث ضعف (عون المعبود شرح أبي داود ۱/۲۵۱) (۲) زرد رنگ کی پگڑی عن زيلبن أسلم أن ابن عمر كان يصبغ لحيته بالصفرة حتى تمتلى ثيابه من الصفرة فقليل له لم تصبغ بالصفرة فقال إنني رأيت رسول الله ﷺ يصبغ بها ولم يكن شيء أحب إليه منها وقد كان يصبغ بها ثيابه كلها حتى عمامته، سنن أبي داود كتاب اللباس باب في المصبوغ بالصفرة، وعن اسماعيل بن عبد الله بن جعفر عن أبيه قال رأيت رسول الله ﷺ وعليه ثوبان مصبوغان بالزعفران رداء عمامة المستدرک للحاکم ۳/۱۸۹، وقال صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه. (۳) سفید رنگ کی پگڑی مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے عن ابی صالح قال رأيت على الشعبي عمامة بيضاء قد أرخت طرفها ولم يرسله وعن إسماعيل بن عبد المطلب قال رأيت على سعيد بن جبير عمامة بيضاء وعن سليمان بن أبي عبد الله قال ادركت المهاجرين الأولين يعمون بعمائم كرايس سوديبيض لا يخرجهما من تحت ذقنه (مصنف ابن أبي شيبة ۵/۱۷۹ كتاب اللباس والزينة باب لبس العمائم البيض) (۴) بزرگ کی پگڑی جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ کا حوالہ دے رہا ہے۔ اسی طرح سنن ابی داؤد میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے قال رأيت رسول الله ﷺ وعليه بردان أخضران (ابو داؤد كتاب اللباس باب في الخضرة) اور اس روایت کو خود امام ترمذیؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ (جامع ترمذی كتاب الادب باب ما جاء في الثوبين الاخضرين) مگر یاد رہے بزرگ کی دوسرے الوان پر کوئی فضیلت نہیں بلکہ اس رنگ کی پگڑی کا استعمال محض اباحت تک ہے۔ اس لئے بہت سارے اہل علم نے اس رنگ کے استعمال سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں والعمامة الخضراء فلاصل لها وإيما حدث سنة ثلاث وسبعين وسبعماية بأمر الملك شعبان بن حسين (الفتاوى الحديثية ۲۲۵) اور علامہ سیوطیؒ نے لکھا ہے الجواب: أن هذه العلامة ليس لها أصل (بقیہ اگلے صفحہ پر)

سیاہ پگڑی کے فوائد: پھر سیاہ پگڑی کے استعمال میں کچھ ایسے فوائد بھی ہیں جو سفید میں نہیں۔ مثلاً میل خورا ہونے کی وجہ سے جلدی اس پر میل ظاہر نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں نبی کریم ﷺ سر مبارک پر تیل کا استعمال کثرت سے کیا کرتے تھے۔ اس لئے بھی سیاہ رنگ زیادہ مناسب تھا۔ جس پر تیل آسانی سے ظاہر نہیں ہوتا۔ خصوصاً سفر کی حالت میں جب دھونے دھلانے کے مواقع کم ہوتے ہیں، سفید کی نسبت سیاہ پگڑے کا استعمال زیادہ مناسب ہے۔ علاوہ ازیں فتح مکہ کے اس تاریخی موقع پر آپ ﷺ نے اس عمل سے دین محمدی ﷺ کے دوام اور عدم تغیر پذیری کی طرف اشارہ بھی فرمایا۔ کیونکہ سیاہ رنگ بھی متبدل اور دوسرے رنگ سے متاثر نہیں ہوتا (۱)۔

(۲) حدثنا ابن أبي عمر ثنا سفیان عن مساور الوراق عن جعفر

ابن عمر و بن حریث عن أبيه قال رأيت علي رسول الله ﷺ عمامة

سوداء (۲)۔

(بقیہ حاشیہ) فی الشرع ولا فی السنة ولا کانت فی الزمن القديم وإنما حدثت فی سنة ثلاث و سبعین و مبعثه بأمر الملك الأشراف یعنی شعبان بن حسین (الحاوی للفتاویٰ ۳۳/۱) اور علامہ محمد کمال نے لکھا ہے سئل عن انتساب إلى آل بیت النبوة و لیس هو منهم و لبس عمامة الخضراء ليقال أنه سیلو شریف ما ذیلنزمه؟ فالجواب: أنه یمنع من لبس العمامة الخضراء و یعز و تعزیراً شدیداً یحبس حتی یظهر صلاحه أفنی بذلك فی البهجة (الفتاویٰ الکاملية ۲۶۵) گویا سبز پگڑی کا ثبوت صراحۃً نہیں۔ اس لئے اس کو سنت نہ سمجھا جائے۔ البتہ اگر اہل جنت کے لباس سے مشابہت یا گنبد خضراء کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے بوجہ عشق استعمال کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ (مختار)

(۱) خلفائے عباسیہ کے ہاں ایک پگڑی کا ذکر ملتا ہے۔ جس کے ذریعے وہ ہر نئے خلیفہ کی دستار بندی کرتے تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ یہ وہی پگڑی ہے جو فتح مکہ کے دن نبی کریم ﷺ نے پہنی تھی۔ اور بعد میں اپنے چچا حضرت عباس کو بخش دی تھی۔ اور اس طرح بنو عباس کو ملی (اصلاح الدین)

(۲) صحیح مسلم ۲۳۹/۱ کتاب الحج باب جواز دخول مكة بغير احرام، ابو داؤد ۲۰۹/۲ کتاب اللباس باب فی العمامة سنن النسائی ۲۵۵/۲ کتاب الزينة باب لبس العمامة السود، ابن ماجه ص ۲۰۸ کتاب إقامة الصلوة والسنة باب ما جاء فی الخطبة يوم الجمعة و کتاب اللباس بالعمامة السوداء (مختار)

ترجمہ: عمرو بن حریشؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے سر مبارک پر سیاہ عمامہ دیکھا۔

(۳) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ غِيلَانَ وَيُوسُفُ بْنُ عِيسَى قَالَا لَنَا وَكَيْعُ عَنْ مَسَاوِرِ الْوَرَّاقِ عَنْ جَعْفَرِ بْنِ عَمْرٍو وَبْنِ حَرِثٍ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ خَطَبَ النَّاسَ وَ عَلَيْهِ عِمَامَةٌ سُودَاءُ.

ترجمہ: عمرو بن حریشؓ سے یہ روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ لوگوں کو اس حال میں خطبہ دیا کہ آپ ﷺ کے سر مبارک پر سیاہ عمامہ تھا۔

وعلیہ عمامة سوداء اوپر کی دونوں حدیثوں میں یہ تعین نہیں ہے کہ حضرت عمرو بن حریشؓ یہاں کس روز اور کس موقع کی بات کر رہے ہیں۔ لیکن مسلم اور نسائی کی حدیثوں میں انہوں نے کہا ہے کہ وہ منظر گویا میرے سامنے ہے جب نبی کریم ﷺ منبر پر خطبہ دے رہے تھے سیاہ عمامہ آپ ﷺ کے سر مبارک پر تھا اور اس کا شملہ دونوں شانوں کے درمیان تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جمعہ کا دن تھا نیز یہ خطبہ اس خطبہ کے علاوہ ہے جو آپ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر دیا تھا۔ کیونکہ وہ خطبہ منبر پر نہ تھا بلکہ کعبہ کے دروازے پر چڑھ کر آپ ﷺ نے دیا تھا۔ صاحب مصابیح نے بھی یہ حدیث باب خطبۃ الجمعہ کے تحت ذکر کی ہے (۱)۔ علامہ نوویؒ اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سیاہ لباس پہننا جائز ہے اگرچہ سفید اس سے بہتر ہے۔

(۱) لیکن علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ عمرو بن حریشؓ کی حدیث میں جو خطبہ مذکور ہے یہ وہی خطبہ ہے جو کہ آپ ﷺ نے فتح مکہ کے دن باب کعبہ کے پاس دیا۔ تو گویا انہوں نے دروازے کی دلیز کو مجازاً منبر کہا ہے۔ (عبد الرؤف مناوی) اور اسی رائے کی طرف میرک شاہؒ کے کلام میں بھی اشارہ ملتا ہے۔ (کما فی جمع الوسائل) نیز علامہ بیجوریؒ فرماتے ہیں کہ ”والمراد بالمنبر فی بعض الروایات عتبة الباب لانها منبر بالمعنی اللغوی و هو کل مرتفع“ (المواهب اللدنیہ) جبکہ ملا علی قاریؒ کی رائے یہ ہے کہ یہ خطبہ آپ ﷺ کا مرض وصال والا ہے۔ (اصلاح الدین)

(۴) حَدَّثَنَا هَارُونُ بْنُ إِسْحَاقَ الْهَمْدَانِيُّ ثَنَا يَحْيَى بْنُ مُحَمَّدٍ الْمَدِينِيُّ عَنْ عَبْدِ الْعَزِيزِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ عَنْ نَافِعٍ عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا اعْتَمَ سَدَلَ عِمَامَتَهُ بَيْنَ كَتِفَيْهِ قَالَ نَافِعٌ وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يَفْعَلُ ذَلِكَ قَالَ عَبْدُ اللَّهِ وَرَأَيْتُ الْقَاسِمَ ابْنَ مُحَمَّدٍ وَ سَالِمًا يَفْعَلَانِ ذَلِكَ (۱)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب عمامہ باندھتے تھے تو اس کا شملہ اپنے دونوں موٹھوں کے درمیان لٹکا ہوا چھوڑ دیتے تھے۔ نافعؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ ایسا کرتے تھے۔ نافعؓ کے شاگرد عبید اللہ بن عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے قاسم بن محمد بن ابی بکر اور سالم بن عبداللہ بن عمرؓ کو ایسا کرتے دیکھا تھا۔

سدل عمامة بين كتفيه الخ یعنی آپ ﷺ نے پگڑی کا شملہ جسے عربی زبان میں عذبة یا علاقة کہتے ہیں کندھوں کے درمیان پیچھے کی جانب چھوڑ دیا تھا (۲)۔ اس حدیث سے شملہ چھوڑنے کا ثبوت ملتا ہے۔ اور یہ سنت ہے۔ عموماً آپ ﷺ شملہ چھوڑ کر پگڑی باندھا کرتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی بغیر شملہ کے بھی پگڑی باندھی ہے۔ اکثر یہ ثابت ہے لیکن بائیں جانب کو چھوڑنے کا ذکر نہیں۔ امام مناویؒ کہتے ہیں کہ کندھوں کے درمیان چھوڑنا افضل ہے۔ یہ بھی آیا ہے کہ آپ ﷺ نے پگڑی کے دونوں سرے چھوڑ کر دو شملے لٹکائے ہوں لیکن عموماً آپ ﷺ ایک شملہ چھوڑ کر پگڑی باندھا کرتے تھے۔

اس کی مقدار میں بھی اقوال ہیں۔ کم از کم مقدار چار انگلیوں جتنی منقول ہے اور زیادہ سے زیادہ

(۱) جامع ترمذی ۳۰۴/۱ باب ما جاء في العمامة السوداء كتاب اللباس باب سدل العمامة بين الكتفين، شرح السنة للبغوی ۳۷۱/۲، كتاب اللباس باب العمامة والتفنع، صحيح ابن حبان ۱۰۴/۸ باب وصف تعميم المصطفى (مختار)

(۲) آگے کی طرف شملہ چھوڑتے ہوئے دائیں جانب چھوڑنا لازمی نہیں ہے۔ علامہ مناویؒ حافظ زین الدین عراقیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ ولیم ارمادل علی تعین الایمن الاقلی حدیث ابی امامۃ عند الطبرانی لکنہ ضعیف بلکہ صوفیاء تو بائیں جانب چھوڑنے کو ترجیح دیتے ہیں تاکہ دل کا رابطہ دنیا اور غیر اللہ سے نہ ہو۔ (اصلاح الدین)

ایک ذراع کا ذکر ہے جو عموماً پیٹھ کی وسط تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے شملہ کو زیادہ لمبا نہیں کرنا چاہیے۔ ذراع سے تجاوز کرنے کو بعض علماء نے بدعت میں شمار کیا ہے اور اس سال کے زمرہ میں ہونے کے سبب ناجائز قرار دیا ہے۔ علامہ مناویؒ کہتے ہیں کہ تکبر کے طور پر زیادہ لمبا چھوڑنا حرام ہے۔ واللہ اعلم

یفعّل ذالک ابن عمرؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے شاگرد حضرت نافعؓ کے بقول حضرت ابن عمرؓ ایسا کرتے تھے۔ یعنی شملہ چھوڑ کر پگڑی باندھا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ ویسے بھی اتباع سنت میں امتیازی مقام رکھتے تھے۔

قال عبید اللہ یہ حضرت نافعؓ کے شاگرد ہیں۔ ورایت القاسم بن محمد و سالما یفعلان ذالک یعنی حضرت قاسمؓ اور حضرت سالمؓ بھی شملہ پیٹھ کی جانب چھوڑا کرتے تھے۔ یہ دونوں ممتاز تابعین میں سے ہیں۔ قول لذکر حضرت ابو بکرؓ کے پوتے اور دوسرے حضرت عمرؓ کے پوتے ہیں۔ ان آثار کے نقل سے امام ترمذیؒ کا مقصد یہ ہے کہ شملہ چھوڑنا سنت ماثورہ ہے۔ اور سلف صالحین نے اس کا التزام فرمایا ہے۔

(۵) حَدَّثَنَا يَوْسُفُ بْنُ عِيسَى ثَنَا وَكِيعٌ ثَنَا أَبُو سَلَيْمَانَ وَ هُوَ

عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ الْغَسِيلِ عَنْ عِكْرَمَةَ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ

خَطَبَ النَّاسَ وَ عَلَيْهِ عَصَابَةٌ دَسْمَاءُ (۱)۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ لوگوں کو خطبہ

دیا اور آپ ﷺ کے سر مبارک پر تیل سے آلودہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔

عن عبد الرحمن بن غسيل الخ حضرت حنظلہؓ کو غسيل الملائکہ کہتے ہیں۔ ان کے بیٹے کے

پوتے حضرت عبدالرحمن بن سليمان بن عبد الله بن حنظلہؓ مراد ہیں۔

حضرت حنظلہؓ نے نئی نئی شادی کی تھی۔ ادھر آپؐ نے بیوی سے ہمبستری کی۔ ادھر جہاد کی منادی

ہوئی۔ جنابت کی حالت میں میدان جنگ کی طرف دوڑے۔ دلہن کا خیال تو کجا، غسل کرنے کے لئے بھی

نہیں ٹھہرے۔ اس قسم کی قربانی کسی بھی امت میں کوئی پیش نہ کر سکا۔ الغرض جہاد کرتے ہوئے جام شہادت

(۱) صحیح بخاری ۱/۲۵، ۱۲۶ کتاب الجمعة باب من قال في الخطبة بعد الشاء

نوش فرمایا۔ آپ کی لاش مبارک پر حضور ﷺ کی نظر پڑی تو دیکھا کہ فرشتے غسل دینے میں مصروف ہیں۔ آپ ﷺ نے تعجب فرمایا۔ بیوی سے پتہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ میرے ساتھ صحبت کی حالت میں منادی کی آواز سنی۔ فوراً اٹھ کر میدان جنگ کو آئے۔ غسل نہیں کیا۔ اگرچہ شہید کو غسل نہیں دیا جاتا مگر جنابت کی وجہ سے فرشتوں نے ان کو غسل دیا۔ چنانچہ اس وجہ سے آپ غسل الملائکہ کہلانے لگے۔

خطب الناس وعليه عصابة دسماء الخ دسماء دسومة سے ہے جو چکناہٹ کو کہتے ہیں اور عموماً تیل لگانے کے سبب ہوتا ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ کے سر پر تیل سے آلودہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ عصابہ دراصل اس پٹی کو کہتے ہیں جس پر عموماً سردرد کے وقت سر باندھا جاتا ہے۔ یہ نبی کریم ﷺ کی مرض الوفا کا واقعہ ہے۔ آپ ﷺ نے باہر آ کر لوگوں کو خطبہ دیا۔ اور امراء کو انصار کی رعایت کا حکم دیا۔ یہ آپ ﷺ کا آخری خطبہ ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے لوگوں کو کوئی خطبہ نہیں دیا۔ اس دوران آپ ﷺ کو سردرد کی شکایت بہت ہوتی تھی بلکہ آپ ﷺ کا اصل مرض ہی یہی تھا۔ اس موقع پر آپ ﷺ کا سر اس پٹی کے ذریعے بندھا ہوا تھا۔ چنانچہ اس حدیث سے پٹی کے ذریعے سر کو باندھنے کا ثبوت ملتا ہے۔ جبکہ بعض شراح حدیث کے نزدیک عصابہ اور عمامہ ہم معنی ہیں۔ لہذا یہاں عمامہ اور پگڑی ہی مراد ہے۔ بلکہ ایک اور روایت میں عمامة دسماء مروی ہے۔ عمامہ کے باب میں لاتے ہوئے شاید امام ترمذی کا بھی یہی مقصد ہے کہ یہاں عمامہ مراد ہے۔

۱۸ . باب ما جاء في صفة ازار النبي ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے تہہ بند کے بیان میں

نبی کریم ﷺ کا تہہ بند اور اس کی مقدار: شلوار کی جگہ لنگوٹی باندھی جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ اسے استعمال کیا کرتے تھے۔ اس باب میں لنگوٹی کا بیان مقصود ہے۔ البتہ ضمننا رداء کا بھی ذکر ہوا۔ ازار کے معنی سختی، شدت اور مضبوطی کے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ ”فأشدد به ازدي“ یعنی میرے بھائی کے ذریعے مجھے تقویت دے۔

چونکہ ازار کو بھی نطق یعنی کمر بند کے ذریعے مضبوطی سے باندھا جاتا ہے۔ اس لئے اسے ازار کہا جانے لگا۔ اس زمانے میں ازار اور لنگوٹی بطور تہہ بند استعمال کرنے کا عام رواج تھا۔ لہذا آپ ﷺ کی لباس میں ازار کے استعمال کا ذکر کثرت سے آیا ہے۔ آپ ﷺ جو ازار استعمال کرتے تھے روایات کے مطابق اس کا طول چار ہاتھ اور ایک بالشت تھا۔ جبکہ عرض دو ہاتھ تھا۔ جبکہ حضور ﷺ کے رداء کے بارے میں دو قسم کی روایات منقول ہیں۔ اول طول چار ذراع اور عرض ڈھائی ذراع دوم طول چھ ذراع اور عرض تین ذراع ایک بالشت۔

شلوار کا حکم: احادیث میں نبی کریم ﷺ کے بارے میں شلوار پہننے کا واضح ثبوت نہیں ہے۔ لیکن صاحب زادہ المعادی تحقیق کے مطابق نبی کریم ﷺ نے شلوار پہنی بھی تھی اور محبت کی نظر سے دیکھ کر یہ بھی فرمایا تھا کہ یہ استر ہے۔ یعنی خوب پردہ پوشی کرنے والا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے شلوار کا خریدنا (۱) ثابت ہے اور یہ قرینہ ہے کہ آپ ﷺ نے اسے پہنا بھی ہوگا۔ بہر حال شلوار بہتر لباس ہے۔

(۱) حدثنا أحمد بن منيع ثنا اسماعيل بن إبراهيم ثنا أيوب عن

حميد بن هلال عن أبي بردة قال أخرجت إلينا عائشة كساً ملبئد

(۱) قال ابن القيم والظاهر انه اشتراه ليلبسه قال وروى انه لبسه و كانوا يلبسونه في زمانه و باذنه .

(جمع الوسائل ج ۱ ص ۲۱۶) (اصلاح الدين)

او ازاراً غليظاً فقالت قبض روح رسول الله ﷺ في هليلين (۱)۔

ترجمہ: حضرت ابو بردہؓ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے ہمیں ایک پیوند لگی ہوئی چادر اور

ایک لنگوٹی دکھائی۔ اور یہ فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کا وصال ان دو کپڑوں میں ہوا تھا۔

ابو بردہؓ: عن ابی بردۃ الخ یہ مشہور تابعی اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے بیٹے ہیں۔ ان کا

نام عامریا حارث تھا۔ کوفہ کے قاضی بھی رہ چکے تھے۔ اپنے والد کے علاوہ دیگر صحابہؓ اور حضرت عائشہؓ سے

بھی روایت ثابت ہے۔ بعض نسخوں میں یہاں ”عن ابیہ“ کا اضافہ ہے۔ لیکن حضرت عائشہؓ سے ملاقات

اور روایت ثابت ہونے کی بناء پر موجودہ نسخہ کی حدیث بھی مرسل نہیں ہوتی۔

زہد نبوی ﷺ یاد دہانی: أخرجت إلینا عائشة الخ حضرت عائشہؓ کبھی نبی کریم ﷺ کی

وفات کے بعد بھی صحابہؓ کو آپ ﷺ کے زہد اور فہر کی زندگی یاد دلانے کے لئے آپ ﷺ کے حالات کا

ذکر کرتی تھیں۔ اس سلسلے میں ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے صحابہؓ کو ایک چادر اور ایک لنگوٹی دکھائی جو

انہوں نے بقصد تبرک حفاظت سے رکھی تھیں (۲)۔ چادر میں تہہ تہہ ٹکڑے سے گئے تھے۔ اور لنگوٹی بھی

کھدر جیسے سخت اور موٹے کپڑے کی تھی دونوں دکھلاتے ہوئے فرمایا کہ ان دو کپڑوں میں شاہ کونین ﷺ کی

روح مبارک پرواز کر گئی تھی۔ کساء ملبداً بدن کے اوپر کا حصہ چھپانے کیلئے جو موٹا کپڑا یا کبیل استعمال

ہوتا ہے کساء کہلاتا ہے جبکہ ملبد سے مراد اکثر شراح کے نزدیک پیوند لگا کپڑا ہے (۳)۔ جبکہ بعض شراح کہتے

(۱) صحیح بخاری کتاب اللباس باب الاکیۃ والخمائل ۸۶۵/۲، کتاب فرض الخمس باب

ما ذکر من ذرع النبی ﷺ وعصاه وسیفه الخ، سنن ابی داؤد ۲۰۴/۲ باب لباس الصوب والشعر

کتاب اللباس، جامع ترمذی ۳۰۳/۱ کتاب اللباس باب ما جاء فی لبس الصوف، ابن ماجہ کتاب

اللباس باب لباس رسول اللہ ﷺ (مختار)

(۲) اس روایت سے بزرگوں کے لباس، عمامہ، عصا وغیرہ اشیاء کو تبرک کے طور پر رکھنا ثابت ہوتا ہے اور ملا علی قاریؒ نے

اس روایت سے اس مسئلہ کا اثبات کیا ہے۔ شا کر غنی سے صابر فقیر بہتر ہے (جمع الوسائل ۲۱۱/۱) (مختار)

(۳) علماء نے لکھا ہے کہ پیوند لگائے ہوئے کپڑوں کا استعمال معیوب نہیں۔ بلکہ مستحسن ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے بارے

میں مشہور ہے کہ جب آپؓ بیت المقدس پہنچے تو آپؓ کی قمیص میں سترہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ تو مسلمان فوج کے جرنیل حضرت

ابو عبیدہؓ نے عرض کیا کہ یہاں کے لوگ اس کو حقیر سمجھتے ہیں۔ تو حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ ہم نادار اور غریب لوگ تھے۔ اللہ نے

ہمیں دین اسلام کی وجہ سے عزت بخشی۔ اگر ہم دین اسلام کے علاوہ عزت تلاش کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہمیں رسوا کرے گا۔ (مختار)

ہیں کہ وہ کپڑا جو موٹائی کی وجہ سے سخت ہو چکا ہو ملبد کہلاتا ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ایک وسیع اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اور دور دور تک کے علاقے اس کے زیر نگیں تھے۔ لیکن اس کے سربراہ کے فخر کی یہ حالت تھی۔ بہر حال اس حدیث میں ازار پہننے کا ثبوت ملتا ہے۔

(۲) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ غِيلَانَ أَنَا أَبُو دَاوُدَ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ الْأَشْعَثِ

ابن سلم قال سمعت عمتي تحدث عن عمها قال بينهما أنا أمشي بالمدينة إذا انسان خلفي يقول ارفع ازارك فإنه اتقى و أبقي فالتفت فإذا هو رسول الله ﷺ فقلت يا رسول الله ﷺ إنما هي بردة ملحاء قال أمالك في أسوة فنظرت فإذا ازاره إلى نصف ساقيه (۱)۔

ترجمہ: عبید بن خالد محاربؓ کہتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ میں ایک مرتبہ جا رہا تھا کہ اچانک ایک شخص میرے پیچھے سے بولا کہ لنگوٹی کو اوپر اٹھاؤ۔ کہ یہ تقویٰ سے زیادہ قریب اور زیادہ دیر تک رہنے کے لئے مفید ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ نبی کریم ﷺ تھے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! یہ ایک معمولی سی سیاہ (نا قابل فخر) چادر ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کیا تیرے لئے میرا اتباع کافی نہیں۔ میں نے اس ارشاد پر نبی کریم ﷺ کی لنگوٹی کو دیکھا تو وہ نصف پنڈلی تک تھی۔

سمعت عمتي تحدث عن عمها الخ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ اشعث کی پھوپھی کا نام رہم بنت الاسود بن خالد ہے۔ اور وہ اپنے چچا عبید بن خالدؓ سے روایت کرتی ہے لہذا ”تحدث عن عمها“ درست ہوگا۔ لیکن علامہ مناویؒ اور دیگر شراح نے لکھا ہے کہ اشعث کی پھوپھی کا نام رہم بنت الاسود بن حنظل بن خالد ہے۔ اور ان کے چچا سے مراد عبید بن خالدؓ ہو گئے۔ لہذا اصح یہ ہے کہ ”تحدث عن عم ابیہا“ کیونکہ عبید رہم بنت الاسود کے باپ اسود کے چچا لگتے ہیں۔

بينما أنا أمشي الخ حضرت عبیدؓ کہتے ہیں کہ میں مدینہ میں جا رہا تھا کہ اچانک ایک انسان

(۱) سنن النسائي ۲/۲۹۷ کتاب الزينة باب العمام السود، مسند احمد ۵/۳۶۵، المستدرک

میرے پیچھے سے آواز لگا رہا تھا کہ تمہ بند کو اونچا کر دو۔ ہاں اے اتقی و ابقی یعنی اونچا باندھنے سے ایک تو لنگوٹی زیادہ محفوظ ہو جائے گا، نجاست وغیرہ نہیں لگے گی۔ دوسرا یہ کہ یہ زیادہ دیر تک باقی رہے گا۔ جلد بوسیدہ بھی نہیں ہوگا۔ نیز ابقی کے یہ معنی بھی ہو سکتی ہے کہ یہ تکبر اور غرور سے زیادہ حفاظت کرنے والا ہے۔ اور بعض روایات میں اتقی کی جگہ انقی کا لفظ ذکر ہے۔ یعنی صفائی سے زیادہ اقرب ہے۔ بہر حال اس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ انسان کو کپڑوں وغیرہ کی بھی رعایت کرنی چاہیے۔ عبید تمہر مارتے ہیں کہ جب میں نے پیچھے لوٹ کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ نبی کریم ﷺ ہی ہیں جو مجھے پکار فرما رہے ہیں۔ انما ہی ہر دہ ملحاء ملحاء املح کی تانیث ہے۔ اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ یہ ایک حسین اور بیش قیمت چادر ہے۔ رنگدار اور خوبصورت کپڑا ہے اور کاٹنے سے تو یہ خراب ہوگا۔ چنانچہ یونہی میں نے پہن لیا۔ تکبر کی وجہ سے یہ لمبا کپڑا میں نے نہیں لیا۔ اور ملحاء اس بکری کو بھی کہتے ہیں جس کے سفید رنگ میں سیاہ دھبے ہوں (اور اس سے مراد وہ سیاہ و سفید ادنی درجے کا کپڑا ہوگا جو کہ اعراب اور مزدور پیشہ لوگ پہنتے ہیں) اس لحاظ سے یہ پرانے اور خراب رنگ سے کنایہ ہوگا۔ لہذا اس کا دوسرا معنی یہ ہوگا کہ یہ تو میلا اور مبتذل کپڑا ہے۔ جس طرح کہ عموماً مزدور پیشہ لوگوں کی محنت مزدوری کا لباس گندہ اور بوسیدہ ہوتا ہے۔

تو یہ اسی قسم کی ایک چادر ہوگی۔ اور صحابی کا مقصد اس قول سے یہ ہوگا۔ کہ یہ اگر لمبا بھی ہے تو اس میں تکبر کا شائبہ نہیں کیونکہ پھٹا پرانا اور میلا پھیلا کپڑا ہے۔ شراح حدیث نے دوسرے معنی کو ترجیح دی ہے۔ اور پہلے معنی کو درست قرار نہیں دیا (۱)۔ دوسرا معنی سیاق و سباق سے بھی مطابق ہے۔ بہر حال اس صحابی نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے مقابلے میں کوئی عذر پیش کیا جس کی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا امالک فی اسوۃ۔ یعنی یہ کیا منطق پڑھائی جاتی ہے۔ کیا میرا طریقہ تیرے لئے قابل اتباع نہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنة (الایۃ)

تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہتر قابل تقلید نمونہ موجود ہے۔

لہذا تم میری پیروی کرو اور باتیں چھوڑ دو۔ گویا نبی کریم ﷺ کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ یہ قیمتی نہیں

(۱) ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ وہو خطا فاحش لفظا ومعنی اور پھر تفصیل سے نقلی اور معنوی اعتبار سے اس رائے

لیکن سدا للذوی عہد اس میں بھی اسہال ناجائز ہے۔

إلی نصف ساقیه آپ ﷺ کا ازار آدمی پنڈلیوں تک لٹک رہا تھا۔ اس حدیث میں بھی ازار کا

پہننا ثابت ہو رہا ہے۔

(۳) حَدَّثَنَا سُوَيْدُ بْنُ نَصْرٍ ثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ الْمُبَارَكِ عَنْ مُوسَى بْنِ

عَبِيدَةَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ بْنِ سَلَمَةَ بْنِ الْأَكْوَعِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ كَانَ عَثْمَانُ بِأَنْزُرٍ

إِلَى أَنْصَافِ سَاقِيهِ وَقَالَ هَكَذَا كَانَتْ إِزْرَةُ صَاحِبِي يَعْنِي النَّبِيَّ ﷺ (۱)۔

ترجمہ: حضرت سلمہ بن الاکوعؓ کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ تہہ بند آدمی پنڈلی تک

باندھتے تھے اور فرماتے تھے کہ اسی طرح میرے آقا یعنی نبی کریم ﷺ کی لنگوٹی بھی تھی۔

سلمة بن الاكوع: عن ابيه حضرت سلمہ بن عمرو بن الاکوع مشہور صحابی ہیں۔ بہادری کی

وجہ سے ممتاز ہیں۔ بہترین تیر انداز تھے، اور تیز اترتے تھے کہ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کو پکڑ لیتے تھے۔ نبی

کریم ﷺ کے ساتھ سات غزوات میں شرکت کی۔ بیعت رضوان میں بھی موجود تھے۔

هكذا كانت ازره صاحبی حضرت عثمانؓ کہتے ہیں کہ میرے آقا کا ازار بھی اسی طرح یعنی

نصف ساق تک ہوتا تھا۔ گویا میں بھی اسی وجہ سے ایسا کرتا ہوں۔ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ

ساتھ ان کے ایک خلیفہ حضرت عثمانؓ کی سلت بھی مذکور ہے۔

(۴) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ أَبِي الْأَحْوَصِ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ عَنْ مُسْلِمِ بْنِ

نَذِيرٍ عَنْ حَذِيفَةَ بْنِ الْيَمَانِ قَالَ أَخَذَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بَعْضَ سَاقِي

أَوْسَاقِهِ فَقَالَ هَذَا مَوْضِعُ الْأَزَارِ فَإِنْ أَبَيْتَ فَاسْفِلْ فَإِنْ أَبَيْتَ فَلَا حَقَّ

لِلْأَزَارِ فِي الْكَعْبَيْنِ (۲)۔

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ ۲۰۶/۸، ۲۰۸ (مختار)

(۲) سنن النسائي ۲۹۸/۲ کتاب الزينة باب موضع الازار، ابن ماجه ۲۶۳/۱ کتاب اللباس باب

موضع الازار ابن هو شرح السنة للبخاری ۱۰/۱۲ باب موضع الازار کتاب اللباس (مختار)

ترجمہ: حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے میری پنڈلی یا اپنی پنڈلی کے گوشت کو پکڑ کر یہ فرمایا کہ یہ حد ہے لنگوٹی باندھنے کی۔ اور اگر تم اس جگہ باندھنے پر قناعت نہ کر سکو۔ تو اس سے کچھ نیچے تک (باندھو) اور اگر اس پر بھی قناعت نہ ہو تو جان لو کہ لنگوٹی کا ٹخنوں پر کوئی حق نہیں۔

حذیفہ بن الیمانؓ کا تذکرہ: عن حذیفہ بن الیمانؓ ابو عبد اللہ حذیفہ بن الیمان عیسیٰ کے والد کا اصل نام حسل بن جابر یا حسیل بن جابر الیمانی تھا۔ حذیفہؓ اور ان کے والد دونوں غزوہ بدر سے کچھ قبل مسلمان ہو چکے تھے۔ ان کے والد غزوہ احد میں غلطی سے مسلمانوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ حضرت حذیفہؓ کو صاحب سر رسول اللہ ﷺ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ آپؐ منافقین اور فتنوں کے سلسلے میں نبی کریم ﷺ کے راز دان تھے۔ غزوہ خندق میں آپ ہی کو نبی کریم ﷺ نے معلومات کیلئے کفار کی فوج میں بھیج دیا تھا۔ آپ گئے اور آ کر خبر دی کہ مشرکین واپس ہونا چاہتے ہیں جس سے نبی کریم ﷺ بہت خوش ہو گئے۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے چالیس دن بعد ۳۵ھ میں مدائن میں وفات پائی اور وہیں دفن ہو گئے۔ بعض اہل سیر ۳۳ھ میں وفات کے قائل ہیں۔

عضلة ماسی او ماسقہ عضلۃ پنڈلی کے اس حصہ کو کہتے ہیں جہاں گوشت زیادہ ہوتا ہے۔ راوی مسلم کو شک ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے اپنی پنڈلی کا ذکر کیا تھا یا نبی کریم ﷺ کی پنڈلی کا ذکر کیا۔ فقال هذا موضع الازار فان ابیت فاسفل الخ۔ یعنی اگر طبیعت کو ناگوار ہو تو ذرا نیچے کر لو۔ لیکن اگر اس سے بھی دل کو اچھا نہ لگے اور نیچے باندھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کیونکہ کعبین میں ازار کا حق نہیں۔ اور اس سے نیچے کرنا اسباب ہوگا۔ جو ناجائز ہے۔

شلوار کا ٹخنوں سے نیچے ہونا: اس حدیث سے اسباب یعنی ازار کا ٹخنوں سے نیچے ہونا ناجائز معلوم ہوتا ہے۔ یہی حکم شلوار اور لمبی قمیص کا بھی ہے۔ اس سلسلے میں علماء کا تقریباً اس بات پر اتفاق ہے کہ مرد کے لئے لنگوٹی اور شلوار کا آدھی پنڈلی تک ہونا مستحب ہے۔ اور اس سے نیچے ٹخنوں تک ہونا بلا کراہت جائز ہے۔ بلکہ اگر کسی عذر کی وجہ سے ٹخنوں سے نیچے ہو جائے تب بھی جائز ہے لیکن بغیر عذر کے ٹخنوں سے نیچے ہونا

مکروہ ہے۔ اور اگر تکبر کی وجہ سے ہو تو حرام ہے۔ دوسری احادیث میں اس پر سخت وعید بھی آئی ہے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ ما اسفل من الکعبین من الازار فی النار (۱)۔

ملا علی قارئ لکھتے ہیں کہ اسبال اور بجز ثوب سے جو ممانعت آئی ہے اس میں استیوں اور شملہ کا متناظر یقے اور حد سے لمبا کرنا بھی آتا ہے۔ لہذا اگر یہ تجاوز بھی تکبر کی نیت سے ہو تو حرام ورنہ مکروہ ہے۔ البتہ عورتوں کے لئے چونکہ ستر کی تاکید آئی ہے۔ لہذا ان کے تمام کپڑوں میں مردوں کی نسبت لمبا چوڑا ہونا ہی بہتر ہے تاکہ جسم کے تمام حصوں کو خوب ڈھانپ سکے۔ اور جب تک یہ اسراف کی حدود تک نہ پہنچے کامنوع نہیں ہوگا۔

یہاں پر یہ بات واضح رہے کہ قاضی عیاضؒ نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ اسبال یعنی کپڑے کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانا مردوں کے لئے ممنوع ہے عورتوں کے لئے نہیں۔ بلکہ ان کے لئے اتنا لمبا کپڑا پہننے کی گنجائش ہے کہ بالشت دو بالشت زمین پر گھسینا رہے۔ جیسا کہ ام سلمہؓ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے اور یہ اس لئے کہ ان کے قدم دکھائی نہ دیں۔ البتہ اگر پاؤں کو جزا ب، موزوں وغیرہ سے ڈھانپ لیا جائے تو پھر زمین تک کپڑا لٹکانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

پھر بعض احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کے لئے بھی اسبال کی حرمت تکبر کی علت کی وجہ سے ہے نہ مطلقاً۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ لا ينظر الله الى من جرد ثوبه خيلاء (رواہ البخاری عن ابن عمرؓ) اسی طرح ابن عمرؓ کی حدیث ہے کہ جب ابو بکرؓ نے اسبال سے نبی کی بات سنی تو نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ میری ازار کا ایک پہلو مجھ سے نہیں سنبھلتا بے اختیار لٹک جاتا ہے۔ اس لئے بہت تکلف سے کام لیکر ہی اسے اونچا رکھ سکتا ہوں۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ "لست ممن بصنعہ خيلاء" تم تکبر کرنے کی غرض سے ایسا کرنے والوں میں سے نہیں ہو۔ تو گویا حضرت ابو بکر صدیقؓ کے اسبال پر آپ ﷺ نے اسلئے انکار نہیں فرمایا کہ وہ تکبر کی نیت سے نہیں تھا۔ اسلئے "ما اسفل من الکعبین فی النار" اور "لاحق للازار فی الکعبین" جیسی احادیث کو بھی تکبراً اسبال پر محمول کیا جائے گا۔

البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ سداً للذریعة مطلقاً اسبال مکروہ ہے اور احتیاط بھی اسی میں ہے نیز تکبر کے علاوہ اسبال کی کراہت کے دوسرے اسباب بھی تو ہیں۔ مثلاً اس میں اسراف اور کپڑے کا ضیاع بھی ہے۔ باب کی پہلی حدیث میں اس طرف بھی اشارہ ہے۔

البتہ فقہائے کرام نے عذر کے وقت اسبال کو بلا کراہت جائز قرار دیا ہے۔ مثلاً کسی شخص کے پاؤں زخمی ہیں۔ اور مکھیوں یا دیگر موذی حشرات سے بچنے کا کوئی دوسرا طریقہ اس کے پاس نہیں سوائے اس کے کہ قمیص یا ازار وغیرہ کو لٹکا کر زخم کو چھپا دے۔ تو اس صورت میں اسبال جائز ہوگا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

۱۹ . باب ماجاء فی مشیة رسول اللہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کی رفتار کے بیان میں

مشیة ”هیئة المشی“ یعنی چال اور چلنے کی عادی کیفیت کو کہا جاتا ہے (۱)۔ امام ترمذی اس باب میں نبی کریم ﷺ کی رفتار مبارک کی کیفیت بیان فرماتے ہیں۔ اگرچہ پہلے باب میں بھی رفتار کا ذکر ضمناً ہو چکا ہے لیکن یہاں اصالت بیان کرتے ہیں۔

(۱) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ أَنَّ ابْنَ لَهِيْعَةَ عَنْ أَبِي يُونُسَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ مَا رَأَيْتُ شَيْئاً أَحْسَنَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ كَانَ الشَّمْسُ تَجْرِي فِي وَجْهِهِ وَمَا رَأَيْتُ أَحَدًا أَسْرَعَ فِي مَشْيِهِ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ كَأَنَّمَا الْأَرْضُ تَطْوِي لَهُ أَنَا لَنَجْهَدَ أَنْفُسَنَا وَإِنَّهُ لَغَيْرُ مَكْثُوثٍ (۲)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے زیادہ حسین کوئی چیز نہیں دیکھی۔ (آپ ﷺ کا چہرہ ایسا چمکدار تھا) گویا کہ آفتاب آپ ﷺ کے چہرہ میں چمک رہا ہے۔ میں نے آپ ﷺ سے زیادہ تیز رفتار شخص کوئی نہیں دیکھا۔ (آپ ﷺ کے چلتے ہوئے) ہم اپنے آپ کو تھکا دیتے تھے اور آپ ﷺ کو (معمول سے زیادہ چلنے سے) پرواہ بھی نہیں ہوتی تھی۔

ما رايت الخ روایت علمی مراد ہے یعنی میرے علم میں آپ ﷺ سے زیادہ کوئی حسین نہیں ہے۔ اگرچہ روایت بصری کا بھی احتمال ہے۔

كَانَ الشَّمْسُ تَجْرِي فِي وَجْهِهِ۔ نبی کریم ﷺ کے حسن اور چہرے کی چمک دمک کو سورج کی روشنی اور حسن سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی گویا کہ آفتاب کا نور آپ ﷺ کے چہرہ انور میں چمکتا جا رہا ہے۔

(۱) المشیة ما يعتاده الشخص من المشی ذکرہ الجاہل دی ۱۲ ج ۱ (المسائل ج ۱ ص ۲۱۶) (اصلاح الدین)

(۲) جامع الترمذی ۲/۲۰۶ کتاب المناقب باب فی صفة النبی ﷺ، مسند احمد ۵/۳۵ (مختار)

أسرع من رسول الله في مشيته یہ لفظ مشیتہ ہے جس طرح کہ باب میں ذکر ہے۔ یعنی آپ ﷺ سے چال میں کوئی تیز تر نہیں تھا۔ یا پھر تاء کے بغیر مشی مصدر ہے۔ اور مضاف مقدر ہے یعنی فی کیفیت مشیہ ﷺ۔ اس قطعہ میں ترجمۃ الباب کے ساتھ مناسبت موجود ہے کیونکہ اس میں تیز رفتاری کا ذکر ہے۔

معجزہ طی الارض: کائنات الارض تطوی لہ طی الارض معجزہ اور کرامت کے طور پر بھی ہوتا ہے۔ اس طرح کہ بہت طویل سفر آسان اور مختصر بن جائے۔ پشتو کے شاعر صوفی عبدالرحمان کہتے ہیں کہ ۔

چی پہ یو قدم تر عرشہ پورے رسی مالیدلے دے رفتار درویشانو

ترجمہ: میں نے ان درویشوں کی رفتار دیکھی ہے جو ایک قدم اٹھا کر عرش تک پہنچ جاتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ رات کے ایک مختصر حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک گئے اور وہاں سے آسمانوں اور جنت و جہنم کا مشاہدہ کر کے واپس آئے۔ دروازے کا کواڑ ابھی ویسے ہی مل رہا تھا۔ یہ طی الارض کا معجزہ تھا۔ اسی طرح اولیائے کرام کے لئے بھی لمبا سفر چھوٹا ہو جاتا ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی کرامت: کہتے ہیں کہ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی مکہ مکرمہ سے پیدل چلے اور عصر کی نماز کیلئے مدینہ پہنچ گئے۔ حالانکہ پیدل جاتے ہوئے یہ پندرہ سولہ دن کا سفر ہے۔ بہر حال یہ ایک اکرام ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیک بندوں کا ہوتا ہے۔ ایک روایت میں نبی کریم ﷺ سے ایک دعا مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہم ازولنا الارض و هوٰن علينا السفر (۱)

ترجمہ: اے ہمارے رب ہمارے لئے زمین کی دوری سمیٹ لے اور ہم پر سفر آسان فرما دے۔

اس حدیث میں بھی اس بات کے امکان کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ویسے بھی خرق عادت امور کا بزرگوں سے صادر ہونا کوئی اچھبے کی بات نہیں۔ میں جن دنوں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے ہاں رہتا تھا جن کو حضرت شیخ الحدیثؒ سے انتہائی محبت تھی۔ اور اسی وجہ سے انہوں نے اس کمرے میں میری رہائش رکھی۔ جو کہ آپ کے کمرے کے اندر کی طرف کھلتا تھا۔ رمضان شریف کا مہینہ تھا۔ وہاں ایک بزرگ حافظ

(۱) جامع ترمذی ۶۵۶/۲ کتاب الدعوات باب ما یقول اذا خرج مسافراً (مختار)

صاحب تشریف لائے انہوں نے کسی بزرگ کا قصہ سنایا اور کہا کہ ایک بار وہ وعظ فرما رہے تھے چھوٹی سی مسجد تھی۔ سامنے ہال اور اس کے بعد برآمدے کی دیوار تھی۔ انہوں نے معراج نبوی ﷺ کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے آسمانوں میں خرق والتیام کے امکان کا مسئلہ چھیڑا اور منطقہ کے اس قول پر رد کیا کہ آسمانوں میں ٹوٹ پھوٹ ممنوع ہے۔ مسجد کے اندر کچھ فلسفی ذہن کے لوگ بھی بیٹھے تھے۔ جن کو شاید یہ بات مستبعد معلوم ہوئی۔ چنانچہ وہ دلوں میں آپ کی بات کو خلاف حقیقت سمجھنے لگے۔ ولی اللہ نے اپنی فراست ایمانی سے محسوس کیا کہ کچھ زائقین بیٹھے ہیں جو اس بات کو نہیں مانتے، چنانچہ وہ جلال میں آئے۔ منبر سے کودے اور کہا ”یوں گئے“ ساتھ ہی دیواروں کو چیرتے ہوئے باہر چلے گئے۔ پھر کہا کہ ”یوں آئے“ اور انہی دیواروں کو چیرتے ہوئے واپس اندر آئے اس طرح سات بار باہر جا کر واپس آئے۔ ہر بار دیوار پھٹ کر اس کو راستہ دیتی اور وہ گزر جاتے اس طرح طی الارض بھی معجزہ اور کرامت کے سامنے کوئی انہونی بات نہیں۔ لیکن یہاں پر طی الارض مراد نہیں۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ عام طور پر نبی کریم ﷺ کی فطری رفتار اور چال اتنی چست تھی کہ بڑا فاصلہ تھوڑے سے وقت میں طے کر لیتے تھے۔ اور یوں محسوس ہوتا تھا گویا زمین ان کیلئے سمنتی جا رہی ہے۔

إِنَّا لَنَجْهَدُ أَنْفُسَنَا - نَجْهَدُ جَهْدَ سَلَاثِي مَجْرَدِ الْمَضَارِعِ كَالصَيْخَةِ - يَأْخُذُ مَضْمُونُ النَّوْنِ يَعْنِي أَعْمَالُ سَلَاثِي مَضَارِعِ مَعْلُومُ كَالصَيْخَةِ - أَوْ مَعْنَى يَهْوُكَ كَمَا هُوَ خُودُكَ تَهْكَا دِيْتِ تَهْ وَأَوْ بِحُكْلَفٍ تَزْجَلْتِ هُوَ خُودُكَ مَشَقَّتْ مِثْلًا كَرَدِيْتِ تَهْ لَيْكِنْ أَفْطَحْتِ كَوَيْسَا جَلْنِي كِيْ طَرَاةٍ نَحْسُ هُوَتِي تَهْ - يَعْنِي أَفْطَحْتِ كَوَيْسَا تَهْكَاوَتْ كَا احْسَاسٍ نَحْسُ هُوَتَا تَهْ - نَدَا سَوْجَهْ سَوْجَهْ مِثْلَ فَرْقِ آتَا تَهْ - بَلْكَ طَمِينَانِ كِيْ سَا تَهْ جَلْتِ تَهْ - أَيْكَ أَوْ رَحِيْثٌ مِثْلَ أَفْطَحْتِ كِيْ صِفَاتِ مِثْلَ ”ذَرِيْعُ الْمَشِيَةِ“ (۱) كَالْفَرْقِ آتَا هُوَ - جَسْ كَا مَطْلَبُ هُوَ كِيْ جَاتِيْ هُوَ أَفْطَحْتِ كَوَيْسَا لَبِيْ لَبِيْ ذُكْ بَهْرَتِي تَهْ - لَيْكِنْ وَهْ بَلْ كَمَا قُوْتِ كِيْ وَجَهْ سَوْجَهْ هُوَتَا تَهْ - نَهْ كِيْ عَجَلَتِ أَوْ مَشَقَّتِ كِيْ صَوْرَتِ مِثْلَ -

(۲) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ حَجْرٍ وَغَيْرُ وَاحِدٍ قَالُوا إِنَّا عَيْسَى بْنُ يُونُسَ عَنْ

عُمَرَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ مَوْلَى غَفَرَةَ حَدَّثَنِي إِبْرَاهِيمُ بْنُ مُحَمَّدٍ مِنْ وَلَدِ عَلِيٍّ

ابن ابی طالب قال کان علی اذا وصف النبی ﷺ قال اذا مشی تفلع
کأنما ینحط فی صیب (۱)

ترجمہ: ابراہیم بن محمد کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ جب نبی کریم ﷺ کا ذکر کرتے، تو
یوں کہتے کہ نبی کریم ﷺ جب چلتے تو پاؤں کو قوت کے ساتھ اٹھا کر چلتے تھے۔ گویا
پستی کی طرف اتر رہے ہوں۔

اس حدیث کی تشریح اس سے پہلے باب خلق النبی ﷺ میں تفصیل سے گزر چکی ہے۔ اس کے
مذکورہ حصے میں آپ ﷺ کی رفتار کا ذکر ہے۔ اور اسی مناسبت سے اس حصے کو اس مقام پر دوبارہ لے آئے۔

(۳) حدثنا سفیان بن وکیع قال أنا ابی عن المسعودی عن
عثمان بن مسلم بن هرمز عن نافع بن جبیر بن مطعم عن علی بن ابی
طالب قال کان رسول اللہ ﷺ اذا مشی تکفأ تکفأ كأنما ینحط من
صیب (۲)۔

ترجمہ: حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ چلتے تھے تو آگے کی طرف
جھک کر قوت کے ساتھ چلتے تھے۔ جیسے کسی اونچی جگہ سے اترائی کی طرف جا رہے
ہوں۔

اذا مشی تکفأ الخ یہ حدیث بھی گزشتہ حدیث کی طرح ہے۔ یہاں حدیث کے مختصر حصے کا
ذکر ہے جو کہ پہلے باب میں مکمل تشریح کے ساتھ گزر چکی ہے۔

(۱) جامع ترمذی ۶۸۲/۲ ابواب المناقب باب ماجاء فی صفة النبی ﷺ، مسند احمد ۵/۳۵،

شرح السنة ۱۳/۲۲۱ باب صفة النبی ﷺ، کتاب الفضائل (مختار)

(۲) جامع ترمذی ۶۸۲/۲ ابواب المناقب باب ماجاء فی صفة النبی ﷺ، شرح السنة ۱۳/۲۲۱

باب صفة النبی ﷺ، کتاب الفضائل، مسند احمد ۵/۳۵ (مختار)

۲۰. باب ما جاء في تقنع رسول الله ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے قناع کے بارے میں

قناع کیا ہے؟ قناع کے استعمال کرنے کو تقنع کہتے ہیں۔ اور قناع وہ کپڑا یا رومال ہوتا ہے جو سر یا چہرہ چھپانے کے لئے استعمال ہوتا ہے (۱)۔ عورت کے اس کپڑے کو بھی قناع کہتے ہیں جو سر یا چہرہ ڈھانپنے کے لئے استعمال کرتی ہے۔ لیکن یہاں وہ کپڑا مراد ہے جو کہ سر پر لگے ہوئے تیل سے کپڑوں کی حفاظت کرنے کے لئے نیز سر کو گرمی یا سردی سے بچانے کے لئے سر پر ڈالتے ہیں۔ عرب ممالک میں آج کل بھی سر پر رومال قسم کا کپڑا ڈالنے کا رواج ہے۔ اور ان علاقوں میں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیونکہ وہ ریگستانی علاقہ ہے۔ گرم ہوا ریت اثراتی رہتی ہے۔ پھر دھوپ کی وجہ سے بدن پر پسینہ بھی ہوتا ہے۔ اس لئے سر اور چہرے کی حفاظت کے لئے رومال سے ڈھانپا جاتا ہے۔ اور آج کل تو یہ عربوں کا گویا قومی شعار بن گیا ہے۔ وہ ایئر کنڈیشنڈ محلات میں رہتے ہوئے بھی یہ رومال استعمال کرتے ہیں۔ اور ان کو یہ بہت زیب بھی دیتا ہے۔ لیکن اس کی تاریخ دراصل بہت قدیم ہے اس باب میں صرف ایک حدیث ہے (۲)۔

(۱) حدثنا يوسف بن عيسى' أنا وكيع' أنا الربيع بن صبيح عن

يزيد بن أبان عن أنس بن مالك قال قال رسول الله ﷺ يكفر

القناع كان ثوبه ثوب زينات. (۳)

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ اپنے سر مبارک پر کپڑا اکثر

رکھا کرتے تھے۔ گویا کہ ان کا یہ کپڑا چکنا پٹ میں تیلی کا کپڑا معلوم ہوتا تھا۔

(۱) ملا علی قاریؒ تقنع کا معنی لکھتے ہیں هو تغطية الرأس بطرف العمامة او برداء اعم من ان يكون فوق

العمامة او تحتها (جمع الوسائل ۱/ ۲۱۸) (مختار)

(۲) یہ روایت باب الترجیل میں بھی گزری ہے یہاں اس کو مستقل باب کے تحت ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ

کا تقنع کا خاص اہتمام فرماتے ہیں۔ (مختار)

(۳) شرح السنة ۱۲/ ۸۲ باب ترجیل الشعر ونهية كتاب اللباس (مختار)

کان ثوبه ثوب زینات خود نبی کریم ﷺ کا نہیں بلکہ قناع کا کپڑا مراد ہے۔ کیونکہ خود آپ ﷺ کہ آپ ﷺ تیل بکثرت استعمال کیا کرتے تھے۔ اور اسی وجہ سے آپ ﷺ کو قناع کا استعمال کرنا پڑتا تھا۔ یعنی عمامہ کے نیچے ایک فاضل کپڑا باندھا کرتے تھے۔ اور آپ ﷺ کے قناع کے کپڑے پر تیل اتنا زیادہ لگا ہوتا تھا کہ وہ کسی تیلی کا کپڑا معلوم ہوتا تھا۔

خصوصی لباس کا فائدہ: یہ حدیث اس سے قبل باب الترجل میں گزر چکی ہے۔ البتہ قناع پہننے کے فوائد کا کچھ تذکرہ یہاں مناسب ہوگا۔ علامہ بیجوریؒ وغیرہ نے لکھا ہے کہ علماء و خواص کے لئے صالحین اور مخصوص طرز کا لباس پہننا چاہیے۔ تاکہ وہ پہچانے جاسکیں۔ اور لوگ ان سے ضرورت کے وقت مسائل پوچھیں۔ ان کی بات مانیں اور عوام کی طرح انہیں نظر انداز نہ کریں۔ قناع بھی چونکہ خواص اور صالحین کا لباس ہے۔ اس وجہ سے اس کا پھننا بہتر ہوگا۔ علاوہ ازیں سر چھپانا بے یار و مددگار ہونے کی علامت ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کا لباس ہے۔ اس لئے یہ ترک معاصی اور خدا سے حیا کی یاد دہانی کراتا ہے۔ جس طرح کہ پرانے زمانے میں طیلسان کے بارے میں اہل تصوف کا قول تھا کہ الطیلسان الخلوة الصغریٰ یعنی طیلسان اہل اللہ کا لباس ہونے کی بنا پر خدا خونی، یاد الہی اور مناجات رب کا مورث ہے۔ جس طرح کہ خلوت کا انتظام ان مقاصد کے لئے کیا جاتا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ

التنقع من اخلاق الانبياء. قناع کا استعمال انبیاء کرام کے اخلاق کا جزو ہے۔

۲۱۔ باب ماجاء فی جلسه رسول اللہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے نشست کے بارے میں

جلسہ خیم کے کسرہ کے ساتھ بیٹھنے کی ہیئت اور انداز کو کہتے ہیں۔ قیام سے بیٹھنے کیلئے عموماً قعود کا لفظ مستعمل ہوتا ہے اور لیٹنے یا تکیہ کے بعد اٹھ بیٹھنے کے لئے عموماً جلوس کا لفظ بولا جاتا ہے۔ لیکن یہاں اس فرق کے بغیر صرف اس ہیئت کا ذکر مقصود ہے جس پر نبی کریم ﷺ بیٹھتے ہوئے متصف ہوتے تھے۔

(۱) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ حَمِيدٍ أَنَّهُ سَمِعَ عَفَانَ بْنَ مَسْلَمَةَ أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا عَبْدِ اللَّهِ ابْنَ

حَسَّانٍ عَنْ جَدِّهِ عَنْ قَلِيلَةٍ بَنٍ مَخْرُومَةٍ أَنَّهَا رَأَتْ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فِي

الْمَسْجِدِ وَهُوَ قَاعِدٌ الْقُرْفُصَاءُ قَالَتْ فَلَمَّا رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ

الْمَتَخَشِّعَ (۱) فِي الْجُلُوسَةِ أَرَعَدْتُ مِنَ الْفُرُوقِ (۲)۔

ترجمہ: قلیلہ بنت مخرمہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ

آپ ﷺ مسجد میں گوٹ مار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے جب ان کو اس عاجزانہ

ہیئت میں بیٹھے ہوئے دیکھا تو میں وحشت کے مارے لرز اٹھی (۳)۔

(۱) علامہ مناویؒ نے لکھا ہے کہ المتخشع باب تعقل سے اور تعقل کا باب تکلف کیلئے نہیں بلکہ زیادہ مبالغہ کے لئے آتا ہے (المنادوی علی جمع الوسائل ۲۲۰/۱) جیسا کہ توحید، تکبر تو گویا آنحضرت ﷺ عاجزانہ حالت میں تشریف فرماتے اور ایسا بیٹھنا آپ ﷺ کو پسند تھا۔ اور آپ ﷺ متکبرین اور جبارہ کی طرح بیٹھنے کو ناپسند فرمایا کرتے تھے اجلس کما یجلس العبد واکل کما یاکل العبد لا علی ہیئۃ جلوس الجبارین المتکبرین من التربع والتمدد والاکساء ورفع الرأس وشماخۃ الأنف وعدم الالتفات الی المساکین والاحتجاب عن المحتاجین (جمع الوسائل ۲۲۰/۱) (مختار)

(۲) الادب المفرد للامام البخاری ص ۱۷۸، شرح السنۃ للبغوی ۱۲/۳۴۳ (مختار)

(۳) ایک دوسری روایت میں ہے کہ میرے اس خوف کو دیکھ کر کسی نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا یہ مسکینہ تو خوفزدہ ہو چکی ہے آپؐ (قلیلہؓ) فرماتی ہے کہ میں آنحضرت ﷺ کی پشت کی طرف تھی آپ ﷺ میری طرف متوجہ بھی نہ ہوئے اور صرف زبان مبارک سے ارشاد فرمایا یا مسکینہ علیک السکینۃ کہ اے مسکینہ سکون اختیار کر، چنانچہ آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا تھا کہ اذهب اللہ ما کان دخل قلبی من الرعب مجھ سے وہ ڈر اور خوف ختم ہوا۔ (جمع الوسائل ۲۲۰/۱) (مختار)

عن جلقیہ۔ کتاب اللباس میں حدیث نمبر ۱۲ میں یہ حدیث کچھ تفصیل سے گزر گئی ہے۔ اور وہاں عبداللہ بن حسان کی دادی اور نانی کے بارے میں تفصیل بھی گزر گئی ہے۔ ان میں سے ایک کا نام صفیہ اور دوسری کا نام دحیہ ہے جو علیہ کی بیٹیاں ہیں۔

قر فضاء کی تفسیر: قر فضاء الف مقصورہ و محدودہ دونوں کے ساتھ ایک ہی معنی میں مستعمل ہے لیکن اس کے معنی میں دو قول ہیں۔ (۱) آدمی اپنی سرین زمین سے لگا کر اس طرح بیٹھے کہ اس کے ران پیٹ سے لگے ہوں اور ہاتھ دونوں پاؤں کے گرد بندھے ہوئے ہوں اسے احتباء بھی کہتے ہیں۔ اور اردو میں گوٹ مارنا (۱)۔ (۲) دوزانوں ہو کر بغلوں میں ہاتھ ٹھونس لے اور پھر جھک کر پیٹ کو رانوں سے لگا دے (۲)۔

(۲) حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ الْمَخْزُومِيُّ وَغَيْرُ وَاحِدٍ قَالُوا أَنَا

سَفِيَانُ عَنْ الزَّهْرِيِّ عَنْ عِبَادِ بْنِ تَمِيمٍ عَنْ عَمِّهِ أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ

مُسْتَلْقِيًا فِي الْمَسْجِدِ وَاضْعًا أَحَدِي رِجْلَيْهِ عَلَى الْآخَرَى (۳)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن زید فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو مسجد میں چھت پر لیٹے ہوئے دیکھا اس حال میں کہ آپ ﷺ نے اپنا ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر رکھا تھا۔

عبداللہ بن زید: حضرت ابو محمد عبداللہ بن زید بن عاصم المازنی حضرت تمیم داری کا علاقائی یا اخیانی بھائی ہے۔ مشہور صحابی ہیں۔ کہتے ہیں کہ میلہ کذاب کے اصل قاتل عبداللہ بن زید ہی تھے۔ جنہوں نے وحشی کی مدد سے اسے جہنم رسید کیا۔ ۶۳ھ کو واقعہ حرہ میں شہید ہوئے۔

(۱) اس طرح بیٹھنا اس وقت ہوتا ہے جب انسان کسی گہری سوچ میں ہو اور آنحضرت ﷺ کا اس طرح بیٹھنا اور گہری سوچ امت کیلئے کی تھی (مختار)

(۲) تیسرا معنی یہ بھی لکھا گیا ہے کہ کسی چیز کا سہارا لیکر سرین پر بیٹھا جائے اور رانوں کو پیٹ سے لگا کر بغلوں میں ہاتھ ٹھونس لئے جائے۔ (اتحافات ۱۶۹) (مختار)

(۳) صحیح بخاری ۶۸/۱ کتاب الصلوٰۃ باب الاستلقاء فی المسجد ومد الرجل، صحیح مسلم

۳۲۰/۲ کتاب اللباس والزینۃ باب فی اباحۃ الاستلقاء الخ، سنن ابی داؤد ۳۱۲/۲ کتاب الادب

باب فی الرجل یضع احدی رِجْلَیْهِ عَلَى الْآخَرَى (مختار)

دو اشکال اور ان کا جواب: رايت رسول اللہ مستلقيا. استلقاء پیٹھ لگا کر لیٹنے کو کہتے ہیں۔ یہاں پر دو اشکال ہیں۔ پہلا یہ کہ نبی کریم ﷺ نے اس طرح لیٹنے سے منع فرمایا ہے کہ ایک پاؤں اٹھا کر دوسرے پر رکھا جائے۔ مسلم شریف کی حدیث میں۔ لا یستلقین احدکم ثم یضع احدی رجلہ علی الآخری۔ تو پھر نبی کریم نے خود یہ عمل کیوں کیا۔ اس اعتراض کے شراب نے متعدد جواب دیے ہیں۔ مثلاً اول یہ کہ آپ ﷺ کا یہ عمل نبی سے قبل تھا نبی بعد میں وارد ہوئی۔ لہذا یہ حدیث منسوخ ہے۔

دوم یہ کہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیت تھی جبکہ دوسروں کیلئے ایسا کرنا منع ہے کیونکہ یہ عمل بے احتیاطی بے ادبی اور غفلت پر دلالت کرتا ہے جو کہ دراصل تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے اور نبی کریم ﷺ میں تکبر مفقود تھا۔ لیکن ان توجیہات کو جو کہ کسی نہ کسی طرح ترجیح پر مبنی ہیں۔ دیگر شراب نے ناپسند فرمایا ہے اور اکثر شراب نے دونوں حدیثوں کو جمع کرنے کی مختلف توجیہات کی ہیں جو یہ ہیں۔

اول نبی کریم ﷺ نے جس استلقاء سے منع کیا ہے وہ ہے کہ جس میں کشف عورت کا خطرہ ہو۔ مثلاً ایک پاؤں کھڑا ہو اور دوسرا اس کے اوپر اٹھا کر رکھ دیا جائے۔

چونکہ عرب میں عام رواج لنگوٹی باندھنے کا تھا اور اس طرح کے عمل سے کشف عورت کا احتمال زیادہ تھا۔ لہذا آپ ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ اب اگر کشف عورت کا احتمال نہ ہو مثلاً لنگوٹی کے جگہ شلوار پہنی ہوئی ہو یا پھر ایک پاؤں بھی پھیلا کر زمین پر پڑا ہو اور دوسرا اس کے اوپر لٹا پڑا ہو۔ تو لنگوٹی ہوتے ہوئے بھی کشف عورت نہیں ہوگا۔ اس سے نبی نہیں ہوگا اور نبی کریم ﷺ کا عمل بھی اس دوسرے قسم پر محمول ہوگا۔

دوم یہ کہ نبی اپنے ظاہر پر محمول ہے لیکن بلا ضرورت لیٹے ہوئے ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں پر رکھنا ممنوع ہے اور اگر ضرورت ہو تو ایسا کرنا منع نہیں ہوگا۔ مثلاً اگر آدمی تھکا ہوا ہو اور تھکا ڈٹ دور کرنے کیلئے تھوڑی دیر کیلئے ایسا کرے تو یہ جائز ہوگا۔

سوم یہ کہ نبی اپنے ظاہر پر محمول ہو اور نبی کریم ﷺ کا عمل بیان جواز کیلئے ہو گیا آپ ﷺ نے ترمیماً نبی کر کے اس بات پر توجیہ کر دی کہ یہ عمل اچھا نہیں۔ اس میں سوء ادب کا احتمال ہے۔ نیز باوقار لوگوں کو

اس سے بچنا چاہیے۔ لیکن چونکہ یہ عمل حرام تو تھا نہیں اسلئے بیان جواز کی بھی ضرورت تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے عملاً اس کی جواز کی طرف اشارہ کر دیا۔ لیکن علامہ بیجوریؒ کہتے ہیں کہ بایں ہمہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے یہ عمل عمومی مجلس کے دوران نہیں کیا تھا بلکہ مسجد میں اس وقت ایسے لوگ نہیں ہونگے۔ جس سے نبی کریمؐ تکلف کرتے ہوں کیونکہ عام لوگوں کے درمیان آپ ﷺ کی نشست و برخاست احتیاط سے ہوتی تھی۔

ملا علی قاریؒ نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ شاید اعتکاف کے دوران مسجد میں اقامت کئے ہوئے آپ اس ہیئت سے لیٹے ہوں گے۔

(۲) دوسرا اشکال اس پر یہ ہے کہ یہ حدیث ترجمۃ الباب سے مطابقت نہیں رکھتی۔ کیونکہ اس میں تو جلسہ کا ذکر نہیں بلکہ آپ ﷺ کے لیٹنے کا بیان ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ترجمۃ الباب کے ساتھ مناسبت ہے۔

مسجد میں سونے کا حکم: کیوں کہ اس حدیث سے مسجد میں لیٹنے کا جواز معلوم ہو رہا ہے (۱)۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ مسجد میں ہر طرح کے بیٹھنے کو بھی جائز سمجھتے ہیں اور خود مسجد میں بیٹھے بھی ہونگے۔

بعض شراح کہتے ہیں۔ کہ یہاں پر ترجمۃ الباب میں تعلیم ہے اور صرف بیٹھنے کا بیان مقصود نہیں۔ بلکہ قیام کے علاوہ حیثیت و کیفیت کا بیان مقصود ہے اس طرح ترجمۃ الباب لیٹ جانے کی کیفیت کو بھی شامل ہوگا۔ لہذا اشکال باقی نہیں رہا۔

(۳) حَدَّثَنَا سَلَمَةُ بْنُ شَيْبٍ أَنَا ابْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ إِبْرَاهِيمَ الْمَدَنِيِّ أَنَا

إِسْحَاقُ بْنُ مُحَمَّدٍ الْأَنْصَارِ عَنْ رَبِيعِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي سَعِيدٍ عَنْ

(۱) یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ فقہاء اور محدثین نے تو مسجد میں سونے کو مکروہ کہا ہے کما فی رد المحتار مگر یہاں تو جواز بلا کراہت معلوم ہوتا ہے۔ الجواب: مگر اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے آنحضرت ﷺ نے ایسا اعتکاف کے دوران کیا ہو اور اعتکاف کی نیت سے مسجد میں لیٹنا وغیرہ جائز ہو (۲) یا یہ جواب دینا ممکن ہے کہ کراہت مسجد کو آرام گاہ بنانے میں ہے اگر کوئی عبادت کرتے کرتے تھک جائے تو کمر سیدھی کرنے اور کچھ سنانے کیلئے لیٹ جائے تو کوئی کراہت نہیں اور اسی کے جواز پر مؤطا امام مالکؒ میں حضرت عثمانؓ کا اثر موجود ہے۔ (بخاری)

أبيه عن جده أبي سعيد الخدري قال كان رسول الله ﷺ إذا اجلس في المسجد احتبى ببدييه (۱)۔

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ جب مسجد میں تشریف رکھتے تو گوٹ مار کر تشریف رکھتے تھے۔

احتباء کسے کہتے ہیں: احتبى ببدييه: احتباء گوٹ مارنے کو کہتے ہیں جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ آدمی سرین پر بیٹھ جائے دونوں گھٹنے آگے کی طرف اٹھائے۔ اور اپنے ہاتھ پنڈلیوں کے گرد حلقہ بناتے ہوئے پکڑے اس طرح آدمی کو بیٹھنے میں آرام ہوتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کسی چیز کو ٹیک لگا کر بیٹھا ہو لیکن ہاتھوں کی بجائے کبھی کبھی کپڑا کمر اور پنڈلیوں کے گرد باندھ کر مزید آرام حاصل کیا جاتا ہے۔ عموماً عربوں اور خصوصاً دیہاتی خانہ بدوشوں کو اس وضع میں بیٹھنے کی عادت ہوتی تھی (۲)۔ کیونکہ ان کی زندگی میں دیواریں ٹیکے اور دیگر ایسی چیزوں کا وجود نہ تھا جس کو وہ ٹیک لگا کر سٹائیں۔

لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ نہ تو ہمیشہ احتباء مستحسن ہے (۳) نہ آپ ﷺ ہمیشہ مسجد میں اس وضع سے بیٹھتے تھے بلکہ کبھی کبھی آپ ﷺ تشہد اور کبھی آلتی پالتی مار کر بھی بیٹھتے ہیں۔ مثلاً ابوداؤد نے حضرت جابر بن

(۱) سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فی جلوس الرجل، السنن الکبری للبیہقی ۲۳۶/۳ شرح السنۃ للبیہقی ۲۳۳/۱۲، ملا علی قاریؒ نے اس روایت کو ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے قال کان رسول اللہ ﷺ إذا اجلس فی المسجد وفی بعض النسخ فی المجلس احتبى ببدييه زاد البزار ونصب رکتیہ واخرج البزار ایضاً من حدیث أبی ہریرۃ بلفظ جلس عند الکعبۃ فضم رجلیہ واقامها واحتبى ببدييه وفی بعض النسخ صلوات اللہ علیہ وفی بعضها صلوات اللہ وسلامہ علیہ (جمع الوسائل ۲۲۲/۱) (مختار)

(۲) کہا جاتا ہے کہ الاحتباء حیطان العرب (یعنی گوٹ مارنا عربوں کے لئے دیواروں کے قائم مقام ہے) (مختار)
(۳) ایسے بیٹھنا اولیٰ ہے اس لئے کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا نے لکھا ہے کہ اس طرح بیٹھنا تواضع اور مسکنت کی نشست ہے اس لئے رسول اللہ ﷺ اس کی اتباع میں اس طرح بیٹھتے تھے اور حضرات صحابہ کرام بھی آنحضرت ﷺ کی اتباع میں ایسا کرتے تھے مگر یہ عمل ہمیشہ نہیں کیا جاتا۔ (مختار)

سمرہ کی حدیث نقل کی ہے کہ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا صَلَّى الْفَجْرَ تَرَبَّعَ فِي مَجْلَسِهِ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ حَسَنًا (۱)۔

اس طرح ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ نہی النبی ﷺ عن الاحتباء يوم الجمعة والامام يخطب یعنی امام کا خطبہ دیتے وقت سامعین کو نبی کریم ﷺ نے احتباء سے منع فرمایا ہے اور یہ اس لئے کہ اس طرح نیند جلدی آتی ہے اور خطبہ سنانا فوت ہو جاتا ہے بلکہ وضوء ٹوٹنے کی وجہ سے نماز جمعہ فوت ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔

(۱) یہی وجہ ہے کہ بلا علی قاریؒ نے لکھا ہے فقيل هذا الحديث مخصص وقال ميرك محمول على اختلاف الاحوال فتارة تربيع وتارة احتبى وتارة استلقى وتارة ثنى رجله توسعة للامة المرحومة (جمع الوسايل ۱/ ۲۲۲) اسی طرح آنحضرت ﷺ نے بیٹھنے کیلئے کوئی خاص اور ممتاز جگہ کا انتخاب نہیں کیا۔ (مختار)

۲۲. باب ما جاء في تكاة رسول الله ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے تکیہ کے بیان میں

تکاة کا معنی: تکاة اصل میں وسکاہ تھا تراش کی طرح اس کے واوکوتا سے بدل کر تکاة بنایا گیا ہے اور یہ مایہ تکاہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ یعنی وہ چیز جو ٹیک لگانے کے لئے تیار ہو چکی ہو۔ اس لئے اگر انسان پر ٹیک لگایا جائے تو اسے تکاة نہیں کہیں گے۔ اس باب میں صرف انہی اشیاء کا ذکر ہوگا جو کہ اسی مقصد کیلئے بنائی گئی تھیں۔ اور نبی کریم ﷺ نے ان پر ٹیک بھی لگایا تھا۔

البتہ اگلے باب میں صرف انسان پر ٹیک لگانے کا ذکر ہے۔ اور اس کو علیہ ذکر کرنے کی وجہ آگے آرہی ہے۔

(۱) حدثنا عباس بن محمد اللوری البغدادی أنا إسحاق ابن

منصور عن إسرائيل عن سماك بن حرب عن جابر بن سمرة قال

رأيت رسول الله ﷺ متكئا على وسادة على يساره (۱)۔

ترجمہ: جابر بن سمرة کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ بائیں طرف کو

رکھے ہوئے ایک وسادہ پر ٹیک لگا کر تشریف فرما ہیں۔

وسادہ اسے اسادہ بھی کہا جاتا ہے اس بڑے سے ٹکیہ کو کہتے ہیں جو ٹیک کے لئے بنایا جاتا

ہے۔ کبھی کبھی سرہانے کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ علی یسارہ الخ دائیں جانب کو ٹیک لگانا بہتر

ہے۔ اس حدیث میں بائیں جانب کا ذکر محض اتفاقی ہے۔ بلکہ آئمہ امام ترمذی یہ بات لارہے ہیں کہ

(۱) سنن ابی داؤد ۲/۲۱۸ کتاب اللباس باب الفرض، جامع ترمذی ۲/۱۰۵ کتاب الادب باب

ما جاء في الاتكاء سنن دارمی ۲/۱۷۶ (مختار)

(۲) اسلئے حافظ ابن قیم نے لکھا ہو کان ﷺ يتكئ على الوسادة وربما اتكاء على يساره وربما

اتكاء على يمينه وكان اذا احتاج في خروجه تركا على بعض أصحابه من

الضعف (زاد المعاد ۱/۶۰) (مختار)

علی یسارہ کا ذکر عمومی طور پر روایات میں نہیں ہے۔

(۲) حَدَّثَنَا حَمِيدُ بْنُ مُسْعِدَةَ أَنَا بَشَرُ بْنُ الْمُفَضَّلِ أَنَا الْجَرِيرِيُّ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي بَكْرَةَ عَنْ أَبِيهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَلَا أَحَدُكُمْ بِأَكْبَرِ الْكِبَائِرِ قَالُوا بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ الْإِشْرَاقُ بِاللَّهِ وَعَقُوقُ الْوَالِدَيْنِ قَالَ وَجَلَسَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَكَانَ مَتَكْنَا قَالَ وَشَهَادَةُ الزُّورِ قَالَ فَمَا زَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقُولُهَا حَتَّى قَلْنَا لَيْتَهُ سَكَتَ (۱)۔

ترجمہ: حضرت ابو بکرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا تم لوگوں کو کبیرہ گناہوں میں بڑے بڑے گناہ نہ بتاؤں۔ صحابہؓ نے عرض کیا کیوں نہیں یا رسول اللہ ﷺ بتادیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ (بڑے گناہ) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک بنانا اور والدین کی نافرمانی کرنا۔ اس وقت آپ ﷺ ٹیک لگائے ہوئے تشریف فرما تھے۔ اہتماماً بیٹھ کر فرمایا۔ اور جھوٹی گواہی دینا یا جھوٹی بات کرنا۔ بار بار اس کو اتنا دہرایا کہ ہم لوگوں نے (جزیہ ترحم سے دلوں میں) یہ کہا کہ کاش اب حضور ﷺ خاموش ہو جائیں۔

ابو بکرؓ: عَنْ أَبِيهِ، عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي بَكْرَةَ عَنْ أَبِيهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَلَا أَحَدُكُمْ بِأَكْبَرِ الْكِبَائِرِ قَالُوا بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ الْإِشْرَاقُ بِاللَّهِ وَعَقُوقُ الْوَالِدَيْنِ قَالَ وَجَلَسَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَكَانَ مَتَكْنَا قَالَ وَشَهَادَةُ الزُّورِ قَالَ فَمَا زَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقُولُهَا حَتَّى قَلْنَا لَيْتَهُ سَكَتَ (۱)۔

ابو بکرؓ: عَنْ أَبِيهِ، عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي بَكْرَةَ عَنْ أَبِيهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَلَا أَحَدُكُمْ بِأَكْبَرِ الْكِبَائِرِ قَالُوا بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ الْإِشْرَاقُ بِاللَّهِ وَعَقُوقُ الْوَالِدَيْنِ قَالَ وَجَلَسَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَكَانَ مَتَكْنَا قَالَ وَشَهَادَةُ الزُّورِ قَالَ فَمَا زَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقُولُهَا حَتَّى قَلْنَا لَيْتَهُ سَكَتَ (۱)۔

(۱) صحیح بخاری ۲/۸۸۴ کتاب الادب باب فی عقوق الوالدین، جامع ترمذی ۲/۱۲ کتاب

البر والصلة باب ما جاء في عقوق والدين. (مختار)

تیس (۲۳) ساتھیوں کے ساتھ طائف کے قلعہ سے بیڑھی چڑھ کر دیوار کو عبور کر کے اترے تھے۔ اس لئے ابوبکرؓ کہلائے وفاقستانہ میں بصرہ میں ہوئی نام فجع بن الحارث اور والدہ کا نام سمیہ تھا جس کا بیٹا زیاد ابن ابی سفیان تھا۔

اس لیے نبی کریم ﷺ نے آپ کو ابوبکرؓ کہا۔ پھر اس کنیت سے آپ مشہور ہوئے بلکہ اگر کوئی آپ سے نسب کے بارے میں پوچھتے تو فرماتے انا مولیٰ رسول اللہ ﷺ میں نبی کریم ﷺ کا آزاد شدہ غلام ہوں۔

کبیرہ کیا ہے؟ الا احدکم باکبر الکبائر۔ کبار کبیرہ کی جمع ہے جو صغیرہ کی ضد ہے۔ چھوٹے گناہ کو صغیرہ اور بڑے گناہ کو کبیرہ کہا جاتا ہے۔ لیکن کبیرہ کی تعریف میں اختلاف ہے کہ کونسا گناہ کبیرہ بنتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ہر وہ گناہ جس پر شریعت میں وعید غضب یا لعنت قسم کے الفاظ سے مواخذہ ہونے کا ذکر ہے۔ وہ کبیرہ ہے بعض نے کہا ہے کہ جس کے بارے میں دنیوی حد شرعی نازل ہو یا اخروی عذاب و دھمکی دی گئی ہو۔ کوئی کہتا ہے کہ ہر وہ جرم جو دین کے بارے میں لاپرواہی برتنے پر ہو کبیرہ ہے۔ کوئی کہتا ہے جس کو قرآن و حدیث نے گناہ کہا ہو۔ بعض نے گن گن کر لکھے ہیں کہ یہ کبار اور دیگر گناہ صغائر ہیں۔ پھر تعداد میں اور تعین میں بھی اختلاف واقع ہوا ہے۔ حتیٰ کہ علامہ ڈھمیؒ نے ایک مستقل کتاب اس کے بارے میں لکھی ہے۔ جس میں چار سو کبار کا ذکر ہے۔ بعض شراح نے ان میں سے بعض کا ذکر کیا ہے (۱)۔ بہر حال

(۱) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے وقد عدد الفقهاء منها جملاً مستکثرة قتل نفس، وزنا و لواط و شرب خمر و سرقة و قذف و شهادة زور و کتم شهادة و یمین غموس و غصب ما یقطع بسرقة و فرار من الکفار بلا عذر و ربا و اخذ مال یتیم و رشوة و عقوق اصل و قطع رحم و کذب علی النبی ﷺ عمداً و افطار رمضان عمداً و بنس کیل او وزن او ذرع و تقدیم مکتوبہ علی وقتها و تاخیرها عنه و ترک الزکاة و ضرب مسلم او ذمی عدواناً و سب صحابی و غیبة عالم او حامل قرآن و معایبة عند الظالم (ظالم سے چٹل کھانا) و دیانۃ (یعنی بیوی، بیٹی کا ناجائز تعلق گوارہ کرنا) و قیادة (اسی طرح کے دوسرے ناجائز تعلقات میں کوشش کرنا) کو ترک امر بمعروف و نہی عن منکر من قادر و تعلم سحر او تعلیمه او عمله و نسیان حروف من القرآن بعد البلوغ و احراق حیوان بغیر ضرورة و یأس من رحمة الله تعالیٰ و امن من مکروه (عذاب سے ڈرنا) و نشوز زوجة (شوہر کی نافرمانی کرنا) اباء حلیلة من خلیلتها عدواً و نمیمة (جمع الوسائل ۲۲۴/۱) اس کے علاوہ بھی کبیرہ گناہ ہیں جو کتابوں میں مذکور ہیں (مختار)

ایسی کوئی جامع تعریف نہیں ہے جو کہ تمام کبار کو شامل ہو اور جس میں صفات داخل نہ ہوں (۱)۔

اسی وجہ سے علامہ واحدیؒ اور بعض دیگر ائمہ نے کہا ہے کہ کبیرہ کی تعریف بھی ہمارے لئے مبہم کر دی گئی ہے تاکہ لوگ خوف کی وجہ سے ہر محصیت سے اجتناب کریں۔ جیسے لیلۃ القدر کے ابہام کی بڑی حکمت بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ شب قدر کی لالچ میں لوگ ہر رات کو عبادت کریں۔ کبیرہ کے بارے میں مزید تفصیلات آپ نے صحیحین کی کتاب الایمان میں پڑھی ہیں۔ اس استفسار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معلم اور مری کی کوچا پیے کہ شاگردوں کو جو اہم بات بتانی ہو تو پہلے ان کی توجہ حاصل کرے اس قسم کے سوال کا بڑا مقصد بھی یہی ہے کہ مخاطب ہمہ تن گوش ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے خیالات و مشاغل چھوڑ کر کمال توجہ سے بات سننے لگتا ہے۔

الا شرک باللہ الخ شرک بدترین گناہ اور کفر ہے۔ لیکن یہاں پر صرف شرک نہیں بلکہ مطلقاً کفر مراد ہے خواہ شرک ہو یا دہریت ہو تعطیل ہو یا تجسیم وغیرہ۔

والدین کی نافرمانی گناہ کبیرہ ہے: وعقوق الوالدین۔ اللہ تعالیٰ کے بعد انسان کے سب سے بڑے محسن والدین ہیں۔ تو اگر ایک طرح محسن اعظم پر کفر کبیرہ ہے۔ تو دوسری طرف والدین جیسے محسن کا کفر ان اور ناشکری اور ان کی نافرمانی حرام اور کبیرہ ہے۔ خواہ والدین کافر کیوں نہ ہوں۔ جب تک وہ محصیت الہی کا حکم نہ دیں۔ ان کی اطاعت واجب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ولا تقل لہما اف ولا تنہرہما۔ وان جاہداک علی ان تشرک باللہ ما لیس لک بہ علم فلا تطعہما وصاحبہما فی السنیا معروفا۔ (الآیۃ) تو اگرچہ ان کی طرف سے محصیت اور شرک کا امر ناقابل اطاعت ہے لیکن ساتھ ساتھ دنیا میں ان سے احسان و نیکی سے پیش آنے کا واضح امر ہے۔ بہر حال والدین سے ایسا رویہ اور سلوک جس سے وہ ناراض اور غصہ ہوں۔ حقوق ہے اور تمام دنیوی امور میں ان کو ایسی اذیت دینا حرام ہے۔

(۱) یہی وجہ ہے کہ علامہ انور شاہ فرماتے ہیں کہ ان دونوں میں نسبت اضافی ہے۔ ہر ایک دوسرے کے مقابلہ میں چھوٹا اور دوسرا بڑا۔ (مختار)

شہادۂ زور اور جھوٹ پر تنبیہ میں زیادہ اہتمام کیوں۔ قال وشهادة الزور اوقال الزور الخ کبیرہ گناہوں کے ذکر میں جھوٹ کو خصوصی اہمیت آپ ﷺ نے دی۔ جس کے اظہار کے لئے آپ ﷺ اٹھ بیٹھے۔ نیز اس کا ذکر بھی بار بار کرنے لگے۔ اور اس اہتمام کا سبب یہ ہے کہ جھوٹ آسان ترین گناہ ہے اور کوئی بھی شخص اسے بول سکتا ہے۔ پھر لوگ اسے بے پرواہی سے بول لیتے ہیں۔ نیز اس کے لئے دشمنی، حسد، استہزاء، اور جرم سے گلو خلاصی بلکہ محض مشغلہ وغیرہ بہت سے دیگر اسباب ہیں۔

علاوہ ازیں شرک کو صحیح الفطرت انسان کا عقل بھی قبول نہیں کرتا۔ اور اسی طرح والدین کی نافرمانی بھی انسان کے طبعی تقاضوں کی ضد ہے۔ جبکہ جھوٹ سے نفرت طبعی نہیں ہوتی نہ ہمیشہ عقل اس سے منع کرتا ہے بلکہ اکثر تو عقل اور نفس کا تقاضا ہی ہوتا ہے جس کی وجہ سے انسان جھوٹ بولتا ہے۔

حضور ﷺ کا اصرار اور صحابہؓ کی شفقت: لیکن سکت الخ یہ اس لئے نہیں تھا کہ آپ ﷺ کی بات صحابہ کو بری لگی۔ بلکہ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے نہایت اہتمام کے اظہار کے لئے جب بار بار جھوٹ کا ذکر کیا۔ تو اس سے ضرور آپ ﷺ کو تھکاوٹ بھی ہو رہی تھی۔ صحابہؓ کو آپ ﷺ پر رحم آیا کہ آپ ﷺ کو تکلیف ہو رہی تھی۔ رہا مقصد تو وہ تو دیسے بھی حاصل ہو چکا تھا۔ چنانچہ صحابہؓ کی یہ تمنا آپ ﷺ پر شفقت پر مبنی ہے۔

بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ امت کے جھوٹ کا ذکر کرتے ہوئے آپ ﷺ کو غصہ اور ناراضگی بھی ہو۔ اور صحابہؓ آپ ﷺ کی ناراضگی کے خوف سے مزید اس کا ذکر نہ کرنے کی تمنا کر رہے ہوں۔ بعض کے خیال میں ہو سکتا ہے کہ یہ خوف ہو کہ مبادا جھوٹوں کے بارے میں آپ ﷺ کوئی ایسے بددعا یہ الفاظ کہیں جو ہمیشہ کے لئے جھوٹوں کے خسران اور بد انجامی کا باعث ہوں۔ بہر حال اس میں اس بات کی تعلیم ہے کہ اہم بات کہتے ہوئے داعظ، خطیب، استاد اور پیر کو تکرار اور اصرار اتنا کر دینا چاہیے کہ سامعین کو اس پر رحم آئے۔

ویسے بھی جھوٹ بہت برا عمل ہے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں جھوٹ بولنے والے شخص کے منہ سے جو بد بول نکلتی ہے اس کی وجہ سے رحمت کے فرشتے دروغ گو شخص سے ایک میل دور کھڑے ہو جاتے ہیں۔

جب حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا مومن جھوٹا ہو سکتا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ پھر خصوصاً جھوٹی گواہی میں تو کبھی معصوم جان کو خطرہ، کبھی دوسرے کے مال پر دست اندازی، کبھی افتراء و بہتان، کبھی حلال کی تحریم اور کبھی حرام کی تحلیل وغیرہ امور کا ارتکاب بھی شامل ہو جاتا ہے۔ بلکہ خود شرک بھی ایک بہت بڑا جھوٹ ہی تو ہے۔ بہر حال اس حدیث میں کبار کا ذکر ہے۔ جن کا حکم یہ ہے کہ اگرچہ رحمت خداوندی کے سامنے کبار کی کوئی حیثیت ہی نہیں وہ سب کو معاف کر سکتا ہے۔ لیکن قانون الہی یہ ہے کہ کبار کو تو بہ سے معاف کرتے ہیں۔

اشکال اور جواب: یہاں پر یہ ایک اشکال ہے کہ اس حدیث میں کسی بھی تکاة کا ذکر نہیں ہے۔ تو اسے یہاں پر کیوں لایا گیا ہے۔ بعض شراح نے تو اس اشکال کو ذکر کر کے اس کا جواب دینے کی تکلیف نہیں کی۔ لیکن بعض حضرات نے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً علامہ ابن حجرؒ نے یہ جواب دیا ہے کہ حدیث سے اتکاء ثابت ہوتا ہے۔ اور اتکاء کے لئے تکاة کا وجود لازم ہے اس لئے دلالت التزامی سے یہ حدیث تکاة پر بھی دلالت کرتی ہے۔

لیکن ملا علی قاریؒ وغیرہ شراح نے اس جواب کو ناپسند کیا ہے۔ کیونکہ اتکاء تکاة کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ بعض دوسرے شراح نے یہ جواب دیا ہے کہ ترجمۃ الباب اس مقام پر عام ہے۔ یعنی اس باب میں تکاة اور غیر تکاة پر ٹیک لگانے کا بیان مقصود ہے۔

(۳) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ ثَنَا شَرِيكٌ عَنْ عَلِيِّ بْنِ الْأَقْمَرِ عَنْ أَبِي

جَحِيفَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَمَا أَنَا فَلَا أَكُلُ مَتَكْنًا (۱)۔

ترجمہ: ابو جحیفہؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں تو ٹیک لگا کر نہیں

کھاتا۔

اس روایت میں ٹیک لگا کر کھانے سے منع کرنا مقصود ہے۔ اس لئے کہ ایسا کرنا انسانی صحت کے

(۱) صحیح بخاری ۸۱۲/۲ کتاب الاطعمة باب الاكل متکناً، سنن ابی داؤد ۴۵۳/۱ کتاب

الاطعمة باب ما جاء في الاكل متکناً، ابن ماجہ ۲۲۲ کتاب الاطعمة باب الاكل متکناً. (مختار)

لئے بھی مضر ہے (۱) اور عبدیت کی طرح کھانے کے خلاف ہے۔

اقا انا فلا اکل متکناً نبی کریم ﷺ خود اپنے آپ کا ذکر تو فرما رہے ہیں۔ اپنی امت کے لیے کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے اگرچہ عاقل کے لیے اشارہ کافی ہے۔ اور اس کا واضح معنی یہی ہے کہ ”مجھے دوسرے لوگوں کا بھی ٹیک لگا کر کھانا پسند نہیں ہے۔ اسی لیے تو خود اس ہیئت پر نہیں کھانا“ کیونکہ متکبرین کی عادتوں میں سے ہے۔ نیز اس طرح ضرورت سے زیادہ کھانا کھایا جاتا ہے۔ جو کہ ایک ناپسندیدہ امر ہے۔ نیز کھانے سے استغناء اور اس کی بے قدری پر بھی دلالت کرتا ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ اس طرح طعام اپنے گلے میں مشقت سے گزرتا ہے اس لیے کبھی کبھی یہ مضر صحت بھی بن جاتا ہے۔ بلکہ امام ابراہیم نخعیؒ سے روایت ہے کہ اکابر پیٹ بڑھنے کے خوف سے ٹیک لگا کر نہیں کھاتے تھے۔ پھر اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ لیٹے لیٹے کھانا اور بھی زیادہ شنيع ہے۔

البتہ کھڑے ہو کر کھانے کو علامہ ابن حجرؒ نے مکروہ نہیں کہا ہے۔ یہاں پر ٹیک لگانا عام ہے۔ تکیہ کو پیٹھ لگا کر ہوا کوئی پہلو لگا کر ہویا دیوار یا ہاتھ وغیرہ سے کسی دوسری چیز کو ٹیک لگایا ہو۔ یہ سب ایک ہی حکم میں ہے بلکہ بعض لوگوں نے گدیے وغیرہ پر الٹی پالٹی مار کر کھانے کو بھی ٹیک لگانے میں داخل کر دیا ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ جبریلؑ نے نبی کریم ﷺ کو ٹیک لگا کر کھانا کھاتے ہوئے دیکھا تو آپ ﷺ کو اس سے منع کیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے کبھی بھی اس حالت میں کھانا نہیں کھایا۔ بہر حال ٹیک لگا کر کھانا کھانا (۱) نئی سائنسی تحقیق نے ٹیک لگا کر کھانا کھانے میں تین قسم کے نقصان بتائے ہیں (الف) کھانا صحیح طور پر نہیں چبایا جائے گا اور اس میں لعاب جتنی ضرورت تھی نہیں ملے گا۔ اور پھر معدے میں جا کر نشتہ دارغذیہ (Cosbohydtes) کو ہضم کرنا ہودہ نہیں مل سکے گا۔ جس سے نظام انہضام متاثر ہوگا۔ (ب) ٹیک لگا کر بیٹھنے سے معدہ پھیل جاتا ہے جس سے غیر ضروری خوراک معدے میں چلی جائے گی۔ اور نظام انہضام متاثر ہوگا۔ (ج) ٹیک لگا کر کھانے سے آنتوں اور جگر (Liver) کے نظام پر برا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے امام ابراہیم نخعیؒ ٹیک لگا کر کھانے کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ پیٹ بڑھ جاتا ہے اور ایسا کھانا متکبرین کی علامت ہے۔ شیخ احمد عبد الجواد الرومیؒ نے آنحضرت ﷺ کے کھانے کیلئے بیٹھنے کے بارے میں لکھا ہے فكانت جلسة رسول الله ﷺ وقت الاكل كلها ادب واحترام فتارة يجلس على صدر قدميه وتارة يجلس ناصباً رجله اليمنى وجالساً على اليسرى (الاحتفالات ۱۷۵) (مختار)

مکروہ ہے یا کم از کم خلاف اولیٰ ضرور ہے۔ البتہ اگر کوئی عذر ہو تو پھر ٹیک لگا کر کھانا جائز ہے۔ اب یہ بات کہ اگر ٹیک لگا کر کھانا مکروہ ہے تو کس وضع سے کھایا جائے۔

ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ کھانے کے وقت مستحب یہ ہے کہ آدمی دو زانوں بیٹھے۔ البتہ قدموں کے پشت زمین پر لگائے (۱)۔ یا پھر دایاں پاؤں کھڑا ہو اور بائیں پاؤں پر بیٹھ جائے۔ علامہ بیجوریؒ پہلی کیفیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ کیفیت کھانے کے سب سے بہتر کیفیات میں سے ہے۔ کیونکہ اس طرح انسان اپنی اس طبعی حالت پر ہوتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ صحت کے اعتبار سے انفع کیفیت ہے۔

(۳) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ مَهْدِيٍّ أَخْبَرَنَا سَفِيَّانُ

عَنْ عَلِيِّ بْنِ الْأَقْمَرِ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا جَعْفَرٍ يَقُولُ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ

لَا أَكُلُ مَتَكْنًا (۲)۔

ترجمہ: ابو جعفرؑ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا۔

یہ حدیث دراصل سابقہ حدیث ہی ہے۔ متن کے الفاظ میں معمولی مغائرت ہے لیکن سند میں فرق ہے۔ اور شاید امام ترمذیؒ نے سند کی تبدیلی کی وجہ سے ہی یہ حدیث دہرائی ہے (۳)۔ بعض شراح نے اس کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ دراصل شریک جو علی بن لا قمر کا شاگرد ہے۔ سنی الحفظ ہے۔ اس لئے سفیان ثوریؒ کے واسطے سے اس حدیث کو روایت کر کے امام ترمذیؒ گزشتہ حدیث کی تقویت فرما رہے ہیں۔ ان دونوں حدیثوں پر بھی وہی اشکال ہوتا ہے کہ ان میں تکاة کا ذکر تو نہیں ہے اور اس کا جواب بھی وہی ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔

(۱) یہی کیفیت نبی کریم ﷺ سے بھی مروی ہے۔ (املاح الدین)

(۲) صحیح بخاری ۸۱۲/۲ کتاب الاطعمة باب الاكل متکناً سنن ابی داؤد ۴۳/۱ کتاب الاطعمة باب ما جاء في الاكل متکناً سنن ابن ماجه ۲۳۲/۱ کتاب الاطعمة باب الاكل متکناً. (مختار)

(۳) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے قال السيد امير الدين يظهر الفرق بين الحديثين باختلاف بعض رجال السند وتغيير يسير في المتن والغرض تأكيد هذا الامر بالنسبة إلى النبي ﷺ (جمع الوسائل ۲۲۹/۱) (مخار)

(۵) حدثنا يوسف بن عيسى ثنا وكيع ثنا اسرائيل عن سماك ابن حرب عن جابر بن سمرة قال رايت النبي ﷺ متكئا على وسادة قال ابو عيسى لم يذكر وكيع على يساره هكذا روى غير واحد عن اسرائيل فحوروا به وكيع ولا نعلم احدا روى فيه على يساره الا ما روى اسحق بن منصور عن اسرائيل.

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرة سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ تکیہ پر ٹیک لگائے ہوئے تشریف فرما ہیں۔ امام ترمذی کہتے ہیں کہ وکیع اس حدیث میں ”علی یساره“ کا لفظ ذکر نہیں کرتے۔ اسی طرح اسرائیل کے متعدد دیگر شاگرد بھی یہ لفظ ذکر نہیں کرتے سوائے اسحق بن منصور کے کسی کے بارے میں ہمیں علم نہیں جو یہ لفظ ذکر کر رہا ہو۔

متکنا علی یساره الخ حضرت جابرؓ کی یہ حدیث باب کی ابتداء میں گزر چکی ہے جہاں پر اسحق کی روایت سے علی یساره کا اضافہ مذکور تھا۔ یہاں پر یہ اضافہ ذکر نہیں ہے۔ لہذا اگر اس حدیث کو حضرت جابرؓ کی اس حدیث سے متصل لایا جاتا تو بہتر ہوتا۔

قال ابو عيسى امام ترمذی کا مقصد اس بیان سے یہی معلوم ہو رہا ہے کہ پہلی سند سے مروی حضرت جابرؓ کی اس حدیث کی غرابت پر تنبیہ ہو جائے کیونکہ ”علی یساره“ کا اضافہ جو کہ اسحاق بن منصورؓ کی روایت میں مذکور ہے اسرائیلؓ کے دیگر شاگردوں کے ہاں موجود نہیں۔ حتیٰ کہ وکیعؓ جیسے عظیم المرتبہ شاگرد نے بھی اسے ذکر نہیں کیا ہے جس کا مرتبہ اسحقؓ سے بڑا ہے۔ اور دیگر تمام شاگرد بھی اس روایت کو اس اضافہ کے بغیر روایت کرتے ہیں۔

لہذا یہ اضافہ غریب ہوگا۔ جامعہ ترمذی میں بھی اس اضافہ پر کلام کیا گیا ہے لیکن اسے یکسر غلط کہنا بھی بیجا ہوگا۔ جیسا کہ امام ترمذیؓ نے بھی یہ جرأت نہیں کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ قوی احتمال موجود ہے کہ اس واقعہ میں آپ ﷺ بائیں طرف ٹیک لگا کر بیٹھے ہوں۔ یہ ناجائز تو نہیں ہے بلکہ اس طرح یہ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ دایاں ہاتھ فارغ ہو جاتا ہے۔ جسے معاف وغیرہ کے کاموں میں لایا جاسکتا ہے۔

۲۳. باب ما جاء في اتكاء رسول الله ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے تکیہ کے علاوہ کسی اور شی پر ٹیک لگانے کے بیان میں

اتکاء ٹیک لگانے کو کہتے ہیں لیکن اس باب کی دونوں حدیثیں چلتے ہوئے کسی آدمی پر ٹیک لگانے سے متعلق ہیں۔ اس طرح یہ باب سابقہ باب یعنی باب تکاة النبی ﷺ سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ جس میں مطلق ٹیک کا ذکر ہے۔ اور یہ اعتراض دفع ہو جاتا ہے کہ مؤلف کو دونوں باب علیحدہ نہیں لانا چاہیے تھے۔ ایک دوسرا فرق بھی شراح نے دونوں بابوں میں بیان کیا ہے۔ کہ تکاة اس چیز کو کہتے ہیں جو ٹیک لگانے کی غرض سے تیار کی گئی ہو۔ جیسے تکیہ، عصا وغیرہ۔ غرض وغایہ کی وجہ سے ٹیک لگانے کے سلسلے میں ان اشیاء کو ایک گونہ مقصودیت حاصل ہوتی ہے۔ اور اسی مقصودیت اور اصلیت کی وجہ سے ان کیلئے خصوصی باب منعقد کیا۔ اس کے برعکس کسی انسان پر ٹیک لگانے میں انسان کے متوکل علیہ ہونے کی حیثیت حقیقی نہیں ہوتی بلکہ عارضی ہوتی ہے۔ البتہ اتکاء مقصود ہوتا ہے۔ اس لئے دوسرا باب اتکاء کے عنوان سے الگ لارہے ہیں۔ علاوہ انہیں دوسرے باب کو الگ ذکر کرنا شاید اس لئے بھی مناسب ہے کہ انسان کے علاوہ دوسری اشیاء پر ٹیک لگانا جائز ہے لیکن کیا انسان پر بھی جائز ہوگا؟ اس سوال کا جواب اہم تھا اور وہ اس باب کی احادیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے۔ لہذا اس باب کو علیحدہ ذکر کیا۔

(۱) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ أَنَا عُمَرُ بْنُ عَاصِمٍ أَنَا حَمَّادُ

ابن سلمة عن حميد عن أنسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ شَاكِيًا فَخَرَجَ يَتَوَكَّلُ

عَلَى أَسَامَةِ وَ عَلَيْهِ ثَوْبٌ قَطْرِيٌّ قَدْ تَوَضَّعَ بِهِ فَصَلَّى بِهِمْ (۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ بیمار تھے۔ چنانچہ حضرت اسامہؓ پر

ٹیک لگائے ہوئے حجرہ سے باہر تشریف لائے۔ اس وقت آپ ﷺ ایک قطری چادر

میں لپٹے ہوئے تھے۔ باہر آ کر آپ ﷺ نے صحابہ کو نماز پڑھائی۔

کان شاکیا الخ یہ حدیث اس سے پہلے ”باب لباس النبی ﷺ“ میں کافی تشریح کے

ساتھ گزر چکی ہے وہیں حضرت اسامہؓ کے بارے میں تفصیل لکھی جا چکی ہے۔ ثوب قطری یہ ایک خاص قسم کا منقش کپڑا ہوتا تھا جو قطر میں بنایا جاتا تھا۔

توضیح بہ توضیح کا معنی تزیین بھی آتا ہے لیکن یہاں پر معنی یہ ہے کہ ”جعلہ كالوشاح“ یعنی آپ ﷺ وشاح کی طرح اسے پہنے ہوئے تھے۔ اور اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ محرم کی طرح چادر کا ایک طرف دائیں ہاتھ کے نیچے سے گزار کر بائیں کندھے پر ڈال دیا جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ چادر اس طرح کندھوں پر ڈالی جائے کہ دونوں پہلو آگے کی طرف لٹک جائیں۔

فصلی بہم یعنی آپ ﷺ نے امامت کر کے صحابہ کرام کو نماز پڑھائی۔ اور ممکن ہے کہ بہم کا معنی ”معہم“ ہو۔ پھر مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ نے صدیق اکبرؓ کی امامت میں صحابہ کرام کے ساتھ نماز پڑھی۔ خود امامت نہ کر سکے۔ جس کی تفصیل دوسرے مقام پر آ رہی ہے۔

(۲) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ أَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُبَارَكِ ثَنَا

عطاء بن مسلم الخفاف الحلبي أنا جعفر بن برقان عن عطاء ابن أبي

رباح عن الفضل بن عباس قال دخلت على رسول الله ﷺ في

مرضه الذي توفي فيه و على راسه عصابة صفراء فسلمت فقال يا

فضل قلت ليبيك يا رسول الله ﷺ قال اشدد بهذه العصابة راسي

قال ففعلت ثم قعد فوضع كفه على منكبي ثم قام ودخل في المسجد

وفي الحديث قصة (۱)۔

ترجمہ: فضل بن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی مرض وفات کے موقع پر میں نبی

کریم ﷺ کے پاس آیا آپ ﷺ کے سر مبارک پر پیلی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے

سلام کیا (جواب دینے کے بعد) آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے فضل! میں نے کہا لیک

یا رسول اللہ، تو آپ ﷺ نے فرمایا ذرا اس پٹی کو مرے سر پر کس کر باندھ دو میں نے

تعمیل کی۔ پھر آپ ﷺ اٹھ بیٹھے اور میرے کندھے پر ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے اور

مسجد میں تشریف لے گئے۔ اس حدیث میں مفصل قصہ ہے۔

عن عطاء بن مسلم الخفاف یہ حلب کے باشندے ہیں۔ مشہور محدث ہیں۔ موزے بنایا کرتے تھے۔ ۱۹۰ھ میں وفات پائی۔

فضل بن عباسؓ: فضل بن عباس نبی کریم ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ غزوہ حنین میں شریک ہوئے اور صحابہؓ میں انتشار کے وقت آپ ﷺ کے ساتھ ثابت قدم بھی رہے۔ حیت الوداع میں شریک ہوئے اور نبی کریم ﷺ کے ردیف رہے۔ پھر جہاد کی غرض سے شام کو نکلے۔ اسی سلسلے میں آپ اردن کے قریب ہی کہیں موجود تھے کہ طاعون عمواس آئی اور آپ اکیس (۲۱) سال کی عمر میں وفات پائے جبکہ بعض اقوال کے مطابق جنگ یرموک میں شہادت پائی۔

عصابة صفراء: عصابة کپڑے کی اس پٹی کو کہتے ہیں جو کہ ٹوٹنے یا درد کی وجہ سے کسی عضو پر باندھی جائے۔ نبی کریم ﷺ کو مرض وفات میں سر درد کی شکایت بہت زیادہ تھی۔ اسی وجہ سے آپ نے سر کو باندھ رکھا تھا۔ یاد لیے ہی سر پر کپڑا پڑا تھا۔ فقال یا فضل یعنی سلام کا جواب دینے کے بعد مجھ سے فرمایا کہ اے فضل اشد بھلہ العصابة راسی ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ پٹی جو دیے پڑی ہے۔ میرے سر پر باندھ لو۔ فوضع کفہ علی منکبی یہی سے ترجمہ الباب کے ساتھ تعلق ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فضل بن عباسؓ کا سہارا لیا تھا۔

لقد دخل فی المسجد یہاں حرف جر کا اظہار کیا گیا ہے جو کہ عموماً ذکر نہیں ہوتا۔ لیکن دخل کے صلہ میں فی کا استعمال جائز ہے۔ اگرچہ عام نہیں ہے۔

وفی الحدیث قصہ اس واقعہ کو دوسرے محدثین نے کتابوں میں نقل کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ ﷺ مسجد آ کر منبر پر تشریف فرما ہوئے اور لوگوں کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ صحابہ کرامؓ حاضر ہوئے۔ تو آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد مسلمانوں سے اس بات کا التماس کیا کہ وہ اپنے تمام حقوق جو نبی کریم ﷺ کے ذمے رہتے ہیں۔ ابھی اس دنیا میں طلب کریں۔ اور آخرت کے لئے نہ چھوڑیں۔ اور جب آپ ﷺ نے مسلمانوں سے اس کا مطالبہ اصرار کے ساتھ کیا تو بعض صحابہؓ نے اپنے حقوق ظاہر کئے جن کو آپ ﷺ نے فضل بن عباسؓ سے کہہ کر ادا کروایا۔ جبکہ بعض صحابہ کرامؓ نے اپنے بعض عوارض کے لئے آپ ﷺ سے دعا بھی کروائی۔ کچھ تفصیل آگے باب الوقات میں آرہی ہے۔

۲۴۔ باب ماجاء فی صفة اكل رسول الله ﷺ

نبی کریم ﷺ کے کھانے کا بیان

اس باب میں امام ترمذی نبی کریم ﷺ کے کھانے کے آداب، طرز اور طریقے بیان فرماتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ آپ ﷺ کیا کیا تناول فرماتے تھے۔ اس کا بیان آئندہ مختلف ابواب میں آئے گا۔ روٹی سالن اور پھل وغیرہ کے لیے الگ الگ ابواب آئیں گے۔ نیز جامع ترمذی کے ابواب الاطعمہ میں تفصیل سے وہ اشیاء ذکر کی گئی ہیں۔ اس باب میں اس بات کا بیان مقصود ہے۔ کہ کھانے کے مناسب انداز اور مسنون طریقے کیا ہیں۔

(۱) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ ثَنَا عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنُ مَهْدِيٍّ عَنْ سَفْيَانَ

عَنْ سَعْدِ بْنِ اِبْرَاهِيمَ عَنْ ابْنِ لَكَبٍ عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِيهِ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ

كَانَ يَلْعَقُ اَصَابِعَهُ ثَلَاثًا قَالَ أَبُو عِيسَى وَرَوَى غَيْرُ مُحَمَّدِ بْنِ بَشَّارٍ هَذَا

الْحَدِيثُ قَالَ كَانَ يَلْعَقُ اَصَابِعَهُ الثَّلَاثَ (۱)۔

ترجمہ: حضرت کعب بن مالک سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی انگلیاں تین

مرتبہ چاٹ لیا کرتے تھے۔

ابن کعب الخ سند میں مذکور اس راوی کا نام عبداللہ یا عبدالرحمن ہے۔ بڑے تابعی ہیں۔ عظمت

کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت کعب بن مالک جیسے جلیل القدر صحابی کے فرزند اور ان سے

فیض یافتہ ہیں۔ بلکہ عبداللہ بن کعب کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو

دیکھا تھا۔

کعب بن مالک کا ذکر: عَنْ اَبِيهِ حضرت کعب کے بیٹے اپنے والد کعب بن مالک بن ابی مالک سلمی

مدنی سے روایت کرتے ہیں۔ حضرت کعب مشہور صحابی ہیں۔ بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانیہ میں شریک رہے۔

غزوہ تبوک میں حاضر نہ ہو سکے۔ بلکہ ان تین محبوب صحابہ میں سے ایک آپ بھی ہیں جن کی توبہ کی قبولیت

(۱) صحیح مسلم ۱۸۳/۲، سنن ابی داؤد ۱۸۱/۲، شرح السنة ۱۵/۱، رقم الحديث ۲۸۷۴،

کو مؤخر کر دیا گیا تھا۔ نبی کریم ﷺ کے شاعروں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ ستر (۷۷) سال کی عمر میں ۵۵ھ کو وفات پائی (۱)۔

تین انگلیاں یا تین بار: یلعق اصابعه ثلاثا۔ یعنی آپ ﷺ کھانا کھانے کے بعد تین بار انگلیاں چاٹتے تھے۔ محمد بن بشار کی روایت میں بھی مذکور ہے۔ لیکن ان کے علاوہ دیگر روایات حضرت کعب بن مالک کی یہ حدیث یوں بیان کرتے ہیں۔ کہ آپ ﷺ تین انگلیاں چاٹتے تھے۔ مذکورہ حدیث کے الفاظ میں دونوں صورتوں کا احتمال موجود ہے۔ لیکن مؤخر الذکر صورت کو بعض شراح نے اس لیے ترجیح دی ہے کہ آگے امام ترمذی خود حضرت کعب بن مالک کی وہ حدیث لاتے ہیں۔ جس میں تصریح ہے کہ ”یا کل باصابعه الثلاث“ اور مؤخر الذکر تشریح پر دونوں روایتوں میں تطبیق ممکن ہے۔ لیکن علامہ ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ بظاہر یہاں تین بار چاٹنے کا ذکر ہے۔ اور دوسری روایات میں تین انگلیوں کا ذکر ہے۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ تین انگلیوں کا تین بار چاٹنا مراد لیا جائے۔

انگلیوں سے کھانا انسان کا اعزاز: اس مقام پر انگلیوں سے کھانا ثابت ہو رہا ہے۔ اور یہ فعل قبیح نہیں بلکہ مستحسن ہے۔ اسی طرح انگلیوں کا چاٹنا بھی مستحسن امر ہے۔ نئی تہذیب کے نام نہاد روشن خیال حلال و حرام اور پلید و ناپاک ہر قسم کی چیزیں کھا کر انگلیوں کے چاٹنے کو بد تہذیبی اور قبیح فعل سمجھتے ہیں۔ بلکہ انگلیوں کے ذریعے کھانا بھی پسند نہیں کرتے۔ حالانکہ غلاظتوں کا یہ حال ہے کہ نہ وضوء نہ غسل۔ لیکن انگلیوں پر ان کو جراثیم نظر آتے ہیں۔ چھری، کانٹے اور چمچوں کے ساتھ کھانا ان کے ہاں قابل فخر تہذیب خیال کیا جاتا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ ہمارے استعمال میں آنے والی چھری، کانٹے اور چمچے تو ہر آدمی کے منہ میں جاتے ہیں۔ خواہ وہ بیمار ہو یا تندرست۔ مغرب کی اندھی تھلید میں ان کو ان آلات میں بھی کوئی عیب دکھائی نہیں دیتا۔ جبکہ ہونٹ میں میں نے کئی بار دیکھا ہے کہ چچا اگر گندہ ہو تو بے تمیز بیرے تھوک کر اپنی گندہ قمیص کے ساتھ ان کو صاف کر کے چمکدار بنا دیتے ہیں۔ اور یہ بیوقوف اس پر اتراتا ہے کہ میں نے چچے کے ساتھ کھانا کھایا۔ اس غلاظت کے بجائے دھلی ہوئی پاک انگلیوں کے ساتھ کھانا اسے گوارا نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے تو کھانے سے قبل ہاتھ دھو کر کھانے کا حکم دیا ہے۔ اور فارغ ہو کر انگلیاں چاٹنے اور پھر (۱) ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانے میں آپ کا انتقال ہوا تھا۔ (اصلاح الدین)

دھونے کی ترغیب دی ہے۔ اور اسی میں برکت کی خبر دی ہے۔

تکرمیم بنی آدم کی ایک صورت: ہارون الرشیدؒ کے لیے ایک بار کھانا لایا گیا۔ اس نے کھانے کے لیے چھچھلانے کا حکم دیا۔ امام ابو یوسفؒ بھی موجود تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ دیکھو خود تیرے پردادا حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے تو اللہ تعالیٰ کے اس قول ”وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ“ کی تفسیر میں یہ فرمایا ہے کہ ”جعلنا لهم اصابع یا کلون بها“ یعنی یہ کہ ہم نے انسان کے اکرام کے لیے اسے انگلیاں بخشی ہیں تاکہ ان کے ذریعے وہ کھانا کھائے۔ اور تم چھچھ کے ساتھ کھانا کھانا چاہتے ہو۔ یہ سن کر بادشاہ نے چھچھ واپس کیا اور انگلیوں کے ساتھ کھانا کھایا۔

خود نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ کھانے والے کو یہ پتہ نہیں کہ کھانے کے کونسے جزاء میں برکت ہوتی ہے (۱)۔ یہی وجہ ہے کہ برتن میں جو تھوڑا سا کھانا رہ جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اسے کھانے کا حکم دیا ہے اور فارغ ہونے کے بعد انگلیاں چاٹنا بھی آپ ﷺ کا مسنون عمل ہے۔

تین انگلیوں کے ساتھ کھانے کی حکمت: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ روایت کے وہ الفاظ جو محمد

بن بشارؒ کے سوا دوسرے حضرات نقل کرتے ہیں، میں اس راز کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کھانے میں تمام انگلیوں کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ بلکہ صرف تین انگلیوں کے ذریعے کھانا کھاتے تھے۔

اس طرح لقمہ چھوٹا زود ہضم اور بے ضرر ہوتا ہے۔ نیز پانچ انگلیوں سے کھانا حرص و شرہ کی علامت بھی

(۱) عن جابر قال قال رسول الله ﷺ اذا وقعت لقمة أحدكم فليأخذها فليعط ما كان بها من اذى

ولياكلها ولا يدعها للشيطان ولا يمسح يده بالمنديل حتى يلعق اصابعه فانه لا يدري في أي طعامه

البركة (مسلم باب استحباب لعق الأصابع والقصة ج ۲ ص ۱۷۵)

اور یہی وہ اصل علت ہے جس کے لیے انگلیاں چاٹنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جبکہ بعض حضرات نے یہ علت بتائی ہے کہ نہ چاٹنے سے زیادہ ٹکڑے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ یعنی دوسری انگلیوں اور ہاتھ پر طعام لگنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ قاضی عیاضؒ نے یہ وجہ بھی بیان کی ہے کہ انگلیاں چاٹنے سے اس تھوڑے طعام کی قدر دانی ہوتی ہے جو انگلیوں پر لگا ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت استغفار سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

بعض ماہرین طب کا خیال ہے کہ کھانا کھانے کے بعد انگلیوں کے پوروں پر وٹامن کے (vit k) جمع ہو جاتا ہے اور انگلیاں چاٹنے سے وہ ضائع ہونے کی بجائے جزو بدن جاتا ہے۔ (مختار)

ہے (۱)۔ بہر حال تین انگلیوں کے ساتھ کھانا اور کھانے سے فراغت کے بعد ان کو چاٹنا سنت ہے۔ اور اس کا اتباع ہر مسلمان کے لیے قابل ثمریات ہونی چاہیے۔

حضرت سلمان فارسیؓ کے بارے میں آتا ہے کہ آپؐ جن دنوں فارس کے گورنر بنے۔ تو ایک دعوت میں حاضر ہوئے جس میں عجم کے بھی بڑے بڑے کماٹرا اور جرنیل آئے ہوئے تھے۔ کھانے کا وقت ہوا اور حضرت سلمانؓ کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ تو کھانا کھاتے ہوئے ایک نوالہ نیچے گر گیا۔ ساتھ بیٹھے ہوئے دوسرے صحابی کو خیال آیا کہ پیروی سنت میں حضرت سلمانؓ یہ نوالہ اٹھا کر کھائیں گے۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت اسے رہنے دیں۔ یہ لوگ دیکھ کر ہنسیں گے کہ یہ کیسے حریص لوگ ہیں۔ یہ دیکھ کر آپؐ نے وہ نوالہ اور بھی اہتمام کے ساتھ اٹھایا۔ اور زور سے بولے کہ عجم کے ان کتوں کی خاطر میں اپنے حبیب ﷺ کی سنت نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ میرے رسول ﷺ کی سنت ہے۔ اس کے بعد نوالہ اٹھایا۔ جو گرد وغیرہ لگا تھا اسے ہٹانے کے بعد تناول فرمایا۔

استحقاق سنت ایک جرم: بہر حال نبی کریم ﷺ کی سنت کو مکروہ سمجھنا کسی مسلمان کا شیوہ نہیں۔ نہ کفار سے مرعوب ہو کر ترک سنت کی جرأت کرنی چاہئے (۲)۔ اب تو بے قدری کا دور آیا ہے حتیٰ کہ عربوں کو (۱) البتہ اگر ضرورت ہو اور تین انگلیوں سے کھانا مشکل ہو تو پھر پانچ انگلیوں کے استعمال میں بھی کوئی حرج نہیں۔ استحباب الأكل بثلاث أصابع من الأبهام والمسبحة والوسطى ولا يضم إليها الرابعة والخامسة إلا لعذر بان يكون مرقا وغيره ما لا يمكن بثلاث وغير ذلك من الأعذار (انوار المحمود ۲/ ۵۷۱) شیخ احمد عبد الجواد الرومیؒ نے لکھا ہے قال الشافعي الأكل بإصبع واحدة مقت وبائنين تكبر وبالثلاثة سنة وبأزيد شر (الاحکامات ص ۱۹۹) (مختار)

(۲) قال ابن حجر واعلم ان الكلام ليمن استقدر ذالك (لعق الاصابع) من حيث هو لا مع نسبة النبي ﷺ ولا تخشى عليه الكفر. اذ من استقدر شيئا من احواله مع نسبة اليه ﷺ كقوله (جمع الوسائل ج ۱ ص ۲۳۳) اور علامہ عینیؒ نے یہ شکایت کی ہے کہ ہمارے زمانے کے لوگ کھانے کے برتن کو صاف نہیں کرتے۔ اور ساتھ اس میں کچھ چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ ایک خلاف سنت اور قبیح عمل ہے۔ اور غیر مسلموں سے مسلمانوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ انگلیاں چاٹنا یا برتن صاف کرنا حرص کی علامت ہے۔ مگر یہ غلط ہے بلکہ انگلیاں چاٹنا اللہ تعالیٰ کی نعمت عظمیٰ کی قدر دانی ہے۔ اور انگلیاں چاٹنا یا برتن کا انگلیوں سے صاف کرنا تکبر کا علاج بھی ہے۔ اور باعث برکت بھی ہے۔ (مختار)

اللہ تعالیٰ نے دولت دی۔ تو ان کی حالت اس قدر خراب ہو گئی کہ برتن یا انگلیاں چاٹنا تو کجا اب تو وہ میز پر پڑے ہوئے صرف ایک بار استعمال ہونے والے برتن یکجا کر کے بوری میں ڈال دیتے ہیں۔ اور گندگی کے ڈرم میں پھینک دیتے ہیں۔ روزانہ کھانوں کی ایک بڑی مقدار انہیں ہاتھ لگائے بغیر ضائع کر دیا جاتا ہے۔ جبکہ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کے مطابق تو طعام کا ایک چھوٹا ذرہ بھی ضائع نہیں ہونا چاہئے۔

قال أبو عيسى: إلی قولہ أصابعه الثلاث ملا علی قاریؒ نے اس روایت کو ترجیح دی ہے (۱)۔ اور اس کی وجہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ علماء نے انگلیاں چاٹنے میں ایک ترتیب بھی لکھی ہے وہ یہ کہ پہلے درمیانی انگلی، پھر سبابہ یعنی شہادت کی انگلی اور بعد میں انگوٹھا چاٹ لینا چاہئے (۲)۔

(۲) حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ الْخَلَّالُ ثَنَا عَفَّانُ ثَنَا حَمَّادُ بْنُ سَلَمَةَ

عَنْ ثَابِتٍ عَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا أَكَلَ طَعَامَ لَعَقَ أَصَابِعَهُ

الثَلَاثَ (۳)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ جب کھانا کھا لیتے تھے۔

تو اپنی تینوں انگلیوں کو چاٹ لیا کرتے تھے۔

(۱) جمع الوسائل ج ۱ ص ۲۳۲

(۲) اس ترتیب میں طبرانی نے حضرت کعب بن عجرہؓ کی ایک حدیث بھی ذکر کی ہے۔ کافی جمع الوسائل اور اس میں عقلی حکمت یہ ہے کہ اس طرح دوسری انگلیاں ٹکڑے سے محفوظ رہتی ہیں۔ شیخ زکریاؒ نے اس ترتیب کے ساتھ انگلیاں چاٹنے کے بارے میں فرمایا ہے کہ سچ کی انگلی لمبی ہونے کی وجہ سے زیادہ ٹوٹ ہوتی ہے۔ اس لئے بھی اس سے ابتداء مناسب ہے۔ اور علامہ منادیؒ نے بھی لکھا ہے لخبر الطبرانی فی الاوسط انه ياكل بأصابعه الثلاث بالإبهام والى تليها والوسطى ثم يلعق أصابعه الثلاث قبل ان يمسحها الوسطى ثم تليها ثم الإبهام وفى رواية الحكيم عن كعب بن عجرة قال رأيت رسول الله ﷺ لعق أصابعه الثلاث حين اراد ان يمسحها يلعق الوسطى ثم التى تليها ثم الإبهام قال الزين العراقي فى شرح الترمذى وبدأ بالوسطى لكونها أكثر هائلوثاً اذ هى أول ما ينزل الطعام لظولها وهى اقرب إلى الفم حتى ترتفع. (المنأوى على

هامش جمع الوسائل ۱/ ۲۳۲) (مختار)

(۳) صحيح مسلم ۲/ ۱۸۳، ابوداؤد ۲۴/ ۱۸۱، كتاب الاطعمة باب اللقمة تسقط (مختار)

لعق أصابعه الثلاث۔ یہاں بھی اس پر تنبیہ ہے کہ نبی کریم ﷺ انگلیوں کے ذریعے کھانا کھایا کرتے تھے۔ اب اگر کوئی شخص ضرورت کی بناء پر چچوں کے ذریعے کھائے۔ مثلاً کھانا نرم ہو جو چچ کے بغیر کھایا نہ جاسکے۔ جیسے کھیر، دہی وغیرہ ہو یا کھانے والا انگلیوں کے ذریعے کھانے سے معذور ہو۔ تو چچ کے استعمال میں حرج نہیں ہے۔ اس طرح گوشت کے لیے چھری کے استعمال میں بھی حرج نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ کافروں کا شعار ہو۔ تو پھر مشابہت سے بچنے کی خاطر احتراز کرنا ضروری ہے۔

(۳) حَدَّثَنَا الْحُسَيْنُ بْنُ عَلِيٍّ بْنِ يَزِيدَ الصَّدَائِيُّ الْبَغْدَادِيُّ ثَنَا

يَعْقُوبُ بْنُ إِسْحَاقَ الْحَضْرَمِيُّ أَنَا شُعْبَةُ عَنْ سَفْيَانَ الثَّوْرِيِّ عَنْ عَلِيِّ ابْنِ

الْأَقْمَرِ عَنْ أَبِي حَبِيبَةَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ أَمَّا أَنَا فَلَا أَكُلُ مَتَكَّنًا (۱)۔

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ ثَنَا عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنُ مَهْدِيٍّ ثَنَا سَفْيَانَ عَنْ عَلِيٍّ

ابن الأقرم نحوه۔

ترجمہ: حضرت ابو حبیہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں تو

ٹیک لگا کر نہیں کھاتا۔

أَمَّا أَنَا فَلَا أَكُلُ مَتَكَّنًا بغیر ضرورت کے ٹیک لگا کر کھانا ٹھیک نہیں ہے۔ ایک طرف تو یہ تو اضع

کے خلاف ہے۔ دوسری طرف یہ کثرت اکل کا سبب بھی ہے (۲)۔ اور یہ دونوں اسلام میں ناپسندیدہ امور

ہیں۔ حدیث کی تفصیل باب ما جاء فی نکاة النبی ﷺ میں گزر چکی ہے۔

وانارا اشارہ کافی است: یہاں نبی کریم ﷺ نے یہ تو نہیں کہا کہ تم ٹیک لگا کر نہ کھاؤ۔ لیکن عقلمند کے

لیے اشارہ کافی ہوتا ہے۔ اور پھر عاشق کو تو محبوب کی ہر ادا پر مرنا چاہیے۔ لہذا صریح نبی کی نسبت اس اشارہ

میں زیادہ تاکید ہے۔ تو گویا نبی کریم ﷺ نے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ تم بھی میرا اتباع کرتے ہوئے

ٹیک لگا کر نہ کھانا۔ اور جہاں جہاں نبی کریم ﷺ سے ٹیک لگا کر کھانا مروی ہے۔ وہ یا تو عذر کی وجہ سے

(۱) صحیح بخاری ۸۱۲/۲ کتاب الاطعمة باب الاکل متکناً، سنن ابی داؤد ۲۵/۲ ۱۷۳ کتاب

الاطعمة باب ماجاء فی الاکل متکناً دارمی ۱۰۶/۲ (مختار)

(۲) نیز اس میں پیٹ بڑھنے کا اندیشہ بھی ہے۔ جیسا کہ امام نخعیؒ سے مروی ہے۔ (املاح الدین)

ہے۔ یا نبی کے ورود سے قبل کی بات ہے۔ یا محض بیان جواز پر حمل کیا جائے گا۔

(۴) حَدَّثَنَا هَارُونُ بْنُ إِسْحَاقَ الْهَمْدَانِيُّ ثَنَا عَبْدَةُ بْنُ سُلَيْمَانَ عَنْ

هشام بن عروة عن ابن لكعب بن مالك عن أبيه قال قال رسول

الله ﷺ يا كل بأصابعه الثلاث و يلعقهن (۱)۔

ترجمہ: حضرت کعب بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تین انگلیوں سے

کھانا کھایا کرتے تھے۔ اور (فراغت کے بعد) ان کو چاٹ لیا کرتے تھے۔

تین انگلیوں سے کھانا سنت ہے۔ یا کل بأصابعه الثلاث الخ اس سے قبل ضمنیہ بات معلوم ہو گئی تھی

کہ نبی کریم ﷺ تین انگلیوں سے کھانا کھاتے تھے۔ اس حدیث میں اس ادب کی تصریح ہے (۲) اور یہ

در اصل وہی حدیث ہے جو دوسری تعبیر سے باب کی ابتداء میں گزر چکی ہے۔ لیکن سعید بن منصور کی ایک

مرسل روایت میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ پانچ انگلیوں سے کھانا کھاتے تھے۔ اور اگر وہ حدیث صحیح ہو تو

دونوں روایتوں میں جمع کیلئے توجیہ یہ ہوگی کہ آپ ﷺ نے بعض اوقات میں ضرورت کے موقع پر پانچ

انگلیوں کے ذریعے بھی کھایا ہوگا۔ اور یہ اس وقت ہوگا جب کھانا انتہائی نرم ہو اور تین انگلیوں سے نہ کھایا

جاسکتے۔

(۵) حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مَنِيعٍ ثَنَا الْفَضْلُ بْنُ دَكِينٍ ثَنَا مُصْعَبُ بْنُ سُلَيْمٍ

قَالَ سَمِعْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يَقُولُ أَتَى رَسُولَ اللَّهِ ﷺ بِتَمْرٍ فَرَأَيْتَهُ

يَاكُلُ وَهُوَ مَقْعٌ مِنَ الْجُوعِ (۳)۔

ترجمہ: حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس کھجوریں لائی

گئیں۔ میں نے آپ کو وہ کھجور تناول فرماتے ہوئے دیکھا۔ اس طرح کہ آپ ﷺ

(۱) صحیح مسلم ۱۸۳/۲ باب استحباب لعق الاصابع کتاب الاشریۃ، شرح السنۃ ۱/۱۵۱/۳

ابواب الاطعمۃ باب لعق الاصابع (مختار)

(۲) امام شافعی کا قول ہے ”الاکل باصبع واحد لقت و باثین تکبر و باثلاثۃ سنۃ و بلزید شرہ (اصلاح الدین)

(۳) صحیح مسلم ۱۸۳/۲ کتاب الاشریۃ باب استحباب تواضع الاکل و صفة قعود، سنن ابی

داؤد ۱۸۱/۲ کتاب الاطعمۃ باب ماجاء فی الاکل متکئاً، (مختار)

بھوک کی وجہ سے اکڑوں بیٹھ کر کسی چیز پر ٹیک لگائے ہوئے تھے۔

وهو مقع من الجوع: اقعاء ضعف کی بنا پر پیٹھ کی جانب ٹیک لگانے کو کہتے ہیں۔ اور یہاں پر یہی معنی مراد ہے۔ اس موقع پر نبی کریم ﷺ نے بھوک کی شدت کی وجہ سے عارض ہونے والے ضعف کی بنا پر اقعاء کیا تھا (۱)۔ ورنہ بلا ضرورت ٹیک لگا کر کھانا۔ آداب طعام کے خلاف اور ناپسندیدہ عمل ہے۔ اقعاء اکڑوں بیٹھنے کو کہتے ہیں۔ اس کی دو اور تفسیریں بھی ہیں۔ اول یہ کہ سرین زمین کے ساتھ لگے ہوئے ہوں اور گھٹنے اوپر کواٹھے ہوئے ہوں۔ نیز ہاتھ زمین پر ہوں۔ نماز میں اقعاء کی یہ صورت مکروہ ہے۔ دوم یہ کہ سرین ایڑیوں پر رکھ کر بیٹھا جائے اور پاؤں پھیلے ہوئے ہوں۔ یہاں پر یہ دونوں صورتیں مراد نہیں۔

(۱) علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے ولیس فی هذا ما يدل على ان الاستناد من آداب الاكل لأنه إنما فعله

لضرورة الضعف (المواهب اللدنیة ص ۱۱۴) (منحتر)

۲۵۔ باب ما جاء في صفة خبز النبي ﷺ

نبی کریم ﷺ کی روٹی کا بیان

خبز کا لفظ خاء کے فتح کے ساتھ مصدر ہے۔ روٹی پکانے کو کہتے ہیں۔ اور خاء کے ضمہ کے ساتھ ”مشی مجبوز“ یعنی خود روٹی کو کھا جاتا ہے۔ اور یہی معنی مراد ہے۔ گویا یہاں نبی کریم ﷺ کے طرز زندگی کے سلسلے کا ایک باب بیان کیا جائے گا۔ وہ یہ کہ آپ ﷺ کی روٹی کس نوعیت کی ہوتی تھی۔ اور باب میں یہ بات بھی بخوبی ظاہر ہو جائے گی کہ نبی کریم ﷺ کی زندگی عمومی طور پر فقر و فاقہ اور زہد و سادگی میں بسر ہوئی۔ عیش و عشرت اور مرغن و مرغوب غذاؤں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ نیز فقر بھی اختیاری تھی۔ نہیں تو آپ کے لیے ساری زمین سونے چاندی کی بنائی جاسکتی تھی اور جنتوں سے کھانوں کے تیار خوان بھی آسکتے تھے۔ لیکن آپ ﷺ نے فقراء کی حوصلہ افزائی اور دلجوئی کرتے ہوئے اس بات پر تنبیہ کر دی کہ دنیا داری میری امت کا اہم مقصد نہ ہو۔ اور عملاً مظاہرہ فرمایا کہ سیر خشکی خلاصہ حیات نہیں ہے۔

کھانا پینا مقصد حیات نہیں: اس کے برعکس آج کی دنیا کا بڑا مقصد روٹی اور اعلیٰ قسم کے کھانے ہوتے ہیں۔ سارا زور پیٹ بھرنے اور اس کے وسائل پر دیا جاتا ہے۔ آج نظام ہائے دنیا کا خلاصہ مادہ پرستی اور معدہ پرستی ہے۔ سوشلزم ہو یا کمیونزم، کیونز م ہو یا مارکسزم سب کے سب پیٹ کی فکر اور پیٹ کی بات کرتے ہیں۔ اور بقول قرآن ”یا کلون کما تکل الانعام (الآیۃ)“ کی عملی تفسیر بنے ہوئے ہیں۔ یہی ان کا مذہب ہے یہی ان کے اخلاق ہیں اور یہی تہذیب جدید کا محور ہے۔ ایک بالشت بھر پیٹ نے ساری دنیا کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ عقل، روح، تن بدن، علم، یونیورسٹیاں، کالج، اکیڈمیاں اور تمام ادارے اسی پر قربان ہو رہے ہیں۔

اسیر مالٹا مولانا عزیز گل کی حکیمانہ تنبیہ: ملت کے عظیم مجاہد حضرت مولانا عزیز گل کا کاخیل نے ایک بار مجھ سے فرمایا کہ دوران اسارت ایک انگریز سے ایک دفعہ میری ان بن ہوئی۔ تو میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر کہا کہ تم کون ہو؟ تم تو کھاد کی مشین ہو کھاپی کر تھوڑا سا کھاد نکال دیتے ہو۔ تمہاری ساری انگریزیت، تہذیب و تمدن اور مذہب کا خلاصہ بس پیٹ ہی تو ہے۔

اکبر ال آبادی مرحوم نے بڑے خوبصورت انداز میں شکم پرستوں پر طنز کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ چند دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ کھاڈیل روٹی کلر کی کر خوشی سے پھول جا بہر حال نبی کریم ﷺ نے فقر و فاقہ کی زندگی گزار کر یہ تعلیم عملاً ہمیں دیدی کہ کھانا تو قوت لایموت کی حد تک ہونا چاہئے۔ یہ اہم ترین مقصد حیات نہیں۔ کسی نعمت کا استعمال اس دنیا میں بطور مقصد نہیں بلکہ بطور ضرورت کرنا چاہئے۔ اب تو مسلمانوں پر بھی فراخی کا دور آیا ہے۔ یہ بڑا امتحان ہے۔ مسلمانوں کی عیشتات میں غم نہیں ہونا چاہیے۔

حضور و اہل بیت کی فاقہ کشی

(۱) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى وَمُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَا ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ ثَنَا شُعْبَةُ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ يَزِيدَ يُحَدِّثُ عَنِ الْأَسْوَدِ بْنِ يَزِيدَ عَنْ عَائِشَةَ أَنَّهَا قَالَتْ مَا شَبِعَ آلَ مُحَمَّدٍ ﷺ مِنْ خَبْزِ الشَّعِيرِ وَمِنْ مَتَابَعِينَ حَتَّى قَبِضَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ (۱)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے اہل و عیال نے جو کی روٹی بھی مسلسل دو دن پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ وفات پائے۔

ماشع آل محمد: نبی کریم ﷺ کے گھر میں گھر کے افراد مسلسل دو دن بھی جو کی روٹی سے سیر نہیں ہوئے۔ حتیٰ قبض رسول اللہ ﷺ الخ وفات سے قبل آپ ﷺ کو جزیرۃ العرب کی فرمانراؤنی ملی تھی۔ اسلامی حکومت کا عرب قیصر و کسریٰ کے درباروں تک چھا گیا۔ پھر بھی فقر کی یہ حالت رہی۔

حدیث کی ترجمۃ الباب سے مطابقت: یہاں پر یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ حدیث میں ”آل محمد“ کی فاقہ کشی کا ذکر ہے۔ اور باب نبی کریم ﷺ کے فقر سے متعلق ہے۔ لہذا مطابقت مفقود ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ عموماً معاش کے سلسلے میں اپنے آپ کی نسبت اہل و عیال مقدم ہوتے ہیں۔ جو ملتا ہے پہلے

(۱) صحیح مسلم ۴/۲۷۸ کتاب الزہد والرفائق، سنن ابن ماجہ ۲۲۸/۱، کتاب الاطعمۃ باب

خبز خبز الشعیر (مختار)

ان کو دیتے ہیں۔ لہذا ظاہر ہے کہ جب آل کو کچھ نہ ملا تو آپ ﷺ کو کیا ملا۔ اور بعض حضرات نے یہ جواب بھی دیا ہے کہ یہاں ”آل“ کا لفظ زائد ہے۔ لہذا معنی یہ ہوا کہ ”ما شبع محمد ﷺ“ یعنی خود نبی کریم ﷺ نے مسلسل دو دن جو سے پیٹ بھر کھانا نہیں کھایا۔ اور آئندہ ایک اور روایت سے اس تو جیہہ کی تائید بھی ہوتی ہے۔

ازواج مطہرات کا فقر: دوسرا شبہ اس مقام پر یہ کیا جاتا ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ کے ذمہ ازواج مطہرات کا نفقہ واجب تھا۔ تو آپ ﷺ نے ان کو ان کا حق نہ دے کر بھوکا کیوں رکھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی تقلید میں ازواج مطہرات نے بھی اختیاری طور پر فقر و فاقہ کو پسند فرمایا تھا۔ اور جب پیغمبر خدا کو فقر و فاقہ پسند تھا تو آپ ﷺ کی پاک بیویوں کو کیوں پسند نہ ہوتا۔ ان کو دنیا کی رنگینوں سے کیا واسطہ؟ بلکہ خود نبی کریم ﷺ نے ان کو اللہ تعالیٰ کے کہنے پر اختیار بھی دیا تھا کہ اگر وہ چاہیں طلاق لے لیں۔ قرآن مجید نے خود اس کا اعلان فرمایا۔ ارشاد ہے کہ **يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لَأَزْوَاجُكُمْ هِيَ كَتَنَّنَ تَرْدُنَ الْحَيَوٰةَ الدُّنْيَا وَزِينَتُهَا فَتَعَالَيْنَ امْتَعِكُنَّ وَأَسْرَحِكُنَّ** (احزاب ص ۲۸)

ترجمہ: اے نبی ﷺ کہہ دے اپنی بیویوں کو اگر تم چاہتی ہو دنیا کی زندگی اور اس کی رونق۔ تو آؤ تمہیں کچھ فائدہ پہنچاؤں اور رخصت کر دوں تم کو خوبصورتی کے ساتھ۔

لیکن انہوں نے دنیوی آسائشوں کو خیر باد کہہ کر نبی کریم ﷺ کے ساتھ فاقے گزارنے کو ترجیح دی۔ تو گویا خود انہوں نے اپنی مرضی سے نبی کریم ﷺ کو اپنا یہ حق معاف کر دیا تھا۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ان پاک بیویوں کو اپنا حق کامل دے دیا کرتے تھے۔ جو آپ ﷺ کو ملا تھا بیویوں کو ان کا نفقہ اس میں سے دیدیتے تھے۔ لیکن وہ بھی ایسی کشادہ دل واقع ہوئی تھیں۔ کہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں صدقہ کر دیتی تھیں۔ اور ضرورت کی چیز بھی ذخیرہ نہیں کرتی تھیں۔ اس لئے وہ ان فاقوں میں آپ ﷺ کی شریک رہیں۔ اگر حضرت عائشہؓ اور دیگر ازواج مطہرات کی سخاوت، کشادہ دلی اور قناعت پر نظر ڈالی جائے۔ تو حیرت ہو جاتی ہے۔

تیسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ نفقہ میں نبی کریم ﷺ ایک چیز نہیں دیتے تھے۔ بلکہ کھجور، جو، گندم

وغیرہ جو بھی میسر آتا دے دیتے تھے۔ اور ان میں سے کسی چیز کی مقدار اتنی نہیں ہوتی تھی کہ مسلسل دو دن تک اسے پیٹ بھر کر کھایا جاسکے۔ لیکن ان توجیہات کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی۔ اصل بات وہی ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے اہل خانہ نے اپنی مرضی سے لذات و خواہشات کو ترک فرمایا تھا۔ اور فقر و فاقہ اور قناعت کی زندگی بسر کرنے کو پسند کیا تھا (۱)۔

ضیاع رزق سے احتراز

(۲) حَدَّثَنَا عَبَّاسُ بْنُ مُحَمَّدٍ الدَّوْرِيُّ ثَنَا يَحْيَى بْنُ أَبِي بَكِيرٍ ثَنَا

حَرِيزُ بْنُ عَثْمَانَ عَنْ سَلِيمِ بْنِ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا أَمَامَةَ الْبَاهِلِيَّ يَقُولُ

مَا كَانَ يَفْضُلُ عَنْ أَهْلِ بَيْتِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ خَبِيزَ الشَّعِيرِ (۳)۔

ترجمہ: حضرت ابو امامہ باہلیؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے گھر والوں سے (کھانا کھانے کے بعد) جو کی روٹی نہیں بچتی تھی۔

سمعت أبا أمامة الخ: حضرت ابو امامہ باہلیؓ مشہور صحابی ہیں۔ مکفرین فی الحدیث میں سے

ہیں۔ پہلے مصر اور پھر حمص میں اقامت اختیار کی۔ اور وہیں ۸۶ھ میں اکا نوے سال کی عمر میں وفات پائی۔ اشکال اور اس کا جواب: (۱) ایک اشکال یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض روایات میں تو تصریح ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے اہل خانہ کو سال بھر کا فقہ عایت فرمایا کرتے تھے۔ تو پھر یہ فاقہ کئی کیسے ممکن تھی۔ بظاہر ان دونوں روایات میں تعارض ہے؟ ازالہ: تو اس اشکال اور تعارض کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں۔

(۱) پہلا جواب یہ ہے کہ بعض اہل علم نے اس حدیث لفظ ال کو زائد کو مانا ہے۔ مطلب یہ کہ یہ فاقہ کئی آنحضرت ﷺ کیا کرتے تھے۔ اور یہ روایت آپ ﷺ کی ذات اقدس کی ترجمان ہے۔ (۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ تو اپنی طرف سے ازواج مطہرات کو ایک سال کا فقہ دیا کرتے تھے۔ مگر ازواج مطہرات شوق ثواب سے اس کو صدقہ کرتی تھیں۔ اس لئے علامہ بیہقی نے لکھا ہے ولا ینافی ذالک انه کان یدخر فی آخر حیاته قوت سنة لعیالہ لانه کان یعرض لہ حاجة المحتاج فیخرج فیہا ما کان یدخرہ (المواہب اللئلیۃ ۱۱۵) (۳) شیخ الحدیث مولانا زکریا نے اس کی دو توجیہات کی ہیں (۱) یہ کہ سال بھر کا فقہ اس حساب سے ہو کہ مسلسل دو دن کی روٹی کا حساب نہ بیٹھتا ہو بلکہ کبھی روٹی، کبھی کھجور اور کبھی فاقہ (۲) دوسری توجیہ یہ ہے کہ وہ فقہ کیا عجب ہے کہ کھجوریں ہی ہوں اس حدیث میں اس کی نفی نہیں بلکہ یہاں تو صرف روٹی کی نفی ہے۔ (مختار)

(۲) جامع ترمذی ۶۱/۲ کتاب الزہد باب ما جاء في معيشة النبي ﷺ، مسند احمد

ما كان يفضل الخ جو کی روٹی بھی گھر میں فاضل نہ بچتی۔ بلکہ جب ملتی تو صرف گزارے کی حد تک میسر ہوتی تھی۔ اور قوت لایموت میں بچ جانے کی توقع ہی کب کی جاسکتی ہے۔ آج کل تو ہمارے ہاں آدھا کھانا بچ کر گل سڑ جاتا ہے۔ جو کہ اسلام میں ناپسندیدہ بات ہے۔ زیادہ کھانے کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے آپ کے ہاں تھوڑا کھانا پکتا تھا۔ یا پھر اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی آپ کے ہاں کچھ زیادہ اور اضافی کھانا پکتا تو بھی وہ گھر میں بچا کر نہیں رکھا جاتا۔ لیکن اول الذکر تو جیہ بہتر ہے جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے دسترخوان سے آپ ﷺ کی وفات تک روٹی کا کوئی ٹکڑا نہ اٹھایا جاسکا۔ و ما رفع عن مائدته كسرة قط۔ (مسند احمد ۶/۱۵۶)

(۳) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَعَاوِيَةَ الْجُمَحِيُّ ثَنَا ثَابِتُ بْنُ يَزِيدَ عَنْ هَلَالِ بْنِ خَبَابٍ عَنْ عِكْرَمَةَ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَبِيتُ اللَّيَالِيَ الْمُتَتَابِعَةَ طَاوِيًا هُوَ وَوَأَهْلُهُ لَا يَجِدُونَ عِشَاءً وَكَانَ أَكْثَرُ خَبْزِهِمْ خَبْزُ الشَّعِيرِ (۱)۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اور ان کے گھروالے متعدد راتیں مسلسل بھوکے گزار دیتے تھے۔ کہ رات کا کھانا میسر نہیں ہوتا تھا۔ اور (جولتا) تو اکثر جو کی روٹی ہوتی تھی۔

طَاوِيًا الخ طَوَى الرَّجُلُ كَمَا هُوَ فِي مَعْنَى هُوَ خَفِضَ بَهْوَكَارَهَا۔ اس طرح طَاوِيَا کے معنی ہوتے ہیں بھوکا۔ یا پھر تقدیر عبارت یوں ہے ”طَاوِيًا كَشَحَهُ عَلَى الْجُوعِ“ یعنی پیٹ میں بھوک کو سمیٹ لیا کرتے تھے۔

اپنی بھی یہی حالت ہوتی تھی۔ اور گھروالوں کی بھی کہ شام کو کھانے کی کوئی بھی چیز نہیں ملی۔ اور بھوکے سو گئے۔ پھر بھی استغناء و قناعت کا یہ حال تھا کہ سوال تو کیا، آپ ﷺ کی طرف سے یا اہل بیت کی طرف سے کسی پر یہ ظاہر بھی نہیں ہوتا تھا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کی یہ حالت اغنیاء تو درکنار فقراء صحابہ

(۱) جامع ترمذی ۶۱/۲ کتاب الزہد باب ما جاء في معيشة النبي ﷺ، سنن ابن ماجہ ۱/۲۳۸

کے لئے بھی قابل برداشت نہ ہوتی۔ لایجندون عشاء عین کے فجر کے ساتھ شام کے کھانے کو کھا جاتا ہے۔ اکثر خبز ہم الخ مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات گندم کی روٹی بھی مل جاتی لیکن اکثر جو کی روٹی ہوتی تھی۔ اور اس میں آپ ﷺ اور ازواج مطہرات کی قناعت کا کمال ہے۔

چھانے بغیر روٹی

(۴) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ ثَنَا عُبَيْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ الْمَجِيدِ الْحَنْفِيُّ ثَنَا عَبْدُ الرَّحْمَنِ وَهُوَ ابْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ دِينَارٍ ثَنَا أَبُو حَازِمٍ عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ أَنَّهُ قِيلَ لَهُ أَكَلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ النَّقْيَ يَعْنِي الْحَوَارِيَّ لِقَالَ سَهْلٍ مَارَأَى رَسُولَ اللَّهِ ﷺ النَّقْيَ حَتَّى لَقِيَ اللَّهَ تَعَالَى فَقِيلَ لَهُ هَلْ كَانَتْ لَكُمْ مَنَاخِلٌ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ مَا كَانَتْ لَنَا مَنَاخِلٌ فَقِيلَ كَيْفَ كُنْتُمْ تَصْنَعُونَ بِالشَّعِيرِ قَالَ كُنَّا نَنْفَخُهُ فَيَطِيرُ مِنْهُ مَا طَارَ ثُمَّ نَعْبِجُهُ (۱)۔

ترجمہ: حضرت سہل بن سعدؓ سے کسی نے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی خالص آٹے یعنی سفید میدے کی روٹی کھائی ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے زندگی بھر وفات تک سفید میدہ دیکھا بھی نہیں تھا۔ پھر پوچھا گیا کہ کیا حضور ﷺ کے زمانہ میں آپ کے ہاں چھلنیاں ہوتی تھیں؟ انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس چھلنیاں نہیں تھیں۔ سائل نے پھر پوچھا کہ (چھلنیوں کے بغیر) تم لوگ جو کے ساتھ کیسا معاملہ کرتے تھے؟ تو حضرت سہلؓ نے جواب دیا کہ جو میں ہم پھونک مار دیتے تھے۔ تو اس کے موٹے موٹے تنکے بھوسہ اڑ جاتا تھا۔ باقی آنا گوند کر پکا لیتے تھے۔

(۱) جامع ترمذی ۶۱/۲ کتاب الزہد باب ما جاء في معيشة النبي ﷺ، صحيح بخاری کتاب

الاطعمة باب النفخ في الشعير ۸۱۴، ۸۱۵، متن ابن ماجه كتاب الاطعمة باب خبز

الشعير ۲۳۷/۱ (مختار)

سہل بن سعد: ابو العباس سہل بن سعد بن مالک بن خالد ساعدی انصاری خزرجی صحابی ہیں۔ ان کے والد بھی صحابی ہیں۔ اصلی نام حزن تھا۔ نبی کریم ﷺ نے تبدیل کر کے سہل نام رکھا۔ وفات نبوی کے وقت ان کی عمر پندرہ برس تھی۔ ۸۸ھ تا ۹۱ھ میں وفات پائی۔ مدینہ میں وفات پانے والے صحابہ میں آپ آخری صحابی ہیں۔

یعنی الحواری یعنی سائل کی مراد نفی سے حواری ہے۔ جو اوامشددہ اور الف مقصورہ کے ساتھ میدہ اور خوب چھنے ہوئے آٹے کو کہتے ہیں۔ حور سے بنا ہے جس کے معنی سفیدی ہیں۔ اور چھاننے کے بعد آٹا بالکل سفید ہو جاتا ہے۔

مارائی کھانا تو کجا آپ ﷺ نے چھنا ہوا آٹا دیکھا بھی نہ تھا۔ بعض شراح نے لکھا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ شام کے اسفار میں آپ ﷺ نے میدے کی روٹی دیکھی اور کھائی ہو۔ خصوصاً بحیراراب کی ضیافت کے دوران۔ کیونکہ شام میں آٹا چھاننے کا رواج زمانہ قدیم سے تھا۔ لہذا یہاں پر بعد النبوة کی قید ضروری ہے۔ اور اسی وجہ سے بخاری شریف کی روایت میں یہ قید موجود ہے کہ مارائی رسول اللہ ﷺ منخلا من حین بعثہ اللہ حتی قبضہ (۱)۔ یعنی بعثت کے بعد آپ ﷺ نے چھلنی نہیں دیکھی تھی۔

لیکن چونکہ یہ محض احتمال کی بنیاد پر کہا جاتا ہے۔ حقیقی روئے کی کوئی دلیل نہیں۔ نیز حضرت سہلؓ کی یہ نفی خود حضرت سہلؓ کے علم کی بنیاد پر وارد ہے۔ اور ان کے علم کے مطابق یہ نفی کلی ہے۔ لہذا اشکال وارد ہی نہیں ہوتا (۲)۔

هل كانت لكم مناخل الخ مناخل منخل کی جمع ہے۔ جو کہ میم کے ضمہ کے ساتھ چھلنی کو کہتے ہیں۔ حضرت سہلؓ سے جب سوال کیا گیا کہ کیا عام روزمرہ کے استعمال میں آپ لوگوں کے ہاں چھلنی موجود تھی؟ تو آپؓ نے فرمایا کہ ہمارے ہاں چھلنیاں زیر استعمال نہیں تھیں۔ اسی وجہ سے بعض اکابر کا مقولہ ہے ”اول بدعة في الاسلام المناخل“ یعنی اسلام میں پہلی بدعت چھلنی کا استعمال تھا۔ جو صحابہ کے

(۱) بخاری جلد ۲ ص ۸۱۵ (کتاب الاطعمة باب علی ما کان النبی ﷺ وأصحابہ یا کلون) (مختار)

(۲) اس لئے شیخ الجواد الروی نے فرمایا ہے کہ ولکن سہلاً لم ینف الاکل فقط بل نفسی الرویة

کذا لک (الاحکامات ۲۰۵) (مختار)

دور میں رائج ہوا تھا۔ لیکن یہاں بدعت کے معنی بدعت سنیہ نہیں جو ناجائز ہے۔ بلکہ مطلقاً جدت کے معنی میں مستعمل ہے۔

کیف کنتم تصنعون بالشعیر یعنی گندم کا آٹا تو چھانے بغیر بھی کھایا جاسکتا ہے۔ لیکن چھلنی نہ ہوتے ہوئے جو کا آٹا کیسے کھاتے تھے۔ کنا ننفخہ الخ یعنی جو (کو کوٹ کر) پہلے اس میں پھونک مار دیتے تھے۔ جو بھوسہ تنکے ہوتے اڑ جاتے۔ اور جو باقی بچتا اسے گوندھ کر کھا لیتے تھے۔

اس حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ آٹا چھان کر کھانا جائز نہیں ہے۔ یہ تو فقط نبی کریم ﷺ کے فقر کا بیان ہے۔ اور ترجمۃ الباب سے مطابقت بھی واضح ہے۔

میز نماخوانوں اور بر تکلف برتنوں سے پرہیز

(۵) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ أَنَا مُعَاذُ بْنُ هِشَامٍ قَالَ سَمِعْتُ أَبِي عَنْ
يُونُسَ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ مَا أَكَلَ النَّبِيُّ ﷺ عَلَى
خَوَانٍ وَلَا فِي مَكْرَجَةٍ وَلَا خَبْزَلَةٍ مَرَّقَ قَالَ فَقُلْتُ لَقَتَادَةَ فَعَلَى مَا كَانُوا
يَأْكُلُونَ قَالَ عَلَى هَذِهِ السَّفَرِ قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ يُونُسُ هَذَا الَّذِي
رَوَى عَنْ قَتَادَةَ هُوَ يُونُسُ الْأَسْكَافُ (۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی میز نماخوان پر یا
چھوٹی پلیٹوں میں کھانا نہیں کھایا۔ نہ کبھی آپ ﷺ کی خاطر نرم چپاتی پکائی جاتی تھی۔
یونسؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت قتادہؓ سے پوچھا کہ پھر صحابہ کس چیز پر کھانا رکھ کر
کھاتے تھے۔ تو انہوں نے کہا کہ انہی چمڑے کے دسترخوان پر (امام ترمذی کے شیخ)
محمد بن بشارؓ کہتے ہیں کہ یونسؓ جو قتادہؓ سے روایت کرتے ہیں وہ یونسؓ اسکاف ہیں۔

ما اكل على خوان عجم کے عیاش امراء میز نماخوانوں پر رکھ کر کھانا کھایا کرتے تھے۔ تاکہ
کھانے کے وقت بھی سرنگوں نہ ہونا پڑے۔ آپ ﷺ نے اس طرز سے اجتناب کرتے ہوئے عملاً ایسا نہ

(۱) صحیح بخاری ۸۱۱/۲ کتاب الاطعمة باب الخبز العرق والاكل على الخوان، سنن ابن ماجه

۲۳۳/۱ کتاب الاطعمة باب الاكل على الخوان والسفرة، (مختار)

کرنے کی تعلیم دی۔ کیونکہ اس میں تکبر کے ساتھ ساتھ تشبہ بالكفار کی علت بھی تھی۔

ولا فی سكرجة الخ سكرجة اس چھوٹے برتن یا پلیٹ کو کہتے ہیں جس میں عموماً مشی اور مرغوب غذا ڈال کر کھائی جاتی ہے (۱)۔ جس طرح کہ آج کل بھی یہ رواج ہے کہ درمیان میں کھانے کا ڈونگایا بڑا برتن رکھا ہوتا ہے۔ اور ارد گرد چھوٹی پلیٹیں ہوتی ہیں۔ جن میں کھانا ڈال کر لوگ کھاتے ہیں یا پھر اگر نفیس اور عمدہ قسم کے کھانے مثلاً اچار، چٹنی اور فرنی وغیرہ ہو تو چھوٹی پلیٹوں میں ڈال کر کھانے والوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ نبی کریم ﷺ پر تکلف کھانوں سے دور رہتے تھے۔ اس لیے پلیٹوں کی ضرورت ہی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ مزید یہ کہ عموماً عربوں کے ہاں اور پھر بالخصوص نبی کریم ﷺ کے ہاں ایک برتن میں شریک ہو کر اکٹھا کھانا کھاتے تھے جو چھوٹی رکابیوں میں ممکن نہیں ہوتا۔

چھوٹی موٹی روٹی: ولا خبز له مرفق نہ آپ ﷺ کے لیے نرم چپاتیاں پکائی گئیں۔ مرقق چھوٹی اور پتلی روٹیوں کو کہتے ہیں۔ جیسے ہندوستانیوں کے ہاں پکانے کا رواج ہے۔ اسے رقاق بھی کہا جاتا ہے۔ اگر گندم کا آٹا خوب نرم اور چھنا ہوا ہو تو اس سے چپاتی پکائی جاسکتی ہے۔ جبکہ مکئی وغیرہ کے آٹے سے مرقق یعنی پتلی چپاتیاں نہیں پک سکتیں۔ اسی طرح اگر گندم کے آٹے میں بھوسی ہو تو پتلی روٹی نہیں پکائی جاسکتی۔ بہر حال نبی کریم ﷺ کی روٹی موٹی ہوتی تھی۔ اور وہ بھی دوسرے شرکاء کے ساتھ اکٹھے اور نیچے پیٹھ کر کھاتے تھے۔ میز کرسی کے تکلفات آپ ﷺ کے ہاں نہیں تھے۔ جیسے کہ حضرت یونسؑ کے استفسار پر حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ ”علیٰ هذه السفرة“ سفرۃ کی جمع (۲) ہے۔ اور حقیقت میں یہ چڑے کا (۱) قال ابن العربي: اناء صغير يوضع فيه الشئ القليل المشهي للطعام الهاضم له كالسلطة والمخلل. (المواهب اللدنیہ ص ۷۷) (مختار)

(۱) جمع سفرۃ وفي النهاية هي في الاصل طعام يتخله المسافر والغالب انه يحمله في جلد مستدير فنقل اسمه الى ذلك الجلد (جمع الوسائل) جبکہ علامہ بیجوریؒ اور علامہ مناویؒ نے چڑے کے گول دسترخوان کا نام سفرہ رکھنے کی وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ ”مضم و تنفرج لفسفر عما ظہرھا“ یعنی اس کے کھلتے ہی یہ اپنے اندر کی چیزوں کا استفسار اور اظہار کر دیتا تھا۔ اسی وجہ سے اسے سفرہ کہا گیا۔ جس طرح کہ سفر کو اسی لئے سفر کہا گیا کہ اس میں مسافر کے اخلاق کا کامل مظاہرہ ہو جاتا ہے۔ نیز نامعلوم مقامات اور احوال سے واسطہ پڑ کر ان کا علم ہو جاتا ہے

دستر خوان ہوتا ہے جس پر لوگ کھایا کرتے تھے۔ جیسا شاعر نے کہا کہ ۔ سفرۃ زمین خوان اوست ایسی سادگی کی زندگی میں برکتیں ہوتی ہیں۔ ہم اور ہمارے طلبہ نے جب سے سادگی اور جفاکشی کی زندگی ترک کر دی ہے۔ برکتیں بھی ساتھ چھوڑ گئی ہیں۔ یونس الامسکاف امام ترمذیؒ ایک راوی کا تعارف کرا رہے ہیں۔ اسکاف موچی کو کہتے ہیں۔ گویا پیشہ کے لحاظ سے وہ موچی تھے۔ اور چونکہ مصنف نے اس راوی کی صرف یہی ایک حدیث روایت کی ہے۔ اس لئے تعین و تعارف کی ضرورت پیش آئی۔

(۶) حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مَنِيعٍ ثنا عُبَادُ بْنُ عَبَّادٍ الْمُهَلَّبِيُّ عَنْ مَجَالِدٍ عَنِ الشَّعْبِيِّ عَنْ مَسْرُوقٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلَى عَائِشَةَ فَدَعَتْ لِي بِطَعَامٍ وَ قَالَتْ مَا أَضْبَعُ مِنْ طَعَامٍ فَإِشَاءُ أَنْ أَبْكِيَ إِلَّا بِكَيْتٍ قَالَ قُلْتُ لِمَ قَالَتْ أَذْكَرُ الْحَالِ الَّتِي فَارَقَ عَلَيْهَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ السَّنِيَا وَاللَّهُ مَا ضَبَعُ مِنْ خَبْزِو لَحْمٍ مَرْتَيْنِ فِي يَوْمٍ وَاحِدٍ (۱)۔

ترجمہ: حضرت مسروقؒ کہتے ہیں کہ میں حضرت عائشہؓ کے پاس گیا۔ انہوں نے میرے لئے کھانا منگایا۔ اور فرمایا میں کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھائی۔ مگر میرا دل رونے کو چاہتا ہے تب میں رولیتی ہوں۔ مسروقؒ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ یہ کیوں؟ آپؓ نے فرمایا کہ مجھے نبی کریم ﷺ کی وہ حالت یاد آ جاتی ہے جس پر وہ دنیا سے تشریف لے گئے۔ (وہ یہ کہ) خدا کی قسم آپ ﷺ نے کبھی بھی ایک دن میں دو بار روٹی اور گوشت سے پیٹ بھر کر نہیں کھایا۔

مسروقؒ یہ مشہور صحابی ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بھانجے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بچپن میں اسے چرایا گیا تھا۔ اور بعد میں پائے گئے۔ وفات نبوی ﷺ سے قبل اسلام لائے۔ اور صدر اول کے صحابہ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ ۱۰۲ھ میں کوفہ میں وفات پائی۔

حضرت عائشہ کا ضبط سے بندھن ٹوٹ جانا: فإِشَاءُ أَنْ أَبْكِيَ الخ علامہ مناویؒ لکھتے ہیں کہ یہ دراصل حضرت عائشہؓ کی طرف سے گویا اعتذار سا ہے۔ کہ مہمان نوازی کے اصول کے مطابق میں

بھی کھانے میں شریک ہوتی تاکہ مہمان بے تکلفی کے ساتھ کھائے۔ لیکن میں یہ اہتمام نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ میں جب کوئی اچھا کھانا پیٹ بھر کر کھاؤں۔ تو دل بھر جاتا ہے اور رونا چاہوں تو رو لیتی ہوں۔ اور جب حضرت مسروقؓ نے اس کا سبب پوچھا۔ تو آپؐ نے فرمایا اذکر الحال التي الخ یعنی پیٹ بھر کر کھانے کے بعد وہ فقر و فاقہ یاد آ جاتی ہے جس میں نبی کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے چلے تھے۔ پھر یہ حزن و ملال اور افسوس مجھے اپنی گرفت میں لے کر یہ احساس دلاتا ہے۔ کہ ہم فقر و فاقے کی اس محمود و محبوب روایت کو کیوں برقرار نہ رکھ سکے۔ اور آج اس مرتبہ عالیہ سے ہم کیوں محروم رہے۔ لہذا رونا آ جاتا ہے۔

ما شبع الخ یعنی اگر شاذ و نادر ایک وقت پیٹ بھر کر کھانے کو مل بھی جاتا تو دوسرے وقت کھانا نہیں ملتا تھا۔ اور سردار دو جہاں علیہ السلام کی یہ تکلیف اور فقر و فاقہ یاد کر کے حضرت عائشہؓ کا رونا بے محل نہیں تھا۔ کیونکہ انہوں نے اس تکلیف کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس کا تصور کر کے تو بہت دور کے لوگوں کا بھی دل بھر جاتا ہے۔ یوں اس آخری جملے میں رونے کی ایک اور وجہ کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔

(۷) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ غِيلَانَ ثنا أَبُو دَاوُدَ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ عَنْ أَبِي

إِسْحَاقَ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ يَزِيدَ يَحْدِثُ عَنْ الْأَسْوَدِ بْنِ يَزِيدَ

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا شَبِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مِنْ خَبْزِ شَعِيرٍ يَوْمَ مِثْنِ مَتَابِعِينَ

حَتَّى قَبِضَ (۱)۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی جو کی روٹی دو دن مسلسل

پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔

یومین متابعین حتی قبض الخ یہاں پر ایام کے ساتھ لیا لی بھی مراد ہیں۔ یعنی دو دن رات مسلسل پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ بخاری شریف کی ایک حدیث میں تین دنوں کا بھی ذکر موجود ہے۔ لیکن وہاں خبز الشعیر کی بجائے خبز البر کا ذکر ہے۔ حدیث کی تشریح باب کی پہلی حدیث کے ضمن میں گزر چکی

(۱) صحیح مسلم کتاب الزهد والرفائق ۲/۴۱، جامع ترمذی ابواب الزهد باب ما جاء في

معيشة النبي ﷺ واهله ۲/۶۱ (مختار)

ہے فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں آل محمد ﷺ کا ذکر تھا۔ اور یہاں خود نبی کریم ﷺ کی بات ہو رہی ہے۔

(۸) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ ثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَمْرٍو أَبُو مَعْمَرٍ

ثَنَا عَبْدِ الْوَارِثِ عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي عُرُوبَةَ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسٍ قَالَ مَا أَكَل

رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَى خَوَانٍ وَلَا أَكَلْ خَبْزًا مَرَّقًا حَتَّى مَاتَ (۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی بھی خوان پر کھانا تناول

نہیں فرمایا۔ اور نہ نرم چپاتی کھائی یہاں تک کہ آپ ﷺ وفات پائے۔

وَلَا أَكَلْ خَبْزًا مَرَّقًا الْخِ مَرَّقٍ كِي تَشْرَحُ بِطَلْعِ الْغُرِّ هَكَذَا هِيَ۔ اس حدیث میں اس بات کی

تصریح ہے کہ آپ ﷺ نے مرقق (نرم) چپاتی نہیں کھائی ہے۔ خواہ وہ آپ ﷺ کے سوا کسی اور کے لیے

کیوں نہ پکی ہو۔ جبکہ اس سے پہلے آپ ﷺ کے لیے پکانے کی نفی کی گئی تھی۔ آپ ﷺ کے کھانے کی نفی

نہیں تھی۔ (صلی اللہ علی نبیہ محمد والہ و صحابہ اجمعین)

خلاصہ باب

اس باب میں نبی کریم ﷺ کی روٹی اور کھانے میں سادگی کا بیان ہے۔ نبی کریم ﷺ کی زندگی

فقر اختیار کا بہترین نمونہ تھی۔ عموماً فاقہ کشی رہتی تھی۔ روٹی ملتی تو عموماً گندم کی نہیں ہوتی تھی۔ جو کی ہوتی

تھی وہ بھی بغیر چھنے ہوئے آٹے سے پکتی تھی۔ بلکہ چھنا ہوا آٹا تو آپ ﷺ نے دیکھا بھی نہ تھا۔ پھر جو

روٹی ملتی وہ بھی قوت لایموت کی حد تک۔ دسترخوان پر کچھ بھی نہ بچتا تھا۔

پھر کھانے کے لیے تکلفات بالکل نہیں ہوتے تھے۔ میز نہ کرسی، پلیٹیں نہ چمچ۔ سادہ دسترخوان بچھا

کرا کٹھے کھانا کھانے کا رواج تھا۔ حتیٰ کہ حضور ﷺ کی اس سلسلے میں سادگی بلکہ جفاکشی کو یاد کر کے فاقہ کشی

میں شریک عائشہ صدیقہؓ کے ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے تھے۔ اور آنسو بے قابو ہو جاتے تھے۔

(۱) صحیح بخاری ۲ / ۹۵۵ کتاب الرقاق باب فضل الفقراء، جامع ترمذی ۲ / ۶۱ کتاب الزهد

باب ما جاء في معيشة النبي ﷺ، (مختار)

۲۶ . باب ما جاء في ادم رسول الله ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے سالتوں کا بیان

إدام کے مفہوم کی تحقیق: اس باب میں سالتوں کا بیان ہے جو نبی کریم ﷺ استعمال کر چکے ہیں (۱)۔ ادم کے مفہوم کے بارے میں تخمین اور امام محمدؒ کے درمیان اختلاف فقہ کی کتابوں میں قسم کے ابواب میں مذکور ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ادم وہ چیز ہے جس میں صلبہ اور اصطبار کا معنی ہو۔ اور روٹی کے ساتھ جعاً کھائی جا سکے۔ یوں کہ روٹی کے ساتھ کھل مل جائے۔ جیسے شوربہ، سرکہ وغیرہ یا وہ چیز جو اصلہ نہ کھائی جائے جیسے نمک وغیرہ۔ بالاستقلال کھائی جانے والی چیزیں ادم نہیں ہیں۔ جیسے گوشت، پنیر اور اٹا وغیرہ۔ جبکہ امام محمدؒ اور ایک قول کے مطابق امام ابو یوسفؒ بھی کہتے ہیں کہ إدام مؤادمة بمعنی موافقة سے مأخوذ ہے۔ لہذا روٹی کے ساتھ جو چیز بھی کھانے میں موافق ہو۔ وہ سب ادم ہے۔ تو گوشت، پیاز اور گڑ وغیرہ ادم میں داخل ہو جائیں گے۔ بہر حال اس قول کا وارد مدار عرف پر ہوگا۔ کہیں کوئی چیز روٹی کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔ وہاں وہ ادم ہوگی۔ دوسری جگہ وہی چیز ادم نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہ صفت اس میں نہیں ہوگی۔

امام ترمذیؒ کا میلان بھی اس قول کی طرف معلوم ہو رہا ہے۔ کیونکہ اس باب میں وہ تمام چیزیں ذکر ہوں گی جن کو آپ ﷺ نے روٹی کی متابعت میں تناول فرمایا ہے۔ مثلاً گوشت، پنیر، روغن زیتون وغیرہ۔ بلکہ کھجور اور کلڑی کا بھی ذکر موجود ہے۔ گویا امام ترمذیؒ کے ہاں جس چیز میں بھی توافق اور جمعیت کا معنی موجود ہو۔ وہ ادم ہے۔ اس باب میں امام ترمذیؒ تینتیس (۳۳) احادیث لارہے ہیں۔

(۱) اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ جو بھی غذا میسر ہوتی تناول فرماتے تھے۔ حافظ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں لکھا ہے کان ہدیہ ﷺ ومیرتہ فی الطعام لا یرد موجوداً ولا یتکلف مفقوداً فما قرب الیہ شی من الطبیات إلا أکله إلا أن تعافہ نفسه فبترکہ من تحریم وماعاب طعاماً قط ان اشتہاء اکلہ والآخر کہ (زاد المعاد ۱/ ۵۳) (مختار)

(۱) حدثنا محمد بن سهل بن عسكر و عبد الله بن عبد الرحمن

قالا ثنا يحيى بن حسان ثنا سليمان بن بلال عن هشام بن عروة عن

أبيه عن عائشة أن رسول الله ﷺ قال نعم الإدم الخَل قال عبد الله

بن عبد الرحمن في حديثه نعم الإدم او الإدم الخَل (۱).

ترجمہ: حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سرکہ اچھا سالن

ہے۔ (ترمذی کے شیخ) عبد اللہ بن عبد الرحمن نے اپنی روایت میں "نعم الإدم او

نعم الإدم" کہا ہے۔

نعم الإدم الخَل یعنی سرکہ بھی بطور ادم استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ دوسرے سالنوں کی طرح

یہ بھی ایک پسندیدہ سالن ہے۔ لہذا جس گھر میں یہ موجود ہے۔ اس گھر والے یہ نہ کہیں کہ گھر میں سالن

نہیں۔ بلکہ سرکہ کو بطور سالن استعمال کریں۔ اور روزانہ مرغن اور تکلفات بھرے سالنوں کی بجائے سرکہ پر

قناعت کریں۔

سرکہ اچھا یا سب سے اچھا: اس تشریح کے مطابق یہاں سرکہ کی افضلیت کا بیان مقصود نہیں۔ بلکہ صرف

اس کی مدح مقصود ہے۔ اور اس مدح سے غرض یا تو ان نادار قسم کے لوگوں کو قناعت کی تعلیم دینا ہے۔ جن کو

صرف سرکہ ہی بطور سالن میسر ہے۔ یا پھر ان لوگوں کی تطلیب خاطر کے لیے حضور ﷺ نے یہ کلمات کہے

ہیں۔ جو کبھی سرکہ بطور ہدیہ پیش کر چکے ہیں۔ تاکہ ان کو ہدیہ کی بے قدری کا احساس نہ ہو۔

نیز یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے جب اپنے گھر میں ادم کی فرمائش کی تو گھر والوں نے صرف

سرکہ کی موجودگی کی خبر دیدی۔ اس پر آپ ﷺ نے گھر والوں کی تسلی اور خاطر داری کیلئے اس پر اکتفاء کی

تلقین فرمائی ہو۔ اس توضیح کے مطابق اب اس اعتراض کا محل باقی نہیں رہتا کہ احادیث مبارکہ میں آتا ہے

کہ آپ ﷺ طعام کی مدح سرائی نہیں کرتے تھے (۲)۔ تو یہاں سرکہ کی مدح کیوں فرمائی ہے۔ جواب یہ

(۱) صحیح مسلم ۱۸۲/۲ کتاب الاشریۃ باب فضیلة الخَل، جامع الترمذی ۶/۲ کتاب الاطعمة

باب ما جاء في الخَل، سنن ابن ماجہ ص ۲۳۶ ابواب الاطعمة باب الاعتدال بالخَل (مختار)

(۲) غیر اَنہ لم یکن یذم ذوا الف ولا یمدحہ (شمائل ترمذی باب کیف کان کلام رسول

اللہ ﷺ). (اصلاح الدین)

ہے کہ طعام کی مدح اشراف اور لالچ کے خوف سے نہیں فرماتے تھے اور اگر کوئی اور مدعا مقصود نظر ہو تو طعام کی مدح کوئی معصیت نہیں ہے۔ جبکہ بعض دیگر شراح کے بقول آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی سرکہ کی دوسرے سالنوں سے افضلیت کو واضح کر رہا ہے۔ اور یہی مقصود ہے کہ سرکہ دیگر ادااموں کی نسبت بہتر سالن ہے۔ سرکہ میں اچھائی کا پہلو یہ ہے کہ دوسری قسم کے سالنوں میں گھی، مصالحہ وغیرہ لوازمات کے ساتھ ساتھ ایک معتد بہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ آگ، برتنوں اور آلات کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ سرکہ تیار سالن ہے۔ بنانے میں محنت نہیں کرنی پڑتی۔ وقت اور پیسہ بھی کم صرف ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں علمائے طب نے سرکہ کے کچھ ایسے فوائد کا ذکر کیا ہے جو اس کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً پیٹ کے کیڑوں کے لیے مفید ہے، زہریلے مواد کو ختم کر دیتا ہے، تیزابیت کو مٹاتا ہے، نیز گرم ہوا اور لو کے معر اثرات کا ازالہ کرتا ہے۔ اس طرح کے بعض دیگر خواص کی وجہ سے مختلف زمانوں میں مختلف انداز سے ڈاکٹروں نے آپ ﷺ کے اس قول کی تائید و تصویب کی ہے۔

علامہ ابن حجرؒ نے اس بات کو رد کیا ہے کہ حدیث شریف سرکہ کی دوسری سالنوں کی نسبت افضلیت پر محمول ہے۔ لیکن ملا علی قاریؒ نے ان پر رد کر کے اس قول کا دفاع کیا ہے (۱)۔ کیونکہ بعض دیگر احادیث بھی سرکہ کی افضلیت کی غماض ہیں۔ مثلاً ایک روایت میں ہے۔ نَعَمِ الْاَدَامُ الْخَلُّ الْلَّهْمُ بَارِكْ فِي الْخَلِّ (۲)۔ سرکہ بہترین سالن ہے۔ اے اللہ اس میں برکت عطا فرما۔ دوسری روایت میں آتا ہے فَإِنَّهُ كَانَ اَدَامُ الْاَنْبِيَاءِ مِنْ قَبْلِي (۳)۔ سرکہ مجھ سے قبل دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کا بھی سالن تھا۔

(۱) قال النووي والصواب الذي ينبغي أن يجزم به أنه مدح للخل نفسه (عون المعبود ۲۱۵/۱۰) (مختار)

(۲) قال الخطابي معنى هذا الكلام مدح الاقتصاد في المأكول ومنع النفس من ملاذ الاطعمة كأنه يقول انتدموا بالخل وما كان في معناه مما تخف مؤونته ولا يعز وجوده ولاننا نقوا في الشهوات فإنها مفسد للدين مقمة للبدن (عون المعبود ۲۱۵/۱۰) فقهاء کرام نے یہاں سے ایک مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ اگر کوئی شخص قسم کھائے کہ وہ سالن نہیں کھائے گا۔ پھر اس نے سرکہ کے ساتھ روٹی کھالی۔ تو اب یہ شخص حائث ہوگا۔ کیونکہ حدیث پاک میں سرکہ کو سالن کہا گیا ہے۔ (مختار)

(۳) جمع الوسائل ص ۲۴۶

نعم الا ادم او الادم. اؤم بضم الدال ادم کی جمع ہے۔ تو اس روایت میں اس لفظ کو مفرد اور جمع دونوں طرح روایت کیا گیا ہے۔ جبکہ اؤم سکون دال کے ساتھ مفرد اور ادم کا ہم معنی لفظ ہے۔ لیکن ادم صرف مفرد ہے (۱)۔

(۲) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ أَبِي الْأَحْوَصِ عَنْ سَمَاقٍ بْنِ حَرْبٍ قَالَ

سَمِعْتُ النُّعْمَانَ بْنَ بَشِيرٍ يَقُولُ أَلَسْتُ فِي طَعَامٍ وَشَرَابٍ مَا شَتَمْتُ لَقَدْ

رَأَيْتُ نَبِيَكُمْ وَمَا يَجِدُ مِنَ الدَّقْلِ مَا يَمْلَأُ بَطْنَهُ (۳)۔

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیر کہتے ہیں کہ کیا تم طعام و شراب کی خاطر خواہ نعمتوں

میں نہیں ہو۔ حالانکہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا تھا۔ کہ ان کے پاس ردی قسم کی

کھجوریں بھی اتنی مقدار میں نہیں ہوتی تھیں جس سے آپ ﷺ اپنا پیٹ بھر سکیں۔

نعمان بن بشیر انصاری خرزجی صحابی ہیں۔ والدین بھی صحابیت کا شرف پا چکے ہیں۔ ابو

عبداللہ کنیت تھی۔ یزید کے زمانہ میں حمص کے والی تھے۔ شعر و شاعری کا ذوق بھی تھا۔ ۶۴ھ کے آخر میں

جب مروان نے حکومت کے حصول کے لئے ضحاک فہری سے جنگ لڑی۔ تو آپ ضحاک کی امداد کے لیے

حمص سے نکلے۔ اور ضحاک فہری کی طرح آپ کو بھی مروان کے ساتھیوں نے قتل کیا۔

السُّتَمُ فِي طَعَامٍ وَشَرَابٍ الْخ (۳) یعنی کیا آج تم مزوں میں نہیں ہو کہ جو دل چاہے وہی

کھانے کو ملے۔ تمہارے پیغمبر ﷺ کو پیٹ بھر کر کھانے کیلئے ردی کھجور بھی نہیں ملتی تھی۔ یہ بات شاید آپ

نے اپنی ولایت کے زمانہ میں اپنے مصاحب صحابہ یا تابعین کو تحدیث بالحمۃ اور تذکیر بالاء اللہ کے طور پر

کہی ہوگی۔

(۱) الا ادم کل موافق وملائم جمعه اَدمُ اُدمُ والَادمُ ما یؤتلم بہ (متجد) (اصلاح الدین)

(۲) صحیح مسلم ۳۰۱/۲ کتاب الزہد والرفاق، جامع الترمذی ۶۲/۲ کتاب الزہد باب ما جاء

فی معیشتہ اصحاب النبی ﷺ، سنن ابن ماجہ ص ۶۰۶ باب معیشتہ آل محمد ﷺ (مختار)

(۳) علامہ بخاری نے لکھا ہے اَی السُّتَمُ مَنَعَمِینَ فِی طَعَامٍ وَشَرَابٍ بِالْمَقْدَارِ الَّذِی شَتَمَ مِنَ السَّعَةِ

وَالْإِفْرَاطِ وَالْخَطَابِ لِلتَّابِعِینَ أَوْ لِلصَّحْبَةِ بَعْدَهُ ﷺ وَالْإِسْتِفْهَامُ لِلتَّكَارُ وَالْتَّوْبِیْخِ وَالْقَصْدُ بِهِ الْحَقُّ

عَلَى الْإِقْصَارِ فِی الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ عَلَى أَقْلٍ مَا یُکْفِی کَمَا کَانَ ذَلِکَ شِعَارَ الْمُصْطَفَی (المواهب

اللذنیہ ص ۱۰۵) (مختار)

دقل ردی قسم کی کھجور کو کہتے ہیں جب کھجوروں کے ڈھیر سے اوپر کی اچھی کھجوریں چن کر اٹھالی جائیں اور اخیر میں سوکھی، چھوٹی، اور بیکار قسم کی کھجوریں رہ جائیں۔ ان کو قتل کہا جاتا ہے۔

ترجمۃ الباب کے ساتھ اس حدیث کی مطابقت یہ ہے کہ ہر وقت یہ لازم نہیں کہ سالن اور دیگر تکلفات تک رسائی ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کچھ دیا ہو تو روٹی کے ساتھ کھالو، نہیں تو سوکھی روٹی پر گزارہ کر لینا۔ جیسا کہ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کے عمل کو بیان کر کے شکر و قناعت کی تلقین کی گئی ہے۔ ہر وقت سالن وغیرہ کا تقاضا حضور ﷺ کی سنت کے خلاف ہے۔

(۳) حَدَّثَنَا عَبْدَةُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ الْخَزَاعِيُّ ثَنَا معاوية بن هشام عن

سفين بن محارب بن دثار عن جابر بن عبد الله قال قال رسول الله ﷺ نعم الإدام الخل (۱)۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ سرکہ اچھا سالن ہے۔

نعم الإدام الخل طہی خواص، آسانی کے ساتھ تیار، وقت اور اخراجات کی بچت کے اعتبار سے سرکہ کو اچھا سالن شمار کیا گیا ہے۔ حدیث کی مزید تشریح گزر چکی ہے۔

(۴) حَدَّثَنَا هناد ثنا وكيع عن سفين عن أيوب عن أبي قلابة عن

زهدم الجرمي قال كنا عند أبي موسى فأتى بلحم دجاج فتنحنأ رجل

من القوم فقال مالك قال اني رأيتها تاكل شيئا نتنا فحلفت ان لا

أكلها قال ادن فأتى رأيت رسول الله ﷺ يأكل لحم دجاج (۲)۔

(۱) جامع الترمذی ۶/۲ کتاب الاطعمة باب ما جاء في الخل، سنن ابن ماجہ ص ۲۳۸ کتاب

الاطعمة باب الاعتماد بالخل، سنن ابی داؤد ۴/۲۹۱ کتاب الاطعمة باب في الخل، (مختار)

قال البيهقوري وهذا حديث مشهور كاد ان يكون متواترا (المواهب اللدنية ص ۱۰۵) هكذا في

جمع الرسائل ۲/۲۳۷ (مختار)

(۲) صحيح مسلم ۴/۲۶۱ کتاب الايمان باب نذب من حلف يمينا الخ، جامع ترمذی ۲/۲۳۶

کتاب الاطعمة باب ما جاء في اكل الدجاج،

ترجمہ: حضرت زہدؑم کہتے ہیں کہ ہم حضرت موسیٰ اشعریؑ کے پاس تھے کہ (کھانے میں) مرغی کا گوشت لایا گیا۔ حاضر لوگوں میں سے ایک شخص کھانا چھوڑ کر ہٹ گیا۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے (کھانا چھوڑ دیا)۔ اس شخص نے عرض کیا کہ میں نے مرغی کو کوئی (گندی) چیز کھاتے دیکھا تھا۔ پس میں نے قسم کھائی ہے کہ مرغی کا گوشت نہیں کھاؤں گا۔ حضرت ابو موسیٰؑ نے فرمایا۔ قریب آؤ (اور کھاؤ) کیونکہ میں نے نبی کریم ﷺ کو مرغی کا گوشت کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔

ابو موسیٰؑ اور زہدؑم: ابو موسیٰؑ زہدؑم بن منصور کا تعلق جرم قبیلہ سے ہے۔ زہدؑم اکرم کے وزن پر اور جرم کا جیم مفتوح اور راء ساکن ہے۔ بصری ثقہ تابعی ہیں۔

ابو موسیٰؑ اشعریؑ بڑے صحابہ میں سے ہے۔ نام عبد اللہ بن قیس ہے۔ یمن کے اشعر قبیلہ سے تعلق ہے۔ جو حسن صورت میں مشہور ہے۔ مکہ میں اسلام کے بعد حبشہ کو ہجرت کی۔ اور فتح خیبر کے موقعہ پر اصحاب السفینہ کے ساتھ واپس تشریف لائے۔ ۲۱ھ میں بصرہ کے گورنر مقرر ہوئے۔ اور ابواز کا علاقہ آپ کی ولایت کے دوران فتح ہوا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں بصرہ کی ولایت سے معزول کئے گئے۔ اور کوفہ کے والی مقرر ہوئے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حکومت سے گوشہ نشینی اختیار کی۔ اور مکہ آکر مستقل رہائش اختیار کی۔ ذی الحجہ ۴۴ھ میں وفات پائی (شذرات الذهب) جبکہ ملا علی قاریؒ نے تاریخ وفات ۵۲ھ لکھی ہے (مرقات ج ۱ ص ۷۸)

کنا عند ابی موسیٰ الاشعری الخ یہ واقعہ بظاہر حکمرانی کے زمانہ کا ہے۔ جب آپؐ کے پاس عموما مہمان آیا کرتے تھے۔ فاسی بلحم دجاج کے دال پر تینوں حرکات پڑھنا جائز ہے۔ لیکن فتح الفصح ہے۔ دجاجہ کی جمع ہے یعنی دسترخوان پر مرغی کا گوشت بھی رکھا گیا۔ جسے دیکھ کر بنو تیم اللہ کے آدمی (۲) نے اس سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور حضرت ابو موسیٰؑ کے استفسار پر یہ عذر پیش کیا کہ میں نے ایک بار (۱) علامہ مناویؒ نے لکھا ہے وفيه مشروعية اجتماع القوم عند صديقهم (المناوی علی هامش جمع الوسائل ۱/ ۴۴۸) (مختار)

(۲) بعض شراح نے یہاں ذکر ہونے والے شخص کو زہدؑم ہی قرار دیا ہے۔ لیکن اکثر شراح نے اس پر رد کیا ہے۔ کیونکہ آنے والی دوسری روایت میں زہدؑم نے اس شخص کا نسب اور طبع بیان کیا ہے۔ اگر وہ زہدؑم ہوتا تو اس بیان کی گنجائش نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے باوجود علامہ ابن حجرؒ اور علامہ عینیؒ نے بوجہ اس پر اصرار کیا ہے۔ یہ کہ زہدؑم جریمی ہی ہیں۔ (اصلاح الدین)

مرغ کو دیکھا تھا کہ وہ گندی و ناپاک چیزیں کھا رہا تھا۔ اس روز سے قسم کھا چکا ہوں۔ کہ مرغ کا گوشت نہیں کھاؤں گا۔ گویا کہ طبعی کراہت (۱) کا عذر پیش کیا۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ میزبان اگر دیکھے کہ مہمان کھانا نہیں کھاتا تو اس کا سبب دریافت کرے تاکہ کوئی ظاہری سبب ہو۔ تو اس کا ازالہ کرے۔ فقال ادن الخ حضرت ابو موسیٰؓ نے نبی کریم ﷺ کے عمل کا حوالہ دیتے ہوئے گوشت کھانے کی دوبارہ دعوت دیدی کہ جب نبی کریم ﷺ نے تناول فرمایا ہے تو تم نے اپنے آپ پر اسے کیوں حرام کیا ہے۔ قرآن مجید میں ایسے ہی موقع کے لیے تمہیں ارشاد ہے لم تحرم ما رحل الله لك (الایۃ) یعنی وہ چیزیں خود پر تم کیوں حرام کرتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے حلال کر دی ہیں۔

مباح شرعی کو ضروری نہیں کہ تم استعمال کرو۔ لیکن اس کے ساتھ تحریم کا معاملہ کرنا خلاف شرع ہے۔ بلکہ حلال چیزوں سے قسم کھانے کے بعد شرعی حکم یہی ہے کہ قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دینا چاہیے (۲)۔ یہاں بھی صحابی نے اپنے ساتھی کو قسم توڑنے کا مشورہ دیا ہے۔ اور اس کا کفارہ بھی وہ یقیناً دے چکے ہونگے۔

اس حدیث میں ترجمۃ الباب سے تعلق اس بات میں ہے کہ راوی کے قول کے مطابق نبی کریم ﷺ نے مرغی کا سالن اور گوشت بھی تناول فرمایا ہے۔ مرغی کا گوشت اور سالن بہت مفید ہے۔ علماء طب نے بھی اس کے متعدد فوائد لکھے ہیں۔ اس میں رطوبت کے ساتھ حرارت بھی ہے۔ زود ہضم ہے۔ تازہ خون کی افزائش کرتا ہے۔ اخلاط کی اصلاح کرتا ہے۔ دماغ کو فائدہ دیتا ہے۔ اعضاء ریئہ اور عقل کو بھی تقویت دیتا ہے۔ نیرقوت باہ کے لیے بھی مفید ہے۔ آواز کو صاف اور رنگ کو حسن و جلا بخشتا ہے۔

لیکن نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ مرغ نہیں کھایا۔ بلکہ یہ تو کسی خاص موقع کا ذکر ہے۔ محض اتفاق (۱) بعض شراح نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مذکور شخص نے شرعی عذر یعنی جلالہ سمجھ کر مرغی کھانے سے قسم کھائی تھی لیکن ملائی قاری وغیرہ نے اس پر رد کیا ہے (راجع جمع الوسائل ج ۱ ص ۲۳۸) (اصلاح الدین)

(۲) عن عبدالرحمان بن سمرہ قال قال رسول الله ﷺ اذا حلقت علی یمنین لرایت غیرہا خیرا منها فکفر عن یمینک و آت الذی ہو خیر (مشکوٰۃ ۲ / ۲۹۶) (مختار)

سے یا کسی دعوت میں پیش کیا گیا تھا۔ اور آپ ﷺ نے بطور سالن استعمال فرمایا تھا (۱)۔

(۵) حدثنا الفضل بن سهل الأعرج البغدادي ثنا إبراهيم ابن

عبد الرحمن بن مهدي عن إبراهيم بن عمر بن سفينة عن أبيه عن جده

قال اكلت مع رسول الله ﷺ لحم حبارى (۲)۔

ترجمہ: حضرت سفینہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ حباری کا

گوشت کھایا ہے۔

حضرت سفینہؓ: عن جده ابراہیمؓ کے دادا کا نام حضرت سفینہؓ ہے جو حدیث کے راوی اور حلیل القدر صحابی

ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اصل نام مہران یا کچھ اور تھا۔ ابو عبد الرحمن کنیت تھی۔ ایک سفر

میں بہت سے لوگوں کا سامان اٹھا کر لے جا رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ کی نظر پڑ گئی۔ اس پر آپ ﷺ نے

فرمایا ”انت سفینہ“ تم تو کشتی بنے ہو۔ اس کے بعد یہ لقب پڑ گیا۔ یہ ہ کے بعد وفات پائی۔

لحم حباری۔ حباری کے بہت سے مصداق بتائے جاتے ہیں۔ اس کا اطلاق تیترا، چکور وغیرہ کے

اقسام اور نوع پر ہوتا ہے۔ جیسے فاخہ، قمری اور کبوتر وغیرہ قسم کے پرندوں پر حمامہ کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس وجہ

سے حباری کی مصداق کی تعیین میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ اس کے مختلف معنی لئے گئے ہیں۔

(۱) البتہ وہ مرغی جو جلالہ ہو یعنی نجاست کھانے کی عادی ہو اس کے گوشت کے بارے میں علامہ خطابی نے لکھا ہے

واختلف الناس في أكل لحوم الجلالة والبيانها فذكره ذلك أصحاب الرأي والشافعي وأحمد ابن

حنبل وقالوا لا يؤكل حتى تحبس أياماً وتعلف علفاً غير هالفاً ذاطاب لحمها فلا بأس بأكله وقدرى

في حديث أن البقر تعلف أربعين يوماً ثم يؤكل لحمها وكان ابن عمر يقول نجس الدجاجة ثلاثة أيام

ثم تذبح وقال إسحق بن راهوية لا بأس أن يؤكل لحمها بعد أن يغسل غسل جيداً وكان الحسن

البصري لا يرى بأساً بأكل لحوم الجلالة وكذلك قال مالك بن أنس انتهى وقال ابن رسلان في

شرح السنن وليس للحبس مدة مقلدة وعن بعضهم في الإبل والبقر أربعين يوماً وفي الغنم سبعة أيام

وفي الدجاجة ثلاثة أهـ (عون المعبود شرح ابی داؤد ۱۰/۱۸۵) (مختار)

(۲) سنن ابی داؤد ۲/۱۷۶ کتاب الأطعمة باب أكل لحم الحبارى، جامع ترمذی ۲/۲ کتاب

الأطعمة باب ما جاء في أكل الحبارى وشرح السنة للبغوی ۱/۲۵۱، کتاب الصيد باب أكل

الدجاج والحبارى (مختار)

چکور، تیر، سرخاب، تھذری اور تلور وغیرہ اس میں داخل ہیں۔ لغت والوں میں صاحب منجد کہتے ہیں۔ کہ ”جباری پالتو مرغی سے قدرے بڑے لمبی گردن والا پرندہ ہے۔ حماقت کی وجہ سے مشہور ہے۔ ایک جگہ اٹھ دے کر جب وہاں سے چلا جاتا ہے۔ تو واپسی میں اپنا گھونسل بھول جاتا ہے اور کسی دوسرے جباری کے اٹھوں پر بیٹھ کر اسے سینے سے لگاتا ہے۔ اس کی متعدد قسمیں ہیں“

بعض لوگوں کے بقول یہ ایک خاک کی رنگ کا صحرائی پرندہ ہے۔ تیز رفتاری سے اڑتا ہے۔ اور بہت تیز دوڑتا ہے۔ خوراک کے حصول کے لیے بہت دور دور کا سفر بھی روزانہ کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر اس کے پر نکال لیے جائیں تو یہ شدت غم سے مرجاتا ہے اس کے پوٹے یا معدے میں ایک قسم کا پتھر بھی ملتا ہے۔ اگر وہ پتھر اس شخص کے گلے یا ہاتھ پر باندھ دیا جائے جسے کثرت احتلام کا عارضہ ہو تو احتلام نہیں ہوگا۔ اور اگر اسہال کی شکایت ہو تو دست بند ہو جاتے ہیں۔ اس کا گوشت گرم اور دیر سے ہضم ہونے والا ہے۔ محنت کش لوگوں کے لیے اس کا کھانا مناسب ہے۔ علامہ دمیریؒ نے حیوة الحیوان میں اس پر مزید بحث کی ہے آج کل کے عرف میں اس کا غالب استعمال تلور (۱) پر ہوتا ہے۔

(۶) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ حَجْرٍ ثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ عَنْ أَيُّوبَ عَنْ

الْقَاسِمِ التِّيمِيِّ عَنْ زُهْدِمِ الْجَرْمِيِّ قَالَ كُنَّا عِنْدَ أَبِي مُوسَى قَالَ فَقَدِمَ

طَعَامُهُ وَقَدِمَ فِي طَعَامِهِ لَحْمٌ دَجَاجٌ وَفِي الْقَوْمِ رَجُلٌ مِنْ بَنِي تَيْمِ اللَّهِ

أَحْمَرُ كَأَنَّهُ مَوْلَى قَالَ فَلَمْ يَدْنِ فَقَالَ لَهُ أَبُو مُوسَى ادْنِ فَإِنِّي قَدْ رَأَيْتُ

رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَكَلَ مِنْهُ قَالَ أَنَّى رَأَيْتَهُ يَا كَلَّ شَيْثًا فَقَضَرْتَهُ فَحَلَفْتُ أَنْ

لَا أَطْعَمُهُ أَبَدًا (۲)۔

ترجمہ: حضرت زہدم جرمیؒ کہتے ہیں کہ ہم حضرت ابو موسیٰؓ کے پاس تھے کہ ان کا

کھانا حاضر کیا گیا۔ کھانے میں مرغی کا گوشت بھی پیش کیا گیا۔ حاضرین میں بنو تیم

(۱) تلور کو پشتو زبان میں ”چاڑے“ کہتے ہیں۔ راقم الحروف نے اسے شکار بھی کیا ہے اور اس کا گوشت بھی کھایا ہے۔

(اصلاح الدین)

(۲) صحیح مسلم ۴/۲ کتاب الایمان باب ندب من حلف یمنی الخ، جامع ترمذی ۲/۲۳۱

ابواب الاطعمة باب ما جاء في أكل الدجاج (مختار)

اللہ کا ایک شخص بھی تھا۔ جس کا رنگ سرخ تھا۔ گویا وہ کوئی عجیب غلام ہو۔ وہ کھانے کے قریب نہ آیا۔ تو ابو موسیٰ نے اسے کہا کہ قریب آؤ۔ میں نے خود نبی کریم ﷺ کو اس کا گوشت کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس شخص نے کہا کہ میں نے تو مرغی کو ایک گندی چیز کھاتے دیکھا تھا۔ جس کی وجہ سے مجھے اس سے گھن آنے لگی۔ پس میں نے قسم کھائی کہ میں کبھی بھی اس کا گوشت نہیں چھکوں گا۔

وفی القوم رجل من بنی نعیم النخ وہ شخص جس کا بہم ذکر پچھلی حدیث میں ہو چکا ہے۔ یہاں پر اس عنوان سے مذکور ہے کہ وہ بنی تیم اللہ سے تھا۔ بنو تیم جو بنو بکر کا ایک بڑا قبیلہ ہے۔ مطلق مذکور ہے۔ لیکن یہاں بنو تیم اللہ مراد ہے۔ جو بنو تیم کی ایک شاخ ہے۔ أحمر کائنہ مولیٰ گویا کہ وہ موالیٰ میں سے تھا۔ اس کی رنگت رومی غلاموں جیسی سرخ تھی۔ باقی یہ وہی حدیث ہے جس میں حضرت ابو موسیٰ اشعرمی کی مجلس کا واقعہ بیان ہوا تھا۔ قلندرنہ یعنی مجھے اس سے گھن اور کراہت آنے لگی۔

(۷) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ غِيلَانَ ثنا أَبُو أَحْمَدَ الزَّهَبِيُّ وَأَبُو نَعِيمٍ قَالَ
ثَنَا سَفْيَانُ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عِيسَى عَنْ رَجُلٍ مِنْ أَهْلِ الشَّامِ يَقَالُ لَهُ عَطَاءٌ
عَنْ أَبِي أُسَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كُلُوا الزَّيْتِ وَادَّهِنُوا بِهِ فَانَّهُ مِنْ
شَجَرَةِ مَبَارَكَةٍ (۱)۔

ترجمہ: حضرت ابو اسیدؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ روغن زیتون کھایا کرو۔ اور اس سے مالش بھی کیا کرو۔ کیونکہ یہ مبارک درخت سے نکلا ہوا تیل ہے۔

ابو اسیدؓ عبد اللہ بن ثابتؓ کی کنیت ہے۔ جو انصاری صحابی ہیں۔ مدینہ میں رہے ہیں۔ صرف یہی ایک حدیث ان سے مروی ہے۔ واضح رہے کہ ابی اسید الساعدیؓ ایک اور صحابی ہیں جو ان کی نسبت قدرے مشہور ہیں۔

(۱) جامع ترمذی ۲/۶ کتاب الأطعمة باب ما جاء في أكل الزيت، السنن الكبرى للنسائي ۳/۱۶۳

کتاب الولیمة ابواب الأطعمة باب الزيت، دارمی ۲/۱۰۲ (مختار)

زیتون کے فضائل: کلو الزیت الخ روغن زیتون کھایا کرو۔ چونکہ روغن زیتون مانع چیز ہے۔ کھایا نہیں جاتا۔ لہذا یہاں پر مراد یہ ہے کہ اسے روٹی کے ساتھ ادا م پتا کر کھاؤ۔ اس طرح حدیث کی ترجمہ الباب کے ساتھ مطابقت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ آپ ﷺ نے خود بھی روغن زیتون کا اسی طرح استعمال کیا ہوگا۔

لأنه من شجرة مباركة الخ ایک اور روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ لأنه شفاء من سبعين داء منها الجزام گویا یہ طبعی فوائد کے لحاظ سے مفید ہے۔ نیز وہ زمین بھی ارض انبیاء اور مبارک زمین ہے جہاں زیتون زیادہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ تخرج من طور سيناء تنبت بالدهن زیتون کا درخت سینا کے کوہ طور میں اگتا ہے۔ اور تیل دیتا ہے۔

بلکہ اس درخت کے مبارک ہونے کی تصریح کی ہے۔ من شجرة مباركة لا شرقية ولا غربية کہ وہ تیل ایک بائیں درخت کا ہے۔ جو نہ مشرق کی جانب ہے اور نہ مغرب کی جانب (۱)۔

بہر حال اس درخت میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی برکتیں ڈالی ہیں۔ تمام قدیم و جدید اطباء بھی اس کی افادیت پر متفق ہیں۔ یورپی ممالک میں بھی بڑے اہتمام سے زیتون کا تیل تیار ہوتا ہے اور ڈبوں میں بند کیا جاتا ہے۔ بہت سی بیماریوں میں بھی مفید ہے۔ مغرب کے لوگ صبح کے وقت اسے بطور ناشتہ کھاتے ہیں جو وہاں بند ڈبوں میں ملتا ہے۔ الغرض یہ کھانے کے کام بھی آتا ہے۔ بطور علاج بھی مستعمل ہے۔ اس کی لکڑی سے دباغت کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس سے حاصل شدہ راکھریشم صاف کرنے کے کام آتا ہے۔ اس کے ساتھ کچا ریشم دھویا جاتا ہے۔ اس کے بعض درختوں کی عمر ہزار برس تک ہوتی ہے۔ ابتداء چالیس سال کے بعد اس میں پھل لگتا ہے۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے تفسیر فتح العزیز میں ”نہین و زیتون“ کے عجیب و غریب خصائص بیان فرمائے ہیں۔ انہی کثیر منافع کی وجہ سے اسے شجرہ مبارکہ کہا جاتا ہے۔ علامہ قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سمیت ستر (۷۰) انبیاء کرام علیہم السلام نے اس درخت کیلئے برکت کی دعا فرمائی ہے۔

(۱) زیتون کے بارہ میں زیادہ تفصیل حضرت مولانا مدظلہ کے کتاب ”اسلام کا نظام اکل و شرب“ شرح ترمذی باب ۱۰۰ الاطعمة والاشربة میں دیکھیں۔ (مختار)

کہا جاتا ہے کہ سانپ عموماً سردی کے موسم میں اندھا ہو جاتا ہے۔ سردی کا موسم گزرنے کے بعد وہ نکلتا ہے تو انجیر یا زیتون کے کسی درخت کے ساتھ آنکھیں مل لیتا ہے۔ جس سے اسکی بینائی عود کر آتی ہے۔ شرح کے بقول زمین پر ابتدائے وجود سے اور پھر طوفان نوح کے بعد پہلے اگنے والا درخت بھی زیتون کا تھا۔

(۸) حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ مُوسَى، ثَنَا عَبْدِ الرَّزَّاقِ ثَنَا مُعَمَّرٌ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ أَبِيهِ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كُلُوا الزَّيْتُ وَادَّهِنُوا بِهِ فَإِنَّهُ مِنْ شَجَرَةٍ مَبَارَكَةٍ (۱) قَالَ أَبُو عِيسَى وَكَانَ عَبْدِ الرَّزَّاقِ يَضْطَرِبُ فِي هَذَا الْحَدِيثِ فَرُبَّمَا اسنده و رُبَّمَا ارسله.

ترجمہ: حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ روغن زیتون کھاؤ۔ اور اس سے مالش بھی کرو کیونکہ یہ مبارک درخت سے نکلتا ہے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ عبدالرزاقؒ اس حدیث کو اضطراب کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ وہ یہ کہ کبھی (حضرت عمرؓ کا ذکر کر کے) اسے مسند بیان کرتے اور کبھی (ان کے ذکر کے بغیر) اسے مرسل لاتے تھے۔

حضرت عمر فاروق اعظمؓ کی شان: عن عمرو امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کے والد کا نام خطاب اور لقب فاروق تھا۔ عدوی قریشی صحابی ہیں۔ ابو حفص کنیت تھی۔ حضور ﷺ نے دعا کی تھی کہ عمرو بن ہشام (ابو جہل) اور عمر بن الخطابؓ میں سے کسی ایک کو اسلام نصیب ہو۔ یہ دعا آپؐ کے حق میں قبول ہوئی۔ اور ۱۰ نبوی اور ایک روایت کے مطابق نبوت کے چھٹے سال آپؐ اسلام لائے۔ آپؐ سے قبل ۳۳ مرد اور چھ عورتیں اسلام لائیں تھیں۔ آپؐ چالیسویں مسلمان ٹہرے اور پھر یہ آیت نازل ہوئی یا ایہا النبی حسبک اللہ و من اتبعک من المؤمنین (الایۃ) بعض مؤرخین نے آپؐ سے قبل اسلام لانے والوں کی تعداد زیادہ ذکر کی ہے۔ حضرت حمزہؓ بھی آپؐ سے تین دن قبل اسلام لائے تھے۔ وہ بھی

(۱) جامع ترمذی ۶/۲ کتاب الاطعمۃ باب ما جاء فی اکل الزیت، سنن ابن ماجہ ص ۲۳۸ کتاب

حضرت عمرؓ کی طرح شجاعت میں مشہور تھے۔ اور جب آپؐ بھی اسلام سے مشرف ہوئے تو نبی کریم ﷺ بہت خوش ہوئے۔ ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بے پناہ قوت اور حوصلہ ملا۔ اسی روز نبی کریم ﷺ حضرت عمرؓ کے مطالبہ پر ان کے اور حضرت حمزہؓ کی معیت میں مسجد حرام تشریف لے گئے۔ قریش نے دونوں کی مصاحبت دیکھی تو ان کو بہت دکھ ہوا۔ اور نبی کریم ﷺ نے اسی روز آپؐ کو فاروق کے لقب سے نوازا۔ آپؐ کے اسلام لانے کا واقعہ عجیب لیکن مشہور ہے۔ اسلام لانے کے بعد ہر موقع پر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش پیش رہے۔ مدینہ طیبہ کو ہجرت کرتے وقت اعلانیہ نکلے اور قریش کو لکار کر ہجرت کی۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے وفات سے پہلے آپؐ کا نام لکھوا کر حضرت عثمانؓ کے ہاتھوں لوگوں سے ان کے لیے بیعت لی۔ اور اس طرح صدیق اکبرؓ کے بعد آپؐ بالاتفاق خلیفہ مقرر ہوئے۔ سب سے پہلے امیر المؤمنین کا لقب بھی آپؐ کو ملا۔ تقریباً ساڑھے دس سال تک یہ خدمت انجام دی۔ اور اپنے رعب، تدبیر، سیاسی بصیرت اور اصلہ رائے سے اسلام کی اشاعت اور اسلامی حکومت کی توسیع میں پیش بہا خدمات انجام دیں۔ آپؐ کے مناقب کے احاطہ کے لیے کتابیں چاہئیں۔ کل ۹۳۵ اور ایک قول کے مطابق ۵۳۷ احادیث کی روایت آپؐ کے واسطے سے ہوئی۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے مجوسی غلام ابو بلولہؓ نے آپؐ کو اس خراج میں تخفیف کی فرمائش کی جو وہ حضرت مغیرہؓ کو ادا کیا کرتا تھا۔ آپؐ نے اس کے مطالبہ کو نامستقول کہہ کر بھی حضرت مغیرہؓ سے اس کی سفارش کر دی۔ مگر ابو بلولہؓ مطمئن نہ ہوا اور ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ کو اس کبخت نے صبح کی نماز میں آپؐ پر خنجر سے حملہ کر دیا جس سے آپؐ شدید زخمی ہوئے اور انہی زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے بعد میں آپؐ نے شہادت پائی۔

كلوا الزيت واذنوا به اس کی تفصیل گزشتہ حدیث میں گزر چکی ہے۔ بضرب فیہ عبد الرزاق النخ یعنی عبد الرزاق سے اس روایت میں اضطراب پایا جاتا ہے۔ جو یہ ہے کہ ”ربما اسندہ و ربما ارسلہ“ یعنی سند میں کبھی حضرت عمرؓ کا ذکر کرتے ہیں اور کبھی چھوڑ دیتے ہیں۔

حدثنا السنجی النخ پہلے جس اضطراب کا بیان ہوا۔ اسی کی وضاحت ہے کہ ایک سند کے ساتھ عبد الرزاق نے اس حدیث کو حضرت عمرؓ کے ذکر کے بغیر روایت کیا ہے۔

کدو کی محبوبیت

(۹) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ وَ عَبْدِ الرَّحْمَنِ ابْنُ مَهْدِيٍّ قَالِ ثَنَا شُعْبَةُ عَنْ قَنَادَةَ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَعْجِبُهُ الدَّبَاءُ فَاتَى بِطَعَامٍ أَوْ دَعَى لَهُ فَجَعَلَتْ اتَّبَعَهُ فَاضْعَهُ بَيْنَ يَدَيْهِ لَعَا أَعْلَمَ أَنَّهُ يَحِبُّهُ (۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کو کدو بہت پسند تھا۔ ایک دفعہ آپ ﷺ کے سامنے کھانا پیش کیا گیا یا (راوی نے یہ کہا کہ) آپ ﷺ کسی دعوت پر بلائے گئے۔ (کھانے میں کدو بھی تھا) میں کدو کے قتلے ڈھونڈ کر نبی کریم ﷺ کے سامنے رکھنے لگا۔ کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ آپ ﷺ کدو پسند کرتے ہیں۔

یعجبہ الدباء دباء دال کے ضمہ اور باء مشدودہ کے بعد الف مددودہ کے ساتھ کدو کو کہتے ہیں۔ اسے عربی زبان میں قرع اور قطین بھی کہا جاتا ہے۔ آخر کا ہمزہ بعض لوگوں کے نزدیک اصلی، بعض کے ہاں زائدہ اور بعض کے خیال میں واو سے بدل کر آیا ہے۔

فجعلت اتبعہ یعنی آپ ﷺ کی پسند کا لحاظ کرتے ہوئے میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر کدو کے ٹکڑے نکالتا۔ اور خدمت اقدس میں پیش کرتا رہا۔

اس حدیث سے چند اہم باتیں مستنبط ہو رہی ہیں۔ اول: یہ کہ کدو کا سالن شوربے کی قسم کا تھا۔ اور اسلامی تعلیمات کے مطابق سالن میں پانی زیادہ ڈالنا مستحب ہے۔ تاکہ پڑوسیوں اور دیگر اصحاب ضرورت کا حصہ بھی ہو سکے۔ دوم: یہ کہ کھانا اکٹھا کھانا مستحب ہے۔ جس طرح کہ یہاں معلوم رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ کھانے میں متعدد افراد شریک تھے۔ سوم: یہ کہ شیخ و مرشد اور استاد و بزرگ کی عزت و اکرام کے لئے ایثار کر کے اس کی پسندیدہ چیز اسے کھانے دی جائے۔ اور اس کے ساتھ عقیدت و محبت کا

(۱) دارمی ۱۰۱/۲، شرح السنۃ للبقوی ۳۰۵/۱۱، کتاب الاطعمۃ، جامع الترمذی ۶/۲ ابواب

مظاہرہ کرنا چاہیے۔ چہارم: یہ کہ نبی کریم ﷺ کو کدو بہت پسند تھا۔ اور یہ بات بہت اہم ہے جو اس حدیث سے بخوبی ظاہر ہو رہی ہے۔

کدو سے آپ ﷺ کی محبت کی ایک وجہ تو اس میں موجود بہت سے طبی فوائد ہیں۔ چنانچہ بقول اطباء اس میں بروقت ہے اور عقل اور دماغی قوتوں میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ علاوہ ازیں کدو کا پودا ہی پودا ہے جس نے حضرت یونس علیہ السلام کو اس وقت گرمی اور سردی سے بچانے کے لیے اپنی آغوش میں جگہ دی۔ جب پہلے پہل مچھلی کے پیٹ سے آپ نکلے۔ گویا کہ وہ حضرت یونس کی ماں کے مرتبہ میں ہے۔ اور یونس اور آپ ﷺ میں اخوت کا رشتہ ہے۔ انہی وجوہ کی بناء پر نبی کریم ﷺ نے کدو کو بنظر محبت دیکھا تھا۔

محبوب کی ہر ادا سے محبت: پھر جن لوگوں کا نبی کریم ﷺ سے عشق کا تعلق ہے وہ لوگ بھی ہر دور میں کدو سے ایک محبوب جیسا معاملہ کرتے ہیں۔ خود حضرت انسؓ جب بصرہ میں مقیم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑی جائیداد باغات اور زمینیں دی تھیں۔ آپ کدو بڑے اہتمام کے ساتھ کاشت کرتے تھے۔ اور پھر کدو کے پودے کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کیا کرتے تھے۔

بالک من شجرة ما احبک الیٰی لحب رسول اللہ ﷺ ایاک (۱)۔

ترجمہ: اے پودے تو نبی کریم ﷺ کی محبوبیت کی وجہ سے مجھے کتنا عزیز ہے۔

یہ اتباع سنت، عشق نبوی ﷺ اور حقیقی محبت کی دنیا ہے۔ عقل و خرد کے دعویدار تو علامات، یادگاروں اور نسبتوں کے قائل نہیں۔ لیکن یہ خشک مزاج اور قشر پرست فلسفی کیا جانیں کہ عشق کیا ہوتا ہے۔ اور محبوب کی طرف منسوب حقیر ترین چیز بھی عاشق کو کیوں عزیز ہوتی ہے۔ مجنون لیلیٰ کی گلی میں کتے کے پاؤں کو چومتا ہے اور فرہاد کو دودھ کی نہر نکالنے کی کیوں سوچ بھی۔ ع

عاشقانِ راندہ ب و ملت جداست

کدو کی تحقیر کی سزا: ہارون الرشید بڑے جاہ و جلال کے بادشاہ تھے۔ کسی نے دربار میں ایک

حدیث پیش کی کہ نبی کریم ﷺ کو کدو بہت پسند تھا۔ درباریوں میں سے ایک بددماغ نے تیوری چڑھائی

یولا کہ کدو بھی کوئی چیز ہے یہ تو بالکل بے مزہ چیز ہے۔ حدیث کے مقابلے میں اس بد بخت کا یہ قول سنتے ہی حضرت امام ابو یوسفؒ نے جو دربار میں موجود تھے۔ فرمایا ”المنطع والسيف“ یعنی تلوار اور وہ کھال جسے بچھا کر دربار میں قتل کیا جاتا ہے لے آؤ۔

آزادی عدلیہ کی ایک مثال: عدالت اور عدلیہ کی آزادی اسی کا نام ہے۔ جس کی مثال اسلامی حکومتیں صدیوں تک پیش کر چکی ہیں۔ اور وہی حقیقی چیف جسٹس ہوتا ہے جس کے سامنے ساری انتظامیہ پہنچ تھی۔ خلیفہ وقت بھی عدالت کے سامنے جواب دہ ہوتا تھا۔ حضرت علیؓ، قاضی شریع کی عدالت میں ایک مقدمہ کے سلسلے میں حاضر ہوئے۔ قاضی صاحب کو اسے اپنے پاس بٹھانا چاہئے تھا۔ لیکن وہ تو کجا جب قاضی شریع نے اکراما کنیت سے خطاب کرتے ہوئے یا ابا الحسن کہا۔ تو آپ کا رنگ فق ہو گیا۔ اور اگرچہ مقدمہ اقلیت کے ایک فرد اور ایک یہودی کے ساتھ تھا۔ لیکن عدالت کی نظر میں جب وہ اسلامی حکومت کا شہری ہے تو اس میں اور دوسرے مسلمان میں کوئی تمیز نہیں۔ خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب اور کسی بھی قوم سے ہو۔

بہر حال عدالت نے فیصلہ یہودی کے حق میں دیا۔ لیکن عدالت پر خاست ہونے کے بعد ہی قاضی شریع نے حضرت علیؓ کو اپنے پاس بٹھایا۔ عزت و اکرام سے نوازا۔ اور پوچھا کہ جب عدالت میں میں نے آپ مخاطب کیا تو آپ کا رنگ کیوں متغیر ہوا۔ شاید اس لئے کہ ایک یہودی کے ساتھ آپ عدالت کے کٹھنوں میں کھڑے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ نہیں۔ بلکہ جب تم نے مجھے کنیت سے پکارا تو مجھے یہ خوف ہوا کہ یہودی کو اس سے تکلیف ہوئی ہوگی۔ اس کے دل میں یہ بات آگئی ہوگی کہ اسلام کے نظام عدل میں یہ عیب ہے کہ اپنوں کو معزز نام سے پکارا جاتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ تم مجھے علیؓ کہہ کر پکارتے۔

بہر حال حضرت امام ابو یوسفؒ نے فیصلہ دیا کہ اس شخص کو بھرے دربار میں قتل کیا جائے کیونکہ اس نے حضور ﷺ کی حدیث کے مقابلے میں ناک بھوں چڑھائی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ کفر کی حد میں پہنچ گیا ہے۔ مگر بعد میں توبہ سے اس کی جان بخشی ہوئی۔

(۱۰) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ ثَنَا حَفْصُ بْنُ غِيَاثٍ عَنْ إِسْمَاعِيلَ بْنِ أَبِي

خَالِدٍ عَنْ حَكِيمِ بْنِ جَابِرٍ عَنْ أَبِيهِ قَالَ دَخَلْتُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ فَرَأَيْتُ

عنده دباء يقطع فقلت ما هذا قال نكثبه طعامنا (۱) قال ابو عيسى و
جابر هذا هو جابر بن طارق و يقال ابن ابي طارق وهو رجل من
اصحاب رسول الله ﷺ ولا يعرف له إلا هذا الحديث الواحد و ابو
خالد اسمه سعد.

ترجمہ: جابر بن الطارق سے روایت ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس گیا۔ میں
نے دیکھا کہ وہاں کدو کے چھوٹے ٹکڑے ٹکڑے کئے جا رہے تھے۔ میں نے عرض
کیا۔ یہ کیا ہے؟ فرمایا اس طرح ہم اپنے سالن میں اضافہ کرتے ہیں۔

امام ترمذی کہتے ہیں کہ جابر جو یہاں مذکور ہے۔ وہ جابر بن الطارق ہیں۔ اور کبھی جابر بن ابی
الطارق بھی بولا جاتا ہے۔ وہ صحابہ میں سے ہیں۔ اور صرف یہی ایک حدیث ہی ان کی معروف ہے۔ نیز
(اسماعیل کے والد) ابو خالد کا نام سعد ہے۔

حکیم بن جابر النخ جابر بن الطارق صحابی ہیں۔ کبھی دادا کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ تو جابر
بن ابی الطارق بھی کہا جاتا ہے۔ ابی الطارق کا نام تافق ہے۔ جابر احمسی صحابی ہیں۔ ان کا کچھ تعارف امام
ترمذی اسلئے کرتے ہیں کہ عموماً جابر کا ذکر ہو تو مشہور صحابی حضرت جابر بن عبد اللہ مراد لئے جاتے ہیں۔ جو
یہاں مراد نہیں۔ جابر بن الطارق کے بیٹے حکیم تابعی ہیں جو ۸۶ھ میں اور ایک قول کے مطابق ۹۲ھ میں
وفات پائے۔

لرايت عنده الدباء يقطع يعني میں نے دیکھا کہ سالن کی تیاری ہو رہی ہے۔ لیکن خلاف
معمول کدو کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹا جاتا ہے۔ اور جب میں نے عرض کیا کہ کدو کو اتنا چھوٹا کیوں
کاٹا جا رہا ہے۔ تو جواب ملا۔ نكثبه طعامنا یعنی سالن میں زیادتی کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ اور سالن
مقدار سے قدرے زیادہ ہو تو بہتر ہے۔ کیونکہ اگر کبھی اچانک مسافر، مہمان یا فقیر مسکین آجائے تو ان کا کام
بھی چل جاتا ہے۔ نیز پڑوسیوں کو بھی اس میں سے حصہ دیا جاسکتا ہے۔ الحدیث اس لفظ کو مرفوع اور

(۱) السنن الكبرى للنسائی ۵۶/۳ کتاب الولیمة ابواب الاطعمة باب تکثیر الطعام بالقرع، سنن

ابن ماجہ ص ۲۳ کتاب الاطعمة باب الدباء، شرح السنة للبغوی ۳۰۵/۱ کتاب الاطعمة، باب

المرقق والدباء (بخاری)

منصوب دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔ کیونکہ نَعُورُ مجہول کا صیغہ اور نَعُورُ ف اور نَعُورُ ف معروف کے صیغے تینوں میں جائز ہیں۔ مؤخر الذکر صورت میں فاعل کا ضمیر راوی کی طرف راجع ہوگا اور الحمد للہ مفعول بہ منصوب ہوگا۔

(۱۱) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ عَنْ مَالِكِ بْنِ أَنَسٍ عَنْ إِسْحَاقَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ أَنَّهُ سَمِعَ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يَقُولُ إِنَّ خِيَّاطًا دَعَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ لَطَعَامٍ صَنَعَهُ فَقَالَ أَنَسٌ فَذَهَبَتْ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ إِلَى ذَلِكَ الطَّعَامِ فَقَرَّبَ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ خُبْزًا مِنْ شَعِيرٍ وَمُرْقَافِيهِ دِهَاءٌ وَقَدْ يَدُ قَالَ أَنَسٌ فَرَأَيْتَ النَّبِيَّ ﷺ يَتَّبِعُ الدِّهَاءَ حَوَالَى الصَّحْفَةِ فَلَمْ أَزَلْ أَحَبَّ الدِّهَاءَ مِنْ يَوْمَئِذٍ (۱)۔

غریبوں اور پیشہوروں کی عزت

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک درزی نے نبی کریم ﷺ کو کھانے پر بلایا۔ جو اس نے (آپ ﷺ کے لیے) تیار کیا تھا۔ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ میں بھی نبی کریم ﷺ کے ہمراہ اس کھانے کے لیے گیا۔ نبی کریم ﷺ کے لیے جو کی روٹی اور شوربہ پیش کیا گیا۔ جس میں کدو اور گوشت کے ٹکڑے تھے۔ تب میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا۔ کہ شوربہ کے برتن کے ہر طرف سے کدو کے ٹکڑے تلاش کر کے کھا رہے ہیں۔ اس دن سے لے کر ہمیشہ مجھے کدو محبوب رہا۔

اِنَّ خِيَّاطًا الْخِ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ یہ شخص نبی کریم ﷺ کے غلام تھے۔ اس سے یہ پتہ بھی چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ پیشوں اور دنیوی امتیازات کا لحاظ کئے بغیر ہر چاہنے والے کی دعوت قبول فرماتے تھے۔ کیونکہ اسلام میں جائز پیشوں میں سے کسی پیشے کی وجہ سے تحقیر جائز نہیں۔ نیز اس پر بھی تنبیہ ہے کہ امیروں کی دعوت قبول کرنے کے ساتھ ساتھ غریبوں کا لحاظ بھی ہونا چاہئے۔ اور مومنین اور درزیوں

(۱) صحیح بخاری ۲۸۱/۱ کتاب البیوع باب الخیاط، صحیح مسلم ۱۸۰/۱ کتاب الأشربة باب جواز الاكل المسروق الخ سنن ابی داؤد ۴۷۲/۲ کتاب الاطعمة باب فی اكل الدباء، جامع ترمذی ۶/۲ کتاب الاطعمة باب ما جاء فی اكل الدباء (مختار)

وغیرہ کی دعوت سے احتراز کرنا ٹھیک نہیں۔ ذہبت معہ چونکہ حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ کے خاص خادم تھے۔ اس لئے ساتھ تشریف لے گئے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ خادم خاص اتباع میں شمار ہوتا ہے جیسے آج کل بھی کوئی معزز شخص اپنے سیکرٹری یا کسی خاص شاگرد کو اپنے ساتھ لے جاسکتا ہے۔ اگرچہ اس کو دعوت نہ بھی دی ہو کیونکہ عرفاً اس کی اجازت ہوتی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دعوت دینے والے نے حضرت انسؓ کو بھی دعوت دی ہو۔ کیونکہ ان کو پہنچا ہوگا کہ نبی کریم ﷺ کی خصوصی خدمت کے لیے حضرت انسؓ ہی زیادہ مناسب ہیں۔ مرقافہ دبء و قدید یعنی اس سالن میں کدو اور گوشت کے تراشے پکائے گئے تھے۔ قد کے معنی طولاً کاٹنے کے ہیں۔ اس لئے قدید کے معنی مقد یعنی طولاً کٹے ہوئے گوشت کے ٹکڑے ہو گئے۔ جو کہ عموماً نمک لگا کر دھوپ میں سکھانے کے لیے رکھ دیئے جاتے ہیں۔ حدیث کے اسی حصے میں ترجمۃ الباب سے مطابقت واضح ہے۔ تتبع الدباء یعنی نبی کریم ﷺ برتن کے مختلف اطراف سے کدو کے ٹکڑے تلاش کرتے رہے۔

ایک اشکال اور جواب: اب ایک اشکال یہ ہے کہ کھانے کے آداب کے سلسلے میں خود نبی کریم ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ کل معا یلبک یعنی اپنے سامنے سے کھاؤ۔ جبکہ یہاں خود نبی کریم ﷺ کا عمل اس کے خلاف ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس مقام پر نبی کریم ﷺ مہمان خصوصی ہیں۔ یہ سارا کاسہ طعام انہی کے لیے تو رکھا گیا ہے۔ نیز آپ کے اس طرح بلا تکلف کھانے سے میزبان کو مزید مسرت اور اس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ لہذا اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ مہمان کی بے تکلفی عرف میں میزبان پر احسان ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اپنے سامنے سے کھانے کے حکم میں راز یہ ہے کہ کبھی دوسروں کے کھائے ہوئے کھانے سے طبعی طور پر کراہت ہوتی ہے۔ اس لیے دوسروں کے آگے سے کھانے سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن یہ علت نبی کریم ﷺ کے جھوٹے (سور) میں بالکل مفقود ہے۔ بلکہ اسے ہمیشہ محبوب اور باعث برکت و شفا تصور کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں کبھی کبھی دوسروں کے آگے سے کھانے میں دوسرے شرکائے طعام یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ شخص زیادہ کیوں کھاتا ہے جو کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر چیزیں کھاتا ہے۔ لیکن استاد، مرشد اور پیغمبر کے اس قسم کے عمل سے عموماً ہر شریک طعام کو مسرت ہوتی ہے۔ لہذا ہمارے لئے تو اس طرح کی تلاش ٹھیک

نہیں جبکہ نبی کریم ﷺ کے اس عمل میں کوئی حرج نہیں۔

صحیحہ: صحفۃ اس برتن کو کہتے ہیں جس میں پانچ آدمیوں کا کھانا رکھا جاسکے۔ بعض نسخوں میں قصعہ کا لفظ آیا ہے جس میں دس آدمیوں کے لیے پیٹ بھر کر کھانے کے لیے کوئی چیز رکھی جاسکتی ہے۔

للم ازل أحب الدباء من يومئذ۔ محبوب کی ہر ادا پسند ہوتی ہے۔ یہی محبت کا تقاضا اور حقیقی محبت کی دلیل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ نے معصیتوں، معاشرتی اقدار اور رواجی پابندیوں کو بالائے طاق رکھ کر حضور ﷺ کی سنتوں کو محبوب رکھا۔ کاش ہمیں بھی حقیقی محبت کی لذت آشنا کی نصیب ہوتی۔
حضور ﷺ کی میٹھی چیز سے محبت:

(۱۲) حدثنا أحمد بن إبراهيم الدورقي و سلمة بن شبيب و

محمود بن غيلان قالوا أنا أبو أسامة عن هشام بن عروة عن أبيه عن

عائشة قالت كان النبي ﷺ يحب الحلواء والعسل (۱)۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو میٹھی چیز اور شہد پسند تھا۔

حلوا سے کیا مراد ہے:

يحب الحلواء والعسل حلوا سے مراد ہمارے ہاں کا معروف حلوا نہیں ہے۔ بلکہ ہر وہ کھانا ہے جس کو میٹھا بنانے میں انسانی صنعت اور کاریگری کا دخل ہو۔ اس تشریح کے مطابق شہد حلوا نہیں ہے اور عطف بلاشبہ درست ہوگا۔

جبکہ بہت سے شراح نے حلوا کی تشریح ”کل ما فيه حلوة“ سے کی ہے یعنی ہر وہ چیز جو میٹھی ہو۔ حلوا ہے۔

(۱) صحیح بخاری ۸۱۶/۲ کتاب الأطعمة باب الحلواء والعسل، صحیح مسلم ۳۷۸/۱ کتاب

الطلاق باب وجوب الكفارة على من حرم امرته، سنن ابی داؤد ۱۶۶/۲ کتاب الاشریة باب فی

شرب العسل، جامع ترمذی ۵/۲ کتاب الأطعمة باب ما جاء فی حب النبي ﷺ الحلواء والعسل،

ابن ماجہ ۵/۲ کتاب الأطعمة باب الحلواء (مختار)

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص تندرست، معتدل القوی اور توانا ہو۔ فطری طور پر اس کا دل عام کھانے کے بعد میٹھی چیز کو چاہتا ہے۔ لہذا یہ نبی کریم ﷺ کے حسن صحت، اعتدال قوی اور صحیح المزاج ہونے کی دلیل ہے۔ کیونکہ کھٹی اور کڑوی چیزیں فاسد اخلاط کے لوگوں کو مرغوب ہوتی ہیں۔

نبی کریم ﷺ شیرین اشیاء کو پسند فرماتے تھے۔ لیکن یہ رغبت کثرت تشہی کی وجہ سے نہ تھی۔ نہ ہر وقت میٹھی چیزوں کی خواہش ساتی رہتی۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ فطرت سلیمہ میٹھی چیزوں کی طرف راغب تھی۔ اور یہ بات زہد و تقویٰ کے منافی بھی نہیں ہے کہ کسی کا دل میٹھی چیزوں یا دوسرے اعلیٰ کھانوں کو پسند کرے۔ وہ بزرگ ولی اور پیغمبر بھی ہو سکتا ہے۔

ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ مذکورہ معنی کو لے کر شہد بھی حلواء کے ضمن میں آتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ خصوصی اور بہت اہم میٹھی چیز ہے بلکہ تمام شیرینیوں کا سرچشمہ ہے۔ ان حلاوتوں کے برعکس جن میں انسان کی صنعت کو دخل ہوتا ہے۔ یہ اعلیٰ قسم کی مٹھاس خود اللہ تعالیٰ اور اس کی قدرت کاملہ کی صنعت کا مظہر ہے۔ علاوہ ازیں قرآن مجید نے ”فيه شفاء للناس“ (الایہ) کا عظیم مرتبہ اسی حلاوت کو دیا ہے۔ اس لئے راوی نے اسے بطور خاص ذکر کیا۔ اور یہ عطف الخاص علی العام للاهتمام کے قبیلہ سے ہوگا۔

(۱۳) حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ مُحَمَّدٍ الزَّعْفَرَانِيُّ أَنَا حَجَّاجُ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ

قَالَ ابْنُ جَرِيرٍ أَخْبَرَنِي مُحَمَّدُ بْنُ يُونُسَ أَنَّ عَطَاءَ بْنَ يَسَارٍ أَخْبَرَهُ أَنَّ أُمَّ

سَلَمَةَ أَخْبَرَتْهُ أَنَّهَا قَرِبَتْ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ جَنَابًا مَشُوبًا فَأَكَلَ مِنْهُ ثُمَّ

قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ وَمَا تَوَضَّأَ (۱)۔

ترجمہ: ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو بھنا ہوا

پہلو کا گوشت پیش کیا۔ آپ ﷺ نے تناول فرمایا پھر آپ ﷺ نماز پڑھنے کے لیے

اٹھے۔ اور وضوء کی تجدید نہیں کی۔

(۱) جامع ترمذی ۵۲/۲ کتاب الأطعمة باب ما جاء في اكل الشواء، السنن الكبرى للبيهقي ۱۵۲/۱

کتاب الطهارة، شرح السنة للبقوی ۲۹۲/۱ کتاب الأطعمة باب اكل الشواء (مختار)

فطرت انسانی اور گوشت خوری: جنباً مشویاً بغل سے نیچے پہلو کو جب کہتے ہیں۔ یہاں پر پسلیاں اور اس کا گوشت مراد ہے۔ جسے بھون کر حضرت ام سلمہؓ نے آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اور آپ ﷺ نے کھایا تھا۔ امام ترمذیؒ اس پر تنبیہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے گوشت کو بطور ادا م تناول فرمایا تھا۔ اور گوشت کھانا فطرت انسانی کی صحت و سلامت کی دلیل ہے۔ کم فہم اور کج فطرت لوگ ہی اس سے انکار کر سکتے ہیں۔ ایک حدیث میں گوشت کو ”سید طعام اهل الجنة“ اور ایک اور روایت میں ”سید طعام اهل الدنيا والآخرة“ کہا گیا ہے (۱)۔ اور اس کے کھانے میں بہت سے طبی فوائد اور حکمتیں ہیں۔ جس پر ہم ان شاء اللہ آگے بحث کریں گے۔ البتہ گوشت کا بہت زیادہ استعمال کبھی کبھی امراض کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ اس لیے حکیم بقراط کا قول ہے کہ ”لا تجعلوا بطونکم مقابر للحيوان (۲)“ یعنی پیٹ کو حیوانات کا مقبرہ نہ بناؤ۔

وضوء ممامست النار: مانو ضاً یعنی آگ پر پکی ہوئی چیز کھا کر بھی آپ ﷺ نے وضو کی تجدید نہیں کی (۳)۔ جس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ ”مامسته النار“ کھانے سے وضوء نہیں ٹوٹتا۔ اور یہی خلفائے راشدین، ائمہ اربعہ اور جمہور علماء کا مسلک ہے (۴)۔ اور وہ احادیث جن سے آگ پر پختہ چیزیں (۱) وقلمروی ابن ماجة وغيره بسند ضعيف اللحم سيد الطعام لاهل الدنيا والآخرة وله شواهد على سيد طعام اهل الدنيا اللحم والارز (جمع الوسائل و مناوی ج ۱ ص ۲۵۷) (مختار)

(۲) المواهب اللغیه ص ۱۲۵

(۳) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے قال المصنف حديث صحيح فيكون ناسخاً لحديث توضؤاً ممامسته النار (جمع الوسائل ۱/ ۲۵۸) (مختار)

(۴) قال العلامة البنوري ذهب جمهور الصحابة والتابعين والائمة الاربعة إلى عدم وجوب الوضوء ممامسته النار وروى مالك في مؤطاه ذلك عن الخلفاء الاربعة الراشدين وكان فيه خلاف في الصلوة الاول ثم استقر الإجماع على عدم الوضوء منه حكاة في فتح الباری عن النورى. ويقول الشاه ولي الله في شرحه على المؤطا المسوى والمصنف (۳۷۱/ ۱) عامة اهل العلم على أن الوضوء ممامسته النار منسوخ (معارف السنن ۱/ ۲۸۷) قال ايضاً الخطايب في معالم السنن (۶۹/ ۱) أحاديث الأمر معمول على الاستحباب لا الوجوب وحكاة الحافظ في الفتح ايضاً الاولى أن يقال إنه مستحب لخواص (معارف السنن ۱/ ۲۸۷) (مختار)

کھانے کے بعد وضوء ثابت ہو رہا ہے یا تو منسوخ ہیں کیونکہ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا وضوء نہ کرنا آخر الامرین ہے۔ اور یاد ہاں وضوء لغوی یعنی ہاتھ منہ دھونا مراد ہے۔

(۱۴) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ أَبِي لَيْثَةَ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ زِيَادٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ

الْحَارِثِ قَالَ أَكَلْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ شَوَاءً فِي الْمَسْجِدِ (۱)۔

ترجمہ: عبد اللہ بن الحارثؓ سے روایت ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بھنا

ہوا گوشت مسجد میں کھایا۔

عبد اللہ بن الحارثؓ: بظاہر حضرت عبد اللہ بن الحارث بن الجوزیؓ مراد ہے جو ۸۶ھ میں

وفات پائے۔ اور مصر میں وفات پانے والے صحابہ میں آخری صحابی ہیں۔

اکلنا مع رسول اللہ ﷺ شواء شواء آگ کے ذریعے بھنے ہوئے گوشت کو کہتے ہیں۔

ایک روایت کے مطابق یہاں پر گوشت کے ساتھ روٹی بھی حاضر تھی۔ لہذا اس سے گوشت کا ادا ہونا ثابت کیا جا رہا ہے۔

مسجد میں کھانے کا مسئلہ: فی المسجد حتی الوسع بلا ضرورت مسجد میں کھانا کھانے سے احتراز کرنا

چاہیے۔ کیونکہ اس سے مسجد کے تلوٹ کے ساتھ ساتھ عبادت میں خلل کا خطرہ ہوتا ہے۔ ہاں اگر ضرورت

ہو تو جائز ہے۔ لیکن چونکہ نبی کریم ﷺ کیلئے تو مسجد ہی مہمان خانہ، دربار، پارلیمنٹ، عدالت اور عبادت

خانہ سب کچھ تھا۔ اس لئے آپ ﷺ نے مسجد میں مہمانوں کو کھانا کھلایا ہوگا۔ اور ایسی صورت میں بلاشبہ مسجد

میں کھانا جائز ہے۔ البتہ مسجد کو بچانے کیلئے دسترخوان وغیرہ کا بندوبست ہونا چاہیے۔ اور چونکہ یہاں صرف

گوشت کھلایا گیا ہے۔ اس لئے مسجد کے خراب ہونے کا اندیشہ ویسے بھی نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ ممکن

ہے کہ نبی کریم ﷺ اعتکاف میں ہوں۔ پھر تو مسجد ہی میں کھانا پڑتا ہے۔ جبکہ بعض علماء کا خیال ہے کہ

(۱) سنن ابن ماجہ ص ۲۳۸ ابواب الاطعمة باب الشواء، شرح السنة للبغوی ۱/۲۹۳ کتاب

نبی کریم ﷺ نے یہاں صرف بیان جواز کیلئے ایسا کیا ہوگا (۱)۔

(۱۵) حدثنا محمود بن غيلان أننا وكيع ثنا مشعر عن أبي
صخرة جامع بن شداد عن المغيرة بن عبد الله عن المغيرة بن شعبة
قال ضفت مع رسول الله ﷺ ذات ليلة فأتني بعنق مشوي ثم أخذ
الشفرة فجعل يحزلي بها منه قال فجاء بلال يؤذنه بالصلوة فالتقي
الشفرة فقال ما له تربت يده قال و كان شارب قذوفا فقال له اقضه
لك على سواك او قصه على سواك (۲)۔

ترجمہ: حضرت مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں۔ کہ ایک رات میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ
مہمان ہوا۔ تو کھانے کیلئے بھنا ہوا پہلو کا گوشت لایا گیا۔ جس کے بعد نبی کریم ﷺ
نے چھری اٹھائی۔ اور مجھے دینے کیلئے اس میں سے (گوشت) کا ٹٹا شروع کیا۔ اسی
دوران بلالؓ نے آکر نماز کی تیاری کی اطلاع دی۔ آپ ﷺ نے (نماز پڑھنے کے
لیے) چھری رکھ دی۔ اور فرمایا کہ بلال کو کیا ہو گیا؟ اس کے دونوں ہاتھ خاک آلود
ہوں (حضرت مغیرہؓ نے) فرمایا اور ایسا ہوا کہ اس کے مونچھوں کے بال بڑھے ہوئے
تھے۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ لاؤ سواک پر رکھ کر میں اسے کتر دوں۔ یا یہ کہا کہ
سواک پر رکھ کر خود اسے کتر دو۔

(۱) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے فیہ دلیل الجواز اکل الطعام فی المسجد جماعة وفرادى ومحلہ ان لم
یحصل ما یقدر المسجد ولا فیکره، او یحرم ویمكن اکلهم علی زمن الاعتکاف فلا یرد ان الاکل فی
المسجد خلاف الاولی (جمع الوسائل ۱/ ۲۵۸) اور علامہ مناویؒ نے لکھا ہے فیہ دلیل لجواز الاکل فی
المسجد جماعة وفرادى بشرط امن التقذیر والاحرام (المناوی علی هامش جمع
الوسائل ۱/ ۲۵۸) مطلب یہ ہے کہ مسجد میں کھانا بلا ضرورت کراہت سے خالی نہیں کما قال الشامی
ویکفرہ.. اکل ونوم لا تلزم تکف وغریب (شامی ۱/) مگر اس میں بھی اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ مسجد میں
کھانے کے ریزے گر کر مسجد خراب نہ ہو جائے۔ بہتر یہ ہے کہ دسترخوان بچھا کر کھایا جائے۔ اس سے مسجد کا فرش خراب اور
گندہ ہونے سے بچ جائے گا (مختار) (۲) سنن ابی داؤد ۱/ ۲۸ کتاب الطہارة باب فی ترک
الوضوء مما مست النار، شرح السنة للبیہقی ۱/ ۲۸۳ کتاب الاطعمة باب اکل الشواء (مختار)

صِفْتُ مع رسول الله ﷺ بعض علماء کے نزدیک یہاں پر ”مع“ کا لفظ زائد یا ”عند“ کے معنی پر ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ میں آپ ﷺ کے ہاں مہمان ٹھہرا۔ علامہ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں کہ ام المؤمنین حضرت میمونہؓ کے حجرے میں حضرت مغیرہ مہمان بن کر آپ ﷺ کے پاس آئے تھے۔ اور بعض لوگ یہ مطلب لیتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو اپنے ہاں مہمان بنایا۔ لیکن اس توجیہ کو ملا علی قاریؒ، علامہ مناویؒ اور علامہ بیجوریؒ نے رد کر دیا ہے۔ تیسرا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ میں اور نبی کریم ﷺ دونوں کسی اور کے ہاں مہمان بنے۔ محدث قاضی اسماعیل نے اس توجیہ کو ترجیح دی ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک صحابیہ حضرت ضباعہ بنت الزبیر نے یہ دعوت کی تھی۔ یہ زبیر بن الحارث بن عبدالمطلب کی بیٹی اور نبی کریم ﷺ کی چچا زاد بہن لگتی تھیں۔

گوشت چھری سے کاٹ کر کھانے کا مسئلہ روایات میں تطبیق: فجعل يتجز معلوم ہوتا ہے کہ سالم جانور کو بھون کر اس دعوت میں پیش کیا گیا تھا۔ بعض علاقوں میں میزبان لوگ مہمان کے آگے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے رکھ دیتے ہیں۔ عرب کے بعض علاقوں میں آج کل بھی اس قسم کا رواج پایا جاتا ہے۔ کہ سالم جانور کو پکا کر کھانے کیلئے رکھ دیتے ہیں۔ اور اس کا گوشت کاٹ کاٹ کر کھایا جاتا ہے۔ بہر حال اس موقع پر بھی آپ ﷺ کی خدمت میں گوشت کا کوئی بڑا ٹکڑا پیش کیا گیا جو سالم اٹھانے کا نہ تھا۔ اس لئے آپ ﷺ اس کو چھری سے کاٹ کر کھانے لگے۔ اور صحابہ کرام کو دینے لگے۔ لیکن یہاں ایک اشکال ہے۔ وہ یہ کہ حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث ہے کہ لا تقطعوا اللحم بالسكين فإنه من صنيع الاعاجم۔ وان هشوه فإنه أهنأ وامرا (۱)۔

ترجمہ: چھری کے ذریعے گوشت کاٹ کر نہ کھاؤ۔ کیونکہ ایسا کرنا عجیبوں کا کام ہے۔ بلکہ دانتوں کے ساتھ کاٹ کر کھاؤ یہ ٹٹھا اور لذیذ ہوتا ہے۔

چنانچہ چھری کے ذریعے کاٹنے کو خود نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ تو آپ ﷺ کا عمل اس کے متضاد کیوں ہے۔ اس اشکال کے متعدد جواب دیئے جاتے ہیں۔

(۱) اولاً تو یہ حدیث ضعیف ہے۔ ابو معشر راوی کی وجہ سے امام بیہقیؒ نے اس کی تضعیف کی ہے۔ اس لئے حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث قطع بالسنن والی حدیث کا معارضہ نہیں کر سکتی۔ جسے امام ترمذیؒ کے علاوہ صحیحین میں بھی روایت کیا گیا ہے۔

(۲) بعض کے خیال میں مذکورہ حدیث حضرت عائشہؓ کی حدیث کیلئے ناسخ ہے۔ چنانچہ اب ممانعت نہ ہوگی۔ لیکن یہ توجیہ قوی نہیں۔ کیونکہ نسخ کیلئے تاریخ کا علم اور منسوخ کا مقدم ہونا ضروری ہے۔ دوسری یہ کہ لا تقطعوا اللحم قوی حدیث ہے۔ اور مذکورہ حدیث فعلی ہے۔ قوی حدیث قوی اور راجح ہوتی ہے۔ اس لئے یہ فعلی سے منسوخ نہیں ہو سکتی۔

(۳) بعض کے خیال میں یہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیت ہے کہ ان کے لیے جائز ہے۔ اور نبی امت کے لیے ہے۔ لہذا امت کے لیے ناجائز ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ میں تشبہ کا سرے سے احتمال نہیں ہے۔

(۴) چوتھا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ عمل بیان جواز کے لیے کیا ہے۔ اور تفصیل یوں ہوگی کہ بلا ضرورت چھری کاٹنے سے کھانا ممنوع ہے۔ اور اگر ضرورت ہو۔ مثلاً ٹکڑا بڑا ہو، جیسے جانور کا سالم پاؤں ہو، جو اٹھایا نہ جاسکے۔ یا مثلاً ٹکڑا ایک ہو جس کو ہاتھ میں اٹھانے سے دوسروں کو ضرر ہو۔ تو اس میں چھری سے کاٹنے کی اجازت ہوگی۔

(۵) بعض کہتے ہیں کہ چھری کے ساتھ کاٹنے اور اس کے ساتھ کھانے میں فرق ہے منہ تک چھری کی مدد سے لے جانا چھری کے ساتھ کھانا ہوگا۔ جو ممنوع ہے۔ اور حضرت عائشہؓ کی حدیث میں بھی وہی مراد ہوگا۔ اعاجم کے ساتھ اسی میں تشبیہ ہے۔ اور وہی ممنوع ہے جبکہ یہاں یہ صورت نہیں ہے۔ بلکہ ممکن ہے کہ آپ ﷺ چھری کے ساتھ کاٹ کر ہاتھ سے کھاتے رہے ہوں جو ممنوع نہیں۔

(۶) علامہ زحشریؒ نے کشاف میں یصنعون اور یعملون کے درمیان میں فرق کا ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یصنعون کا معنی یہ ہے کہ کوئی کسی کام کو عادت بنا کر ہمیشہ کرے۔ اور یعملون کا اطلاق کبھی کبھار کرنے پر ہوتا ہے۔ اس فرق کو مد نظر رکھ کر یہاں ایک اور جواب کا احتمال بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ نے ”من عمل الاعاجم“ نہیں کہا بلکہ ”من صنیع الاعاجم“ کہا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اعاجم کا

یہ شعار ہے۔ اور وہ ہمیشہ ایسا کرتے ہیں۔ ان کا شعار اپنانا اور ہمیشہ ایسا کرنا بری بات ہے۔ جیسے آج کل انگریزیت پذیر طبقہ لازماً کھڑے ہو کر اور چھری کاٹنے سے کھانے کو تہذیب کہتے ہیں۔ اور یہی ان کی صنع، معمول اور عادت مستمرہ ہے۔ مسلمانوں کے لیے اس کو عادت بنا کر ان کا اتباع ممنوع ہے۔ اور اگر کبھی کبھی برائے ضرورت اس بات کی نوبت آجائے تو یہ عمل جائز ہوگا۔

یَحْزُلِي بِهَا مَنَهَا حَوْكَ مَعْنَى هِيَ قَطْعٌ لِعَيْنِي كَمَا اس نے۔ بعض نسخوں میں يَحْزُلِي (بالحاء) ہے اور حَزْ كِطْرَحْ حَزْ بھی کاٹنے کے معنی میں آتا ہے۔ دونوں نصر کے باب سے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا یہ عمل ایک طرف آپ ﷺ کی تواضع پر دلالت کرتا ہے۔ دوسری طرف حضرت مغیرہؓ کی تالیفِ قلب اور تائیس بھی مد نظر ہوگی۔

حضرت بلال حبشیؓ: فجاء بلال ابو عبد الرحمن بلال بن رباح حبشی غلاموں میں سے پہلے اسلام لانے والے صحابی ہیں۔ اسلام سے قبل مشرک مالک کے ہاتھوں سخت اذیتیں برداشت کیں۔ بعد میں ابو بکر صدیقؓ نے خرید کر آزاد کر دیا۔ غزوہ بدر اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے۔ اذان کی خدمت آپؐ کے سپرد تھی۔ ۱۸ھ کو تریسٹھ (۶۳) سال کی عمر میں دمشق میں اور ایک قول کے مطابق دار یا شام میں وفات پائی۔ اور باب الصغیر دمشق میں دفن ہوئے۔

یؤذنه یہاں افعال کے باب سے مستعمل ہے۔ جو اعلام اور اخبار کے معنی میں آتا ہے۔ اور اگر یؤذنه ہوتا تو پھر اعلام الصلوٰۃ کے معنی میں ہوتا۔ اور بالصلوٰۃ ذکر ہونے کے بعد فعل میں تحریر مانتے۔ تربت بداء یہ جملہ بظاہر ایک قسم بددعا ہے۔ جس کا معنی یہ ہے کہ اس کا ہاتھ غبار آلود ہو۔ یعنی وہ مسکین و فقیر ہو جائے۔ کیونکہ فقراء و مساکین کے ہاتھ کام کرنے کے سبب اور بالخصوص زمینوں اور مٹی میں کام کرنے کی وجہ سے غبار آلود رہتے ہیں۔ لیکن اکثر ترجم اور شفقت و محبت کے لیے بھی یہ جملہ مستعمل ہوتا ہے۔ جس طرح کہ دوسری زبانوں میں بھی بددعا کے بعض جملے رحم اور شفقت کے مواقع پر بولے جاتے ہیں۔ بعض اوقات محض ملامت کے طور پر بھی یہ کلمہ استعمال ہوتا ہے (۱)۔

(۱) اسلئے علامہ جو اردوئی نے لکھا ہے جری علی السنة العرب لمجرد اللوم لا للدعوة علیہ (الاحتیاطات)

بلال کی دعوت نماز پر ناراضگی کے توجیہات: اب یہ اشکال پیدا ہوگا کہ حضرت بلالؓ نے تو نماز کی طرف بلایا ہے۔ تو نبی کریم ﷺ کو اس پر اعتراض کیوں ہے۔ اور ان کو کیوں ملامت فرما رہے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے پہلے گزر چکا ہے کہ یہ جملہ بدوعاء، زبرد تو بیخ اور محبت و ترحم تینوں مقاصد کے لیے بولا جاتا ہے۔ لہذا اگر اس کلام کو محبت و ترحم کی بجائے زبرد تو بیخ پر حمل کریں گے۔ تو توجیہ یہ ہوگی کہ ابھی نماز کے لیے وقت باقی تھا۔ لیکن بلالؓ نے نماز کی طرف بلایا۔ جس طرح کہ ہمارے ہاں کی مساجد میں بعض اوقات کچھ مقتدی اس قسم کے بھی ہوتے ہیں۔ جنہیں بہت جلدی ہوتی ہے۔ اور ابھی وقت باقی ہوتا ہے کہ وہ امام کو جماعت کھڑی کرنے پر مجبور کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یا اس کی تاخیر اور سستی کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ بعض اوقات امام کا کوئی ضروری کام ہوتا ہے۔ مثلاً وہ درس دینے میں مصروف ہے یا مہمانوں کے ساتھ بات کر رہا ہوتا ہے۔ بہر حال ایسے موقعوں پر مقتدیوں کو قدرے صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ دو چار منٹ کی تاخیر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تو شاید یہاں بھی ایسا ہی ہو کہ نبی کریم ﷺ کا خیال ہے کہ ادھر میزبان نے کتنی محبت اور محنت سے دعوت کا انتظام کیا ہے۔ مہمان ابھی کھا رہے ہیں۔ اور میزبان ابھی مزید تسلی سے کھانا چاہتا ہے۔ جماعت میں ابھی وقت باقی ہے کہ حضرت بلالؓ آئے کہ جماعت کا وقت ہو گیا ہے۔ اور یہ بات یقیناً نامناسب ہے۔ اس لئے آپ ﷺ نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے یہ کلمات کہے۔ لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ آپ ﷺ نے یہ کلمات زجر کے لیے استعمال نہ کئے ہوں۔ بلکہ آپ ﷺ نے بطور محبت و مدح یہ قول کیا ہو کہ خدا بلال کا بھلا کرے کہ انہوں نے نماز کی طرف توجہ دلائی۔ ورنہ ہم شاید غفلت میں رہ جاتے۔ اور کھانے اور باتیں کرنے میں مجھو ہو کر نماز کو موخر کر دیتے۔ تو گویا آپ ﷺ نے اس کے اس عمل کی تحسین فرمائی۔

قصہ شوارب میں توجیہات: قال یعنی مغیرہ بن شعبہؓ نے کہلوکان شاربہ قدوسی: قال کی ضمیر مغیرہ بن شعبہؓ کو راجع ہو تو شاربہ کی ضمیر میں تین احتمال ہیں۔ اول: یہ کہ خود حضرت مغیرہؓ اپنے آپ بیان کر رہے ہیں اور اصل میں شاربہ بنی قدونی (۱) تھا۔ لیکن متکلم سے غائب کو التفات ہوا ہے۔ دوم: یہ کہ ضمیر

(۱) وقع فی روایۃ ابی داؤد "وکان شاربہ قدوسی فقصہ لی علی سواک" (ابوداؤد ۴/۱۷۲ کتاب

الطہارۃ باب ۷۳) (اصلاح الدین)

نبی کریم ﷺ کو راجع ہو یعنی نبی کریم ﷺ کی مونچیں قدرے لمبی ہو گئی تھیں۔ کبھی کبھی آپ ﷺ کو بھی موقع نہیں ملتا تھا۔ ورنہ نبی کریم ﷺ عموماً مونچیں کاٹا کرتے تھے۔ آپ ﷺ مونچیں قینچی سے کترواتے تھے۔ مونڈتے نہ تھے۔ سوم: یہ کہ ضمیر حضرت بلالؓ کو راجع ہو۔ یعنی بلالؓ کی مونچیں بڑھی ہوئی تھی۔ اور نبی کریم ﷺ نے اسے مخاطب کر کے فرمایا کہ اقصہ لک اب احتمال اول میں اشکال نہیں ہے۔ کیونکہ لک میں لام منفعت کے لیے ہیں۔ توافقہ لک کا معنی یہ ہوگا کہ لاؤ میں ٹھیک کردوں تیری نفع کے لیے۔ اور اگر بلالؓ کو ضمیر راجع ہو تو بھی ترجمہ اسی طرح ہوگا اور اشکال نہیں ہوگا۔ لیکن خود نبی کریم ﷺ کو ضمیر راجع ہو تو یہ اشکال ہے کہ اقصہ لک کا کیا معنی ہوگا۔ تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا خیال تھا بلکہ یہ ایک حقیقت تھی کہ چونکہ صحابہؓ کو نبی کریم ﷺ کے بال محفوظ رکھنے کا شوق تھا جیسا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے طلق کیا تو صحابہؓ نے بالوں کو آپس میں بانٹ دیا۔ تو گویا آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ تو میرے بال نہیں چھوڑتے۔ آؤ تیرے لمبے بال کاٹ دوں۔ تم اسے اپنے پاس بطور تبرک محفوظ رکھ لو۔ تو اس صورت میں لام منفعت کیلئے درست ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب: ایک اور اشکال یہاں یہ ہے کہ جب نماز کے لیے دعوت ہوئی اور نبی کریم ﷺ نے چھری رکھ کر کھانا بھی چھوڑ دیا۔ تو اس کے بعد فوراً نماز کے لیے جانا چاہیے تھا۔ مونچیں کاٹنے یا دوسرے کاموں کی وجہ سے نماز میں تاخیر ہو جاتی ہے تو یہ ناجائز ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ضروری تو نہیں کہ یہ عین اسی موقع کی بات ہو بلکہ یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اس وقت نماز پڑھنے گئے ہوں۔ پھر نماز کے بعد یہ واقعہ ہوا ہو۔ گویا یہ محض ایک ضمنی بات تھی جو کہ صحابی نے درمیان میں بتلا دی نہ یہ کہ عین اسی موقع پر نماز کے وقت میں یا اذان کے بعد نبی کریم ﷺ نے میرے، دوسرے صحابی یا اپنے بال کاٹنے کا کام بھی کیا۔

مونچیں کترانا چاہیے یا مونڈھنا: اس حدیث سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اس قسم کے لوگ پسند نہ تھے جو مونچھے بڑھا کر رکھتے تھے۔ مونچوں کو لینا تو آپ ﷺ نے

خصال فطرت اور سنن الانبياء میں سے شمار کیا ہے (۱)۔ آپ ﷺ خود بھی نظافت کا بہت اہتمام فرماتے تھے اور صحابہ کو بھی میلا کچلا رہنے سے منع فرماتے تھے۔

علی سواک یعنی کنگھی وغیرہ نہیں ہے۔ لاؤ سواک کے ساتھ ٹھیک کر دو۔ مطلب یہ ہے کہ مونچوں کا بال کاٹنے ہوئے نبی کریم ﷺ نے اس بات کا لحاظ کیا کہ کہیں بال کم یا زیادہ نہ لئے جائیں۔ اس لیے سواک رکھ کر ان میں توازن قائم کرنے کیلئے مدد لی۔ جس طرح کہ کنگھی سے مدد لی جاتی ہے۔ مونچوں کو قینچی کے ساتھ کترنا مسنون ہے۔ اور اتنا کترنا چاہیے کہ حلق کے قریب ہو۔ لیکن خود حلق یعنی مونچیں موٹھنا مسنون نہیں۔ بعض علماء حلق یعنی موٹھ ہٹنے کی مسنونیت کے بھی قائل ہیں۔ لیکن اکثر علماء اس کی تصویب نہیں کرتے۔ امام مالکؒ نے تو موٹھ ہٹنے والے کی تادیب کا حکم دیا ہے۔ بلکہ اسے مثلہ قرار دیا ہے۔ یہاں ایک اور احتمال بھی ہے کہ قال کا ضمیر مغیرہ بن عبد اللہؒ کو راجع ہو۔ اور وہ اپنے استاد مغیرہ ابن شعبہؒ کا بیان کرتے ہوں کہ میری مونچیں بڑھی ہوئی تھیں۔ تو حضرت مغیرہؒ نے کہا کہ لاؤ میں ٹھیک کر دوں۔ لیکن عموماً پہلی توجیہ کو ترجیح دی جاتی ہے۔

(۱۶) حَدَّثَنَا وَاصِلُ بْنُ عَبْدِ الْأَعْلَىٰ لَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فَضِيلٍ عَنْ أَبِي

حَبِيبٍ التَّيْمِيُّ عَنْ أَبِي زُرْعَةَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ أَتَى النَّبِيَّ ﷺ بِلَحْمٍ

فَرَفَعَ إِلَيْهِ الدِّرَاعَ وَكَانَتْ تَعْبُجُهُ فَهَسَ مِنْهَا (۲)۔

(۱) أخرجه الصحاح كلها. وروى ابن حبان "ذكر لرسول الله ﷺ المجوس فقال إنهم قوم يوفرون سبالهم ويحلقون لحاهم فخالقوهم.... وفي خبر عند أحمد قصوا سبالكم ووفروا للحاكم لكن رأى الغزالي وغيره أنه لا بأس بترك سبال اتباعاً للعمر وغيره. (بيجوری ص ۱۲۷) وفي الدر المختار عن المعجبی حلق الشارب سنة وقيل بدعة وفي الشامية والقص منه سنة بالاجماع. (ج ۵ ص ۲۸۸) (اصلاح الدين)

(۲) صحيح بخاری ۴۷۰/۱ کتاب الانبياء باب قول الله عز وجل ولقد ارسلنا نوحاً الى قومه، جامع ترمذی ۵/۲ کتاب الاطعمة باب ما جاء في آتى اللحم كان احب الى رسول الله ﷺ، ابن حاجة ص ۲۲۵ کتاب الاطعمة باب احب اللحم (مختار)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں گوشت لایا گیا۔ پھر ان کو اگلے پاؤں کی پنڈلی کا گوشت پیش کیا گیا۔ جو ان کو پسند تھا۔ تو آپ ﷺ نے اسے دانتوں سے کاٹ کر تناول فرمایا۔

فرفع اليه الذراع جانور کی اگلی ٹانگ میں گھسنے سے بچنے کے حصہ کو کہتے ہیں۔

دانتوں سے گوشت کاٹ کر کھانا: و كانت تعجبه نبی کریم ﷺ کو ذراع اس لئے پسند تھا کہ اس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے۔ نیز یہ جلدی پک جاتا ہے۔ جیسے کہ آگے ایک اور حدیث میں بھی آتا ہے۔ بعض نسخوں میں یہاں تعجبه تذکیر کے صیغے سے مذکور ہے اور دونوں صحیح ہیں۔ اس لیے کہ اعضاء میں سے جو اعضاء بدن میں دودو یعنی مکرر ہیں وہ سب مؤنث سماعی ہیں۔ لیکن ذراع اس ضابطے سے مستثنیٰ ہے (۱) اور مذکر بھی استعمال ہوتا ہے۔ فنهش منھا یعنی چھری سے نہیں بلکہ منہ لگا کر دانتوں سے گوشت کاٹ کر کھانے لگے۔ نهش سین اور شین دونوں کے ساتھ ”اخذ باطراف الاسنان“ یعنی دانتوں سے کاٹ کر کھانے کو کہتے ہیں گوشت میں یہ مسنون ہے (۲)۔

(۱) حدثنا محمد بن بشار ثنا أبو داؤد عن زهير يعني ابن محمد عن

أبي إسحاق عن سعد بن عياض عن ابن مسعود قال كان النبي ﷺ

يعجبه الذراع قال وسم في الذراع و كان يرى أن اليهود سموه (۳)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو ذراع کا گوشت پسند

تھا۔ اور ذراع ہی میں آپ ﷺ کو زہر دیا گیا تھا۔ اور خیال یہ تھا کہ یہود نے آپ ﷺ

کو زہر دیا تھا۔

(۱) اسی طرح ہدی بھی مذکر استعمال ہوتا ہے۔ کبھی کبھی مؤنث استعمال ہوتا ہے (کما صرح بہ النووی ۱/۳۵، ۷۳) (مختار)

(۲) آج کل کے جدید سائنس نے بھی اس حکمت کی تائید کی ہے۔ اور کہا ہے کہ اس طرح کرنے سے معدہ کو تقویت ملتی ہے اور انسان بے شمار بیماریوں سے بچ جاتا ہے۔ (مختار)

(۳) سنن ابی داؤد ۲/۷۴ کتاب الاطعمة باب اكل اللحم، ابو داؤد الطیامی ۳۸۸، البیہ

مسند احمد میں کان النبی ﷺ کی جگہ کان احب العراق آیا ہے۔ مسند عبداللہ ابن مسعود ۶۵۰ (مختار)

حضرت عبداللہ بن مسعود: حضرت عبداللہ بن مسعود ہندلی صحابی ہیں۔ ان کے والد بنو زہرہ کے حلیف تھے۔ والدہ مسلمان ہو کر صحابیت کا شرف پانچکی ہیں۔ آپ بھی سابقین اولین صحابہ میں سے ہیں۔ آپ ہی کی ایک روایت کے مطابق آپ چھٹے مسلمان تھے۔ آپ سے قبل صرف پانچ آدمی ایمان لائے تھے۔ پہلے حبشہ اور پھر مدینہ کو ہجرت فرمائی۔ بدر اور پھر اس کے بعد تمام غزوات میں بھی شرکت کی۔ بدر میں ابو جہل زخمی ہو چکا تھا۔ آپ نے جا کر اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اور نبی کریم ﷺ کو خبر دی جس سے نبی کریم ﷺ انتہائی خوش ہوئے۔ نبی کریم ﷺ کی ذاتی خدمت میں بھی پیش پیش تھے۔ لہذا آپ کو صاحب السواک والعلین والوسادۃ بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ میں اور میرا بھائی جب یمن سے آئے تو عبداللہ ابن مسعود اور ان کی والدہ کا بھی نبی کریم ﷺ کے ہاں کثرت سے آنا جانا دیکھ کر ایک طویل مدت تک یہی خیال رہا کہ یہ دونوں نبی کریم ﷺ کے گھر کے افراد ہیں۔ ہجرت سے پہلے حضرت زبیرؓ اور ہجرت کے بعد حضرت سعد بن معاذؓ سے مواخات کا رشتہ نبی کریم ﷺ نے قائم کیا تھا۔

شام کی فتوحات میں بھی شریک رہے۔ بعد میں حضرت عمرؓ نے آپ کو کوفہ میں معلم بنا کر بھیجا۔ اور حضرت عثمانؓ نے آپ کو کوفہ کا امیر مقرر کر دیا۔ پھر کچھ مدت کے بعد آپ کو معزول کر کے مدینہ طلب کیا۔ کوفہ کے لوگوں نے ٹھہرنے کو کہا لیکن آپ نے اطاعت کا حق ادا کرتے ہوئے ان کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ ۳۲ھ میں مدینہ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ خلفائے راشدین کے بعد آپ افتد اصحابہ تھے۔ اور احناف کے مذہب کا مدار زیادہ تر آپ ہی کے فقہ پر ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ نے غلاموں اور مویشیوں کے علاوہ نوے ہزار (90,000) دینار نقد ترکہ میں چھوڑے تھے۔ آپ کے مناقب کے لیے کئی دفتر ناکافی ہیں۔ رضی اللہ عنہ وعن الصحابة اجمعین۔

وسم فی الذراع سم مجہول کا صیغہ ہے اور نائب فاعل کا ضمیر نبی کریم ﷺ کو راجع ہے، معنی یہ کہ نبی کریم ﷺ کو ذراع میں زہر دیا گیا تھا۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ اس کا نائب فاعل محذوف ہو۔ اور تقدیر یوں ہو کہ وسم فی الذراع یعنی اوقع السم فی الذراع معنی یہ ہوگا کہ زہر کو ذراع میں ملایا گیا تھا۔

زہر دینے والا کون؟ وکان یروی ان الیہود سموہ یروی مجہول اور یروی معلوم دونوں طرح

پڑھنا جائز ہے۔ اور دونوں صورتوں میں یہ ظن معلوم کے معنی میں ہے۔ ضمیر حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کو راجع ہے۔ معنی یہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا خیال تھا کہ یہ زہر یہود نے آپ ﷺ کو دیا تھا۔ اور یہ محض خیال نہ تھا بلکہ یہ درحقیقت یہود کی سازش کا نتیجہ تھا کیونکہ زینب بنت الحارث جو سلام بن معکم کی بیوی تھی نے دیگر یہود کے مشورے سے نبی کریم ﷺ کو زہر دیا تھا۔ اس لئے جس روایت میں یہودی عورت کا ذکر ہے وہ اس روایت سے متعارض نہیں ہے۔

فتح خیبر کے موقع پر یہود نے شکست کھائی لیکن یہ غیبت قوم ڈنگ مارنے سے کبھی نہیں چوکتی۔ چنانچہ فتح خیبر کے بعد آپ ﷺ نے وہیں قیام فرمایا تو اس سازش کا شکار ہوئے۔ یہود کو معلوم تھا کہ آپ ﷺ اپنے کریمانہ اخلاق کی بدولت امیر غریب، دوست دشمن، اور مرد و عورت سب کی دلداری کرتے ہیں اور دعوت قبول کرتے ہیں۔ لہذا انہوں نے اس عورت کو تیار کروایا کہ وہ آپ ﷺ کو کھانے کی دعوت دے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے یہودی عورت کی دعوت کو قبول کر لیا۔ اور جب کھانے بیٹھے تو فطری رغبت کے مطابق ذراع کو اٹھایا۔ اس میں اتنا خطرناک اور زور اثر زہر ڈالا گیا تھا کہ آپ نے منہ لگایا ہی تھا کہ وحی آئی (۱) اور آپ ﷺ کو اطلاع دی گئی کہ اس میں زہر ہے۔ لیکن صرف منہ لگانے کی وجہ سے آپ ﷺ کو مستقبل میں بھی سخت تکلیف رہی۔ وفات تک ہر سال اس کے اثرات ظاہر ہوتے تھے۔ گرمی کے موسم میں آپ ﷺ پر خاص کراثر ظاہر ہوتا جس کی وجہ سے آپ ﷺ کو سچے لگوا کر خون نکالنا پڑتا۔ حتیٰ کہ وفات کے وقت اسی زہر کے اثر سے آپ ﷺ کی رگیں پھٹ پڑیں۔

معنوی شہادت: اور یہ ایک گونہ شہادت بھی تھی جس کے لئے آپ ﷺ کے دل میں ہمیشہ سے ایک تڑپ اور جذبہ عشق موجود تھا۔ اور اگرچہ آپ ﷺ حکمت الہی کے تحت آخر دم تک لوگوں کے ہاتھوں سے محفوظ رہے لیکن منصب نبوت کی تکمیل کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی اس تمنا کو بھی پورا کر کے شہادت سے سرفراز فرمایا۔ لَوَدِدْتُ اَنْ اُقْتَلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَمْ اَحْيَا لَمْ اُقْتَلَ (الحديث) الخ

(۱) بعض روایات میں آتا ہے کہ اس ذراع نے آپ ﷺ سے کلام کر کے زہر کے وجود کی خبر دی۔ ممکن ہے کہ ذراع کے اخبار کے بعد اس کی تصدیق کی خاطر جبریلؑ نے بھی آکر خبر دی ہو۔ اکثر شراح نے یہی تفسیق کی ہے۔ (اصلاح الدین)

بعض صحابہ نے بھی یہ زہریلا گوشت کھالیا تھا جن میں سے ایک شخص شہید ہوئے۔ جن کا نام بشر بن براءؓ یا بشر بن براءؓ تھا۔ بعد میں جب اس عورت سے پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے زہر ملانے کا اعتراف کیا (۱)۔ اب بعض روایات میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس عورت کو معاف کر دیا۔ جبکہ بعض میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس کو قصاصاً قتل کر دیا۔

سوائے ورثاء کے قاتل کو غنوکا کسی کو اختیار نہیں: بظاہر یہ تعارض معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت دونوں روایتیں اپنی جگہ صحیح ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ نے اسے اپنے حق میں معاف کر دیا۔ اور اگرچہ اس عورت نے اقدام قتل کیا تھا۔ لیکن جس طرح آپ ﷺ کی عادت شریفہ تھی کہ آپ ﷺ کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیتے تھے۔ اس لئے اس کو معاف فرمایا لیکن بعد میں جب پتہ چلا کہ ایک صحابی اس عورت کی وجہ سے شہید ہو گئے تو پھر چونکہ قصاص لازم ہو گیا۔ لہذا قصاصاً قتل کر دیا۔ آپ ﷺ دوسروں کے قصاص معاف کرنے کے مجاز تو نہ تھے۔ کیونکہ اسلام میں گورنر، صدر یا قاضی وغیرہ کو قاتل کے معاف کرنے کا حق نہیں۔ بلکہ قاتل ضرور قتل کیا جائے گا جب تک مقتول کے ورثہ معاف نہ کریں۔

ہمارے ہاں تو ایسی گنگا بہتی ہے۔ قتل کو فوجداری جرم قرار دے کر مقتول کے ورثہ کو تو اس حق سے محروم کر دیا گیا ہے لیکن غیروں کو اس کا مجاز ٹھہرایا گیا ہے یہ یہود و نصاریٰ کے وہ کالے قوانین ہیں جو آج تک ہم پر مسلط ہیں۔

قتل عمد اور آلہ جارحہ: یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اگر اسے زہر دے کر قتل کرنے کے سبب قتل کروایا تو اس سے امام شافعی کا مسلک ثابت ہوتا ہے کہ قصاص کے لیے قتل عمد میں آلہ جارحہ شرط نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہؒ تو قتل عمد میں آلہ جارحہ کو شرط مانتے ہیں۔ اور زہر دینا آلہ جارحہ کا استعمال نہیں ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے اسے قصاصاً نہیں بلکہ تعزیراً قتل کر دیا ہوگا۔ اور قاضی کے لیے سنگین جرائم میں سیارۂ و تعزیراً قتل کروانے کا اختیار ہے۔

(۱) اس پوچھ گچھ کے بعد مسلمان ہو گئی۔ علامہ جواد الروی نے لکھا ہے ولقد اسلمت زینب فترکھا رسول اللہ ﷺ

لاسلامھو لانہ کان لا ینقم لنفسہ (الامحالات ص ۲۲۱) (مختار)

(۱۸) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ ثَنَا مُسْلِمُ بْنُ أَبِرَاهِيمَ ثَنَا أَبَانُ بْنُ يَزِيدَ عَنْ
لُقَاةٍ عَنْ شَهْرِ بْنِ حَوْشَبٍ عَنْ أَبِي عُبَيْدٍ قَالَ طَبَخَتْ لِلنَّبِيِّ ﷺ قَدْرًا
وَكَانَ يَعْجِبُهُ الذَّرَاعُ فَنَاولَتْهُ الذَّرَاعَ ثُمَّ قَالَ نَاولْنِي الذَّرَاعَ فَنَاولَتْهُ ثُمَّ
قَالَ نَاولْنِي الذَّرَاعَ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ وَكَمْ لِلشَّاةِ مِنْ ذَّرَاعٍ
فَقَالَ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ سَكَّتْ لَنَا وَلَتَنِي الذَّرَاعُ مَا دَعَوْتُ (۱).

ترجمہ: حضرت ابو عبیدہؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے لیے ہاڈی پکائی۔
چونکہ نبی کریم ﷺ کو ذرا ع کا گوشت زیادہ پسند تھا۔ لہذا میں نے انہیں ایک ذراع
پیش کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے (دوسری) ذراع (بھی) دیدو۔ میں نے دے
دی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے ایک اور ذراع دے دو۔ میں نے عرض کیا کہ
حضور ﷺ بکری کی کتنی ذراع ہوتی ہیں؟ (یعنی صرف دو ہی تو ہوتی ہیں) تو
آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تو خاموش
رہتا تو جب تک میں مانگتا رہتا (ہاڈی سے نکال نکال کر) تو مجھے ذرا عیں دیتا رہتا۔

ابو عبیدہؓ یہ صحابی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ آپ ﷺ کی خدمت کیا کرتے
تھے۔ یہی ان کا نام اور یہی کنیت مروی ہے۔ اور صرف اسی ایک کتاب میں صرف یہی ایک روایت ان کی
موجود ہے۔ بعض حضرات نے ان کا نام ابو عبیدہؓ یعنی تاء کے ساتھ نقل کیا ہے لیکن صحیح بغیر تاء کے ہے۔

ثُمَّ قَالَ نَاولْنِي الذَّرَاعَ اس فرمائش سے ذراع کے گوشت میں آپ کی زیادہ رغبت ظاہر ہوتی
ہے لیکن ظاہر ہے کہ طلب کرنے کے بعد آپ ﷺ اسے اکیلے تو نہیں کھاتے تھے بلکہ دیگر دوستوں کو بھی
کھلاتے تھے۔ وَكَمْ لِلشَّاةِ الذَّرَاعَ گویا حضرت ابو عبیدہؓ اس بات پر تعجب ہوا کہ یہ نبی کریم ﷺ کیسی
بات کر رہے ہیں کہ بکری کے تو صرف دو ذراع ہوتے ہیں۔ اور آپ ﷺ دو ذراع لینے کے بعد تیسرا بھی
مانگ رہے ہیں۔ لہذا بطور تعجب پوچھا کہ شاة کے کتنے ذراع ہوتے ہیں۔ دو تو میں دے چکا ہوں۔

نبی کریم ﷺ کے حکم کے مقابلے میں عقل پرستی: لیکن دراصل اس تعجب اور استبعاد میں ان سے چوک ہوئی۔ کہ مقام تعمیل ارشاد کا تھا۔ یہ سوچنا ہی بے جا تھا کہ نبی کریم ﷺ کا یہ مطالبہ خلاف عقل ہے جب نبی کریم ﷺ کسی بات کا حکم دیتے تھے تو عقل، فلسفہ، اور سائنس کو درمیان میں لانا اور ممکن ناممکن کی گنجھائیاں سلجھانا ہی غلط ہے۔ وہ پہاڑ اٹھانے کا حکم دیں تو مامور کو کوشش کرنی چاہیے۔ اور اس بات کی تعلیم دینے کے لیے آپ ﷺ نے فرمایا والدی نفسی بیدی لو سکت الخ یعنی اگر تم اعتراض نہ کرتے اور خاموشی سے تعمیل ارشاد کرتے۔ تو تم اور ذراع بھی نکال کر دیتے رہے۔ اور پچشم مشاہدہ دیکھ لیتے کہ ایک جانور کے متعدد ذراع بھی ہو سکتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی زندگی کثیر طعام کے اس قسم کے معجزات سے بھری پڑی ہے تھوڑا سا کھانا زیادہ بن گیا۔ اور چھوٹے سے برتن میں انگلیاں ڈبودی ہیں۔ تو اس سے پانی چشموں کی طرح بہنے لگا ہے۔ اور اگر موسیٰ علیہ السلام نے بطور معجزہ ایک پتھر سے چشمے جاری کئے ہیں تو آپ ﷺ نے انگلیوں سے اسی طرح کے چشمے جاری کئے ہیں۔ اور ساری کی ساری فوج اور اس کے جانور اس سے سیر بھی ہو چکے ہیں۔

سنن ابن ماجہ میں متعدد روایات کثیر طعام کے سلسلے میں موجود ہیں۔ اسی طرح قاضی عیاضؒ نے بھی شفا نامی کتاب میں اس قسم کی متعدد روایات ذکر کی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے معجزے کا اثر ہی تھا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کھجوروں کے ایک تھیلے سے طویل زمانہ تک کھجوریں کھاتے رہے۔ لیکن اس تھیلے کی کھجوریں ختم نہ ہوئی۔ اور ایسا بھی ہوا کہ کسی صحابی نے آپ ﷺ کو کھانے پر بلایا اس نے صرف آپ ﷺ کے لیے کھانا تیار کیا ہوا تھا۔ لیکن آپ ﷺ نے اپنے ساتھ لشکر روانہ فرمایا۔ اور وہی تھوڑا سا کھانا سارے لشکر کے لیے کافی ہوا بلکہ ان سے باقی بھی بچا۔ جیسا کہ غزوہ خندق میں ہوا۔

چوں و چرا کر ناب رکات سے محرومی کا سبب بنتا ہے: بہر حال اگر صحابی سوال نہ کرتے تو بطور معجزہ اللہ تعالیٰ یہاں بھی کئی ذراع پیدا فرماتے لیکن یہ بات کہ ایسا کیوں نہ ہوا۔ اور یہ معجزہ کیوں منقطع ہو گیا۔ تو اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ صحابی کی طرف سے نبی کریم ﷺ کا انقیاد تام نہ ہوا۔ اور اس کا اثر نبی کریم ﷺ کے معجزات کے برکات پر بھی پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ جب شاگرد بگڑا ہو تو اس کے استاد کی

روحانیت کو بھی نہیں پہنچتی ہے۔ بیٹا خراب ہو تو اس کی برائی باپ پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ ملا علی قاریؒ کا قول ہے کہ اکرام تام کیلئے انقیاد تام کی ضرورت ہوتی ہے۔ تکثیر طعام یا اس قسم کا دوسرا معجزہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کا اکرام ہوتا ہے۔ اور امتی میں انقیاد تام نہ ہو تو ماحول سارا مکدر ہو جاتا ہے۔ اور معجزے کے ظہور کا سلسلہ بھی منقطع ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں نبی اکرم ﷺ کی کامل توجہات بھی ختم ہو جاتی ہے۔ ایسی برکتیں اور ظاہری یا معنوی فیوضات تب ظہور پزیر ہوتی ہیں جب نبی کی پوری توجہ اور انہماک ہو۔ صحابی نے جب درمیان میں چون و چرا کی تو اس سے توجہ کا وہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ جس طرح کہ بعض اوقات کوئی مقرر عجیب و غریب بیان کرتا ہے۔ پوری تقریر علوم و معارف کا سلسلہ ہوتا ہے لیکن درمیان میں کوئی شخص گڑبڑ کرے تو وہ سلسلہ کٹ جاتا ہے۔

توجہ تام کے حصول کیلئے انقیاد تام: ہمارے بزرگ مولانا عبد اللہ در خواستی صاحبؒ جسے لوگوں نے سیاست کی نذر کر کے بڑا نقصان کیا۔ عظیم شخصیت، سلف کا نمونہ اور سادگی و مجذوبیت کے پیکر تھے۔ عموماً وہ یہاں آتے رہتے توجہ جلسے میں تقریر کرتے ہوئے یہ کیفیت کبھی کبھی طاری ہو جاتی اور فرماتے ”تار کٹ جاتی ہے“ تقریر کے دوران کوئی اٹھتا تو فوراً بیٹھ جانے کو کہتے اور فرماتے کہ میرا تار کٹ جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص جب پوری توجہ اور انہماک سے اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی مدد ہوتی ہے۔ مقرر اور مدرس کا شرح صدر ہوتا ہے۔ لیکن درمیان میں گڑبڑ اور آداب مجلس کے خلاف کوئی کام ہو جائے تو یہ سلسلہ کٹ جاتا ہے۔ اس لئے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب اس شخص نے بات کی۔ تو نبی کریم ﷺ کی اس کیفیت اور توجہ واستغراق میں فرق آ گیا۔ جس کی وجہ سے اس معجزہ سے محروم ہونا پڑا۔ ملا علی قاریؒ کہتے ہیں۔ کہ انبیاء علیہم السلام و اولیاء کرام کے ہاتھ پر خرق عادت امور کا ظہور حالت فناء میں ہوتا ہے۔ ان کو اس حالت میں اور تو اور خود اپنے آپ کا احساس تک نہیں ہوتا ہے۔ اور جب یہ احساس ختم ہونے لگے۔ توجہ تبدیل ہو جاتی ہے تو خرق عادت امور بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ یہاں بھی خادم سے مکالمہ اور رب سے انقطاع ربط معجزہ کی انہماک کا سبب بنا۔ واللہ اعلم

(۱۹) حَدَّثَنَا ابْنُ مُحَمَّدٍ الزَّعْفَرَانِيُّ ثَنَا يَحْيَى بْنُ عُبَادٍ بْنُ فُلَيْحٍ ابْنُ سُلَيْمَانَ قَالَ حَدَّثَنِي رَجُلٌ مِنْ عِبَادٍ يُقَالُ لَهُ عَبْدُ الْوَهَّابِ بْنُ يَحْيَى بْنُ عُبَادٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الزَّبِيرِ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا كَانَ الدَّرَاعُ أَحَبَّ لِلْحَمِّ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ وَلَكِنَّهُ كَانَ لَا يَجِدُ اللَّحْمَ إِلَّا غَبًّا وَكَانَ يَعْجَلُ إِلَيْهَا لِأَنَّهَُا أَعْجَلُهَا نَضِجًا (۱).

ترجمہ: حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ذراع کا گوشت (لذت کی وجہ سے) حضور کو زیادہ پسند نہ تھا لیکن چونکہ آپ ﷺ کی رسائی گوشت تک کبھی کبھی ہوتی تھی۔ اور آپ کو گوشت کھانے کی جلدی ہوتی تھی (تاکہ دیگر مشاغل کے لیے جلدی فارغ ہوں) اور گوشت میں ذراع سب سے جلدی پکنے والی ہوتی ہے (اس لیے آپ ﷺ اسے پسند فرماتے تھے)

ذراع کے گوشت سے محبت کا سبب: ما كانت الذراع الخ اس حدیث میں حضرت عائشہ اس بات کی نفی نہیں کرتیں کہ آپ ﷺ کو ذراع کا گوشت پسند نہ تھا۔ بلکہ دراصل اس پسندیدگی کی سب سے اہم وجہ بیان فرما رہی ہیں۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ بعض اوقات کوئی شخص لذیذ اور مرغین کھانوں کا ہر وقت شوقین ہوتا ہے۔ اور یہی اس کی زندگی کا اہم مقصد ہوتا ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ ایسے نہ تھے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں جو بھی میسر ہوتیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا فرماتے۔ اس کے باوجود ذراع کی مرغوبیت کی متعدد وجوہ میں سے حقیقی وجہ اور سبب یہ ہے۔ کہ آپ ﷺ کو روز روز گوشت نہیں ملتا تھا۔ کبھی تو دو دو مہینے گھر میں آگ بھی نہ جلتی بلکہ اسودین یعنی کجور اور پانی پر گزارہ ہوتا تھا۔ شاذ و نادر کبھی گوشت میسر ہوتا جو گھر پکتا۔ یا کہیں دعوت میں واسطہ پڑتا۔ اور انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ جو چیز مدت کے بعد میسر ہو انسان اسے جلد ہی کھانے کو پسند کرتا ہے۔ ایسے موقع پر انتظار کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

(۱) جامع ترمذی ۵/۲ کتاب الاطعمۃ باب ما جاء فی ای اللحم کان احب الی رسول

اللہ ﷺ (مختار)

آج بھی جبکہ گوشت لوگوں کو بکثرت ملتا ہے۔ جب لوگ قربانی کرتے ہیں۔ تو جلدی پکنے والا گوشت الگ کر کے جلدی جلدی پکا لیتے ہیں۔ باقی گوشت کے پکنے کا انتظار کرنے کی بجائے یہ گوشت پہلے کھا جاتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ بھی ایسی ہی طبعی تقاضے کی بناء پر جلدی پکنے والے گوشت کو کھانے میں مقدم فرماتے تھے۔ اور پکنے میں ذراع کا گوشت کم وقت لیتا ہے۔ اس لیے آپ ﷺ اس کو پسند فرماتے تھے۔

گوشت خوری فطرۃ انسانی: نبی کریم ﷺ بشری تقاضوں سے عاری نہ تھے۔ ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی شکرگزاری میں سب سے پیش پیش تھے۔ اور شکر سے پہلے طبعی تقاضوں کی پاسداری کرنی پڑتی ہے۔ رہبانیت سے کنارہ کش ہونا پڑتا ہے۔ اور گوشت کی طرف دل کی رغبت انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ نہ یہ زہد و قناعت سے متصادم ہے نہ مذہب سے اس کا ٹکراؤ ہے۔ کسی آسمانی مذہب نے کبھی اس سے منع نہیں کیا۔ اگرچہ انسانی دماغ کے ایجاد شدہ مذاہب آج بھی گوشت کھانا ناجائز اور مکروہ خیال کرتے ہیں۔ ہمارے قریب ہندوستان ہی میں لاکھوں بلکہ کروڑوں انسان اس قسم کے افکار و عقائد رکھتے ہیں۔ گوتم بدھ کی تو ساری تعلیمات کا محور یہی تھا۔ کہ گوشت کھانا ظلم اور حیوانات کے ساتھ زیادتی ہے۔

یہ بھی عجیب فلسفہ ہے جس پر ان مذاہب کی بنیاد ہے۔ بلکہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی بعض جاہل توہمات کی دنیا آباد کئے ہوئے ہیں۔ پچھلے دنوں جرمنی میں ایک بڑی پارٹی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ گوشت کو چھوڑ کر سبزیاں اور ترکاریاں کھائیں گے۔ کیونکہ گوشت خوری ظلم ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر تمہارے خیال میں یہ جانوروں پر ظلم ہے تو حیوانات کی طرح نباتات بھی تو آخر شعور رکھتی ہیں اور جدید تحقیقات سے یہ بات قطعی طور پر ثابت کی جاتی ہے کہ نباتات میں ایک قسم کی حیات اور حس موجود ہے۔ بلکہ وہ آوازوں کو سنتے ہیں اور یہ تو مشاہدہ ہے کہ بعض پھول ہاتھ لگتے ہی مرجھا جاتے ہیں یا بند ہو جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں ان میں باقاعدہ تَلْقِیْح کا عمل ہوتا ہے۔ ان میں ایک گونہ جماع، حمل اور بیج اور تخم کا استقرار تو مستلزم باتیں ہیں۔ یورپ میں اس بات پر بھی تحقیق کی گئی ہے کہ بعض پودے موسیقی اور گانوں سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اور یہ ان کی نشوونما اور وجد و مستی کا سبب بنتی ہیں۔ بہر حال نباتات میں شعور کا وجود اب ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ لہذا ان میں اور جانوروں میں فرق نہیں ہوگا۔ بلکہ زمین میں بھی آخر ایک قسم کا

شعور ہے۔ تو اس پر کوٹنا، چلنا پھرنا اور اسے چیرنا پھاڑنا کیا ظلم نہ ہوگا۔ اسی طرح دودھ دے اور تمام ماکولات اور مشروبات یہاں تک کہ پانی بھی جراثیم، بیکٹیریا اور جنین سے بھری ہوئی ہیں جو ذی حیات چیزیں ہیں۔ ایک گلاس دودھ کو خوردبین سے دیکھیں تو کروڑوں اربوں زندہ اشیاء تیرتی نظر آتی ہیں۔

حاصل یہ کہ دوسری مخلوقات سے استفادہ گناہ سمجھا جائے تو پھر تو خدا کی خدائی سے نکلنا پڑے گا کیونکہ ہر مخلوق ایک حد تک باشعور ہے۔

آریہ سماج نے جب گوشت خوری کے خلاف تحریک چلائی اور مسلمانوں کو اس بنا پر ظالم سمجھنے لگے۔ تو جواب میں ہمارے اکابر حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ اور اس کے ساتھیوں کو میدان میں آنا پڑا۔ حضرت نانوتویؒ نے اس سلسلے میں ”تحفہ لجمیہ“ نامی کتاب لکھی۔ جس میں گوشت کھانے کے جواز کے دلائل اور فوائد لکھے۔ امام غزالیؒ نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ گوشت بدن کو صاف رکھتا ہے اور اخلاق میں حسن پیدا کرتا ہے۔ اور جس شخص نے چالیس روز تک مسلسل گوشت نہیں کھایا اس کے اخلاق خراب ہو جاتے ہیں (مواہب لدنیہ ص ۱۲۵، (جمع الوسائل ج ۱ ص ۲۵۸)

بہر حال گوشت کھانا انسانی فطرت، آسمانی مذاہب اور اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے (۱)۔ اور اسی وجہ سے آپ ﷺ کو گوشت پسند ہوتا تھا۔ پھر خصوصاً مذکورہ وجہ کی بنا پر جلدی پکے والا گوشت زیادہ مرغوب ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں رسول اللہ ﷺ کی زندگی بہت معروف ہوتی تھی۔ وقت کی پابندی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ لکل شیء عنده عتاد۔ کیونکہ آپ ﷺ کے اعمال میں بیک وقت عبادت، جہاد، تعلیم، تبلیغ اسلام اور مملکت وغیرہ کے امور ہوتے تھے۔ چنانچہ جس حصہ کے پکے میں وقت کم لگتا تھا۔ وہ اس وجہ سے بھی زیادہ پسند ہوتا تھا۔ کہ اس میں وقت کی بچت ہوتی تھی۔

یہاں پر امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے بقول حضور ﷺ کے انتخاب کا سبب سرعت نفع یعنی جلدی پکنا ہے۔ مگر حضور ﷺ کی محبت کا سبب اس کے ساتھ ساتھ استلذذ یاد دیگر اسباب بھی ہو سکتے ہیں۔ گویا اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کہ ذرا ع کی محبوبیت کی یہ وجہ حضرت عائشہؓ کی ذاتی رائے ہے۔

(۱) مرغی، بھینز، بکری، اونٹ، خرگوش اور جبارئی (کلور) اور تیز کا گوشت تناول فرمانا آپ ﷺ سے ثابت ہے۔

علامہ ابن حجرؒ نے بھی تصریح کی ہے کہ یہ حضرت عائشہؓ کی ذاتی رائے ہے۔ ورنہ سابقہ احادیث سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ گوشت ملے یا نہ ملے۔ ذرا ع سے آپ ﷺ کی طبیعت تھی۔

بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ بظاہر حضرت عائشہؓ کا مقصد یہی بیان کرنا ہے کہ نبی کریم ﷺ لذتوں کے پیچھے پڑنے والے نہ تھے۔ اور محبوبیت کا مدار استلذ از نہیں بلکہ سرعت نفع تھا۔ لیکن حق یہ ہے کہ لذیذ چیز کو لذت کی بنا پر پسند کرنا بھی کوئی عیب نہیں بلکہ بشریت کا تقاضا ہے۔ البتہ محض لذت کو سبب ترجیح بنا کر ضروریات پر مقدم کرنا بڑی بات ہے۔

بائیں ہمہ حضرت عائشہؓ کی دقیقہ سنجی اور رفیق حیات کی حراج شناسی پر اعتماد کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سابقہ احادیث سے پسندیدگی ثابت ہوتی ہے۔ جس کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں کہ یہ قطعہ لحم باقی تمام اعضاء کی نسبت محبوب تر بھی ہو سکتا ہے کہ محبت واستلذ از کسی اور قطعہ لحم سے ہو جیسے کہ بعد کی حدیث میں آتا ہے کہ اطیب اللحم لحم الظهر۔ وہاں اطیب کا لفظ ریڑھ کی ہڈی کے گوشت کو ذرا ع پر ترجیح دینے میں مضرع ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ کا تجزیہ معقول و مقبول ہے۔ واللہ اعلم

(۲۰) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ غِيلَانَ ثنا أَبُو أَحْمَدَ ثَنَا مَسْعُورٌ قَالَ سَمِعْتُ

شَيْخًا مِنْهُمْ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ جَعْفَرٍ يَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ

اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ أَطْيَبَ اللَّحْمِ لَحْمَ الظَّهْرِ (۱)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ گوشت میں

بہتر گوشت پیٹھ کا گوشت ہے۔

شیخا من فہم بنو فہم کے قبیلے کے اس شخص کا نام مجہول ہے۔ اس کی تعیین میں محدثین نے اپنی

اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا نام محمد بن عبداللہ ابورافع منہی ہے جبکہ بعض کے خیال میں

اس کا نام محمد بن عبدالرحمن ہے۔

(۱) السنن الکبریٰ للنسائی ۵۴/۳ کتاب الولیمة ابواب الاطعمة باب لحم الظهر، سنن ابن ماجہ

ص ۲۳۷ باب اطائب اللحم کتاب الاطعمة باب اطیب اللحم، شرح السنة للبغوی ص ۲۹۹ ج ۱

کتاب الاطعمة (مختار)

(۲) تطبیق روایات لحم ذراع لحم ظهر: ان اطيب اللحم لحم الظهر الخ اس روایت کے مطابق نبی کریم ﷺ کے نزدیک جانور میں سب سے اچھا گوشت پیٹھ کا گوشت ہے۔ پھلی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ذراع کے گوشت کو پسند فرماتے تھے۔ یہاں پیٹھ کے گوشت کو بہترین قرار دیا ہے۔ بظاہر اس تعارض کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ حیثیات اور وجوہ ترجیح مختلف ہوتی ہیں۔ ذراع کا گوشت جلدی پلکا ہے تو پیٹھ کا گوشت عموماً زمین سے دور رہنے کے سبب نرم ہوتا ہے۔ ماہرین کے قول کے مطابق جو گوشت زمین پر نہیں لگتا وہ نرم ہوتا ہے جبکہ پاؤں اور اطراف کا گوشت زمین کے ساتھ لگتا اور رگڑتا ہے۔ اس لئے اس میں قدرے سختی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں پیٹھ کا گوشت میٹھا اور ریشوں سے پاک ہوتا ہے۔ ویسے بھی ہڈیوں کا گوشت دوسرے قسم کے گوشت کی نسبت بہتر ہوتا ہے۔ کیونکہ ہڈی کی لذت، حلاوت اور قوت بھی اس میں شامل ہوتی ہے۔ نیز اسے دانتوں سے نوح کر کھایا جاتا ہے جس سے لذت دو بالا ہو جاتی ہے۔

اس حدیث میں ریڑھ کی ہڈی کے گوشت کو اطیب کہا گیا ہے۔ جس کے معنی لذیذ ترین، بہترین کئے گئے ہیں۔ بعض شراح اطہر اور بعض نے اہل کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ تمام معانی اس حصے کے گوشت کی ترجیح پر دلالت کرتے ہیں۔

اس طرح بعض احادیث میں آپ ﷺ سے لحم الرقبۃ یعنی گردن کی ہڈی کے گوشت کی تعریف بھی منقول ہے۔ مختلف مواقع پر مختلف حیثیتوں سے آپ ﷺ نے مختلف اعضاء کو پسند فرمایا ہے۔ لہذا اسے تعارض نہیں کہا جاسکتا۔

بعض اعضاء کو آپ ﷺ نے مکروہ کہا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک روایت ہے کہ کان المصطفیٰ مکروہ من الشاة سباعا المرارة والمثانة والحیاء والذکر والانثیین والغدة والدم (۱) نبی کریم ﷺ ونبے میں سات اعضاء تلی، مثانہ، فرج، ذکر، فوطے، غدود اور خون کو مکروہ سمجھتے تھے اسی طرح ایک حدیث میں گردوں کی کراہت کا ذکر بھی آیا ہے۔

(۲۱) حَدَّثَنَا سَفْيَانُ بْنُ وَكَيْعٍ ثَنَا زَيْدُ بْنُ الْحَبَابِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الْمُؤْمَلِ عَنْ ابْنِ أَبِي مَلِيكَةَ عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ نَعَمْ الْإِدَامُ الْخَلُّ (۱).

ترجمہ: حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سرکہ بہترین سالن ہے۔

خل (سرکہ): نعم الا دَامُ الخَل یعنی سرکہ بہت اچھا سالن ہے۔ ترمذی میں نبی کریم ﷺ کے بارے میں آیا ہے کہ آپ ﷺ اچھے کھانوں کی تعریف اور مدح میں وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ ہاں کبھی کبھی میزبان کی دلدادہی یا مہمان کی خاطر مدارت کے لیے تحسین بھی فرمایا کرتے تھے، لیکن اس مقام پر سرکہ کی مدح کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ سرکہ کو شاید لوگ سالن ہی نہ سمجھیں۔ اور سرکہ ملنے کے وقت ناشکری کے مرکب ہوں۔ تو دراصل آپ ﷺ مخاطبین کو یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ سرکہ اگرچہ بظاہر حقیر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں بلکہ یہ تو ایک نعمت ہے۔ اور بہت اچھا سالن ہے۔

حدیث کی مزید تفصیل ابتدائی باب میں گزر چکی ہے۔

(۲۲) حَدَّثَنَا أَبُو كَرِيبٍ ثَنَا أَبُو بَكْرِ بْنُ عِيَاشٍ عَنْ ثَابِتِ أَبِي حَمْزَةَ الشَّامِيِّ عَنْ أُمِّ هَانِئٍ قَالَتْ دَخَلَ عَلَيَّ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ أَعْنَدُكَ شَيْءٌ فَقُلْتُ لَا إِلَّا خَبْزَ يَابَسٍ وَ خَلٌ فَقَالَ هَاتِي مَا أَقْفَرُ بَيْتَ مَنْ أَدَمَ فِيهِ خَلٌ (۲).

ترجمہ: حضرت ام ہانیؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ (فتح مکہ کے موقع پر) میرے پاس تشریف لائے۔ اور فرمایا کہ تیرے پاس کوئی (کھانے کی) چیز ہے میں نے عرض کیا سو کھی روٹی اور سرکہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ فرمایا وہ لے آؤ۔ وہ گھر جس میں سرکہ ہو سالن سے خالی نہیں ہے۔

(۱) تفردہ الإمام الترمذی جامع ترمذی ۶/۲ ابواب الأطعمة باب ما جاء في الخَل (مختار)

(۲) جامع ترمذی ۶/۲ کتاب الأطعمة باب ما جاء في الخَل، شرح السنة للبغوی ۱۱/۳۱۰ رقم

حدیث ۲۸۶۷ ابواب الأطعمة باب الخَل، المستدرک للحاکم ۴/۵۴ (مختار)

کے معنی ہے خالی ہونا۔ جبکہ بعض فاء کی تقدیم کے ساتھ فقر کو اس کا مادہ کہتے ہیں (۱)۔ اور الفقر الرجل جس طرح کہ مال سے خالی ہونے کو کہتے ہیں۔ اس طرح افقر الدار کا بھی یہی معنی ہوگا کہ وہ گھر غیر آباد اور خالی ہو گیا۔ فیہ خل یہ بیت کی صفت ہے۔ اور صفة وموصوف کے درمیان فصل بالاجنبی بشرطیکہ وہ اجنبی ایسا ظرف ہو جو موصوف کے عامل کا معمول اور اس سے متعلق ہو جائز ہے۔ اور یہاں بھی ”من ادم“ فقر سے متعلق ہوگا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ من ادم بھی بیت کی صفت ہے۔ کیونکہ ادم چڑے کو کہتے ہیں اور بیت من ادم سے مراد چڑے کا بتا ہوا خیمہ مراد ہوگا۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا۔ کہ چڑے کا بتا ہوا گھر جس میں سرکہ ہو خالی شمار نہ ہوگا۔ لیکن اکثر شراح نے پہلی توجیہ کو ترجیح دی ہے۔

(۲۳) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى قَالَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ ثَنَا شُعْبَةُ

عَنْ عَمْرِو بْنِ مَرْوَةَ عَنْ مَرْوَةَ الِهْمْدَانِيَّ عَنْ أَبِي مُوسَى عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ

فَضَّلَ عَائِشَةُ عَلَى النِّسَاءِ كَفَضَلَ الثَّرِيدُ عَلَى سَائِرِ الطَّعَامِ (۲)۔

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حضرت عائشہؓ کی دوسری عورتوں پر ایسی فضیلت ہے جیسے ثرید کی فضیلت (دوسرے تمام) کھانوں پر۔

(۲۴) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ حَجْرٍ ثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ جَعْفَرٍ ثَنَا عَبْدِ اللَّهِ بْنُ

عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ مَعْمَرٍ الْإِنصَارِيُّ أَبُو طَوَالَةَ أَنَّهُ سَمِعَ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ

يَقُولُ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَضَّلَ عَائِشَةُ عَلَى النِّسَاءِ كَفَضَلَ الثَّرِيدُ

عَلَى سَائِرِ الطَّعَامِ (۳)۔

(۱) لیکن شراح نے روایت اور دروایت سے غلط کہا ہے۔ والخصمیل فی جمع الوساکیل ج ۱ ص ۲۶۸ (اصلاح الدین)

(۲) صحیح بخاری کتاب احادیث الانبیاء باب قول اللہ تعالیٰ وضرب اللہ مثلاً للذین، المسنن الکبریٰ ۵/۲۸۳ کتاب عشرة النساء باب حب الرجل بعض نسائه، جامع الترمذی ۵/۲ کتاب الاطعمہ باب ما جاء فی فضل الثرید علی الطعام (مختار)

(۳) صحیح بخاری ۱/۵۳۲ کتاب الفضائل الصحابة باب فضل عائشة، صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابة باب فضل عائشة، جامع ترمذی ۲/۲۲۱ کتاب المناقب باب فضل عائشة، سنن ابن ماجہ ص ۲۳۶ کتاب الاطعمہ باب فضل الثرید علی الطعام (مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا حضرت عائشہؓ کی

دوسری عورتوں پر ایسی فضیلت ہے جیسے ثرید کی فضیلت (دوسرے تمام) کھانوں پر۔

کفصل الثرید علی سائر الطعام او پر کی دونوں حدیثوں کی سیاق سے ثرید کی فضیلت معلوم

ہوتی ہے کیونکہ آپ ﷺ نے افضل النساء حضرت عائشہؓ کو ثرید سے تشبیہ دی ہے۔ گویا ثرید کی فضیلت تو

معلوم و مشاہد ہے اور اس سے یہ بات ضمناً ثابت ہو رہی ہے کہ آپ ﷺ نے ثرید کھایا ہوگا۔ ورنہ پھر تشبیہ

کیسے دیدی۔ اور اسی میں ترجمہ الباب سے مطابقت ہے۔ لہذا امام مناویؒ کا یہ قول کہ وهذا الحديث

بعید المناسبة بالباب مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

ثرید اس کھانے کو کہا جاتا ہے جس میں گوشت اور روٹی کو خوب ریزہ ریزہ کر کے سالن میں ڈال

دیا جائے۔ یہ کھانا مقوی لذیذ و مضم اور معدے کے لیے غیر مضر ہوتا ہے۔ نیز اس کے کھانے میں سہولت

ہوتی ہے اور کھانے والا تھوڑے وقت میں بقدر کفایت کھا کر فارغ ہو جاتا ہے۔ اور انہی اوصاف کی بنا پر

ثرید کو فضیلت بھی حاصل ہے۔

فضیلت ام المؤمنین عائشہؓ: دراصل اس حدیث میں تمام عورتوں پر حضرت عائشہؓ کی فضیلت کا بیان

ہے۔ ازواج مطہراتؓ بلکہ تمام عورتوں میں ان کو بڑا مقام حاصل تھا۔ اور بہت حیثیتوں سے ان کو دوسری

عورتوں پر برتری حاصل ہے۔ حضرت خدیجہؓ اور حضرت فاطمہ الکبریٰؓ کے فضائل کتب میں مذکور ہیں۔ لیکن

آپ کو بھی بے شمار فضائل حاصل ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت خدیجہؓ مرتبہ میں حضرت عائشہؓ سے مقدم تھیں۔ لہذا یہاں پر نساء

سے مراد نساء زمانہا ہے۔ یعنی اپنے زمانہ کی عورتوں پر حضرت عائشہؓ کو فضیلت حاصل ہے۔ اس طرح

حضرت خدیجہؓ الکبریٰؓ مفضول عورتوں سے نکل جاتی ہیں کیونکہ وہ تو پہلے وفات پا چکی تھیں اور اپنے زمانہ

کے ازواج مطہراتؓ نیز دیگر عورتوں میں آپ کو شرف و فضیلت اور بلند مرتبہ حاصل تھا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہؓ کو امت کی سہولت کی خاطر علم و فضل کی بڑی دولت سے مالا مال کیا۔

اور امت کو آپ سے بڑا فیض پہنچا۔ حضرت فاطمہؓ بھی نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد بہت جلد یعنی صرف

چھ ماہ بعد وفات پا گئیں۔ لیکن حضرت عائشہؓ خلافت راشدہ کے تمام ادوار میں زندہ رہیں۔ اور لوگوں کی علمی تفکلی بجاتی رہی۔ اس لیے اگرچہ حضرت خدیجہؓ اور حضرت فاطمہؓ بھی بجائے خود عظیم عورتیں تھیں۔ لیکن حضرت عائشہؓ کو علمی تبحر کی وجہ سے اپنے زمانہ کی تمام عورتوں پر برتری حاصل ہوئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ فضیلت کی بہت سی حیثیتیں ہوتی ہیں۔ مثلاً حضرت فاطمہؓ کو اس حیثیت سے فضیلت حاصل ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کا جزو ہیں۔ اور رضعیہ کے واسطے سے جو فضل آپ کو حاصل ہے وہ دوسری عورتوں کو حاصل نہیں۔ اور حضرت خدیجہؓ کو اس حیثیت سے فضیلت حاصل ہے کہ ایسے حالات میں جب نبی کریم ﷺ کا کوئی سہارا نہ تھا تبی دستی کے ان دنوں میں حضرت خدیجہؓ نے اپنا سب کچھ لٹا کر اسلام اور نبی کریم ﷺ کی خدمت کی۔ اللہ تعالیٰ نے ووجدک عائلاً فاغنیٰ۔ میں آپ کے مال ہی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اسلام لانے میں عورتوں میں تو کوئی بھی آپ سے سبقت نہ لے سکی۔ جبکہ بعض کا قول ہے کہ مردوں اور عورتوں سب میں پہلی مسلمان حضرت خدیجہؓ ہیں۔

وجوہ ترجیح فضیلت عائشہؓ: دوسری طرف حضرت عائشہؓ کو متعدد حیثیتوں سے فضیلت حاصل ہے۔ جن میں چند اہم درج ہیں۔

(۱) انتہائی درجہ کی فقاہت اور علمی دسترس کی حامل تھیں۔ تبحر علمی اور حافظہ و ذکاوت میں آپؓ اپنی نظیر آپ تھیں۔

(۲) نوعمری ہی میں آپ کو معاملہ فہمی اور دیگر مزایا و کمالات حاصل تھے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ میرے ساتھ بستر میں ہوں۔ تب بھی جبرئیل میرے پاس وحی لاتے ہیں۔ ازواج مطہرات میں آپؓ کی باری ہوتی تو وحی کثرت سے آتی۔ جس کا سبب یہ تھا کہ وحی سے بنی نوع انسان کو علم و فیض پہنچانا ہی مقصود تھا۔ اور نبی کریم ﷺ کے پاس کی یہ طالب علم زیادہ اخاذ اور ذہین تھی۔

(۳) نصف امت یعنی صنف نازک کی تو آپؓ ہی ترجمان تھیں۔ اور ان کے مسائل تو آپؓ ہی کے طفیل انہیں پہنچے۔ بلکہ مردوں کے بہت سے مسائل بھی آپؓ کے توسط سے مردوں کو پہنچے۔ چنانچہ وہ ماں ہونے کے علاوہ ہماری شیخ اور استاد بھی ہیں۔

(۴) وہ مکرمین فی الحدیث میں سے ہیں۔ یہ مرتبہ صحابہ میں سے بہت کم صحابہ کو حاصل ہے۔

(۵) ان کی براءت میں تقریباً دو رکوع قرآن مجید نازل ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے براءت کا یہ اعزاز فقط آپ ہی کا حصہ ہے۔ ان رکوعوں میں مذکورہ فضائل کی تفصیل تفاسیر میں مذکور ہے۔

(۶) ان کا نکاح آسمانوں میں طے ہوا۔

(۷) نکاح سے قبل ہی نبی کریم ﷺ کو ان کی تصویر دکھادی گئی۔ جو کہ اس زمانہ کی خرق عادت ٹیلی وژن کی مثال تھی۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جبرائیلؑ نے آکر میرے سامنے ایک رومال کھولا جس میں حضرت عائشہؓ کی تصویر بنی ہوئی تھی (۱)۔ اور بعض کہتے ہیں کہ حضرت جبرائیلؑ نے جھیلی دکھائی جس پر حضرت عائشہؓ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ ساتھ ساتھ جبرائیلؑ نے یہ بھی کہا کہ یہ آپ کی دنیا اور آخرت میں بیوی ہے۔ اور پھر آپ ﷺ سے حضرت عائشہؓ کا نکاح ہوا۔ حالانکہ اس سے قبل جبر بن مطعم بن عدی (۲) نامی ایک شخص سے حضرت عائشہؓ کے نکاح کی بات ہوئی تھی۔ بلکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس رشتہ کو جلدی طے کرنے کے لیے مطعم بن عدی سے رابطہ کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن چونکہ وہ کافر تھا۔ اس لئے وہ اس بات کو نالتا رہا۔ ادھر حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد حضرت خولہؓ جو حضرت عثمان بن مظعونؓ کی بیوی تھی۔ کی مدد سے نبی کریم ﷺ نے آپ کا رشتہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے طلب فرمایا۔ اور اس طرح آپ کو ام المؤمنین ہونے کا شرف حاصل ہوا (۳)۔

بہر حال دیگر صحابیات اور ازواج مطہرات پر بعض وجوہ کی بنا پر آپ کی افضلیت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ البتہ ان سیدات میں سے مطلقاً افضلیت کا شرف کس کو حاصل ہے۔ دلائل کے تعارض کی بنا پر توقف اور تفویض الی اللہ تعالیٰ سب سے مناسب ترین مسلک ہے (۴)۔

(۱) عن عائشہ أن جبرئیل جاء بمصور تھا فی خرقۃ حریر خضراء إلى النبی ﷺ فقال إن هذه زوجتك فی الدنيا والآخرة۔ ترمذی ج ۲ ص ۲۲۸ (اصلاح الدین)

(۲) حضرت جبر بن مطعمؓ حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے قبل اسلام لائے۔ (اصلاح الدین)

(۳) ابن حجرؒ نے الاصابہ میں حضرت عائشہؓ کے کچھ دیگر امتیازات و فضائل کا بھی ذکر کیا ہے۔ (اصلاح الدین)

(۴) كما قال الملا علی قاری والحاصل أن الحبثات مختلفۃ الروایات متعارضة والمسألة ظنیة والتوقف لا ضرر فیہ قطعاً فالتسلیم اسلم واللہ اعلم (جمع الوسائل ۱/ ۲۷۰) (اصلاح الدین)

(۲۵) حدثنا قتيبة بن سعيد انا عبد العزيز بن محمد عن سهيل ابن

ابي صالح عن ابيه عن ابي هريرة انه رأى رسول الله ﷺ توضأ من

ثور اقط ثم رآه اكل من كتف شاة ثم صلى ولم يتوضأ (۱).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ

نے پیڑ کا ایک بڑا ٹکڑا کھانے کی وجہ سے وضوء فرمایا۔ پھر اس کے بعد اس نے نبی

کریم ﷺ کو دیکھا کہ دہنے کے شانے کے گوشت سے کچھ تناول فرمایا۔ پھر نماز ادا کی

اور وضوء کی تجدید نہیں کی۔

من ثور اقط (۲) ثور پیڑ کے ٹکڑے یا پیڑ کے بڑے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ اور اقط قاف کے ضمہ،

کسرہ اور سکون تینوں صورتوں میں پیڑ کو کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پیڑ کا ٹکڑا کھالینے کے بعد آپ ﷺ نے وضوء کیا۔

وضوء مما مست النار کا فقہی مسئلہ: ثم صلى الله عليه وسلم صلى ولم يتوضأ یعنی گوشت

کھانے کے بعد آپ ﷺ نے وضوء کئے بغیر نماز ادا کی۔ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضوء لازم ہوتا

ہے یا نہیں۔ یہ فقہی مسئلہ ہے جمہور کا مذہب یہ ہے کہ مما مست النار کھانے سے وضوء لازم نہیں ہوتا۔ اس

حدیث میں جمہور کیلئے دلیل موجود ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے آخری بار وضوء نہیں کیا گویا یہ حکم کبھی

تھا۔ لیکن بعد میں منسوخ ہو گیا تھا۔ بلکہ یہ ممکن ہے کہ ابتداء پیڑ سے وضوء کرنے کا کوئی اور سبب ہو۔ مثلاً

آپ پہلے سے وضوء سے نہیں تھے یا آپ ﷺ نے استحباباً وضوء کیا ہوگا یا پھر یہاں پر وضوء لغوی مراد ہوگا۔

یعنی آپ ﷺ نے ہاتھ منہ دھویا ہو۔ لیکن نماز کے جواز کیلئے یہ بھی ضروری نہیں بلکہ استحباب کے درجہ میں

(۱) شرح معانی الآثار ۱/۶۷۷ ابن ماجہ ص ۳۷ کتاب الطہارۃ باب الرخصة في ذلك مسنن

نسائی ۱/۱۰۵، ۱۰۶، مسند احمد ۳۶۶ (مختار)

(۲) ثور الخ کے بارے میں علامہ مناویؒ نے لکھا ہے الثور هو قطعة من الشيء لأن الشيء اذا قطع من الشيء

ثار عنه وازال وفي القاموس الثور القطعة من الاقط فالاضافة لاغية وهو لبن يجمد بنار (المناوی علی

هامش جمع الوسائل ۱/۲۷۱ (مختار)

کی گئیں۔ تو حضرت دجیہ کلبیؓ نے نبی کریم ﷺ سے ایک باندی دینے کی درخواست کی آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ ایک باندی لے لو۔ چنانچہ وہ گئے اور حضرت صفیہؓ پر نظر انتخاب پڑی۔ ادھر نبی کریم ﷺ کو بتایا گیا کہ صفیہؓ بنی قریظہ اور بنو نظیر کی سردار زادی ہے۔ اور آپ ﷺ کے لائق ہے۔ تب نبی کریم ﷺ نے حضرت دجیہؓ کو حکم دیا کہ وہ حضرت صفیہؓ کی جگہ کوئی اور باندی لے لے۔ بلکہ ملا علی قاریؒ اور علامہ بیجوریؒ لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے حضرت دجیہؓ کو بدلہ میں سات باندیاں دیدیں۔ پھر اس کو آزاد کر کے نکاح کیا اور آزادی ہی کو مہر بنا دیا۔

علامہ ابن حجرؒ الاصابہ میں روایت کرتے ہیں کہ حضرت صفیہؓ نے خیبر میں خواب دیکھا کہ چاند اتر کر میری جھولی میں آگرا ہے۔ یہ خواب انہوں نے اپنی ماں (۱) سے بیان کیا۔ تو ماں نے ایک زوردار تھپڑ منہ پر مارتے ہوئے کہا کہ تو چاہتی ہے کہ عرب کے بادشاہ سے بیاہی جائے۔ اس تھپڑ کا اثر نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آنے تک ان کے چہرے پر موجود تھا۔ اس وقت آپؐ کی عمر تقریباً سترہ برس تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حسن سے بھی نوازا تھا۔ پہلی دفعہ مدینہ آنے کے بعد مدینہ کی عورتیں بکثرت دیکھنے کے لیے آپؐ کے ہاں آتی رہیں۔ حضرت عائشہؓ بھی نقاب اوڑھ کر اور دیگر عورتوں میں چھپ چھپا کر حارثہ بن نعمانؓ کے گھر دیدار کے لیے گئیں۔ جہاں پر قدم مدینہ کے دنوں حضرت صفیہؓ گور کھا گیا تھا۔

بتمرو و سوبق نکاح کے موقع پر آپ ﷺ نے راستہ ہی میں صحابہؓ کی دعوت و لیمہ کی۔ اور سفر کے دوران ہی ایک جگہ قیام کر کے کھجور اور ستو جو کچھ حاضر تھا حاضرین کو کھلایا۔ بخاری کی روایت میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے حبس کا ولیمہ کھلایا۔ حبس ایک قسم کا حلوا ہوتا ہے جو کھجور، ستو، گھی اور پنیر وغیرہ سے بنایا جاتا ہے۔ بعض روایات میں پنیر کا ذکر بھی ہے۔ لیکن ان روایات میں تطبیق آسان ہے۔ کیونکہ یہ دراصل ایک اجتماعی قسم کی دعوت تھی۔ آپ ﷺ نے دسترخوان بچھا کر سب کو دعوت دیدی۔ اور آنے والے صحابہؓ اپنے ساتھ کئی چیزیں لائیں۔ کوئی کھجور لایا تو کوئی ستو۔ کسی نے پنیر کا حصہ شامل کر دیا تو کسی کے پاس حبس ہوگی جو پیش کر چکا ہوگا اور پھر اجتماعی طور پر کھالیا۔ اسی لئے روایات میں مختلف اشیاء کا ذکر ہے۔

(۱) علامہ بیجوریؒ نے ماں کی جگہ باپ کا ذکر کیا ہے۔ لیکن الاصابہ میں ماں کا ذکر ہے۔ (اصلاح الدین)

(۲۷) حدثنا الحسن بن محمد البصري ثنا الفضيل بن سليمان
 حدثني فائد مولى عبيد الله بن علي بن أبي رافع مولى رسول الله ﷺ
 قال حدثنا عبيد الله بن علي عن جلدته سلمى أن الحسن بن علي وابن
 عباس وابن جعفر أتوها فقالوا لها اصنعي لنا طعاما مما كان يعجب
 رسول الله ﷺ ويحسن اكله فقالت يا بني لا تشتهييه اليوم قال بلى
 اصنعيه لنا قال فقامت فاخذت شيئا من الشعير فطحنه ثم جعلته في
 قدر و صبت عليه شيئا من زيت و دقت الفلفل والتوابل فغربته اليهم
 فقالت هذا مما كان يعجب النبي ﷺ ويحسن اكله (۱).

حضور اقدس ﷺ کے ساتھ کھانے کا عملی نمونہ:

ترجمہ: سلمیٰ کہتی ہیں کہ حسن بن علیؓ، حضرت عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن جعفرؓ
 ان کے پاس آئے۔ اور کہا کہ ہمارے لئے وہ کھانا تیار کر لو جو حضور ﷺ کو پسند تھا۔ اور
 آپ ﷺ اسے رغبت سے کھاتے تھے۔ سلمیٰ نے کہا کہ بیٹے! آج تم وہ کھانا پسند نہیں
 کرو گے۔ انہوں نے کہا کہ کیوں نہیں۔ تم ہمارے لیے پکاؤ (تو) وہ انھیں اور کچھ جو
 لے کر اسے پیسا۔ پھر اسے ہانڈی میں ڈالا اور اوپر سے زیتون کا تیل تھوڑا ڈال دیا۔
 اور کچھ مریج مصلح بھی پیس کر ملا دیا پھر ان کے سامنے پیش کیا۔ اور کہا کہ یہ کھانا ہے جو
 نبی کریم ﷺ کو پسند ہوتا تھا اور آپ ﷺ اسے رغبت سے تناول فرماتے تھے۔

حضرت سلمیٰ سلمیٰ حضرت صفیہ بنت عبدالمطلبؓ کی آزاد کردہ اور ایک قول کے مطابق خود
 نبی کریم ﷺ کی آزاد کردہ باندی تھیں۔ اور نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ابو رافعؓ کی بیوی تھی۔
 نبی کریم ﷺ کی خدمت کیا کرتی تھی۔ بالخصوص کھانا پکانے میں ازواج مطہرات کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ علاوہ
 ازیں اہل بیت کے بچوں کی خدمت بھی آپؐ کے سپرد تھی۔ حضرت ابراہیم بن النبی ﷺ اور حسینؓ کی بچپن
 میں خدمت کی۔ حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد غسل بھی آپؐ نے دیا۔

یابنی بعض شراح کہتے ہیں کہ یہ باء کے فتح اور نون کے کسرہ کے ساتھ جمع کا میضہ ہے۔ جو یاء متکلم کی طرف مضاف ہے۔ اصل میں بنین تھا۔ لیکن اکثر شراح نے اسے مفرد مصغر مضاف الی یاء المتکلم قرار دیا ہے اور یہی رائج بھی ہے۔ کیونکہ بعد میں تصحیہ کا میضہ بھی مفرد مخاطب کا ہے۔ گویا حضرت سلمیٰؓ نے تینوں میں سے کسی ایک کو مخاطب کیا جو کہ درخواست پیش کرنے والے تھے۔ یا ان میں سے سے بڑے یعنی حضرت حسن بن علیؓ کو مخاطب کیا تھا۔

لا تشعہیہ الیوم مطلب یہ ہے کہ تم یہ مطالبہ چھوڑ دو۔ تم اس زمانے کے نہیں ہو۔ وہ تکلیف برداشت نہیں کر سکتے جو کہ نبی کریم ﷺ برداشت کیا کرتے تھے۔ آج تم وہ کھانا کھانا پسند نہیں کرو گے۔ کیونکہ زمانہ بدل گیا ہے۔ وسعت اور فراخی آچکی ہے۔ اس لئے وہ فھر کا کھانا کون پسند کرے گا۔ ہمارے یہاں بھی یہی حالت ہے۔

ہمارے حضرت شیخ الحدیثؒ (والد ماجد) فرماتے تھے کہ مجھ کے علاقے میں ہم نے طالب علمی کے دوران جوار اور باجرے کی روٹی اور لسی سے روزے رکھے ہیں۔ چارے کا ساگ پکایا کرتے تھے۔ حضرت نانوتویؒ اور حضرت علامہ گنگوہیؒ دہلی میں بھوک کی شدت کی وجہ سے رات کو شہر سے باہر نکلتے اور سبزی فروش جو خراب سبزی باہر پھینک دیتے تھے۔ اس سے قابل استعمال سبزی جمع کر کے پکاتے اور کھا لیتے۔ جبکہ آج ہم نہایت محکم کی زندگی گزار رہے ہیں۔

بہر حال حضرت سلمیٰؓ نے بھی یہ فرمایا کہ آج تمہارا دل اس کھانے کو نہیں چاہے گا۔ اب محکم کا زمانہ ہے کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا کے تمام مسلمان اہل بیت پر جان چڑھتے تھے۔ نبی ﷺ کے ساتھ نسبت کے سبب تمام صحابہ بھی ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ تو چونکہ یہ حضرات لذیذ اور اچھے کھانے دیکھ چکے تھے اس لئے حضرت سلمیٰؓ نے کہہ دیا کہ تم وہ پسند نہیں کرو گے۔ ہلی اصنعہ لنا الخ تینوں حضرات نے اپنی فرمائش دہرائی کہ نہیں بلکہ ہمارے لیے وہ کھانا تیار کرو ہم ضرور کھائیں گے۔ جس پر حضرت سلمیٰؓ نے اٹھ کر جولیا۔ اسے پیسا۔ پھر اسے ہانڈی میں ڈال کر تیل زیتون تھوڑی مقدار میں ملا دیا۔ پھر سیاہ مرچ اور مصالحہ ملا کر اسے ابالا (۱)۔ اس سے جو کھانا تیار ہوا حضرت سلمیٰؓ کے قول کے مطابق یہی نبی کریم ﷺ کی محبوب غذا تھی۔

(۱) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرچ مصالحہ اور لذیذ کھانا خلاف سنت نہیں۔ (مخار)

(۲۸) حدثنا محمود بن غيلان ثنا أبو أحمد ثنا سفيان عن الأسود بن قيس عن نبيح العنزي عن جابر بن عبد الله قال اتانا النبي ﷺ في منزلنا فذهبنا له شاة فقال كانهم علموا اننا نحب اللحم وفي الحديث قصة (۱)۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہمارے پاس ہمارے گھر تشریف لائے ہم نے ایک دنبہ ذبح کر دیا۔ نبی کریم ﷺ نے (مترجا) فرمایا کہ گویا ان لوگوں کو پتہ تھا کہ ہمیں گوشت پسند ہے (امام ترمذی کہتے ہیں کہ) اس حدیث میں قصہ ہے (جو اختصاراً متروک ہے)

لذبحنا له شاة اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے آنے کے بعد حضرت جابرؓ نے دنبہ ذبح کر دیا جبکہ غزوہ خندق کے قصہ میں تصریح ہے کہ وہاں نبی کریم ﷺ کے آنے سے قبل ہی کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس لیے بعض شراح جیسے علامہ مناویؒ وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہ کوئی اور واقعہ ہے۔ لیکن ملا علی قاریؒ نے اس کا تین طرح سے جواب دیا ہے۔ اول یہ کہ یہاں انسانا سے مراد ”اراد ان یاتینا“ ہوگا۔ دوم: یہ کہ ہو سکتا ہے کہ غزوہ خندق کے موقع پر جب حضرت جابرؓ نے دیکھا کہ خلاف توقع آنے والے صحابہ بہت زیادہ ہیں۔ تو دوسرا دنبہ نبی کریم ﷺ کی آمد کے بعد ذبح کیا ہو۔ سوم: یہ کہ ہو سکتا ہے اسی روز نبی کریم ﷺ پہلے اتفاقاً یا کسی دوسرے کام کی غرض سے حضرت جابرؓ کے پاس آئے ہوں۔ اور واپسی کے بعد حضرت جابرؓ نے دنبہ ذبح کر کے دوبارہ کھانے پر آپ ﷺ کو بلایا ہو۔

كانهم علموا الخ یہ محض میزبان کی دلدادگی اور اس عمل پر اظہار مسرت کے طور پر فرمایا۔

معجزہ نکشیر طعام: وفي الحديث قصة الخ وہ قصہ یہ ہے کہ غزوہ خندق کے موقع پر حضرت جابرؓ نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ سخت بھوکے تھے۔ تو آپ ﷺ کو کھانا کھلانے کا ارادہ کیا۔ گھر گئے دنبہ ذبح کیا۔ اور

(۱) سنن ابی داؤد کتاب الصلوٰۃ باب الصلاة على غير نحر المرأة، مسند احمد ۳/۳۰۳، السنن

الكبرى للنسائي كتاب اليوم واليلة، سنن دارمی ۲/۵۲، صحيح ابن حبان رقم الحديث ۵۹۱

بیوی کو کھانا پکانے کا حکم دیا۔ خود چھپکے سے نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور انہیں دعوت دی کہ میں نے طعام کا بندوبست کیا ہے۔ آپ ﷺ تشریف لے آئیں۔ نبی کریم ﷺ نے تمام صحابہ میں اعلان فرمایا کہ حضرت جابرؓ نے دعوت کا اہتمام کیا ہے سب آؤ، اور تقریباً ایک ہزار افراد کو لے کر نبی کریم ﷺ حضرت جابرؓ کے گھر گئے حضرت جابرؓ یہ دیکھ کر سخت پریشان ہوئے کہ میں نے تو ایک چھوٹی سی ہانڈی پکانے اور چند آدمیوں کا کھانا تیار کرنے کا کہا ہے۔ اب یہ سینکڑوں آدمیوں کے لیے کیسے کافی ہوگا۔ گھر دوڑے آئے بیوی کو ماجرا سنایا اس نے کہا کہ اگر یہ نبی کریم ﷺ نے بلائے ہیں تو خود ہی وہ انتظام بھی فرمائیں گے۔ وہ جانے اور ان کا کام جانے۔ اب ہو سکتا ہے کہ گھر آ کر حضرت جابرؓ نے دوسرا دنبہ بھی ذبح کیا ہو۔ پھر نبی کریم ﷺ آئے تو حکم دیا کہ ہانڈی پر ڈھکنا رکھ دو۔ کھانے پر بھی دم کیا۔ حضرت جابرؓ نے تمام صحابہ کو کھلایا۔ وہ قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ان کی ہانڈی پہلے کی طرح بھری ہوئی تھی یعنی ان کو اس میں کسی کمی کا احساس نہیں ہوا۔

اس میں کشیر طعام کا معجزہ بھی ظاہر ہوا جو کئی بار نبی کریم ﷺ سے صادر ہوا ہے۔

(۲۹) حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِي عُمَرَ ثَنَا سَفْيَانُ ثَنَا عَبْدِ اللَّهِ بْنُ مُحَمَّدٍ بْنُ عَقِيلٍ سَمِعَ جَابِرَ أَوَّلَ سَفْيَانَ وَأَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُنْكَدَرِ عَنْ جَابِرٍ قَالَ خَرَجَ رَسُولُ اللَّهِ وَأَنَا مَعَهُ فَدْخَلَ عَلَى امْرَأَةٍ مِنَ الْأَنْصَارِ فَلَذَبَحَتْ لَهُ شَاةً فَاكَلَ مِنْهَا وَاتَّهَ بِقِنَاعٍ مِنْ رَطْبٍ فَاكَلَ مِنْهُ ثُمَّ تَوَضَّأَ لِلظُّهْرِ وَصَلَّى ثُمَّ أَنْصَرَفَ فَاتَّهَ بِعِلَالَةٍ مِنْ عِلَالَةِ الشَّاةِ فَاكَلَ ثُمَّ صَلَّى الْعَصْرَ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ (۱)۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک بار نبی کریم ﷺ گھر سے نکلے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ ایک انصاری عورت کے مکان پر تشریف لے گئے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے لیے ایک دنبہ ذبح کیا۔ نبی کریم ﷺ نے اس کے گوشت میں سے کچھ کھایا۔ پھر انہوں نے چنگیری میں تازہ کھجور لا کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش

(۱) جامع ترمذی ۱/۱۶۱ کتاب الطہارۃ باب ما جاء فی ترک الوضوء مقامست النار، السنن

الکبریٰ للہیثمی ۱/۵۶۱ کتاب الطہارۃ، مسند احمد ۳/۲۷۴ (مختار)

کی۔ تو آپ ﷺ نے اس میں سے بھی کچھ لیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ظہر کی نماز کے لیے وضوء کیا اور نماز ادا کی۔ پھر آپ ﷺ واپس تشریف لائے تو وہ عورت دینے کے باقی ماندہ گوشت میں سے کچھ گوشت لے آئی۔ آپ ﷺ نے اسے تناول فرمایا۔ پھر آپ ﷺ نے عصر کی نماز پڑھی اور (دوبارہ) وضوء نہیں فرمایا۔

فدخل على امرأة الخ مدينة کے گرد و نواح میں باغ تھے۔ اور بعض صحابہ کے گھر بھی تھے۔ جہاں اس عورت کا گھر بھی تھا۔ آپ ﷺ شاید اس عورت کی دعوت پر وہاں گئے ہو گئے۔ یا کسی دوسری غرض سے وہاں گئے تھے۔ فناع من رطب قناع کجور کے پتوں سے بنی ہوئی اس چنگیر کو کہتے ہیں جس میں عموماً کجور وغیرہ رکھ کر کھائے جاتے ہیں۔ فانتہ بعلالة علالة اس تھوڑے سے کھانے کو کہتے ہیں جو کہ معمول کے کھانے سے قیل محض بھوک مٹانے کی خاطر کھایا جائے۔ جیسے ناشتہ یا مہمانوں کی پہلی بار آمد کے موقع پر چائے بسکٹ وغیرہ یا آج کل سوپ یا سلاد۔ لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ چونکہ اس عورت نے دعوت کی ہے۔ آپ ﷺ ایک دفعہ کھانا کھا چکے ہیں لیکن اظہار محبت کی خاطر اس عورت نے مزید کھانا چاہا۔ تاکہ واپس جانے سے قبل آپ ﷺ کچھ اور بھی تناول فرمائیں۔ لہذا جو گوشت باقی تھا وہ بھی رکھ دیا۔ اور آپ ﷺ نے دوبارہ کھالیا۔ معلوم ہوا کہ اگر ضرورت ہو تو کسی کی دلجوئی کی خاطر مزید کھانا بھی جائز ہے (۱)۔

(۳۰) حدثنا العباس بن محمد الدوري ثنا يونس ابن محمد ثنا

فليح بن سليمان عن عثمان بن عبد الرحمن عن يعقوب بن أبي

يعقوب عن أم المنذر قالت دخل علي رسول الله ﷺ ومعه علي ولنا

دوال معلقة قالت فجعل رسول الله ﷺ يأكل وعليّ معه ياكل فقال

رسول الله ﷺ لعليّ مه يا عليّ فانك ناقة قالت فجلس عليّ

(۱) اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت جانور کو ذبح کر سکتی ہے۔ اور عورت کے ہاتھ کا ذبیحہ حلال ہے۔ اگرچہ وہ حالت حیض یا نفاس میں ہو۔ عوام الناس میں یہ غلط مشہور ہے کہ عورت ذبح نہیں کر سکتی۔ اور اس کے ہاتھ کا ذبیحہ حرام ہے۔ (بخاری)

والنبي ﷺ ياكل قالت فجعلت لهم سلقا و شعيرا فقال رسول الله ﷺ لعلی یا علی من هذا فاصب فانه اوفق لك (۱)۔

ترجمہ: ام المہند رکھتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ میرے پاس تشریف لائے۔ حضرت علیؑ بھی ساتھ تھے۔ ہمارے یہاں کھجور کے خوشے لٹکے ہوئے تھے۔ نبی کریم ﷺ (ان خوشوں میں سے چن چن کر کھجور) کھانے لگے۔ اور حضرت علیؑ بھی آپ ﷺ کے ساتھ کھانے لگے۔

آپ ﷺ نے حضرت علیؑ کو فرمایا تم مت کھاؤ۔ اے علیؑ تم (بیماری گزار کر) کمزور ہو چکے ہو۔ ام المہند رکھتی ہیں پس علیؑ بیٹھ گئے اور نبی کریم ﷺ کھاتے رہے۔ کہتی ہیں کہ پھر میں نے ان کے لئے چند رو اور جو کا کھانا تیار کیا۔ تو نبی کریم ﷺ نے حضرت علیؑ سے فرمایا اے علیؑ اس سے کھاؤ۔ یہ تمہارے لیے مناسب ہے۔

ام المنذر: ان کا نام سلیمی بنت قیس بن عمرو ہے۔ کنیت سے مشہور ہیں۔ مشہور بدری صحابی سلیط بن قیس کی بہن ہیں۔ بیعت رضوان میں بھی شرکت کر چکی ہے۔ باپ کی جانب سے نبی کریم ﷺ کی خالادوں میں سے تھی۔ انصار کے بنو النجار قبیلہ سے تعلق تھا۔ نبی کریم ﷺ سے کچھ اور روایات بھی ان کے واسطے سے مروی ہیں۔ علامہ منادیؒ نے ان کا نام سلمۃ بنت قیس لکھا ہے۔ جو اسماء الرجال کی کتابوں میں نہیں ملتا۔

کھانے پینے میں حالت صحت و مرض کا خیال: ولنا دوال معلقة دوال دالیه کی جمع ہے جو کھجور کے اس خوشے کو کہتے ہیں جسے نیم پختہ حالت میں درخت سے کاٹ کر لٹکایا جائے۔ اور پختہ ہونے پر اس سے کھجور کھائی جائے۔ خود دونوں کے مادے میں تطبیق کا مفہوم موجود ہے کنویں کے کنارے لٹکی ہوئی بالٹی کو بھی دالیه کہا جاتا ہے۔ اس لیے بعد میں معلقة کا لفظ ذکر کرنے سے دالیه میں تحدید ہوگی۔ اور یہ صرف خوشے کے معنی میں لی جائیگی۔ مطلب یہ ہوا کہ کھجور بھرے خوشے باغ میں لٹک رہے تھے۔

(۱) جامع ترمذی کتاب الطب باب ما جاء في الحمية، سنن ابی داؤد ۲۵/۱۸۳ کتاب الطب باب الحمية سنن ابن ماجہ ص ۲۲۵ ابواب الطب باب الحمية، مصنف ابن ابی شیبہ ۷/۳۳ (مختار)

مہ یا علی مہ منع کرنے کے لیے استعمال ہونے والا کلمہ ہے۔ فانک ناقلہ یعنی تم کمزور ہو۔ اس لئے کھجور مت کھاؤ۔ نقاہت اس متوسط حالت کو کہتے ہیں جو بیماری سے شفا یاب ہو جانے اور صحت کاملہ کے درمیان ہوتی ہے۔ شاید حضرت علیؓ اس سے قبل بیمار رہ چکے ہوں۔ لہذا نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ابھی تو بیماری گزار چکے ہو۔ اس لئے فی الحال کھجور جیسی ثقیل اور گرم چیز سے پرہیز کرنا چاہیے۔ جو نقصان وہ ثابت ہو سکتی ہے (۱)۔

سلفا و شعیراً سلق چقدر کو کہتے ہیں۔ من هذا فاصب یعنی یہ کھانا تیرے مزاج کے موافق ہے۔ اطباء نے چقدر اور جو کے فوائد بیان کی ہیں۔ برووت اور نرمی کی نقاہت کے لیے یہ بہت مفید ہیں۔

(۳۱) حدثنا محمود بن غیلان ثنا بشر بن السری عن سفیان عن

طلحة بن یحییٰ عن عائشة بنت طلحة عن عائشة أم المؤمنین قالت

کان النبی ﷺ یا تینی فیقول أعندک غداء فاقول لا قالت فیقول إني

صائم قالت فأتانا یوما فقلت یا رسول اللہ ﷺ انه اهدیت لنا هدیة

قال وما هی قلت حمیس قال اما إني اصبحت صائماً قالت ثم اکل (۲)۔

ترجمہ: ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ میرے پاس آ کر

پوچھتے تھے۔ کیا کھانے کے لیے کچھ آپ کے پاس ہے؟ پھر جب میں کہتی کہ نہیں ہے

تو آپ ﷺ فرماتے کہ میں روزہ رکھتا ہوں۔ ایک دن وہ میرے پاس تشریف

لائے۔ تو میں نے کہہ دیا کہ ہمارے پاس ایک ہدیہ بھیجا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے

فرمایا کیا چیز ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حمیس ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے

تو صبح سے روزہ کا ارادہ کر رکھا تھا۔ فرماتی ہیں کہ پھر حضور ﷺ نے اسے تناول فرمایا۔

(۱) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسباب کی رعایت توکل کے منافی نہیں، علامہ بخاری نے لکھا ہے ویؤخذ من هذا ان

التداوی مشروع ولا ینافی التوکل (المواہب اللدنیة ص ۱۱۸) (مختار)

(۲) صحیح مسلم ۳۶۴/۱ کتاب الصیام باب جواز صوم النافلة بنية من النهار قبل الزوال الخ،

سنن ابی داؤد ۳۴۰/۱ کتاب الصوم باب فی الرخصة ذلک، سنن النسائی ۳۲۰/۱ کتاب الصیام

باب فی باب صیہام المتطوع (مختار)

عائشة بنت طلحة: یہ تابعیہ ہیں۔ عائشہ صدیقہ کی شاگرد ہیں۔ انتہائی حسین و جمیل عورت تھی۔ مصعب بن زبیرؓ نے دس لاکھ درہم (۱) دے کر اس سے نکاح کیا۔ ان کے قتل ہونے کے بعد عمر بن عبد اللہ تمیمی نے ایک لاکھ دینار پر آپؐ سے شادی کی۔ اور ان کے بعد اپنے چچا زاد بھائی عمر بن عبید اللہ سے شادی کی۔ انھوں نے بھی ایک لاکھ دینار مہر دیا۔

ام المؤمنین ازواج مطہرات کو ام المؤمنین اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ دیگر مؤمنین پر ماں کی طرح حرام ہیں۔ یا اس لئے کہ والدہ کی طرح قابل احترام ہیں۔ نیز وہ امت پر والدہ کی طرح رحیم و شفیق بھی ہیں۔

نفل روزہ کے افطار کا مسئلہ: عندک غداء فداء من لے کر دو پہر تک کے وقت میں کھانے کا نام ہے۔ لیکن کبھی کبھی مطلق کھانے کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ لیکن یہاں اول الذکر متعین ہے کیونکہ روزہ کی نیت اسی وقت میں کی جاسکتی ہے۔ چونکہ نبی کریم ﷺ کی حضرت عائشہؓ سے زیادہ محبت کا صحابہؓ کو علم تھا۔ اس لیے وہ ہدایا بھیجنے میں حضرت عائشہؓ کی باری (قسم) کا لحاظ رکھتے تھے۔ تاکہ نبی کریم ﷺ ہدایا کو ان کے ہاں سے کھائیں۔ یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ کو حضرت عائشہؓ کے ہاں کچھ نہ کچھ کھانے کو مل جاتا۔ اور یہاں پر حضرت عائشہؓ کی مراد بھی غالباً یہی معلوم ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کھانے کی توقع رکھتے ہوئے فرمائش کر دیتے تھے۔

قلت حینس حیس ایک قسم کا حلوا ہوتا تھا۔ جو کھجور، گھی اور پیڑیا آٹے کو ملا کر بناتے تھے۔ اما انی اصبح صائم یعنی اگرچہ صبح سے روزہ کی نیت کر لی تھی لیکن یہ روزہ عموماً بغیر کچھ کھائے رکھا جاتا تھا۔ لہذا جب کچھ کھانے کو ملا۔ تو اب روزہ افطار کر کے حیس کھا لوں گا۔ روزہ کی قضاء دوسرے دن ہو جائے گی۔ جبکہ بعض شراح نے ترجمہ یہ کیا ہے کہ روزہ تو نہیں رکھا تھا۔ البتہ روزہ رکھنے کا ارادہ تھا۔ لیکن اب حیس کھانا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔ یہ ترجمہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ احتاف کے نزدیک نفل روزہ شروع کرنے سے واجب ہو جاتا ہے۔ تو پہلی تشریح کے مطابق افطار کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

(۱) شذرات میں مصعب بن زبیرؓ کی طرف سے دیا جانے والا مہر بھی ایک لاکھ دینار لکھا ہے۔ (اصلاح الدین)

لیکن اول الذکر تشریح پر بھی جواب ممکن ہے۔ وہ یوں کہ ضرورت کے وقت نفلی روزہ توڑنا جائز ہے اگرچہ اس کی قضاء لازم ہو جاتی ہے۔ بقیہ مباحث اور دلائل فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔۔۔ اس حدیث سے ایک اور مسئلہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص مضطرب صوم سے اجتناب کر چکا ہو تو نفلی روزہ کی نیت نصف النہار تک کر سکتا ہے۔ اس طرح یہ حدیث امام مالکؒ پر جرح ہوگی جو کہ حیثیت یعنی رات ہی سے نیت کرنے کو شرط کہتے ہیں۔

(۳۲) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ ثَنَا عُمَرُ بْنُ حَفْصِ بْنِ غِيَاثٍ

ثَنَا أَبِي عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ أَبِي يَحْيَى الْأَسْلَمِيِّ عَنْ يَزِيدَ بْنِ أَبِي أُمِيَّةٍ الْأَعْوَرِ

عَنْ يَوْسُفَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ سَلَامٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ رَأَيْتُ

النَّبِيَّ ﷺ أَخَذَ كَسْرَةً مِنْ خُبْزِ الشَّعِيرِ فَوَضَعَ عَلَيْهَا تَمْرَةً ثُمَّ قَالَ هَذِهِ

إِدَامُ هَذِهِ فَأَكَلَ (۱)۔

ترجمہ: یوسف بن عبد اللہؒ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ جو کی روٹی

کا ٹکڑا اٹھا کر اس پر ایک کھجور رکھ دی۔ پھر فرمایا کہ یہ کھجور اس روٹی کا سالن ہے۔ اور

پھر تناول فرمایا۔

یوسف بن عبد اللہؒ: عام نسخوں میں یہ حدیث یوسفؑ سے مروی ہے۔ جبکہ بعض نسخوں میں

”یوسف بن عبد اللہ بن سلام عن عبد اللہ بن سلام“ ذکر ہے۔ اکثر شراح نے پہلے نسخے کی تصحیح کی ہے۔ علامہ

ابن حجرؒ نے الاصابہ میں اور علامہ ابن عبد البرؒ نے استیعاب میں اس حدیث کو یوسف بن عبد اللہؒ کو منسوب کی

ہے۔ نیز امام ابوداؤدؒ نے اسے یوسفؑ سے روایت کیا ہے۔

یہ حضرت عبد اللہ بن سلامؒ کے بیٹے ہیں۔ صغریٰ میں نبی کریم ﷺ کو دیکھا تھا اور کچھ ادا میں محفوظ

کر لی تھیں۔ ولادت کے بعد حضرت عبد اللہ بن سلامؒ انہیں نبی اکرم ﷺ کے پاس لے آئے۔ آپ ﷺ

نے اسے اٹھایا اور اس کا نام یوسف رکھ دیا اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانہ خلافت

میں وفات پائی۔

عبداللہ بن سلام: مشہور صحابی ہیں۔ بنو قینقاع سے تعلق تھا۔ حضرت یوسف کی اولاد میں سے تھے۔ لہذا نسباً بنی اسرائیلی تھے۔ لیکن خزرج کے حلیف ہونے کی وجہ سے کبھی خزرجی بھی کہا جاتا ہے۔ اصل نام حصین تھا۔ نبی کریم ﷺ نے تبدیل کر کے عبداللہ رکھ دیا۔ یہود کے جید علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں نبی کریم ﷺ کی آمد کے بعد حاضر ہوئے تو بے اختیار بول پڑے ”ما هذا الوجه بوجه كذاب“ پھر اسلام لے آئے۔ اور نبی کریم ﷺ سے کہا کہ میں یہود کا سردار ہوں۔ اور ان سے میں زیادہ علم رکھنے والا ہوں۔ آپ ﷺ ان سے میرے بارے میں ان کو میرے اسلام کی خبر پہنچنے سے قبل پوچھ لیں۔ تو یہود بھی اس کا اعتراف کریں گے۔ گویا یہود کی تعصب پر پہلے دن ہی سے نبی کریم ﷺ کو خبردار کیا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو جنت کی بشارت دیدی تھی۔ ۳۳ھ میں مدینہ میں وفات پائی۔

تعریف ادا م نہیں بلکہ قلمتہ مطلوب ہے: ہذا ادا م ہذا یعنی یہ تمرۃ (کھجور) بھی سالن ہے۔ نبی کریم ﷺ لغوی یا عرفی امور کو بیان کرنے کے لیے نہ معوث ہوئے تھے نہ یہاں یہ مقصد ہے۔ بلکہ مقصد یہاں قناعت کی تعلیم دینا ہے۔ اس لیے حقیقت یہ ہے کہ یہاں پر کھجور کو مجازاً ادا م کہا گیا ہے۔ یعنی اگرچہ یہ لغت و عرفاً ادا م نہیں لیکن قناعت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے ادا م سمجھ لینا چاہئے۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس حدیث سے شوافع کا مذہب قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ کھجور ادا م ہے اور قسم کے باب میں ادا م سے قسم کھجور کو شامل ہوگا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پھر یہ کلام بے مقصد رہ جاتا۔

(۳۳) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ ثَنَا سَعِيدُ بْنُ سُلَيْمَانَ عَنْ عِبَادِ

بْنِ الْعَوَامِ عَنْ حَمِيدٍ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ

يَعْجِبُهُ النَّفْلُ قَالَ عَبْدُ اللَّهِ يَعْنِي مَا بَقِيَ مِنَ الطَّعَامِ (۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ کو بچا ہوا کھانا پسند ہوتا تھا۔

يعجبه النفل نفل کا ترجمہ خود راوی کر رہے ہیں۔ دراصل مالک چیز میں جو مادہ نیچے بیٹھ جاتا ہے اسے نفل کہتے ہیں۔ لیکن کھانا کھانے کے بعد جو تھوڑا کھانا برتن میں رہ جاتا ہے اسے بھی نفل کہتے ہیں۔ اور

یہاں یہ مراد ہے۔ اسے پسند کرنے کی کئی وجوہ ہیں۔ مثلاً عموماً یہ زیادہ پختہ اور ہضم کے قریب ہوتا ہے۔ لذیذ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ نیز متکبرین ایسے باقی ماندہ کھانے کو معیوب سمجھتے ہیں۔ اس لیے آپ ﷺ کا اسے کھانا تواضع سے زیادہ قریب ہے۔ پھر گھی، تیل، چکناہٹ سالن کے اوپر اوپر ہوتا ہے جس کا مضر ہونا معلوم ہے۔ اور کم چکناہٹ کی وجہ سے سالن کا کچھلا حصہ زیادہ مناسب رہتا ہے۔

بعض لوگوں نے یہاں ثقل کا ترجمہ ثرید سے کیا ہے۔ لیکن باوجود یہ کہ ثرید نبی کریم ﷺ کا محبوب تھا۔ لیکن اول الذکر ترجمہ اولیٰ ہے۔

(وصلی اللہ تبارک و تعالیٰ علی حبیبہ محمد و علی آلہ و صحبہ و اتباعہ اجمعین)

خلاصہ باب

اس باب میں ان اشیاء کا بیان ہے جن کو نبی کریم ﷺ نے بطور سالن استعمال فرمایا ہے۔ خواہ وہ عرفا سالن ہو یا نہ ہو۔ مثلاً گوشت کا ذکر ہے جس کو آپ ﷺ نے ادم کی حیثیت سے استعمال کیا ہے۔ پھر گوشت میں دنبے، مرغی، جباری (تلور) جیسے حیوانات کا گوشت اور دنبے کے گوشت کے بعض ان حصوں کا بیان ہے جن کو نبی کریم ﷺ نے پسند کر کے تناول فرمایا۔ مثلاً ذراع (پنڈلی)، پہلو (پسلیوں) اور کمر کا ابالا ہوا۔ اور بھنا ہوا گوشت آپ ﷺ تناول فرما چکے ہیں۔ نیز یہ بھی بیان ہے کہ ذراع کا گوشت آپ ﷺ کو پسند تھا مگر کیوں؟

اسی طرح اس باب میں ادم کے سلسلے میں آپ ﷺ کی سادگی اور قناعت کو خوب واضح کر دیا گیا ہے چنانچہ سرکہ، روغن زیتون، شہد، پنیر، ستو کے ساتھ کھجور، کدو، اس کا شوربہ اور جو کی روٹی کے ساتھ کھجور کا بطور سالن استعمال اس باب میں مذکور ہیں جو انتہائی بے تکلفی کا مظہر ہے۔ اور اسی اختیاری سادگی کو اجاگر کرنے کے لیے آپ ﷺ نے سرکہ کو بہتر سالن کہا ہے۔ اس کو بیان کرنے کیلئے غریبوں کی دعوت قبول کرنے کا ذکر ہے۔ اور اس پر تنبیہ کے لیے حضرت سلمیٰ اہل بیت کے صاحبزادوں کیلئے نبی کریم ﷺ کے معمول کی غذا جیس کو تیار کرنے سے کتراری ہیں۔

البتہ بعض چیزوں میں نبی کریم ﷺ کی طبعی رغبت کا اظہار کر کے آپ ﷺ کی فطرتِ سلیمہ کے حسن انتخاب کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً ذراع کے گوشت، مفل، ثرید، شہد اور دیگر میٹھی اشیاء کی پسندیدگی سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ بشری تقاضوں سے بالاتر اور مشہیات سے مستغنی نہ تھے۔ بلکہ اس سلسلے میں طبع سلیم کے مالک تھے۔ صرف فقر اختیاری اور ذوق قناعت ہی آپ ﷺ کی سادگی کا باعث تھا۔

”اللهم فصل عليه صلوة ترضاه له“

۲۷۔ باب ما جاء في صفة وضوء رسول الله ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے (وضوء) ہاتھ منہ دھونے کا بیان

وضوء سے مراد اس مقام پر لغوی وضوء ہے۔ اصطلاحی وضوء مراد نہیں ہے (۱)۔ اور عند الطعام کے معنی کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہیں۔ دونوں کا ذکر آئے گا۔

(۱) حدثنا أحمد بن منيع ثنا إسماعيل بن إبراهيم عن أيوب عن ابن أبي مليكة عن ابن عباس أن رسول الله ﷺ خرج من الخلاء فاقرب إليه الطعام فقالوا ألا ناتييك بوضوء قال إنما امرت بالوضوء إذا قمت إلى الصلوة (۲)۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ بیت الخلاء سے باہر آئے تو آپ ﷺ کو کھانا پیش کیا گیا۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ کیا ہم آپ کے لیے وضوء کا پانی نہ لائیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے تو وضوء کا حکم صرف اس وقت دیا گیا ہے جب نماز کا ارادہ کروں۔

من الخلاء خلاء دراصل خالی جگہ کو کہتے ہیں۔ لیکن یہاں قضائے حاجت سے کنایہ ہے کیونکہ یہ کام تنہائی میں کیا جاتا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ قضائے حاجت کے بعد جب آپ ﷺ نے استنجاء کیا تھا۔ (۱) وضوء یخرج الواد اس پانی کو کہا جاتا ہے جس سے پاکی حاصل کی جاتی ہے۔ اور بغض الواد حصول طہارت کے اس مخصوص طریقے کو کہا جاتا ہے جو نماز سے پہلے اپنائی جائے۔ مگر یہاں پر وضوء کے بارے میں شیخ جواد الروئیؒ نے لکھا ہے والمراد هنا بالوضوء اللغوی وهو غسل اليدين والقدم لأن الوضوء الشرعی ليس مسنوناً قبل الطعام ولا بعده (الاتحافات ۲۳۲) علامہ تجرئیؒ نے لکھا ہے والمراد بالوضوء الوضوء ما يشتمل الشرعی واللغوی بدلیل الاخبار الآتية فارادة الشرعی من حيث بيان عدم طلبه عند الطعام لا وجوباً ولا ندباً وإرادة اللغوی من حيث بيان ندبه عند الطعام قبله وبعده (المواهب اللدنیة ۱۲۰) مگر حضرات محدثین نے اسی کو راجح قرار دیا ہے کہ یہاں وضوء سے مراد وضوء لغوی ہے۔ (مختار)

(۲) سنن ابی داؤد ۲۵۲/۱ کتاب الأطعمة باب فی غسل الیدین عند الطعام، سنن الترمذی ۱۷۱/۱ کتاب الطہارة باب الوضوء لكل صلوة، شرح السنة للبغوی ۱۱/۲۸۳ کتاب الأطعمة باب الوضوء عند الطعام (مختار)

واپسی پر کھانے کی کوئی چیز پیش کی گئی۔

الانٹیک بوضوء بعض نسخوں میں ”لانٹیک“ بغیر ہمزہ کے ذکر ہے۔ اس صورت میں ہمزہ استفہام مقدر ہوگا۔ وضوء اس پانی کو کہتے ہیں جس سے وضو کیا جائے۔ صحابہؓ کا یہ سوال شاید اس وہم پر مبنی ہے کہ کھانے سے قبل بھی اصطلاحی وضوء کرنا ہوتا ہے۔

وضوء لغوی نہ کہ اصطلاحی: انما امرت الخ یعنی اگر تم اصطلاحی وضوء کروانا چاہتے ہو تو اسے تو اللہ تعالیٰ نے نماز یا وہ کام جو نماز کے حکم میں ہے، کے لیے واجب کیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے وَاِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ (الایہ)

اور اگر وضو لغوی مراد ہے تو وہ تو ہو چکا ہے۔ حاصل کلام یہ ہوا کہ وضوء اصطلاحی نہ قبل الطعام ضروری ہے اور نہ بعد الطعام اسے واجب کیا گیا ہے۔

(۲) حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ الْمَخْزُومِيُّ ثَنَا سَفْيَانُ بْنُ عَيْنَةَ

عَنْ عَمْرِو بْنِ دِينَارٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْحَوِيرِثِ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ خَرَجَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنَ الْغَائِطِ فَاتَى بِطَعَامٍ فَقِيلَ لَهُ لَا تَتَوَضَّأُ فَقَالَ أَصْلَى فَاتَوَضَّأَ (۱)۔

ترجمہ: ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ قضاے حاجت سے فارغ ہو کر باہر آئے تو آپ ﷺ کے پاس کھانا لایا گیا۔ آپ ﷺ سے کہا گیا کہ کیا آپ ﷺ وضوء نہیں کریں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا میں نے نماز پڑھنی ہے جو وضوء کروں۔

غائط المنخفض من الارض یعنی زیرین زمین اور گہرائی کو کہتے ہیں۔ عموماً قضاے حاجت کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ لہذا قضاے حاجت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن یہاں مکان مراد ہے تاکہ خروج کا لفظ حقیقت پر محمول ہو۔

(۱) صحیح مسلم ۱/۶۲ کتاب البیض باب اكل المحدث الطعام الخ، السنن الكبرى

للبيهقي ۱/۳۲ کتاب الطهارة (مختار)

الاتوضا اصل میں تنوضاً تھا تخفیفاً ایک تاء کو حذف کیا گیا۔ فقال اصلی یہاں ہمزہ استفہام محذوف ہے۔ یعنی اُصلی۔ معنی یہ کہ کیا میں نے نماز پڑھنی ہے جو وضوء کر دوں۔ اور اگرچہ وضوء علی الوضوء بہتر ہے لیکن کھانے کے لیے تو وضوء لازم نہیں ہے۔

(۳) حدثنا يحيى بن موسى ثنا عبد الله بن نمير ثنا قيس بن الربيع

حدثنا قتيبة ثنا عبد الكريم الجرجاني عن قيس بن الربيع عن أبي

هاشم عن زاذان عن سلمان قال قرأت في التوراة إن بركة الطعام

الوضوء بعده فذكرت ذلك للنبي ﷺ وأخبرته بما قرأت في التوراة

فقال رسول الله ﷺ بركة الطعام الوضوء قبله والوضوء بعده (۱)۔

ترجمہ: حضرت سلمان فارسی کہتے ہیں کہ میں نے تورات میں پڑھا تھا کہ کھانا

کھانے کے بعد وضوء کرنا برکت کا سبب ہے۔ میں نے نبی کریم ﷺ سے یہ بات کہی

اور اپنے تورات پڑھنے کی بات بھی کی۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کھانے کی برکت

کا سبب کھانے سے قبل اور کھانے کے بعد وضوء یعنی (ہاتھ منہ دھونا) ہے۔

کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھ دھونے کی برکت: قرأت فی التورات الخ حضرت

سلمان فارسی کو اللہ تعالیٰ نے طویل عمر دی تھی۔ اور بہت سے مذاہب سے گزرے تھے۔ تورات اور انجیل

کے عالم تھے۔ تفصیلی حالات گزر چکے ہیں۔ بركة الطعام: یعنی کھانے سے فراغت کے بعد اگر ہاتھ

دھولے جائیں تو کھانے میں برکت ہوتی ہے۔ (۲) کیونکہ دسومت اور وہ آلودگی جو کھانے سے ہاتھ کو لگتی

ہے دور ہو کر ہاتھ پاک ہو جاتے ہیں۔ جبکہ اطباء کے بقول اگر دسومت ہاتھ پر باقی رہے۔ تو وہ ایک خاص

قسم کی بیماری ”لحم“ پیدا کرتی ہے۔ جو کہ جنوں کی ایک قسم ہے۔

(۱) سنن ابو داؤد ۴۷۲/۲ کتاب الأطعمة باب غسل اليدين قبل الطعام، شرح السنة

لبغوی ۲۸۲/۱ کتاب الأطعمة باب الوضوء عند الطعام، السنن الكبرى للبيهقي ۷/۵۵۷ کتاب

الأطعمة، جامع الترمذی ۳۳۸/۲ کتاب الأطعمة باب الوضوء قبل الطعام وبعده، (مختار)

(۲) علامہ عینی نے لکھا ہے کہ برکت کا مطلب یہ ہے کہ کھانا زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ اور امام غزالی نے لکھا ہے کہ کھانے سے

پہلے ہاتھ منہ دھونا اور بعد میں ہاتھ منہ دھونا فخر کو دور کرتا ہے (مختار)

الوضوء بعده یعنی یہ درست ہے کہ کھانے کے بعد ہاتھ دھونے میں برکت ہوتی ہے۔ لیکن اس بات میں ایک کمی ہے۔ وہ یہ کہ کھانے سے قبل بھی ہاتھ دھونا باعث برکت ہے۔ اور اس طرح نبی کریم ﷺ نے کھانے سے قبل وضوء لغوی کی ترغیب دے کر یا تو شریعت موسوی پر اضافہ کیا ہے۔ جو کہ آپ ﷺ کے مناصب میں سے ہے۔ اور یا اس تعریض کی طرف اشارہ ہے کہ تورات میں تحریف ہوئی ہے۔ ایک قطعہ حکم کو حذف کر دیا گیا ہے۔ وہاں تو ”قبلہ“ کا ذکر ہے۔ لیکن پہلے ہاتھ دھونے کا حکم انہوں نے چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ پہلے ہاتھ دھونے میں بھی برکت ہوتی ہے۔ کھانا زہریلے اثرات سے پاک ہو جاتا ہے۔ اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے میں برکت کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہضم ہو کر عبادات، تحصیل علم اور جہاد کی قوت پیدا کرتی ہے۔ صحیح مصرف میں صرف ہوتا ہے۔ اور گناہوں کا سبب نہیں بنتا۔

ہاتھ دھلواتے وقت یہ ادب بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ کھانے سے قبل بچوں اور نوعمروں کو معمر لوگوں سے پہلے ہاتھ دھلوائیں کیونکہ ان کے ہاتھ پر عموماً گندگی بھینی ہوتی ہے۔ جبکہ کھانے کے بعد معمر لوگوں کو ہاتھ دھونے میں نوعمروں پر اکرنا مقدم کرنا چاہیے۔

خلاصہ باب

اس باب میں کھانا کھانے کے لیے ضروری اور غیر ضروری صفائی کا ذکر ہے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانا کھانے سے قبل ہاتھ دھونا چاہیے۔ اس سے کھانے میں برکت ہوتی ہے۔ اسی طرح کھانے کے بعد بھی ہاتھ دھونا باعث برکت ہے۔ البتہ کھانے سے پہلے اصطلاحی وضوء کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۲۸۔ باب ما جاء في قول رسول الله ﷺ قبل الطعام و بعد ما يفرغ منه

کھانے سے پہلے اور بعد میں حضور اقدس ﷺ کی دعائیں

یعنی وہ کونسی دعائیں اور ذکر و اذکار ہیں جو کھانا کھانے سے قبل اور اس کے بعد نبی کریم ﷺ سے

ثابت ہیں۔ اس باب میں ان کا ذکر ہے۔

کھانا کھانے سے قبل بسم اللہ اور کھانے کے بعد الحمد للہ پڑھنا نبی کریم ﷺ کی سنت ہے۔ لیکن یہاں

طعام سے مراد صرف کھانا نہیں بلکہ مشروبات کا پینا بھی اس سے ملحق ہے۔ لہذا کھانا اور پینا دونوں مراد ہیں۔

(۱) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ ثَنَا ابْنُ لَهْيَعَةَ عَنْ يَزِيدَ بْنِ أَبِي حَبِيبٍ عَنْ

رَاشِدِ بْنِ جَنْدَلٍ الْيَافَعِيِّ عَنْ حَبِيبِ بْنِ أَوْسٍ عَنْ أَبِي أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيِّ

قَالَ كُنَّا عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ يَوْمًا فَقَرَّبَ إِلَيْهِ طَعَامٌ فَلَمْ أَرْطَعْهُ مَا كَانَ

أَعْظَمَ بَرَكَتَةٍ مِنْهُ أَوَّلَ مَا أَكَلْنَا وَلَا أَقْلَ بَرَكَتَةٍ فِي آخِرِهِ قُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ

كَيْفَ هَذَا قَالَ إِنَّا ذَكَّرْنَا اسْمَ اللَّهِ حِينَ أَكَلْنَا ثُمَّ قَعَدَ مِنْ أَكْلِ وَلَمْ يَسْمَعْ

اللَّهُ تَعَالَى فَاكُلْ مَعَهُ الشَّيْطَانُ (۱)۔

بسم اللہ نہ پڑھنے کی بے برکتی:

ترجمہ: حضرت ابوایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ ایک روز ہم نبی کریم ﷺ کے پاس

حاضر تھے کہ آپ ﷺ کو کھانا پیش کیا گیا۔ میں نے اس روز جیسا کھانا کبھی نہیں دیکھا

تھا۔ جو ابتداء میں تو ہمارے کھانے کے وقت نہایت بابرکت ہو۔ اور کھانا ختم ہوتے

وقت انتہائی بے برکت ہو۔ ہم نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ یہ کیسے ہوا۔ تو

آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہم نے اس وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیا تھا۔ جب ہم کھانا کھانے

لگے تھے۔ اس کے بعد ایک ایسا فحش کھانا کھانے بیٹھ گیا جو اللہ کا نام لئے بغیر کھانا

کھانے لگا۔ تب شیطان بھی اس کے ساتھ کھانے لگا۔ (جس سے برکت اٹھ گئی)

(۱) شرح السنة ۲۷۵/۱۱ کتاب الأطعم باب التسمية على الأكل والحمد في آخره،

ابو ایوب انصاریؓ: خالد بن زیدؓ نام ہے۔ اور کنیت سے مشہور ہیں۔ خزرجی انصاری صحابی ہیں۔ بیعت عقبہ میں شریک تھے۔ نبی کریم ﷺ نے ہجرت فرمائی تو سب سے پہلے آپ کے ہاں ٹھہرے تھے۔ اور ایک ماہ تک آپ کو نبی کریم ﷺ کی مہمان نوازی کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں یزید بن معاویہ کی سرکردگی میں جہاد کے لیے نکلے۔ قسطنطینیہ کے آس پاس بیمار پڑ گئے تو ساتھیوں کو وصیت کی کہ اگر میں وفات پاؤں تو میری لاش اپنے ساتھ لے چلو۔ اور دشمن سے مقابلہ ہو تو اس وقت مجھے اپنی قدموں میں دفن کر دو۔ چنانچہ ۵۷ھ کو راستہ میں وفات پائی اور قسطنطینیہ کی فصیل کے پاس ہی دفن کر دیے گئے۔ قبر مبارک آج تک مرجع خلائق ہے۔ لوگ حصول شفاء کے لیے بھی بطور تبرک زیارت کے لیے آتے ہیں۔ مدینہ میں آپ کے گھر کی جگہ ایک مدرسہ بنایا گیا تھا۔ جسے مدرسہ شہابیہ کہا جاتا تھا۔ اب یہ سارے مقامات حرم نبوی میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔ (شذرات الذہب)

اول ما اکلنا الخ ما مصدریہ وقفیہ ہے۔ یعنی اول زمان اکلنا۔ اسی طرح ”فی آخرہ“ کا معنی یہ ہوگا کہ ”آخر وقت اکلنا یا آخر زمان اکلنا“ مقصود یہ ہے کہ کھانا شروع کرتے وقت کھانا بہت بابرکت تھا۔ پھر ختم ہوتے وقت کھانا بہت بے برکت ہو گیا۔ کیف ہذا صحابہ کرامؓ کے سوال کا مقصد یہ ہے کہ ابتداء میں تو کھانا ختم ہونے کو نہیں آتا تھا۔ یہ آخر میں اسے کیا ہو گیا۔ اور کس حکمت اور کس سبب سے یہ ناکافی ہو گیا۔ قال انا الخ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ابتداء میں ہم جتنے بھی لوگ تھے۔ کھانے سے قبل بسم اللہ پڑھ چکے تھے۔ درمیان میں ایک شخص ہمارے ساتھ بغیر بسم اللہ پڑھنے کھانے میں شریک ہوا۔ جسکی وجہ سے کھانے کی برکت جاتی رہی۔ کیونکہ بسم اللہ نہ پڑھنے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غفلت بلکہ خلاف سنت کام کے ارتکاب کی بناء پر شیطان شریک طعام ہوا۔ جس کی عادت ہے کہ مکھی کی طرح ہمیشہ گندگی کی طرف لپکتا ہے۔ جب اجتماع سنت ترک ہوا تو معنوی ٹکدر کی وجہ سے اسے موقع ملا اور کھانا کھانے بیٹھا۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ کھانے کی ابتداء میں بسم اللہ کہنا سنت ہے۔ ذکرنا اسم اللہ بعض کا خیال ہے کہ یہاں صرف اللہ کا نام مراد ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ جملہ بسم اللہ الرحمن الرحیم مراد ہے۔ دونوں کا احتمال ہے۔ لیکن مؤخر الذکر افضل ہے پھر بسم اللہ کا پڑھنا بعض کے نزدیک واجب ہے اور اکثر سنت

مؤكدہ ہونے کے قائل ہیں جس طرح کے دائیں ہاتھ سے کھانے میں بھی اختلاف ہے۔ بعض واجب اور جمہور اسے سنت کہتے ہیں۔

بسم اللہ ہر فرد پڑھے گا یا ایک کا کافی ہوگا: اس حدیث میں یہ بات قائل بحث ہے کہ کیا ہر شخص فرداً فرداً بسم اللہ پڑھے گا یا ایک شخص کا بسم اللہ کافی ہوگا۔ اول الذکر جمہور کا مذہب ہے۔ لیکن امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ ابتداءً جو لوگ کھانا کھانے اکٹھے بیٹھتے ہیں ان میں سے ایک شخص کی بسم اللہ سب کے لیے کافی ہو جائے گی۔ ہر شخص کے لیے ضروری نہیں۔ اگرچہ بہتر تو یہی ہے کہ ہر شخص الگ الگ بسم اللہ پڑھے (۱)۔ اب امام شافعیؒ کے مذہب پر سوال یہ ہے کہ پھر اس مقام پر یہ نو وارد شخص جو آیا اس شخص کے حق میں سابقہ بسم اللہ کیوں کافی نہ ہوا۔ تو جواب یہ ہوگا کہ دراصل ایک شخص کی بسم اللہ حاضرین کی طرف سے کافی ہو جاتی ہے غائبین کے لیے نہیں۔ اور یہ جو نیا شخص آیا ہے وہ چونکہ غائب تھا۔ اس لئے اس کے حق میں وہ بسم اللہ کافی نہ ہوئی۔ کیونکہ سابقین کا تسمیہ لاحقین تک متعدی نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ سابقین کو بھی برکتوں سے محروم کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے۔

اکل شیطان کی نوعیت: فاکل معہ الشیطان شیطان کھانا کھاتا ہے۔ اور اس کی کیفیت مختلف ہو سکتی ہے۔ جو کہ مجہول ہے۔ ہر مخلوق کے کھانے کے انداز بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اور خوراک بھی مختلف ہوتی ہے۔ بعض مخلوقات منہ سے کھاتے ہیں۔ بعض سوگھ کر، کچھا آنکھوں سے کھاتے ہیں۔ اسی طرح شیطان کے کھانے کے بھی اپنے طریقے ہیں۔ لہذا بعض علماء نے جو اس جملے کی تاویلات کی ہیں۔ ان کی تاویلات سے صرف نظر کرنا ہی بہتر ہے۔ اور شیطان کا کھانا حقیقت پر محمول ہوگا۔ اور جب نبی کریم ﷺ نے ہمیں خبر دی ہے تو کیفیت سے لاعلمی کے باوصف ہمارا اس پر ایمان ہے (۲)۔

(۱) بیہوری ۱۳۹، جمع الوسائل ج ۱ ص ۲۸۶

(۲) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے واکل الشیطان محمول علی حقیقہ عند جمہور العلماء و سلفاً و خلفاً لامکانہ شرعاً و عقلاً (جمع الوسائل ۲۸۶/۱) البتہ یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ مسئلہ یہ ہے کہ جب مجلس میں ایک ہی آدمی بسم اللہ پڑھے تو وہ سب کیلئے کافی ہے۔ پھر شیطان نہیں آئے گا۔ تو یہاں کیسے آیا۔ حالانکہ اس آدمی کے آنے سے پہلے حاضرین مجلس نے بسم اللہ پڑھی تھی؟ الجواب: اس اشکال کا اہل علم حضرات نے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(۲) حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ مُوسَى ثَنَا أَبُو دَاوُدَ ثَنَا هِشَامُ الدَّسْتَوَائِيُّ عَنْ
بَدِيلِ الْعَقِيلِيِّ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمِيرٍ عَنْ أُمِّ كَلْثُومٍ عَنْ عَائِشَةَ
قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَقُلْ بِسْمِ اللَّهِ أَوَّلَهُ وَآخِرَهُ (۱)۔
تبارک و تعالیٰ علی طعامہ فلیقل بسم اللہ اولہ و آخرہ (۱)۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں
سے کوئی کھانا کھائے اور اللہ تعالیٰ کا نام لینا بھول جائے (بسم اللہ نہ پڑھے) پھر
(کھانے کے دوران یا د آنے کے بعد) ”بسم اللہ اولہ و آخرہ“ کہہ دے۔

فلیقل بسم اللہ الخ یعنی ”واذکر ربک اذا نسیت“ پر عمل کرتے ہوئے گزشتہ تفصیر کی
بقدر امکان تلافی کر لے۔ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے یہ بعید نہیں۔ کہ اس بسم اللہ کی برکت سے ابتداء
طعام بھی بابرکت ہو۔ وسط طعام اور آخر طعام بھی۔ کیونکہ یہاں پر اول و آخر کنا یہ ہے سارے طعام سے۔
لہذا وسط طعام خارج نہ ہوگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اول سے نصف اول اور آخر طعام سے نصف آخر مراد ہو۔
پھر تو واسطہ موجود بھی نہیں ہے (۲)۔

(بقیہ حاشیہ) مختلف جوابات دیئے ہیں۔ (۱) بعض فرماتے ہیں ثم فقد کا مطلب یہ ہے کہ ای قعد بعد لفر اغنا من
الطعام اور اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی تو ظاہر ہے کہ بے برکتی ہوگی۔ اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی تھی۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ
مسئلہ ان افراد کیلئے ہے جو ابتداء اکٹھے کھانے میں شریک ہوں اور ان میں سے کوئی ایک بھی بسم اللہ نہ پڑھے۔ تو سب کیلئے
کافی ہے۔ لیکن جو شخص بعد میں کھانے میں شریک ہو جائے تو اس کو بسم اللہ پڑھنی ہوگی۔ اور یہاں ظاہر ہے کہ یہ شخص بعد
میں شریک ہوا ہے اور اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی۔ اس لئے بے برکتی ہوئی (جمع الوسائل ۲۸۶/۱) (مختار)

(۱) سنن ابی داؤد ۲/۲۷۲ کتاب الاطعمة باب تسمية على الطعام، السنن الكبرى للنسائي ۷/۷۸
کتاب عمل اليوم واللیة باب ما یقول اذا نسی تسمية، دارمی ۲/۹۳، السنن الكبرى
للبيهقي ۷/۲۷۶، (مختار)

(۲) ابوداؤد اور مشکوٰۃ میں روایت ہے کہ کان رسول اللہ ﷺ جالماً ورجلاً یا کل فلم یسم حتی لم یبق من
طعامه إلا لقمة فلما رفعها إلى فيه قال بسم الله أوله وآخره فضحك النبي ﷺ ثم قال ما زال
الشیطان يأكل معه فلما ذكر اسم الله استقاء ما في بطنه سنن ابی داؤد (بقیہ حاشیہ) مکمل صفحہ پر

بسم اللہ پڑھنا سنت ہے یا مستحب: رے یہ بات کہ بسم اللہ ابتدائے طعام کیلئے سنت ہے یا مستحب۔ تو ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ ”والتسمية مستحبة في الاكل اجماعاً“ یعنی کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے۔ لیکن یہاں مستحب سے سنت مراد ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس حدیث میں ”فلیقل“ امر کا صیغہ ہے۔ اسی طرح آئندہ حدیث میں ”سم“ بھی امر کا صیغہ ہے۔ جو کم از کم سنت ہونے کا فائدہ دیتا ہے۔

(۳) حدثنا عبد الله بن الصباح الهاشمي البصري ثنا عبد الله بن علي بن معمر عن هشام بن عروة عن أبيه عن عمر بن أبي سلمة أنه دخل على رسول الله ﷺ و عنده طعام فقال أدن يا بني فسم الله تعالى و كل بيمينك و كل مما يليك (۱)۔

ترجمہ: حضرت عمر بن ابی سلمہ سے روایت ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ کے پاس کھانا رکھا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بیٹا قریب ہو جاؤ۔ بسم اللہ پڑھو۔ دائیں ہاتھ سے کھاؤ، اور اپنے سامنے سے کھانا کھاؤ۔

عمر بن ابی سلمہؓ: عمر بن ابی سلمہؓ یہ ام المؤمنین ام سلمہؓ کے بیٹے اور نبی کریم ﷺ کے ربیب ہیں۔ والد کا نام عبد اللہ بن عبد الاسدؓ ہے۔ جو سابقین صحابہ میں سے ہیں۔ اور نبی کریم ﷺ کے رضاعی (بقیہ حاشیہ) کتاب الاطعمہ باب التسمیۃ عند الطعام۔ علامہ شمس الحق عظیم آبادی نے استقاء مافی بطنہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے استقاء ای الشیطان مافی بطنہ ای ممّا آکله والاستقاء استفعال من القی بمعنی الاستفراغ وهو محمول علی الحقیقة او المراد البرکۃ الداہیۃ بترک التسمیۃ کأنہا کانت فی جوف الشیطان أمّانة فلما سمی رجعت إلی الطعام (عون المعبود شرح ابی داؤد ۱۰۵/۱۷۳) (مختار)

(۱) جامع ترمذی ۷/۲ کتاب الاطعمہ باب ماجاء فی تسمیۃ علی الطعام، السنن الکبریٰ للنسائی ۷/۶، کتاب عمل الیوم واللیلۃ ما یقول لمن یأکل، مؤطا امام مالک ص ۸۱ کتاب صفۃ النبی باب ماجاء فی الطعام والشرب (مختار)

بھائی ہونے کے علاوہ پھوپھی زاد بھائی بھی تھے۔ جنگ احد میں زخمی ہونے کے بعد مدینہ میں وفات پا چکے تھے۔ عمرؓ ان کے والدین کی ہجرت کے دوران حبشہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اور نبی کریم ﷺ کی تربیت میں پلے بڑھے۔ جنگ جمل میں حضرت علیؓ کے رفیق رہے۔ اور انہی کی طرف سے بحرین کے والی بھی مقرر ہوئے۔

دائیں ہاتھ سے کھانا وجوب کا قول: **فَسَمِ اللّٰهُ الْخَبْرَ** نبی کریم ﷺ نے کھانے کے تین منبرے آداب کی تعلیم دی ہے۔ اول بسم اللہ پڑھنا، دوم دائیں ہاتھ سے کھانا، سوم اپنے سامنے سے کھانا۔ پہلے ادب کی تفصیل گزر چکی ہے۔ جبکہ دائیں ہاتھ سے کھانا جمہورائے سنت مؤکدہ ہے۔

بعض لوگوں نے اسے واجب بھی کہا ہے۔ کیونکہ روایات میں اس کی تاکید اور ترک پر وعید آئی ہے۔ مثلاً ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا۔ لیکن وہ ”لا استطیع“ کہہ کر حیلے بہانے تراشتا رہا۔ آپ ﷺ کی زبان سے نکال ”لا استطعت“ جس سے اس آدمی کا ہاتھ شل ہو گیا۔ حدیث میں آتا ہے کہ ”فما رفعها الی فیہ“ (۱) یعنی اس کے بعد اس کا ہاتھ مزہ تک نہیں اٹھتا تھا۔ ایک اور حدیث میں بائیں ہاتھ سے کھانے کو شیطان (۲) کا عمل کہا گیا ہے۔ ان وعیدات کی وجہ سے بعض لوگوں نے وجوب کا قول کیا ہے۔ لیکن جمہور اسے سنت مؤکدہ ہی کہتے ہیں۔

اپنے سامنے کھانے کا حکم: اسی طرح اپنے سامنے سے کھانا بھی جمہور کے ہاں سنت ہے۔ اور بعض کے ہاں یہ بھی واجب ہے۔ مگر یہ حکم اس وقت ہے کہ برتن ایک ہو۔ کھانا ایک قسم کا ہو۔ اور اطراف میں فرق نہ ہو اور اگر برتن مختلف ہوں یا کھانے کی مختلف چیزیں مثلاً پھل وغیرہ پڑے ہوں تو پھر اپنی طبیعت کی پسندیدہ چیز دوسرے شخص کے سامنے سے کھانا بھی جائز ہے۔ جس طرح کہ باب الاوام میں کدو کے ٹکڑوں کے بارے میں گزر چکا ہے۔

(۱) عن سلمة بن الأكوع أن رجلاً أكل عند النبي ﷺ بشماله فقال كل بيمينك قال لا استطیع

فقال ”لا استطعت ما منعه إلا الكبر قال فما رفعها الی فیہ“ (مسلم ج ۲ ص ۱۷۲) (مختار)

(۲) لا تأكلوا بالشمال فإن الشيطان يأكل بالشمال (مسلم ج ۲ ص ۱۷۲) (مختار)

(۴) حدثنا محمود بن غيلان ثنا أبو أحمد الزبيري ثنا سفين

الثوري عن أبي هاشم عن إسماعيل بن رباح عن رباح بن عبيدة عن أبي

سعيد الخدری قال كان رسول الله ﷺ اذا فرغ من طعامه قال

الحمد لله الذي أطعمنا و سقانا وجعلنا من المسلمين (۱).

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کھانا کھانے

سے فارغ ہو جاتے تو یہ دعا پڑھتے تھے ”الحمد لله الذي اطعمنا و سقانا

وجعلنا من المسلمين“ تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں۔ جس نے ہمیں کھانا

کھلایا، پانی پلایا اور ہمیں مسلمان بنایا۔

نعمت ایمان: وجعلنا من المسلمين کھلانے پلانے کی نعمت تو بڑی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی تمام

نعمتوں میں سے بڑی نعمت یعنی اسلام کا ذکر بھی نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ گویا اگر اسلام کی نعمت نہ ہو

تو ہر نعمت عذاب بن جائے۔ کیونکہ مرغ پلاؤ وغیرہ جتنے بھی اچھے کھانے ہوں، ان کا حساب بھی اتنا ہی سخت

ہوگا اور پھر عذاب بھی سخت ملے گا جتنا جسم پھلا پھولا اور چربی دار ہوگا۔ عبد القواء والٹھازم ہوگا۔ اتنی ہی

تکلیف زیادہ پہنچے گی۔ جبکہ نعمتوں کی تکمیل ایمان سے ہوتی ہے۔ کوئی بھی نعمت اس کے بغیر نعمت نہیں۔ اسی

عظیم نعمت نے مشیت خاک کو کندن بنایا۔ کسی نے کیا خوب فرمایا۔

حمد بے حد مر خدائے پاک را
آنکہ ایمان داد مشیت خاک را

اور اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ اس نعمت کا بھی ذکر کرتے تھے۔ اور تمام دیگر نعمتوں کے ساتھ اس

کے استحضار کا اہتمام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس حدیث میں اس بات کی تعلیم ہے کہ ہر نعمت کا شکر یہ ادا

کرنا چاہیے۔ کھانا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عظیم نعمت ہے۔ اس پر شکر لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

که لئن شکرتم لا زیلنکم و لئن کفرتم إن عذابی لشدید۔ اور چونکہ کھانا عموماً پینے سے خالی

(۱) سنن ابی داؤد ۱۸۲/۲ کتاب الاطعمة باب ما یقول الرجل اذا طعم، السنن الکبریٰ

للنسائی ۸۰/۶ کتاب عمل الیوم الیلۃ باب ما یقول اذا شرب اللبن، مصنف ابن ابی

شیبۃ ۱۲۱/۸۔ (مختار)

نہیں ہوتا۔ اس لئے وسقانا کا اضافہ بھی کر دیا تاکہ تمام نعمتوں کا ذکر ہو جائے۔

نعمت طعام پر حمد:

(۵) حدثنا محمد بن بشار ثنا يحيى بن سعيد ثنا ثور بن يزيد ثنا

خالد بن معدان عن أبي أمامة قال قال رسول الله ﷺ اذا رفعت

المائدة من بين يديه يقول الحمد لله حمداً كثيراً طيباً مباركاً فيه غير

مودع ولا مستغنى عنه ربنا (۱)۔

ترجمہ: حضرت ابو امامہ باعلیٰ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے سے

جب دسترخوان اٹھایا جاتا۔ تو آپ ﷺ یہ دعا پڑھتے ”الحمد لله حمداً لخم“

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں۔ ایسی تمام تعریفیں جو ریا و نمود سے پاک اور برکت

والی ہیں۔ ایسی تعریفیں جو ناقابل ترک ہوں۔ نہ اس سے استغنا کیا جاسکتا ہو۔ تو ہی

ہمارا رب ہے (حمد و دعا سننے والا)

حمد حضور ﷺ اور امت کی خاص پہچان: الحمد لله الخ نبی کریم ﷺ حمد کے مواقع تلاش

فرماتے تھے۔ اور اس کو عجیب تعبیرات اور قسم قسم کے الفاظ سے ادا فرماتے تھے۔ بلکہ حمد تو آپ ﷺ کی

امتیازی خصوصیت ہے۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ کی امت کا نام حمادون یعنی زیادہ حمد کرنے والے شہرا۔ نبی کا نام محمد

اور احمد ہے۔ نبی کا آخری مقام بھی مقام محمود ہے۔ قرآن کی ابتداء حمد سے ہوئی۔ جنت میں داخل ہونے

کے بعد یہ امت یہی کہے گی کہ الحمد لله الذی اور ثنا الارض (الآیۃ) اور نبی کریم ﷺ قبر سے اٹھیں

گے تو روایات کے مطابق آپ ﷺ کے ہاتھ میں لواء الحمد یعنی حمد کا جھنڈا ہوگا۔

(۱) صحیح بخاری ۸۲۰/۲ کتاب الاطعمة باب ما يقول اذا فرغ من الطعام ۸۲۰/۲، سنن ابی

داؤد ۱۸۲/۲ کتاب الاطعمة باب ما يقول الرجل اذا طعم، السنن الکبریٰ للنسائی ۷/۶ کتاب

عمل اليوم واللیلة باب ما يقول اذا رفعت المائدة، ابن ماجہ ۲۴۳ کتاب الاطعمة باب ما يقال

اذا فرغ من الطعام (مختار)

بہر حال یہ ایک اہم صفت ہے۔ اور علماء نے مختلف اسالیب سے اس امت پر اس کا حاوی ہونا بیان کیا ہے۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ حمد سے سیر نہیں ہوتے تھے۔ اور یہاں بھی فرماتے ہیں کہ حمداً کثیراً طیباً۔ یعنی حمد ہو زیادہ ہو۔ ریاض و مود کی لائقوں سے پاک اور مبارک ہو۔ یعنی پھلے پھولے اور اس کی نشوونما ہوتی رہے۔ غیر مودع اگر دال پر فتح ہو تو یہ حمد سے حال ہوگا۔ اور معنی یہ ہوگا کہ غیر متروک ہو۔ اور اس سے فراق کبھی نہ ہو۔ کبھی اس سے دل نہ بھرے۔ اگرچہ کھانا کتنا بھی لذیذ کیوں نہ ہو اس سے دل بھر جاتا ہے۔ بلکہ ہر خوبصورت چیز اور محبوب ذات سے ایک نہ ایک دن دل اچٹ جاتا ہے۔

مگر آپ ﷺ کے بقول حمد ایسا ہو جو چھوڑا نہ جاسکے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ لفظ اللہ سے حال بنے۔ اور معنی یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کبھی متروک نہ ہو۔ یعنی ہمیشہ کے لیے وہ ہماری عبادت اثابت اور دعاؤں کا مرجع رہے۔ اور مودع کی دال پر کسرہ ہو تو پھر قائل اور حامد سے حال ہوگا۔ مطلب یہ ہوگا کہ ایسی حمد کہ میں اسے کبھی ترک نہ کروں۔ لیکن یہ احتمال مابعد کے جملہ ”ولا مستغنی عنہ“ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ جو صرف حمد یلفظ اللہ سے حال بن سکتا ہے۔

ولا مستغنی عنہ اس کا بھی یہی مقصد ہے۔ یعنی اس حمد سے استغناء اور بے نیازی نہ ہو۔ یا اللہ تعالیٰ سے اعراض بے توجہی نہ ہو۔ کیونکہ منعم کامل ہونے کی وجہ سے اس کے احسانات سے اغماض ممکن نہیں۔ تمام عالم کا نظام ہمارے اوپر ایک بڑا انعام ہے۔ عرش سے فرش تک انعامات ہیں۔ انسان منعم علیہ ہے۔ اور رب العالمین منعم حقیقی ان تین چیزوں میں سب کچھ سمٹ گیا ہے۔

ایر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند تا تو نانے بکف آری و بظلمت نخوری

ان تمام الفاظ کا خلاصہ یہ ہے کہ حمد دائم ہو۔ بار بار ادا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبدیت کا احتیاج اور شکر کی ادائیگی کا رشتہ ہمیشہ استوار رہے۔

دینا اس لفظ کے اعراب میں تین احتمالات ہیں۔ یا تو مرفوع ہے۔ مبتدا مقدر کے لئے خبر ہونے کی وجہ سے یعنی ”ہو دینا“ یا ”انت دینا“ یا پھر یہ خبر مقدم۔ یعنی غیر مودع کے لیے مبتدا ہے۔ لیکن اس

تقدیر پر غیر مرفوع پڑھا جائے گا۔ تقدیریوں ہوگی ”ربنا غیر مودع“ یا منادئی ہونے کی وجہ سے منصوب ہوگا۔ یا نصب فعل مدح۔ فعل اختصاص یا فعل اعنی کی تقدیر کی وجہ سے نصب ہوگا۔ تیسرا احتمال جر کا ہے۔ یعنی لفظ اللہ سے بدل بن کر مجرور ہے۔

(۶) حَدَّثَنَا أَبُو بَكْرِ مُحَمَّدُ بْنُ أَبَانَ ثَنَا وَ كَيْع عَنْ هِشَامِ الدِّسْتَوَائِي عَنْ بَدِيلِ بْنِ مَيْسَرَةَ الْعَقِيلِيِّ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُبَيْدِ بْنِ عَمِيرٍ عَنْ أُمِّ كَلْبُومَ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَأْكُلُ الطَّعَامَ فِي سَعَةٍ مِنْ أَصْحَابِهِ فَجَاءَ أَعْرَابِي فَأَكَلَهُ بِلَقْمَتَيْنِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَوْ سَمَى لَكُفَاكُم (۱)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ چھ آدمیوں کی معیت میں کھانا کھا رہے تھے کہ ایک بدوی آیا۔ اور سارا کھانا دو لقموں میں ختم کر دیا۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ اگر یہ بدوی بسم اللہ پڑھتا تو یہ کھانا سب کے لئے کافی ہو جاتا۔
جاء اعرابی صحرا میں زندگی بسر کرنے والے لوگوں کو اعرابی کہتے ہیں۔ جو پانی اور چارے کی تلاش میں کوچ در کوچ کرتے رہتے ہیں۔

لو سَمَى لَكُفَاكُم یعنی اس نو وارد کے بسم اللہ نہ پڑھنے کی وجہ سے کھانے کی برکت جاتی رہی۔ اگر یہ شخص بسم اللہ پڑھتا تو کھانے میں برکت ہوتی۔ اور بظاہر یہ تھوڑا سا کھانا تم سب کے لیے کافی ہو جاتا۔ جیسے کئی مواقع پر معجزہ کے طور پر اس قسم کی تکثیر کا مشاہدہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غفلت اور ترک سنت کا ارتکاب ہوا۔ تو شیطان کو موقع ملا اور کھانا ختم کر دیا۔

(۷) حَدَّثَنَا هَنَادٌ وَمَحْمُودُ بْنُ غِيلَانَ قَالَا حَدَّثَنَا أَبُو أُسَامَةَ عَنْ زَكْرِيَّا بْنِ أَبِي زَائِدَةَ عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي بَرْدَةَ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ لِيَرْضَى عَنِ الْعَبْدِ أَنْ يَأْكُلَ الْأَكْلَةَ وَيَشْرَبَ

الشربة فیحمدہ علیہا (۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے اس بات پر بہت راضی ہوتے ہیں۔ کہ وہ ایک بار کھانا کھائے، یا پانی پیے اور پھر (شکر ادا کرتے ہوئے) رب ذوالجلال کا حمد بیان کرے۔

ان یا کل الاکلة: اكلة فتح حمزہ کے ساتھ ہے۔ الفعل للمرة یعنی بسبب الاکلة یعنی ہر بار جب وہ کچھ کھاتا ہے۔ اویشرب شربة یعنی ہر بار جب وہ کچھ پیتا ہے۔ صبح ہو، شام ہو، دوپہر ہو یا رات کوئی بھی وقت ہو۔ اور کوئی بھی کھانا ہو۔ ہر نوالے اور ہر گھونٹ کے ساتھ حمد ادا کرے۔ بعض لوگوں نے اکلة کو ضم حمزہ پڑھا ہے۔ جو نوالہ کے معنی میں ہے۔ لیکن شربة کے قرینہ سے فتح کا احتمال قوی ہے (۱)۔

فیحمدہ علیہا تو وہ اس کھانے پینے پر رب تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔ اس کی حمد بیان کرے۔ تو ضمیر اکلة یا شربة کو بطریق تردید راجع ہے۔

اس حدیث میں بھی دوسری احادیث کی طرح کھانے کے بعد الحمد للہ کہنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

(۱) صحیح مسلم ۳۵۲/۲ کتاب الذکر والدعا و باب استحباب حمد اللہ تعالیٰ بعد الاکل والشرب، جامع ترمذی ۳/۲ کتاب الأطعمة باب ماجاء فی الحمد علی الطعام اذا فرغ منه، مسند احمد ۱۰۰/۳ (مختار)۔

خلاصہ باب

اس باب میں ان اذکار کا بیان ہے جو کھانا کھانے سے پہلے یا بعد میں نبی کریم ﷺ سے مروی ہیں۔ کھانا کھانے سے قبل بسم اللہ پڑھنا سنت ہے۔ جو کھانے میں برکت کا سبب بنتا ہے۔ اور شیطان کے تصرف کے لئے مانع ہے۔ اور اگر بھولے سے ابتداء میں پڑھنا رہ جائے۔ تو جب بھی درمیان میں یاد آئے تو بھی بسم اللہ پڑھنی چاہیے۔ اسی طرح کھانے سے فراغت کے بعد حمد اور شکر کے الفاظ کہنا مسنون ہے۔ جس کے آسان الفاظ یہ ہیں کہ الحمد لله الذی اطعمنا و سقانا و جعلنا مسلمین۔

اس کے ساتھ ساتھ ضمنادائیں ہاتھ سے کھانے، اور اپنے سامنے سے کھانے کی مسنونیت کا بیان بھی ہوا ہے۔

۲۹۔ باب ما جاء في قدح رسول الله ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے پیالہ کا بیان

جس طرح کھانوں میں نبی کریم ﷺ کی سادگی اور اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کے شکر کا بیان تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے گھر کے برتن تکلفات سے پاک تھے: اسی طرح نبی کریم ﷺ کے کھانوں کے برتنوں میں بھی تنوع اور تکلفات نہیں تھے۔ آج کل تو صبح کے کھانے کیلئے برتنوں کے الگ سیٹ مہیا کئے جاتے ہیں تو شام کے کھانوں کیلئے الگ سیٹ کا تقاضا ہوتا ہے۔ کہیں چائے کا سیٹ ہے تو کہیں شربتوں کا سیٹ ہے۔ اس باب میں نبی کریم ﷺ کے کھانے پینے کے برتن کا ذکر ہے۔ اور اس پر تنبیہ ہے کہ برتنوں کا اہتمام اصل مقصود نہیں ہوتا۔ مقصود تو کھانا ہوتا ہے جس برتن کے ذریعے بھی ہو۔ گزشتہ زمانے میں ہمارے طلبہ کا بھی یہی حال تھا کہ جو برتن کھانے کا ہوتا تھا وہی پینے کیلئے بھی استعمال۔ جیسا کہ اس باب میں بیان ہوگا کہ نبی کریم ﷺ کے کھانے اور پینے کیلئے ایک ہی پیالہ تھا۔ پانی، شربت، لسی اور دودھ وغیرہ سب اسی میں تناول فرماتے۔ ہر چیز کیلئے الگ سیٹ موجود نہیں تھے۔

تغیث کے اس دور میں تو مختلف ڈیزائن اور رنگوں کے برتنوں سے الماریاں بھری ہوتی ہیں۔ لیکن بیویوں کا پھر بھی مطالبہ ہوتا ہے کہ ڈیزائن اور فیشن بدل چکا ہے۔ زمانہ کے ساتھ چلنا ہے۔ اس لیے دوسرا سیٹ لینا ضروری ہے۔

(۱) حَدَّثَنَا الْحُسَيْنُ بْنُ الْأَسَدِ الْبَغْدَادِيُّ ثَنَا عَمْرُو بْنُ مُحَمَّدٍ ثَنَا

عِيسَى بْنُ طَهْمَانَ عَنْ ثَابِتٍ قَالَ أَخْرَجَ إِلَيْنَا أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ قَدَحَ

خَشَبٍ غَلِيظًا مُضْبِبًا بِحَلِيدٍ فَقَالَ يَا ثَابِتُ هَذَا قَدَحُ رَسُولِ

اللَّهِ ﷺ (۱)۔

ترجمہ: حضرت ثابت کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ نے ہم کو لکڑی کا موٹا پیالہ جس میں

لوہے کے پترے لگے تھے نکال کر دکھلایا۔ اور فرمایا کہ اے ثابت یہ حضور ﷺ کا

پیالہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا پیالہ: قدح خشب (۱) چونکہ حضرت انسؓ آپ ﷺ کے خادم تھے اس لئے نبی کریم ﷺ کی متعدد چیزیں آپ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت انسؓ کے پاس رہ گئی تھیں۔ خاص خادم اور خاص شاگرد کے ساتھ بعض اوقات کچھ خاص چیزیں بطور نشانی رہ جاتی ہیں۔ ان اشیاء سے مذکورہ پیالہ آپؐ نے بطور تبرک لیا تھا۔ یہ لکڑی کا بنا ہوا پیالہ تھا (۲)۔ جو آپؐ لوگوں کو دکھایا کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کے پیالہ پر پٹیاں: مضیبا بحدید یعنی جس پر لوہے کے ضباب یعنی پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ ضباب ضبة کی جمع ہے جو کسی برتن کی مضبوطی کے لیے اس کے گرد لگائی جانے والی دھات کی پٹی کو کہتے ہیں گویا اس پیالہ کے کناروں پر مضبوطی کی غرض سے یا کہیں سے ٹوٹنے کی وجہ سے لوہے کی پٹی لگی ہوئی تھی (۳)۔

(۱) علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے قدح خشب ای قدحاً من خشب لافلاضافة بمعنى من قوله غليظاً مضيباً بالنصب على انه صفة قدح ورواه في جامع الاصول غليظ مضيب بالجر وهو كذلك في بعض النسخ وهو من قبيل هذا حجر مضرب خرب وقوله بحديد متعلق بمضيباً (المواهب اللدنية ص ۱۲۵) (مختار)

(۲) رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ عام طور پر لکڑی کے پیالہ میں پانی پیا کرتے تھے۔ کما جاء في رواية عن انس انه قال لقد سقيت رسول الله ﷺ من هذا القدح اكثر من كذا وكذا (جمع الوسائل ۱/ ۲۹۴) (مختار)

(۳) سوال یہ ہے کہ یہ تہییب رسول اللہ ﷺ نے فرمائی تھی یا حضرت انسؓ نے کی تھی۔ تو علامہ بیجوریؒ نے فرمایا ہے کہ اس میں دونوں کا امکان موجود ہے۔ اور علامہ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے وفي الصحيح ايضاً انه قد اتعدع فسلسل بعضه بعض بقضة فيحتمل أن الواصل هو النبي ﷺ أو انس وكلام العسقلاني يميل إلى الأول حيث قال هو الظاهر ويؤيده ما ورد في الصحيح أن قدح النبي ﷺ قد اتعدع فاتخذ مكان الشعب سلسلة من فضة لم قال ويحتمل أن يكون الواصل أنساً ويؤيده ما رواه البيهقي عن انس ولفظه فجعلت مكان الشعب سلسلة انتهى والظاهر أن يحمل قوله فاتخذ على أنه أمر بالاتخاذ على الامتداد المجازي ويحمل قوله فجعلت على الامتداد الحقيقي فاتفق الروايتان (جمع الوسائل ۱/ ۲۹۴) (مختار)

خلاصہ باب

نبی کریم ﷺ کے استعمال میں آنے والے پینے کے برتنوں کے متعلق اس باب میں امام ترمذی نے دو حدیثیں بیان فرمائی ہیں۔ دیگر کتب حدیث میں بھی اس سلسلے میں کچھ روایات موجود ہیں۔

امام بخاریؒ نے ”باب الشرب من قدح النبی ﷺ“ کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت انسؓ کے پاس آپ ﷺ کا ایک پیالہ تھا جسے حضرت انسؓ بڑی حفاظت سے رکھا کرتے تھے۔ ایک بار یہ ارادہ بھی فرمایا کہ اس پر لگی ہوئی لوہے کی پٹی کی بجائے سونے یا چاندی کی پٹی لگا دے۔ لیکن ام انسؓ کے خاوند حضرت ابو طلحہؓ کے منع کرنے پر یہ فیصلہ بدل دیا۔ بعد میں جب وہ ٹوٹ گیا تو حضرت انسؓ نے اس پر چاندی کا حلقہ لگا دیا۔ کہتے ہیں کہ حضرت نضر بن انسؓ کی میراث میں سے یہ پیالہ آٹھ لاکھ درہم میں فروخت ہوا۔ اسی طرح کا ایک پیالہ حضرت بہل بن سعدؓ کے پاس تھا جس میں نبی کریم ﷺ پی چکے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ جس زمانہ میں مدینہ کے گورنر تھے۔ اس زمانہ میں یہ پیالہ حضرت بہل سے مانگا اور حضرت بہل نے یہ پیالہ ان کو ہبہ کر دیا (۱)۔ ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے پاس بھی ایک ایسا پیالہ تھا جو نبی کریم ﷺ کے استعمال میں آچکا تھا۔ نبی کریم ﷺ کے ہاں جو پیالے تھے ان میں سے لکڑی کے پیالوں کے علاوہ ایک شیشے کا پیالہ بھی بتایا جاتا ہے (۲)۔ اور بعض کیلئے خصوصی نام بھی رکھے گئے تھے۔ مثلاً ایک کو ریان (۳) اور ایک کو مضبٹ کہا جاتا تھا۔ نیز ایک قدح مضبب بھی تھا۔

(۱) بخاری شریف ج ۲ ص ۸۴۲

(۲) عن ابن عباس قال كانت لرسول الله ﷺ قدح قوارير يشرب فيه (ابن ماجہ آخر ابواب الاشریہ ص ۲۵۳) (مختار)

(۳) قال ابن القيم وكان للمصطفى اقداح واحد منها الریان و آخر الخ. هكذا وجدت في شرح الشمائل للمناوی علی هامش جمع الوسائل فذكره بالباء واللام اقوال و لعل ذالك من سبق القلم و الصحيح ما ذكرنا انه الریان كما ذكره البيجوری فی شرحه فی هذا المقام وزاد كان للنبي ﷺ قدح من عید ان بفتح العين المهملة والعید انه النخلة السحوق و هو الذي كان يوضع تحت سريره ليول فيه باللیل (اصلاح الدين عفی عنه)

۳۰۔ باب ما جاء في صفة فاكهة رسول الله ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے پھل تناول فرمانے کا بیان

اس باب میں ان پھلوں کا بیان ہے جو نبی کریم ﷺ نے تناول فرمائے ہیں۔ ”فاکھہ“ ما يتفكه به الانسان کا نام ہے۔ یعنی وہ چیز جو تلافی کی غرض سے کھائی جائے۔ اس کا اطلاق گندم اور چاول جیسی بطور تغذی کھائی جانے والی اشیاء پر نہیں ہوتا۔ اس طرح سبزیوں نیز ان چیزوں کو بھی فاکھہ نہیں کہتے جو کہ بطور دوا استعمال ہوتی ہیں بلکہ عموماً کھانے کے بعد تلافی کی خاطر جو چیز کھائی جاتی ہے فاکھہ کہلاتی ہے۔

فاکھہ کے مفہوم میں اختلاف: ائمہ کے درمیان یہ اختلاف فقہ اور اصول فقہ کی کتب میں تفصیل سے مذکور ہے۔ کہ فاکھہ کا مفہوم کن چیزوں کو شامل ہے اور کونسی اشیاء اس سے خارج ہیں۔ مثلاً اگر کسی شخص نے فاکھہ یعنی پھل نہ کھانے کی قسم کھائی تو امام ابو حنیفہؒ کے ہاں کھجور اور انار سے حائث نہیں ہوگا۔ کیونکہ اول الذکر تغذی اور دوسرا تداوی کے لیے بھی مستعمل ہوتا ہے۔ جبکہ فاکھہ وہ ہے جو تغذی یا تداوی کے لیے نہ ہو۔ ان کی دلیل اس سلسلے میں یہ ہے کہ قرآن مجید ”فیہا فاکھہ و نخل و دمان“ کہہ کر نخل اور دمان یعنی کھجور اور انار کو فاکھہ پر عطف کر دیا گیا ہے۔ اور عطف مغایرت کا مقتضی ہے۔ اگر کھجور اور انار بھی پھل ہوں تو اس کا عطف فاکھہ پر صحیح نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس صاحبینؒ کے نزدیک دونوں چیزیں فاکھہ میں شمار کی جاتی ہیں۔ اور فاکھہ سے قسم کھانے والا شخص کسی ایک کے کھانے سے حائث ہوگا۔ گویا ان کے نزدیک فاکھہ میں تلافی یا تداوی کا نہ ہونا شرط نہیں۔ لیکن درست بات یہی ہے کہ اس قسم کا اختلاف زمانہ اور مختلف علاقوں کے عرف پر مبنی ہے۔ ویسے بھی ایمان اور قسموں کا دار و مدار عرف پر ہے۔

تو گویا جس ملک میں جو چیز بطور تفکھ کھائی جائے۔ وہ فاکھہ ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں کھجور اور انار میں سے کوئی بھی اتنی مقدار میں نہیں پایا جاتا کہ لوگ اسے بطور تغذی استعمال کریں۔ بلکہ تفکھ اور تلافی کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں۔ لہذا یہ فاکھہ میں آئیں گے۔ اور جہاں پر کھجور وغیرہ اتنا زیادہ ہو کہ اسے غذا کے طور پر کھایا جائے تو یہ فاکھہ میں شمار نہ ہوگا اور نہ قسم کھانے والا اس کے کھانے سے حائث ہوگا۔

صاحبین کا فتویٰ بھی اس پر مبنی ہے۔ یعنی یہ بات کہ قرآن مجید میں مذکورہ دونوں پھلوں کو فاکھتہ پر عطف کیا گیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا عطف اہتمام شان کی غرض سے کیا گیا ہوگا۔ مثلاً انار کی افادیت اور لذت کو مد نظر رکھ کر اہتمام شان کی وجہ سے اس کی تخصیص کی گئی ہوگی۔ جس طرح کہ دوسری جگہ آتا ہے وفا کھتہ و اباً یہاں انہی کی تشریح میں عام مفسرین ان اشیاء کا نام لیتے ہیں جو کچی کھائی جاتی ہیں۔ اور پھلوں میں سے نہیں۔ مثلاً گاجر، مولیٰ اور ککڑی وغیرہ۔ لیکن بعض مفسرین نے جن میں ہمارے علامہ مناظر احسن گیلانی بھی ہیں ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ اباً سے آم بھی مراد ہو سکتا ہے جسے آج بھی عربی میں انہ کہتے ہیں۔ اور اس کا ذکر فاکھتہ کے بعد زیادہ اہتمام کی وجہ سے کیا گیا ہے ورنہ آم بھی تو پھل ہے۔

(۱) حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ مُوسَى الْفَزَارِيُّ ثنا إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ أَبِيهِ

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ جَعْفَرٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَأْكُلُ الْقَنَاءَ بِالرُّطْبِ (۱)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن جعفر سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ککڑی کو کھجور کے ساتھ کھایا کرتے تھے۔

عبداللہ بن جعفر کا شمار کم عمر صحابہ میں ہوتا ہے۔ باب نمبر ۱۳ میں ان کے احوال مذکور ہیں۔ یا کل القناء بالرطب قنأ کی متعدد قسمیں ہیں۔ یہ کھیرے کی طرح کچا کھایا جاتا ہے۔ اردو میں اسے ککڑی کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے اس عمل سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ مصلحت کے تحت بیک وقت دو چیزیں کھانا ناجائز نہیں۔

مصرفین کی طرح ہر وقت طرح طرح کے کھانے منہ میں ٹھونسنے اور بسیار خوری کی عادت نبی کریم ﷺ کو پسند نہ تھی لیکن نبی کریم ﷺ کا مذکورہ عمل اس کے جواز کے لئے کافی ہے۔ گویا کراہت صرف اس صورت میں ہوگی جب اسے عادت بنا دیا جائے۔

(۱) صحیح بخاری ۸۱۸/۲ کتاب الأطعمة باب القناء بالرطب، صحیح مسلم ۱۸۰/۲ کتاب الأشریة باب أكل القناء بالرطب، ابو داؤد کتاب الأطعمة باب فی الجمع بین الکونین عند الاکل ۱۸۰/۲، ابن ماجہ ص ۲۳۸ کتاب الأطعمة باب القناء والرطب یجمعان (مختار)

طبی مرکبات سے علاج کا نبوی ﷺ اصول: علاوہ ازیں قوانین طب کی رو سے کسی چیز کی مضر خصوصیت دوسری چیز کے ملانے سے بدل سکتی ہے۔ زیادہ تر دوائیں بھی مرکبات کی صورت میں بنتی ہیں۔ تو مفردات کے ساتھ ساتھ علم طب کے مرکبات کا ایک عظیم الشان دروازہ حضور اقدس ﷺ کے اس عمل نے کھولا اور اس کا اصل یہی باب ہے کہ مختلف اشیاء کے ملانے سے اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر ایک چیز میں حرارت زیادہ ہے تو دوسرا جو کہ بارد ہے اس کی حرارت کو کم کر دیتا ہے تو نبی کریم ﷺ نے اس عمل سے اس بات کی طرف بھی اشارہ فرمایا کہ اعتدال مقصود ہو تو ترکیب کرنا چاہیے۔

یہاں بھی کھجور گرم اور ککڑی بارد ہے جبکہ زیادہ گرم یا زیادہ سرد چیز کا کھانا نقصان دہ ہوتا ہے۔ اس لیے طبائع اطعمہ اور ان کی خصوصیات کا لحاظ رکھنا اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

ابوداؤد کی روایت (۱) میں تو نبی کریم ﷺ نے اس کی تصریح بھی کی ہے کہ یکسو بخور هذا ببرد هذا وبرد هذا بخور هذا یعنی اس ایک کی گرمی کو دوسرے کی سردی سے اور دوسرے کی سردی کو اس کی گرمی سے توڑا جاتا ہے (۲)۔

(۲) حَدَّثَنَا عَبْدَةُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ الْخَزَاعِيُّ الْبَصْرِيُّ ثَنَا معاوية بن هشام

عن سفيان عن هشام بن عروة عن ابية عن عائشة أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ يَأْكُلُ

البطيخ بالرطب (۳)۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ تربوز کو تازہ کھجور

کے ساتھ کھایا کرتے تھے۔

(۱) ابوداؤد ۱۸۰/۲۵ کتاب الأطعمة باب الجمع بين اللونين عند الأكل ج ۲ صف ۱۸۰ (مختار)

(۲) قال النووي فيه جواز أكل الطعامين معاً والتوسع في الأطعمة ولا خلاف بين العلماء في جوازه (جمع الوسائل ۱/۲۹۶) (مختار)

(۳) السنن الكبرى للنسائي ۱۶۶/۴ کتاب الوليمة ابواب الأطعمة باب الرطب، سنن ابی

داؤد ۱۸۰/۲۵ کتاب الأطعمة، جامع ترمذی ۶/۲ کتاب الأطعمة باب ما جاء في أكل البطيخ

بالرطب، السنن الكبرى للبيهقي ۷/۲۸۱ (مختار)

کان یا کل البطیخ (۱) بالرطب یہاں بھی وہی حکمت ملحوظ ہے کہ کھجور کی گرمی کو کم کرنے کے لیے تربوز کو بھی ساتھ ساتھ تناول فرمایا۔

(۳) حدثنا ابراهيم بن يعقوب ثنا وهب بن جرير ثنا ابي قال سمعت حميداً يقول او قال حدثني حميد قال وهب و كان صديقاً له عن أنس بن مالك قال رأيت النبي ﷺ يجمع بين الخربز والرطب (۲)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو خربوزہ اور کھجور اکٹھے کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔

لطیف سند کی نکتہ: او قال حدثني حميد الخ اس مقام پر راوی وهبؓ کو شک ہے کہ میرے والد جریرؓ نے سمعت حمید کہا یا حدیثی حمید کہا۔ بہر حال یہ اور اس قسم کی توضیحات سے روادۃ حدیث کا روایت میں (۱) بطیخ کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض نے اس کا معنی خربوزہ لکھا ہے۔ اور بعض نے تربوز فرمایا ہے۔ اگر بطیخ کا معنی تربوز لیا جائے۔ جیسا کہ مشہور ہے۔ تو پھر کوئی اشکال نہیں رہتا۔ لیکن اگر خربوزہ مراد لیا جائے تو پھر اشکال ہوگا کہ اس میں یکسر حر ہذا ببر دھذا کیسے ہوگا۔ جیسا کہ ابوداؤد کی روایت میں وضاحت کے ساتھ مذکور ہے۔ کہ کان یا کل البطیخ بالرطب لبقول یکسر حر ہذا ببر دھذا او بر دھذا بحر ہذا؟ تو علماء کرام نے اس کی مختلف توجیہات کی ہیں۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں بروایت سے مراد برویت حس ہے یعنی ہاتھ لگانے میں ٹھنڈک اگر خربوزہ کو کانٹے کے بعد تھوڑی دیر کھلا رکھ دیا جائے تو وہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اور بعض حضرات نے یہ توجیہ کی ہے کہ اس سے مراد کچا خربوزہ ہے۔ اس لئے کہ خربوزہ جب کچا ہو تو سرد (ٹھنڈا) ہوتا ہے اور جب پک جائے تو اس کی خاصیت بدل جاتی ہے۔ جیسا کہ آم کے بارے میں مشہور ہے کہ آم جب کچا ہو تو بار دھوتا ہے اور جب پک جائے تو حار (گرم ہو جاتا ہے) اور بعض کا کہنا ہے یہ برویت امور اضافیہ میں سے ہے کہ بطیخ کی برویت رطب کے اعتبار سے ہیں کیونکہ رطب شدیداً لحرارۃ ہے۔ یہ توجیہات اس معروف اور مشہور قول کے اعتبار سے ہیں ورنہ شیخ بوعلی سینا سے منقول ہے کہ خربوزہ بھی بار دھوتا ہے۔ لہذا بطیخ سے دونوں معنی مراد لئے جاسکتے ہیں۔ اس لئے مدینہ منورہ میں دونوں (خربوزہ اصغر، تربوز اصغر) پیدا ہوتے تھے۔ اور آئندہ روایت میں روایت رسول اللہ ﷺ یجمع بین الخربز والرطب کی تصریح موجود ہے۔ (مختار)

(۲) السنن الکبریٰ للنسائی ۱۶۷/۳ کتاب الولیمة ابواب الاطعمة باب الجمع بین الخربز والرطب، صحیح ابن حبان رقم حدیث ۱۳۵۶ (مختار)

انتہائی درجہ کا حزم و احتیاط معلوم ہوتا ہے۔ منکرین حدیث جب ان باریکیوں سے چشم پوشی کر لیتے ہیں تو انکار حدیث کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور اگرچہ بظاہر ان دونوں میں کوئی بڑا فرق دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن درحقیقت ان میں باریک اور اہم فرق موجود ہے۔

وکان صدیقاً له الخ اس جملہ میں حمید سے جریر کا سماع ثابت کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ جب دونوں دوست تھے تو سماع بھی ضرور ثابت ہوگا۔ اور ساتھ ساتھ اس سے جریر کا مرتبہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ معمولی آدمی نہ تھے بلکہ حمید جیسے امام کے دوست تھے۔ چنانچہ اس جملے سے جریر کا تذکیہ اور اس کی توثیق بھی ہوگئی۔ اس لحاظ سے ”وکان صدیقاً له“ کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جریر حمید کا دوست تھا۔ اور یہ معنی بھی محتمل ہے کہ حمید جریر کا دوست تھا۔ اس سے بھی جریر کی توثیق ہوتی ہے۔ لیکن اس طرح کان ضمیر حمید گوراج ہوگا۔ یہ دونوں ترجیح اس وقت ہیں جب صدیق فتح صاد کے ساتھ ہو۔ لیکن ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ ایک نسخہ صدیق یعنی صاد کے کسرہ اور وال مشدّد کسور کے ساتھ ہو۔ پھر معنی یہ ہوگا کہ حمید جریر کی زیادہ تصدیق کرنے والے تھے۔

خریوزہ یا تر یوزہ: الخریز والوطب اس مقام پر خربز کے معنی میں اختلاف ہے بعض شارحین کے ہاں اس سے زرد رنگ کا پھل یعنی خریوزہ اور بعض کے ہاں سبز رنگ کا پھل یعنی تر یوزہ مراد ہے۔ مؤخر الذکر قول اکثر علماء کا ہے۔ ان کے خیال میں چونکہ تر یوزہ طبعی برودت کا حامل ہے جبکہ خریوزہ خود بھی گرم ہے۔ اس لئے کھجور کی گرمی کو توڑنے والا خریوزہ نہیں بلکہ تر یوزہ ہو سکتا ہے۔ دوسری دلیل وہ گزشتہ روایت کو بتاتے ہیں کہ وہاں بطخ کا ذکر ہے۔ تو گویا حضرت انسؓ بھی وہی حضرت عائشہؓ کی حدیث میں مذکورہ واقعہ کا ذکر کرتے ہیں لیکن بطخ سے تعبیر خربز سے کیا گیا ہے۔ اور اگر خریوزہ ہی مراد ہو تو پھر کچا خریوزہ مراد ہوگا جو کھیرے کی طرح طبعی طور پر سرد اور مٹھاس سے خالی ہوتا ہے۔ لیکن بعض شراح کے خیال میں خود خریوزہ کا مراد ہونا بھی محتمل ہے کیونکہ وہ اگرچہ گرم ہے لیکن کھجور کی نسبت بارد ہے۔ اس لیے ترکیب کے بعد کم از کم کھجور کی حرارت کو ختم کر سکتا ہے۔ علامہ مناویؒ نے اس احتمال کو ترجیح دی ہے۔ اور حافظ زین عراقیؒ کا قول بھی نقل کیا ہے کہ ”الخریز اسم للاصفر بارض العراق“۔

(۴) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَى ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ الرَّمْلِيُّ ثَنَا
عبدالله بن يزيد بن الصلت عن محمد بن اسحاق عن يزيد بن رومان
عن عروة عن عائشة أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَكَلَ الْبَطِيخَ بِالرُّطْبِ (۱).
ترجمہ: حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ تربوزہ کو تر کھجور کے ساتھ تناول
فرماتے تھے۔

اکل البطیخ بالرطب اس حدیث کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔ پہلے دوسری سند سے مصنف
اسے لاکھے ہیں۔

(۵) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ عَنْ مَالِكِ بْنِ أَنَسٍ وَحَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ
مُوسَى ثَنَا مَعْنُ ثَنَا مَالِكُ عَنْ سَهِيلِ بْنِ أَبِي صَالِحٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي
هَرِيرَةَ قَالَ كَانَ النَّاسُ إِذَا رَأَوْا أَوَّلَ التَّمْرِ جَاءُوا بِهِ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَإِذَا
أَخَذَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَالَ اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي ثَمَارِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِي
مَدِينَتِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا وَفِي مَدْنَا اللَّهُمَّ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ عَبْدَكَ وَ
خَلِيلَكَ وَنَبِيكَ وَإِنِّي عَبْدُكَ وَنَبِيكَ وَأَنَّهُ دَعَاكَ لِمَكَّةَ وَإِنِّي
أَدْعُوكَ لِلْمَدِينَةِ بِمِثْلِ مَا دَعَاكَ بِهِ لِمَكَّةَ وَفِيهِ مِثْلُهُ مَعَهُ قَالَ ثُمَّ يَدْعُو
أَصْغَرَ وَبِكِبْرَاهُ فَيُعْطِيهِ ذَلِكَ الثَّمَرُ (۲)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ جب لوگ کسی فصل آنے پر نئے پھل کو دیکھتے
تو اس کو حضور ﷺ کی خدمت میں لا کر پیش کرتے۔ پس جب نبی کریم ﷺ اس کو لیتے
تو فرماتے اے اللہ ہمارے لیے ہمارے پھلوں میں برکت عطا فرما اور ہمارے لیے

(۱) تفرد الامام الترمذی بهذا الحديث، جامع ترمذی ۲/۶ ابواب الاطعمة (مختار)

(۲) صحيح مسلم ۲/۴۴۲ كتاب الحج باب فضل المدينة، جامع ترمذی ۲/۸۳ كتاب
الدعوات باب ما يقول اذا رأى باكرة من الثمر، السنن الكبرى للنسائي ۶/۸۳ كتاب عمل اليوم
الليلة باب ما يقول اذا ادعى باول الثمر (مختار)

ہمارے شہر میں برکت عطا فرما۔ اور ہمارے لیے (ہمارے پیانوں یعنی) صاع اور مد میں برکت عطا فرما۔ اے اللہ بیشک ابراہیم تیرے بندے دوست اور نبی تھے۔ اور بیشک میں تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں۔ اور بیشک انہوں نے شہر مکہ کے لیے تجھ سے دعا فرمائی تھی اور میں تجھ سے مدینہ کے لیے اس جتنا مانگتا ہوں جتنا انہوں نے مکہ کے لیے مانگا تھا۔ اور اس جتنا مزید بھی مانگتا ہوں۔ فرمایا پھر نبی کریم ﷺ کی نظر جس چھوٹے سے چھوٹے بچے پر پڑتی اس کو بلا کر وہ پھل اس کو دے دیتے تھے۔

پہلا پھل حضور اقدس ﷺ کی نذر: جاء وا به إلى النبي ﷺ اهل مدينة كرواج تھا کہ جب پہلی بار درخت کا پھل یا کھیت میں سبزی لگ جاتی تو اظہار محبت و عقیدت کے لیے اس کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کرتے تھے۔ اس میں نبی کریم ﷺ کو اپنے اوپر ترجیح، محبت کا اظہار، تعظیم اور ثمرات میں طلب برکات کے علاوہ اس بات پر تنبیہ بھی مقصود ہے کہ رزق الہی کا اولین اور سب سے زیادہ مستحق اشرف خلائق نبی کریم ﷺ ہیں (۱)۔

بلکہ ہمارے ہاں بھی یہی رواج بعض علاقوں میں چلتا ہے کہ لوگ عقیدت اور تعظیم کے طور پر علماء و مشائخ کو ایسے مواقع میں خود پر بھی مقدم کر لیتے ہیں۔ بزرگوں کی خدمت میں اس قسم کا پھل پیش کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف اس عمل سے آپ ﷺ اس لئے خوش ہوتے تھے کہ ملک کی معاشی حالت کی بہتری پر ملک کا سربراہ خوش ہوتا ہے۔ آپ ﷺ بھی مدینہ کی ظاہری خوش حالی اور فلاح کے لیے فکر مند رہتے۔ اور دعا فرمایا کرتے تھے کہ

اللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي ثَمَارِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِي مَدِينَتِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا وَفِي مَدَنَّا.

ترجمہ: اے اللہ ہمارے لیے ہمارے پھلوں میں برکت ڈال اور ہمارے شہر میں برکت ڈال اور ہمارے لئے صاع اور مد (یعنی فصل کے پیانوں) میں برکت ڈال۔

(۱) علامہ بیجوریؒ، يؤخذ منه أنه يندب الاتيان بالباكورة لأكبر الصوم علماً وعملاً (مختار)

جو کہ دراصل معاشی آسودگی کی دعا تھی۔ اس لیے کہ باہر کے لوگوں کو کچھ فروخت کرنا ہو تو پکانوں اور باٹوں سے کیا جاتا ہے چنانچہ ان میں بھی برکت کی دعا کی۔ اور ساتھ ساتھ مدینہ میں برکت وہاں پر شعائر اسلامیہ کی بقاء کی دعا بھی تھی تاکہ عبادات اور بالخصوص زکوٰۃ اور صدقات جیسے مالی شعائر زندہ رہیں۔ انہی دعاؤں کا اثر آج بھی حرمین میں دکھائی دیتا ہے۔ جہاں ہر چیز وافر ہوتی ہے۔ پھل کی کمی نہ سبزی کی۔ حالانکہ لاکھوں افراد حج کے موسم میں جا کر یہ چیزیں کھاتے ہیں مگر دکانیں پھر بھی بھری ہوتی ہیں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ یحییٰ الیہ من کل الثمرات (الآیۃ) اور وارزقہم من الثمرات (الآیۃ) کا ظہور ہے۔

خلۃ ابراہیم: اللہم ان ابراہیم علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے خلیل تھے بعض کا خیال ہے کہ خلیل خلۃ سے ہے جس کے معنی حاجت کے ہوتے ہیں۔ اور چونکہ دوست سے حاجت پوری ہوتی ہے اس لیے دوست کو بھی خلیل کہتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک یہ خلۃ بضم خاء ہے۔ جس کے معنی ایسی محبت کے ہوتے ہیں جو خلال قلب، یعنی قلب کے وسط میں داخل ہو۔ اسی طرح خلیل محبوب کے معنی میں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ بھی خلیل ہے کیونکہ وہی حقیقی حاجت روا اور محتاج الیہ ہے۔ اور بندہ خلیل ہے لیکن وہ محتاج ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے یہ تمغہ اور خصوصیت حضرت ابراہیم کو دی ہے۔

وانی عبدک الخ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابراہیم کے لیے نبوت، خلۃ اور عبدیت تینوں صفات ذکر فرمائیں لیکن خود اپنے لیے خلیل ہونے کا اعزازی لفظ ذکر نہیں کیا۔ اپنے بارے میں آپ ﷺ انتہائی تواضع اور عجز و انکساری کی صفات برتتے تھے اور خصوصاً یہ موقع تو دعا کا ہے جس میں عاجزی ہی زیادہ کام آتی ہے۔ بایں ہمہ آپ ﷺ روایا کرتے تھے کہ اے اللہ میں نے عبدیت کا حق بھی ادا نہیں کیا۔ تو اگرچہ تمام بندوں میں نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہیں اور آپ ﷺ نے سب سے بڑھ کر اس صفۃ خلۃ سے بھی متصف ہیں لیکن تواضعاً آپ ﷺ نے اسے اپنے لیے استعمال نہیں کیا۔

وانہ دعاک لمحۃ یعنی پہاڑوں کے درمیان اور ریت کے ٹیلوں نیز لوق ووق صحرا میں انہوں نے مکہ کے لیے دعائیں کی تھیں۔ ایک بہت ہی غیر آباد مقام کو اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے لیے منتخب فرمایا

تھا۔ سویزر لینڈ، فرانس، سوات، کشمیر یا مری کی بجائے مکہ میں بیت اللہ بنایا۔ اس میں بڑی حکمت ہے کہ اس طرح عشق و عبادت کی شان باقی رہتی ہے۔ خوبصورت مقامات کو تو لوگ سیر کرنے جاتے ہیں۔ عشاق کی جگہیں جنگل، صحرا اور بیابان ہوتی ہیں۔ پھول باغات اور دلکش مناظر ان کو اس نہیں آتے۔ جبکہ بیت اللہ کی زیارت تو ابتداء سے آخر تک سفر عشق اور محبت کے منازل ہیں۔ مکہ بھی ایسے ہی ایک بہت غیر آباد علاقے میں واقع ہے۔ اور خصوصاً ابراہیم کی آمد کے وقت تو اور بھی ہوکا منظر تھا۔ پانی تھانہ چارہ۔ گھر نہیں تھے، پرانے آثار بھی مٹ چکے تھے۔ وہ آئے تو دعا کی جو یہ تھی:

ربنا انی اسکنت من ذریعتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم۔ ربنا
لیقموا الصلوة فاجعل افئدة من الناس تهوی الیهم وارزقهم من
الثمرات لعلهم يشکرون۔ (الایة)

نیز آپ ﷺ نے فرمایا رب اجعل هذا بلداً آمناً وارزق اهله من
الثمرات۔ (الایة)

ترجمہ: اے ہمارے رب میں اپنی اولاد کو تیرے معظم گھر (کعبہ) کے قریب ایک
میدان میں جو زراعت کے قابل بھی نہیں آباد کرتا ہوں تاکہ وہ لوگ نماز کا اہتمام
رکھیں۔ پس آپ کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دیجئے اور ان کو پھل کھانے
کو دیجئے تاکہ یہ لوگ شکر کریں۔

اے میرے پروردگار اس جگہ کو امن والا شہر بنادے اور اس شہر والوں کو
پھلوں سے رزق دے دے۔

ثمرات کل شیء کا مطلب: یہ دعائیں تھیں جو سب قبول ہو گئیں۔ اور کچھ نہ اگانے والے
میدان کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ ”و یجئ الیہ ثمرات کل شیء“ یہاں کل شئی
کے معنی یہ نہیں کہ ہر قسم کا پھل ہر ملک سے آتا ہے بلکہ کل ثمر کی بجائے کل شئی کا ذکر اس لیے کیا کہ
تمام دنیا کے متاع زیست کا خلاصہ وہاں لایا جاتا ہے۔ مثلاً ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ، گھڑیاں اور کپڑا وغیرہ بھی

سب ثمرات الاشياء ہیں۔

توتھو شئی سے مراد اس چیز کا حاصل اور پیداوار ہے۔ وہ چیز بے جان ہو یا جاندار، پھل ہو یا غلہ، زمین کی فصلیں اور سبزیاں ہوں یا کارخانوں کی مصنوعات ہوں۔ بہر حال دنیا کے تمام ممالک جو بھی کام کی چیز بناتے ہیں وہ بنا کر مکہ مکرمہ پہنچاتے ہیں۔ وانی ادعوک الخ یعنی اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے لیے مانگا تھا تو میں مدینہ کے لیے اس سے دو چند مانگتا ہوں۔ اور اس دعا کا اثر آج بھی حجاج کو محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ مدینہ میں راحت مل جاتی ہے۔ آسائش سکون اور ارزانی وہاں مکہ کی نسبت زیادہ ہے۔ جہاں گلی گلی، ڈڑہ ڈڑہ جمال نبوی ﷺ سے منور اور وجود اطہر سے معطر ہے۔

ثم يدعو اصغر وليدا الخ ایسے موقع پر نبی کریم ﷺ مجلس میں موجود سب سے چھوٹے بچے کو بلا کر بطور حد یہ لایا جانے والا پھل دے دیتے۔ ایک تو نو عمر بچوں کو نئے نئے پھل وغیرہ زیادہ پسند ہوتے ہیں۔ اس لیے اس عمل سے ان کی دلجوئی بھی ہو جاتی ہے۔ اور بچوں کی دلجوئی ایک نیکی ہے جو دعا کو درگاہ ربوبیت میں قبولیت کے قریب تر کر دیتی ہے (۱)۔

نیز ولید اور اس قسم کی چیز کے درمیان ایک مصنوعی مناسبت بھی ہے۔ وہ یہ کہ ولید بھی نو عمر اور نوخیز پھل جیسا ابھی پیدا ہوا ہوتا ہے۔ اور یہ لائی ہوئی چیز باکورہ بھی نوخیز اور تازہ پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے ولید کو دیتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے استحقاق اور ایک لطیف مناسبت کا لحاظ رکھا ہے۔ خود اس نئے پھل کو اس لئے نہیں کھاتے تھے کہ اس طرح کھانے میں حرص اور خواہش نفس پورا کرنے کا شبہ ہوتا ہے۔ نیز اس بات پر تنبیہ کے لیے بھی خود کھانے سے پرہیز کرتے تھے کہ پاکیزہ نفوس اور کامل الاخلاق لوگوں کے لیے نئے پھلوں کا تناول تب کرنا چاہئے جب عوام الناس میں سے تمام یا اکثر کی رسائی ایسے پھل تک ہو جائے۔

(۱) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے ولیہ بیان حسن عشرتہ و کمال شفقتہ و مرحمتہ و ملاطفہ مع الکبیر والصغیر و تنزیل کل احد فی مقامہ و مرتبہ الاثقة بعد (جمع الوسائل ۱/ ۲۰۰) اور یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ اس وقت تک پھل تناول نہ فرماتے تھے جب تک فراوانی نہیں ہوتی تھی۔ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے والنفوس الذکیۃ لا یرکن الی تناول شی من الباکورۃ إلا بعد ان یعم وجودہ و یقدر کل احد علی اکلم جمیع الوسائل ۱/ ۳۰۰) (مختار)

(۶) حدثنا محمد بن حميد الرازي ثنا ابراهيم بن المختار عن محمد بن اسحاق عن ابي عبيدة بن محمد بن عمار بن ياسر عن الربيع بنت معوذ بن عفراء قالت بعثني معاذ بن عفراء بقناع من رطب وعليه اجر من قشاء زغب و كان النبي ﷺ يحب القشاء فاتيت به و عنده حلية قد قدمت عليه من البحرين فملكه منها فاعطانيه (۱)۔

ترجمہ: ربیع فرماتی ہیں کہ مجھے میرے چچا معاذ بن عفراء نے ایک تھال جن پر روئیں دار چھوٹی ککڑیاں بھی تھیں دیکر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ نبی کریم ﷺ ککڑی پسند کیا کرتے تھے۔ جس وقت میں یہ طبق لائی حضور ﷺ کے پاس کچھ زیورات تھے۔ جو بحرین سے آئے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے ان میں سے ہاتھ بھر کر مجھے مرحمت فرمائے۔

ربیع: عن الربيع الخ رائے مضموم یا مفتوح اور یائے مشد و کمسور کے ساتھ یہ راویہ کا نام ہے۔ والد کا نام معوذ ہے۔ جو میم مضموم اور واو مشد و کمسور کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ معوذ بن حارث مشہور بدری صحابی ہیں جو ابن عفراء کے نام سے مشہور ہیں۔ والدہ عفراء بنت عبیدہ (۲) مشہور صحابیہ ہیں۔ خود ربیع بنت معوذ بن حارث بن رفاعہ مشہور صحابیہ ہیں۔ بیعت رضوان میں بھی شرکت کی۔ نبی کریم ﷺ آپ کی شادی کے دوران آپ کے گھر تشریف لائے تھے۔ جس میں دفن رہا تھا۔ اور بدر کے شہداء کو بھی یاد کیا جا رہا تھا۔ آپ ﷺ بیٹھے سنتے رہے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت ربیع نے آپ ﷺ کو پانی اٹھیل کر وضوء بھی کرایا تھا۔ کئی غزوات میں شرکت کی۔ زخمیوں اور شہداء کی خدمت کرتی رہی۔ حضرت عثمان کی شہادت کے ایام تک زندہ رہیں۔

معاذ و معوذ: بعثنی معاذ: معاذ بھی معوذ کے بھائی ہیں۔ جلیل القدر بدری صحابی ہیں۔ یہی وہ دو نامور ہستیاں تھیں جنہوں نے نو عمری کے باوجود جنگ بدر میں ابو جہل پر حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔

(۱) انظر بهذا الحديث الامام الترمذي البغوي في شرح السنة ۳۳/۱۱ كتاب الاطعمة (مختار)

(۲) حضرت عفراء وہ واحد صحابیہ ہیں جن کے سات بیٹے جنگ بدر میں شریک تھے۔ کما فی الاصابة (مرتب)

حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ ان دونوں کا قصہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بدر میں صفیں کھڑی ہو گئیں تو میں نے دیکھا کہ میرے دونوں طرف دونو جوان کھڑے ہیں۔ جنگ کی شدت اور طرفین میں ناتجربہ کار نوجوانوں کی وجہ سے عدم تحفظ کا تصور کر کے میں پریشان ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ان دونوں نے باری باری ابو جہل کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ میں نے کہا کہ تم اس کا کیوں پوچھ رہے ہو۔ ابو جہل تو بہت مضبوط شخصیت کا مالک ہے۔ ہم سب مل کر اس کا علاج نہیں کر سکے۔ تم بچے ہو کر کیا کر سکو گے۔ لیکن انہوں نے پھر منت کی۔ میں نے اچانک ابو جہل کو صفیں درست کرتے ہوئے دیکھا تو ان دونوں کو اشارہ سے بتا دیا کہ وہ ہے۔ دونوں نوجوان شاہینوں کی طرح چھپے اور ابو جہل کو شدید زخمی کر دیا۔ پھر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے آکر اس کی گردن کاٹ دی۔

حضرت معوذؓ تو غزوہ بدر میں شہید ہو گئے تھے اور حضرت معاذؓ کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اپنے بھائی کی طرح بدر میں شہادت پائی۔ جبکہ دوسرے قول کے مطابق آپؓ بدر میں زخمی ہو گئے تھے۔ اور پھر مدینہ منورہ آکر وفات پائی۔ لیکن علامہ ابن عبدالبرؒ اور علامہ ابن حجرؒ نے دونوں روایتوں کو مرجوح قرار دیا ہے۔ صحیح قول کے مطابق آپؓ نے حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانے میں وفات پائی تھی۔ البتہ بدر میں آپؓ کا ایک ہاتھ کٹ گیا تھا۔

بقناع من رطب تازہ کھجور کا بھرا ہوا ایک تھال دے دیا۔ وعلیہ اجر و اجر و جرو کی جمع ہے جرؤ دراصل بلی، کتے، درندوں اور مرغی وغیرہ کے چھوٹے بچے کو کہا جاتا ہے لیکن یہاں جرو قماء سے چھوٹی چھوٹی ککڑیاں (۱) مراد ہیں۔ جن پر عموماً چھوٹے چھوٹے تیز کانٹوں جیسے بال ہوتے ہیں۔ اور پکڑتے وقت انگلیوں میں چبھ جاتے ہیں۔ بہر حال تازہ تازہ ککڑیاں کھجور کے ساتھ رکھی تھیں۔

رُعب یہ لفظ مرفوع ہے۔ اور جرو کی صفت ہے۔ جس طرح کہ آنے والی روایت میں ہے جبکہ بعض

(۱) اہل حجاز کے ہاں جرو کا اطلاق ہر چھوٹی چیز پر ہوتی ہے۔ چنانچہ زمشریؒ ایک شخص سے روایت کرتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ میں ایک گلی سے گزر رہا تھا۔ کہ اچانک ایک آدمی کو دیکھا جو سر پر بالن کی گھڑی اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ بولا ”اعطنی ذالک الجرو“ میں نے دیکھا نیچے کتا ہے نہ کتے کا بچہ میں نے کہا ”ماہنا جرو“ وہ بولا ”انت عراقي اعطنی تلک القشاء“ تم عراقی معلوم ہوتے ہو میں یہ ککڑی مانگ رہا ہوں۔ (بخاری)

کے ہاں مجرور ہے۔ اور ثناء کی صفت ہے۔ ازغب کی جمع ہے جو کہ چھوٹے روؤں والے اور تیز کاتنوں والے کو کہتے ہیں۔

وعنده حلية لحيته کے وزن پر حُلّی کی جمع ہے قرآن مجید میں بھی ”وَتَسْتَخْرِجُونَ مِنْهُ حُلِيَةً تَلْبَسُونَهَا“ میں مذکور ہے۔ زیور کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے پاس بحرین کے خراج کے مال سے کچھ سونے چاندی کے زیور لائے گئے تھے۔

فملا يده الخ چونکہ ہدیہ لانے والی ایک لڑکی تھی۔ جن کو فطری طور پر زیورات سے محبت ہوتی ہے۔ اس لیے آپ ﷺ نے احسان کا بدلہ مناسب اور ایسے احسان سے دیا جس سے وہ زیادہ خوش ہوتی ہے۔ اور زیورات سے تزیّن عورت ہی کیلئے مناسب ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ

أَوْ مِنْ يُنْشَأُ فِي الْحُلِيِّ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرَ مُبِينٍ (زخرف ۱۸)

کیا (خدا کی اولاد ہے) وہ جو کہ عادیّہ آرائش میں نشوونما پائے۔ اور مباحثہ میں قوت بیانیہ بھی نہ رکھے۔

(۷) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ حَجَرٍ أَنَا شَرِيكَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مُحَمَّدٍ ابْنِ

عَقِيلٍ عَنِ الرَّبِيعِ بِنْتِ مَعُوذِ بْنِ عَفْرَاءَ قَالَتْ أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ بِقِنَاعٍ مِنْ

رَطْبٍ وَاجْرُو زَغَبٍ فَأَعْطَانِي مَلَكَفَهُ حَلِيًّا أَوْ قَالَتْ ذَهَبًا (۱)۔

ترجمہ: ربیع سے روایت ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں کھجور اور چھوٹی

روئیں دار کڑیوں کی چنگیری لے کر حاضر ہوئی۔ تو نبی کریم ﷺ نے مجھ کو ایک ہاتھ

بھر کر زیور عطا فرمایا۔ یا یہ کہا کہ سونا عطا فرمایا۔

اس حدیث کی تشریح بھی پچھلی حدیث جیسی ہے۔ صرف ایک مقام پر راوی کے شک کا ذکر ہے کہ

حضرت ربیع نے حلّیا کہا تھا یا ذہب۔ دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ بہت زیادہ بخشنے والے تھے۔

اور احسان کے بدلہ میں محسن (۲) سے بڑھ جاتے تھے۔

(۱) بتفرقہ هذا الحديث الامام الترمذی (مختار)

(۲) بخاری شریف کی روایت میں ہے کان النبی ﷺ يقبل الهدية ويحب عليها بخاری ۱/۳۵۲ کتاب

الهدية اعكافاة في المعية (اصلاح الدين)

خلاصہ باب

نبی کریم ﷺ کو پھل پسند تھے۔ اور ہر قسم کے پھلوں کے ساتھ ذوق سلیم کے مطابق معاملہ فرماتے تھے۔ اس باب میں چند اشیاء مثلاً گلڑی، خر بوزہ، تر بوزہ اور کھجور کا ذکر ہے۔ آپ ﷺ نے ان میں سے کھجور کو دوسرے مذکورہ اشیاء کے ساتھ تناول فرمایا۔ کیونکہ اس طرح ان دونوں چیزوں میں طبعی اعتدال پیدا ہو جاتا تھا۔ نیز طبی لحاظ سے اس کا فائدہ بھی بڑھ جاتا تھا۔ کیونکہ کھجور کے ساتھ سرد چیزوں کا استعمال ہو تو یہ بدن کی نشوونما میں بہت مؤثر اور مقوی ہو جاتا ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میری والدہ کی خواہش تھی کہ شادی سے قبل میں فریبہ ہو جاؤں۔ ان کی یہ خواہش صرف اس وقت پوری ہوئی جب مجھے کھجور کے ساتھ گلڑی کھلائی گئی۔ تو میں خوب فریبہ ہو گئی (۱)۔

اس کے ساتھ ساتھ ذائقہ میں بھی بہت اعتدال آ جاتا ہے۔ کیونکہ گلڑی کھجور کی تیز مٹھاس کو کم کر دیتی ہے۔ اور کھجور کی وجہ سے گلڑی کا پھیکا پن ختم ہو جاتا ہے اور معتدل ذائقہ بن جاتا ہے۔ علاوہ ازیں دیگر روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ ان گور بھی تناول کر چکے ہیں۔

(۱) ابوداؤد ۲/۱۸۹ کتاب الطب باب فی السمۃ وابن ماجہ ص ۲۳۶ ابواب الاطعمۃ باب القناء و الرطب

۳۱. باب ما جاء في صفة شراب رسول الله ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے مشروبات کا بیان

اس باب میں نبی کریم ﷺ کے مشروبات کا بیان ہے کہ آپ ﷺ نے کیا کیا پیا ہے اور کس صفت کے ساتھ مشروبات آپ ﷺ کو مرغوب ہوتے تھے۔ گویا ”کُلّ شراب شرہ رسول اللہ ﷺ“ کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

(۱) حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِي عُمَرَ ثَنَا سَفْيَانُ عَنْ مَعْمَرٍ عَنْ الزُّهْرِيِّ عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ أَحَبَّ الشَّرَابِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ الْحَلْوُ الْبَارِدُ (۱)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ٹھنڈے اور میٹھے مشروب کو تمام مشروبات میں سب سے زیادہ پسند فرماتے تھے۔

کان أحب الشراب إلى رسول الله ﷺ آپ ﷺ کا مرغوب ترین مشروب وہ تھا جس میں دو صفتیں ہوں۔ اول یہ کہ وہ میٹھا ہو۔ دوم یہ کہ ٹھنڈا ہو۔

پانی کی دو مرغوب صفتیں: نعمتوں میں رغبت صحیح و سالم انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ پانی میں پینے کے لحاظ سے مرغوب صفتیں دو ہی ہیں۔ یعنی میٹھا ہونا اور ٹھنڈا ہونا۔ اس لیے آپ ﷺ ان دو صفتوں والے پانی کو پسند فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کے لیے میٹھا پانی دور کے کنوؤں سے مدینہ منورہ لایا جاتا تھا (۲)۔

(۱) جامع ترمذی ۲/۱۱ کتاب الاشریۃ باب ما جاء ای شراب کان أحب إلى رسول الله ﷺ، مصنف ابن ابی شیبہ ۸/۳۶۱، شرح السنۃ ۱/۳۶۲ کتاب الاشریۃ (مختار)

(۲) اور ایک روایت کے مطابق یہ کنواں مدینہ منورہ سے دو دن (یعنی ۳۶ میل) کی مسافت پر تھا۔ اور آپ ﷺ میٹھے اور ٹھنڈے پانی کا اہتمام فرماتے تھے۔ اس لئے علامہ ابن بطال نے فرمایا ہے کہ ٹھنڈے پانی کا اہتمام کرنا زہد کے خلاف نہیں۔ اور نہ کھار پانی پینا باعث فضیلت ہے۔ امام داراللمجرۃ امام مالکؒ اپنے تلامذہ سے فرمایا کرتے تھے کہ ٹھنڈا پانی پیا کرو۔ اس لئے کہ ٹھنڈے پانی کی وجہ سے دل کی گہرائی سے شکر ادا ہوتا ہے۔ حافظ ابن قیمؒ نے فرمایا ہے کہ پانی میں جب دو اوصاف (علاوت اور برودت) پائے جائیں تو ایسا پانی حفظانِ صحت کا ضامن ہے۔ اور تیخیر کو دفع کرتا ہے۔ (مختار)

سات مخصوص کنوؤں کا پانی آپ ﷺ پسند فرماتے تھے۔ جن کا پانی پینے کے لیے آپ ﷺ کو مہیا بھی کیا جاتا تھا۔ ان میں بیرسقا زیادہ مشہور تھا جو مدینہ منورہ سے ایک یا دوسرے قول کے مطابق دودن کے سفر کے قاصد پر تھا۔

یہاں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ ٹھٹھے مشروب سے وہ پانی مراد ہو جس میں شہد، شربت، یا غنیز ملا دیا گیا ہو جو کہ ایک مستقل نعمت ہے۔ اور نعمت جتنی اعلیٰ ہو، اتنا ہی خلوص حمد و شکر میں ہوتا ہے اور دل کی گہرائیوں سے الحمد للہ کی صدا اٹھتی ہے۔

ایسے ہی جب خوب پیاس لگی ہوئی ہو اور ٹھنڈا اور میٹھا پانی ملے تو بے اختیار آدمی کی زبان سے اللہ کا شکر ادا ہوتا ہے۔ اور انہی اسباب کی بنا پر آپ ﷺ کو اس قسم کا پانی زیادہ پسند ہوتا تھا۔

(۲) حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مَنِيعٍ ثنا إِسْمَاعِيلُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ أَنَا عَلِيُّ بْنُ زَيْدٍ عَنْ عُمَرَ هُوَ ابْنُ أَبِي حَرْمَلَةَ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ دَخَلْتُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنَا وَخَالِدُ بْنُ الْوَلِيدِ عَلَى مِمْوَنَةَ فَجَاءَ تَنَا بَانَاءُ مِنْ لَبَنٍ فَشَرِبَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَأَنَا عَلَى يَمِينِهِ وَخَالِدُ عَلَى شِمَالِهِ فَقَالَ لِي الشَّرْبَةُ لَكَ فَإِنْ شِئْتَ أَتَرْتُ بِهَا خَالِدًا فَقُلْتُ مَا كُنْتُ لِأَوْثَرِ عَلَى سُرُكٍ أَحَدًا ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ أَطْعَمَهُ اللَّهُ طَعَامًا فَلْيَقِلَّ اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيهِ وَأَطْعَمْنَا خَيْرًا مِنْهُ وَمَنْ سَقَاهُ اللَّهُ لَبَنًا فَلْيَقِلَّ اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيهِ وَزِدْنَا مِنْهُ ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَيْسَ شَيْءٌ يَجْزِي مَكَانَ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ غَيْرَ اللَّبَنِ.

قال أبو عيسى هكذا روى سفيان ابن عيينة هذا الحديث عن معمر عن الزهري عن عروة عن عائشة ورواه عبد الله بن المبارك و عبد الرزاق وغير واحد عن معمر عن الزهري عن النبي ﷺ مرسلًا ولم يذكر وافيته عن عروة عن عائشة وهكذا روى يونس وغير واحد عن الزهري عن النبي ﷺ مرسلًا قال أبو عيسى وإنما اسنده ابن

عينة من بين الناس۔

وميمونة بنت الحارث زوج النبي ﷺ هي خالة خالد بن الوليد و
خالة ابن عباس وخالة يزيد بن الاصم واختلف الناس في رواية هذا
الحديث عن علي بن زيد بن جدعان فروى بعضهم عن علي بن زيد
عن عمر ابن أبي حرملة وروى شعبة عن علي بن زيد فقال عن عمرو
بن حرملة والصحيح عمر بن حرملة (۱)۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں اور خالد بن ولیدؓ دونوں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ حضرت ميمونہ کے پاس آئے۔ ام المؤمنین ہمارے لیے دودھ کا ایک برتن لائیں۔ نبی کریم ﷺ نے (اس دودھ میں سے) پیا۔ میں نبی کریم ﷺ کے دائیں جانب اور خالد بن ولیدؓ بائیں جانب بیٹھے تھے۔ آپ ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ پینے کی باری تیری ہے۔ اگر تو چاہے تو خالد کو ترجیح دیدے۔ میں نے کہا کہ میں آپ ﷺ کے جھوٹے میں اپنے پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کوئی چیز کھلائے۔ تو وہ یہ دعا پڑھے کہ اے اللہ تو اس (کھائی ہوئی چیز) میں ہمارے لیے برکت عطا فرما۔ اور اس سے بہتر چیز عطا فرما۔ اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ دودھ عطا فرمائے۔ تو وہ یہ دعا پڑھے، اے اللہ تو اس دودھ میں ہمارے لیے برکت عطا فرما۔ اور ہمارے لیے اس میں زیادتی فرما۔ پھر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دودھ کے سوا کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو کھانے اور پانی دونوں کی کفایت کرے۔ (اس کے بعد امام ترمذیؒ نے دونوں حدیثوں کی سندوں کے بارے میں کچھ توضیحات کی ہیں۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی)

(۱) منن ابی داؤد ۲۵/۶۸ کتاب الاشریۃ باب ما یقول اذا شرب اللبن، جامع ترمذی ۲/۱۸۳

کتاب الدعوات باب ما یقول اذا اکل طعاماً السنن الکبریٰ للنسائی ۶/۷۹ کتاب عمل الیوم واللیلۃ

باب ما یقول اذا شرب اللبن (مختار)

دخلت الخ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں اور حضرت خالد بن ولیدؓ نبی کریم ﷺ کے گھر گئے۔ اور ام المؤمنین حضرت میمونہ بنت الحارثؓ کے حجرے میں داخل ہوئے۔ حضرت ابن عباسؓ حضرت میمونہؓ کے بھانجے لگتے ہیں۔ کیونکہ وہ حضرت میمونہؓ کی بہن لبابہ الکبریٰ کے بیٹے ہیں۔ اور ام المؤمنینؓ کی دوسری بہن لبابہ الصغریٰ چونکہ حضرت خالدؓ کی والدہ ہیں اس لیے وہ حضرت خالدؓ کی بھی خالہ لگتی ہیں۔ اس طرح حضرت یزید بن الاصمؓ کی والدہ بھی حضرت میمونہؓ کی بہن ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہاں حجاب کی رکاوٹیں نہیں ہیں۔

فشرب رسول الله ﷺ نبی کریم ﷺ نے خود اپنے آپ کو اس لئے مقدم فرمایا کہ اس طرح دودھ میں برکت پیدا ہوگی۔ اور ساتھ ساتھ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت خالدؓ کی بھی یہی خواہش ہوتی تھی کہ وہ نبی کریم ﷺ کا جھوٹا پی لیں۔

الشربة لك شمين پر تینوں حرکات آتے ہیں۔ اور اس سے معانی بھی بدل جاتے ہیں لیکن پینے کی باری جس کی ہو اس کیلئے کہتے ہیں۔ له شرب، یا له شربة یعنی شین کو کمزور پڑھا جاتا ہے۔ اسی معنی پر قرآن میں بھی آتا ہے۔ ”ولها شرب ولكم شرب يوم معلوم“ یعنی اس اونٹنی کے لیے پینے کا معین نمبر اور تمہاری باری کا بھی مقرر دن ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی شین کمزور کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔

معاشرتی آداب کی حکیمانہ تعلیم: لہذا معنی یہاں یہ ہوگا کہ باری تو تمہاری ہے۔ کیونکہ تم دہنی جانب ہو۔ اور ایمن زیادہ مستحق ہوتا ہے۔ لیکن دوسری طرف حضرت خالد بن ولیدؓ ہیں جو عمر میں بزرگ ہیں اور اکبر منا بھی ایک لحاظ سے زیادہ قابل قدر ہوتا ہے۔ اس لئے اگر دونوں سامنے ہوتے پھر تو عمر کا لحاظ کیا جاتا۔ اور اکبر منا سے ابتداء ہوتی کیونکہ یہی شرعی آداب ہیں۔ لیکن چونکہ ابن عباسؓ دائیں اور حضرت خالدؓ بائیں جانب تھے۔ اس لیے اس حیثیت سے حضرت ابن عباسؓ کو ترجیح ملتی تھی۔ نبی کریم ﷺ کے اس بیان سے ایک معاشرتی ادب کی تعلیم بھی ملتی ہے۔ کہ دائیں جانب کو بائیں جانب پر ترجیح حاصل ہے۔

فان شئت آثرت بها خالداً اس مشورہ اور ارشاد میں نبی کریم ﷺ نے ایک اور ادب کی

طرف اشارہ فرمادیا کہ عمر میں بزرگ کی بھی رعایت کرنی چاہیے۔ آپ ﷺ نے حضرت ابن عباسؓ کو ایثار کرنے کا مشورہ دیا۔

نا قابل ایثار نعمت: حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ میں تو آپ ﷺ کا حکم ماننے اور تعمیل ارشاد کے لیے بسر و چشم تیار ہوں۔ لیکن ہر چیز میں تو ایثار بھی نہیں ہوتا۔ لہذا ماسکنت لا ولتر علی سورک احداً یعنی خالد کا احترام مجھ پر واجب ہے۔ لیکن آپ ﷺ کے جھوٹے میں ایثار کر کے کسی کو نہیں دے سکتا۔ خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ کیونکہ یہ تو ہر وقت نہیں ملتا (۱)۔

اسی طرح کے ایک اور واقعہ میں ایک صحابی اور اس کے بیٹے میں یہ نزاع پیدا ہوگی کہ ان میں سے کون جہاد میں شامل ہو جائے۔ اور کون گھر میں رہے۔ دونوں میں قرعہ اندازی کی گئی۔ تو قرعہ بیٹے کا نکل آیا۔ باپ نے منت کی کہ ”آئرنی“ یعنی قربانی کر کے یہ باری مجھے دے دو۔ لیکن بیٹے نے فرمایا لا یؤثر بالجنة احدٌ احداً اہدا یعنی جنت میں ایثار نہیں کیا جاسکتا۔ اور اگر جنت جہاد کے راستے میں ملے۔ تو وہ کسی کو نہیں دے سکتا خواہ باپ (۲) کیوں نہ ہو۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ حضرت خالدؓ کو مقدم کر دیتے۔ تو اس میں ایک اور فائدہ بھی تھا کیونکہ اگر وہ پی لیتے تو حدیث کی رو سے اس کا جھوٹا بھی تو شفا تھا کیونکہ ارشاد ہے کہ فی سور المؤمن شفاء پھر ساتھ ساتھ نبی کریم ﷺ کا جھوٹا بھی تھا۔ دونوں سور جمع ہو کر فضیلت اور بڑھ جاتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی کوشش یہ تھی کہ عین اس جگہ پر ہونٹ رکھ دے جہاں نبی کریم ﷺ نے لب مبارک رکھے تھے اس دوسری غرض کی وجہ سے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے پیالہ حضرت خالدؓ کو نہیں دیا۔ ثم قال السخ پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس کو اللہ تعالیٰ طعام دے دے جو بھی پھل وغیرہ نصیب ہو۔ تو وہ تناول کرتے ہوئے یوں کہے۔

(۱) یہاں پر یہ مسئلہ بھی قابل توجہ ہے کہ قربات میں ایثار جائز ہے یا نہیں؟ تو شوافع کے ہاں قربات میں ایثار جائز نہیں۔ لیکن حنفیہ کثر اللہ سوادہم کے ہاں جائز ہے۔ بشرطیکہ قربات نافلہ ہوں۔ اور استدلال میں یہی روایت پیش کرتے ہیں کہ اگر ایثار جائز نہ ہوتا تو آنحضرت ﷺ عبداللہ بن عباسؓ کو ایثار کا مشورہ کیوں دیتے۔ (بخاری)

(۲) المواب اللہ نیہ ص ۱۳۸

دودھ اعلیٰ ترین نعمت ہے: اللہم بارک لنا فيه واطعمنا خيرا منه۔ یعنی اللہ ہمارے لیے اس چیز میں برکت ڈال دے۔ اور اس سے بہتر چیز ہمیں عطا فرما۔

اور جس نے دودھ پیادہ یہ کہے کہ اے اللہ ہمارے لیے اس میں برکت ڈال دے۔ اور اسے زیادہ فرما۔ کیونکہ دودھ تمام نعمتوں میں اعلیٰ ترین نعمت ہے۔ اور دنیا کے تمام ڈاکٹر، سائنس دان اور علم حیوانات و نباتات کے ماہرین اس پر متفق ہیں کہ ہر نعمت سے بڑھ کر ایک اور نعمت بھی ہے سوائے دودھ کے۔ ایبارٹریوں کی تحقیقات سے سائنس دودھ کی مکمل غذائیت کا وہی فیصلہ دہرا رہی ہے جو کہ چودہ سو سال قبل نبی کریم ﷺ نے کیا تھا۔ اور آج بھی محققین کی رائے یہ ہے کہ بچے کیلئے ڈبوں میں بند دودھ یا دوسری دوائیں اتنی مفید نہیں جتنا ماں کا دودھ مفید ہے۔ پھر دودھ میں جو حیاتیں، پروٹین اور نباتاتی اجزاء شامل ہیں۔ وہ دوسرے اغذیہ میں کب ملتے ہیں۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے اعلان فرمایا کہ لبس شیشا یجزی مکان الطعام والشراب غیر اللبن کہ کھانے پینے کی تمام اشیاء کا نعم البدل دودھ کے سوا کوئی اور طعام نہیں ہو سکتا۔

اغذیہ اور کھانوں کا کوئی بھی ماہر چودہ سو سال قبل یہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے یہ آپ ﷺ کی نبوت کا بین ثبوت ہے۔

مسند اور مرسل کی سند کی بحث: قال ابو عیسیٰ الخ امام ترمذیؒ یہاں باب کی دونوں حدیثوں کی سندوں کے بارے میں کچھ تبصرہ کرنا چاہتے ہیں۔ پہلی حدیث کی سند پر تبصرے کا حاصل یہ ہے کہ سفیان بن عیینہؒ نے اس حدیث کو مسند روایت کیا ہے۔ حضرت عروۃؒ کے واسطے سے حضرت عائشہؓ سے اس روایت کو مسند ذکر کرنے میں وہ متفرد بھی ہیں۔ لیکن اس حدیث کی یہ غرابت اس کی صحت کی منافی نہیں ہے۔ دوسری طرف امام زہریؒ جو خود بھی تابعی ہیں۔ اس حدیث کو نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں اور صحابی یا کسی دوسرے واسطہ کا ذکر بھی نہیں کیا ہے تو صحابی کے ذکر نہ کرنے کی وجہ سے یہ مرسل ہوئی۔ لیکن یہ مرسل بھی اجماعاً حجت ہے۔ ہمارے ہاں تو مرسل حجت ہے۔ لیکن شوافع کے ہاں اس لیے حجت ہے کہ یہ مسند سے مؤید ہے۔ امام ترمذیؒ نے جامع میں مرسل کی سند کو مسند کی نسبت رائج قرار دیا ہے۔ علامہ مناویؒ

نے زہریؒ کی سند میں عروہؓ کے ترک کرنے کی وجہ سے حدیث کو منقطع کہا ہے۔ لیکن چونکہ زہریؒ خود تابعی ہیں۔ لہذا یہاں صرف صحابی کا ترک لازم آتا ہے۔

قال ابو عيسى الخ دوسری حدیث کے بارے میں تبصرہ کر رہے ہیں۔ جس میں ایک تو حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور خالد بن ولیدؓ دونوں کا حضرت ام المؤمنین میمونہؓ کے ساتھ رشتہ کا بیان کر رہے ہیں کہ دونوں کی خالہ گنتی ہیں۔ لہذا ان کا حرم نبویؐ کے ہاں داخلہ قابل اعتراض نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ اس سند میں علی بن زیدؓ کے استاد کے نام میں اختلاف ہے کہ وہ عمرؓ ہے یا واو کے ساتھ عمروؓ ہے۔ اور ان کے والد کی کنیت ابو حرمہ ہے یا نام حرمہ ہے۔ تو روایات میں اختلاف ذکر کرنے کے بعد فیصلہ سناتے ہیں کہ یہ نام عمر بن ابی حرمہؓ ہے اس کا نام عمرو نہیں ہے۔ نہ والد کا نام حرمہ ہے۔

ام المؤمنین میمونہؓ: وميمونة بنت الحارث الخ ام المؤمنین میمونہؓ کا پہلا نام ہنہ تھا۔ نبی کریم ﷺ نے نام تبدیل کر کے میمونہ رکھا۔ جاہلیت کے زمانہ میں معوذ بن عمرو ثقفی کے نکاح میں تھیں۔ اس سے جدائی کے بعد ابو رہم نامی شخص سے نکاح کیا۔ اس کی وفات کے بعد ذی القعدہ ۷ھ میں عمرۃ القضاء کے سفر کے دوران مکہ سے دس میل کے فاصلہ پر واقع سرف کے مقام پر نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آئیں۔ اس وقت آپ ﷺ احرام میں تھے۔ عمرہ سے واپسی پر اسی جگہ شادی کی تقریب کا اہتمام ہوا۔ اور عجیب اتفاق یہ پیش آیا کہ ۵ھ یا ایک قول کے مطابق ۱۱ھ کو اسی مقام پر آپ کا انتقال بھی ہوا۔ اور یہیں دفن ہوئیں۔ آپؐ نبی کریم ﷺ کی نکاح میں آنے والی سب سے آخری بیوی تھیں۔ عبداللہ بن عباسؓ کی والدہ لبابہ کبریٰؓ اور خالد بن ولیدؓ کی والدہ لبابہ الصغریٰؓ آپؐ کی حقیقی بہنیں تھیں۔ علاوہ ازیں نو یا دس اخیانی بہنیں بھی تھیں۔ جن میں حضرت اسماء بنت عمیسؓ کا نام بھی ہے جو حضرت علیؓ کی بیوی تھی۔ اور حضرت علیؓ سے پہلے حضرت ابو بکر صدیقؓ اور اس سے پہلے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی طرف سے بیوہ ہو چکی تھی۔ ان تینوں حضرات سے اسماءؓ کی اولاد بھی ہوئی تھی۔

خلاصہ باب

اس باب میں یہ بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ٹھنڈا اور میٹھا پانی بہت مرغوب ہوتا تھا۔ نیز دودھ بھی آپ شوق سے پیتے تھے۔ اور اس کو بڑی نعمت کہتے۔ حتیٰ کہ اس سے بڑی نعمت کا گویا تصور بھی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ اس کی دعا کی جائے۔

میٹھے اور ٹھنڈے پانی کی طلب بلکہ اس سلسلے میں تکلف بھی تعیش اور ترفہ کے ذمے میں نہیں آتی۔ نہ یہ زہد کے منافی ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے بھی میٹھے اور کڑوے پانی میں فرق کو اشارہ کیا ہے فرماتے ہیں کہ هذا عذب فرات سائغ شرابه وهذا ملح اجاج
شیخ ابوالحسن شاذلیؒ فرماتے ہیں کہ جب میں میٹھا پانی پیتا ہوں۔ تو دل کے وسط سے رب ذوالجلال کے لیے حمد نکل جاتی ہے۔

(فالحمد لله على نعماته الكاملة)

۳۲. باب ما جاء في صفته شرب رسول الله ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے پینے کے طریقے کا بیان

مشروبات کی کیفیت کے بیان کے بعد اس باب میں نبی کریم ﷺ کے پینے کا طریقہ بیان کیا جاتا ہے۔ اور بالخصوص اس بات کی تفصیل ہے کہ کھڑے ہو کر پینا جائز ہے یا نہیں۔ عام روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عذر اور مجبوری نہ ہو تو حتی الوسع کھڑے ہو کر پانی پینے سے اجتناب کیا جائے اور اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر پینا چاہیے۔ لیکن بعض مواقع میں خود نبی کریم ﷺ سے کھڑے ہو کر پانی پینا ثابت ہے۔ جیسے زمزم کا پانی نبی کریم ﷺ نے کھڑے ہو کر پیا ہے۔ یہاں پر امام ترمذی پہلے وہ احادیث لاتے ہیں جن میں کھڑے کھڑے پانی پینا ثابت ہے۔

(۱) حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مَنِيعٍ ثَنَا هَشِيمٌ أَنَا عَاصِمُ الْأَحْوَلِ وَمُغِيرَةُ عَنْ

الشَّعْبِيِّ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ شَرِبَ مِنْ زَمْزَمَ وَهُوَ قَائِمٌ (۱)۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے زمزم کا پانی

کھڑے ہو کر پیا۔

زمزم کیا ہے؟ زمزم حرم پاک میں موجود پانی کا نام ہے جو کہ زمانہ قدیم سے کنویں کی صورت میں موجود تھا۔ اس کے لغوی معنی ”بہت زیادہ“ کے ہوتے ہیں۔ اور یہ پانی بھی اتنا زیادہ ہے کہ کئی ہزار سال استعمال ہونے کے باوجود یہ ختم ہونے کو نہیں آتا۔ حالانکہ یہ اس وادی غیر ذی ذرع میں واقع ہے جہاں میلوں تک گھاس اور پانی نہیں ہے اب تو زمزم کے پانی کو مدینہ تک باقاعدہ پہنچانے کی کوشش جاری ہے۔ مسجد نبوی ﷺ میں تو اب بھی یہ عام ملتا ہے بعض اہل خیر حضرات یتیم گروں سے وہاں یہ پانی پہنچاتے ہیں۔

(۱) صحیح بخاری ۱/۲۲۱ کتاب الحج باب ما جاء في زمزم، صحیح مسلم ۲/۷۳۱ کتاب

الأشربة باب في الشرب من زمزم قائماً جامع ترمذی ۲/۱۰ کتاب الأشربة باب ما جاء في الرخصة

في الشرب قائماً، سنن النسائی ۲/۳۹ کتاب مناسک الحج باب الشرب من زمزم (منتخب)

بعض لوگوں نے وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ حضرت ہاجرہؓ نے جب پہلے پہلے اس پانی کو زمین سے اٹھتے ہوئے دیکھا تو جلدی جلدی ادھر ادھر سے مٹی اور پتھر لا کر بند باندھنے لگی۔ اور ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگی ”زم زم“ جس کا معنی ہے ٹھہر جا ٹھہر جا۔ اسی وجہ سے اس پانی کا نام زم زم پڑ گیا۔

زم زم کی برکات: یہ بہت مبارک پانی ہے۔ پینے والوں کو بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ نیز اس کے پیتے ہوئے جو دعا کی جاتی ہے وہ بھی قبول ہوتی ہے۔ مستجاب وغیرہ ہونے کے سبب صدق دل سے کی جانے والی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ علماء کرام اور بزرگان عظام سے اس موقع پر کچھ مخصوص دعائیں منقول ہیں۔ جن کی قبولیت کی شہادت تاریخ دے رہی ہے۔

مثلاً علامہ ابن حجرؒ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے اس مقام پر یہ دعا کی تھی کہ اے اللہ میرا حافظہ علامہ ذہبیؒ کے حافظے جیسا بنادے۔ ایک اور محدث کے بارے میں آیا ہے کہ انہوں نے دعا کی کہ اے اللہ میری تمام زندگی اتباع سنت میں گزرے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ سب سے بہتر دعا یہ ہے کہ اے اللہ مجھے مستجاب الدعوات بنادے۔ بہر حال جہاں دعا قبول ہوتی ہے شرب زم زم انہی مواقع میں سے ایک ہے (۱)۔ البتہ بہتر دعا کا انتخاب اس کا ملکہ اور اس کا الہامی القاء کسی کسی کو ہوتا ہے۔ ایک ضروری بات یہ ہے کہ دعا اخلاص اور سوز و گداز کے ساتھ ہونی چاہیے۔ سرسری زبان سے اور قلب غافل کے ساتھ دعائیہ کلمات کی ادائیگی مقصود نہ ہو۔ یہ عبادت کی مغز ہے عشق و محبت کے ساتھ ہو۔ جیسے نبی کریم ﷺ کی دعائیں ہیں۔ ملا علی قاریؒ نے ”الحزب الاعظم“ کے نام سے آپ ﷺ کی مسنون دعاؤں کو جمع کیا ہے۔ جن الفاظ، تعبیرات اور درود کے ساتھ آپ ﷺ نے دعائیں مانگی ہیں کتاب پڑھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ بالخصوص سفر حج و عمرہ اور حرمین میں اس کی کیفیات اور لطف و بالا ہو جاتے ہیں جس کا پچھلے تیس چالیس سال سے مجھے تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ والحمد للہ

معنوی برکت کے ساتھ ساتھ زم زم میں کچھ ظاہری خصوصیات بھی ہیں۔ یہ کھانے کی بھی کفایت کرتا ہے۔ کیونکہ اس میں غذائیت موجود ہے۔ بہت سے بزرگوں نے طویل عرصہ تک صرف زم زم پی کر گزارہ کیا

(۱) عن جابر بن عبد اللہ یقول سمعت رسول اللہ ﷺ ماء زم زم لما شرب له ۱۲ ابن ماجہ ۲۲۰ ابواب

ہے۔ جیسا کہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے بارے میں روایت ہے کہ ایک طویل مدت تک آپ نے زمزم پینے کے سوا کچھ نہیں کھایا (۱)۔

پانی پینے کا طریقہ: یہاں پر نبی کریم ﷺ سے قیام کی حالت میں پانی پینا ثابت ہو رہا ہے۔ یہ حجۃ الوداع کا موقعہ تھا۔ نبی کریم ﷺ اس روز سواری پر سوار طواف کر رہے تھے۔ طواف کے بعد دو گانہ پڑھنے کیلئے آپ ﷺ سواری سے اترے ہوئے تھے۔ اور اسی دوران آپ ﷺ نے زمزم کا پانی مانگا ہوگا۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے پیش کیا ہوگا۔ اس تشریح کے مطابق اس باب کی تیسری حدیث اور زیر نظر حدیث میں تطبیق ہو جاتی ہے کہ یہاں تو حضور ﷺ کا خود پینا ذکر ہے۔ اور وہاں پر ابن عباسؓ کی طرف سے پیش ہونے کا ذکر ہے۔ لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ یہ دونوں الگ الگ واقعے ہوں۔ ایک بار آپ ﷺ نے خود پیا ہو۔ دوسری بار ابن عباسؓ نے پیش کر دیا ہو۔

کھڑے ہو کر پینے کی ممانعت و اباحت کا بحث: بہر حال آپ ﷺ نے عملاً کھڑے کھڑے پانی پیا۔ جس سے اس عمل کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ لیکن مسلم شریف کی ایک روایت میں آیا ہے کہ

لا یشر بن احد منکم قائما فمن نسی فلیستقئ (۲)۔

تم میں سے کوئی کھڑے ہو کر پانی نہ پئے۔ جس نے بھولے سے پیا۔ وہ اسے قے کر دے۔ جس سے کھڑے ہو کر پینے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ اس بظاہر ممانعت کو دیکھ کر بعض لوگوں نے احادیث نبوی کو ناخ کہہ کر کہا کہ کھڑے ہو کر پینا جائز نہیں۔ اور جہاں نبی کریم ﷺ سے کھڑے ہو کر پینا مروی ہے۔ وہ یا تو منسوخ ہے۔ یا پھر عذر پر محمول ہے۔ مثلاً زمزم کا پانی کھڑے کھڑے اس لیے پیا تھا کہ چونکہ اس کنویں کے کنارے بہت ازدحام ہوتا ہے۔ پھر اس زمانے میں منڈھیر پر کیچڑ اور پانی بھی ہوتا تھا۔ لہذا یہاں بیٹھنا مشکل ہوتا تھا۔ پرانے زمانے میں زمزم کھلا کنواں تھا۔ اور اس پر چرخی لگی ہوئی تھی۔ ڈول (۱) حضرت ابو ذرؓ جب پہلے پہلے نبی کریم ﷺ کے ساتھ ملاقات کی خاطر مکہ تشریف لائے تو ایک موقع پر اپنی روپوشی کی حالت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ”فاختبات بین الکعبۃ و بین استارھا و لبثت فیہا بین خمس عشرة من

یوم و لیلۃ و مالی طعام و لا شراب الا ماء زمزم۔ کذا فی الاصابة ج ۲ ص ۶۳ (اصلاح الدین)

(۲) مسلم ج ۲ ص ۲۷۳ (بخاری)

سے پانی نکالا جاتا تھا۔ مشینیں تھیں نہ نکلے۔ بلکہ چرخی اور ڈول تو مشین کے دور تک لگی ہوئی تھی۔ میرے مشاہدے کی ۱۳۸۳ھ کی بات ہے کہ لوگ خود ڈول کے ذریعے پانی نکال بھی سکتے تھے۔ کنویں کے اندر جھانکنا بھی ممکن تھا اور لوگ جھانک بھی لیتے تھے۔ کیونکہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص کنویں میں جھانک کر دیکھے تو تمام گناہ اس میں جھڑ جاتے ہیں (۱)۔

آج کل تو وسیع انتظامات مثلاً جنگلوں، ٹنکوں، اور مشینوں کے باوجود ازدحام اتنا زیادہ ہوتا کہ ٹنکوں پر نمبر ملنا مشکل ہوتا ہے۔ ملے بھی تو کھڑے ہو کر پینے کی سہولت ہے۔ اور قیام کی حالت ہی میں پینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ لہذا نبی کریم ﷺ نے بھی ضرورت کی بنا پر کھڑے ہو کر زمزم پیا ہوگا۔ ویسے عام حالات میں ایسا کرنا مکروہ ہوگا۔ پانی زمزم کا ہو یا کوئی دوسرا پانی ہو۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینے سے نبی کی حدیث سے زمزم اور وضوء کے پانی کی تخصیص ہو چکی ہے۔ گویا احادیث نبی کی تعمیر منسوخ ہو چکی ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کا عمل اس کے لئے ناسخ ہے اور صرف ان دو موقعوں میں بیان جواز کے لیے آپ ﷺ نے ایسا کیا ہے۔ تو گویا عمومی طور پر تو کھڑے کھڑے پینا مکروہ ہوگا۔ البتہ دو جگہ جائز ہوگا۔ کیونکہ زمزم اور وضوء کا پانی عام پانیوں کی طرح نہیں ہے۔ اس کی خصوصیات اور فضائل کی وجہ سے اس کا زیادہ پینا مطلوب ہے۔ اور اس کا مشروع طریقہ بھی یہی ہے کہ قبلہ رو کھڑے ہو کر جکلف زیادہ پیا جائے (۲)۔

تیسری رائے یہ ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع کرنے کا حکم ارشاد پر مبنی ہے۔ اور نبی تڑپتی ہے۔ کیونکہ کھڑے کھڑے پانی پینے میں دنیوی مفاسد اور طبی نقصانات ہیں۔ لہذا شرعی نقطہ نگاہ سے پیٹھ کر پینا ضروری ہے۔ نہ کھڑے ہو کر پینا مکروہ بلکہ بدن انسانی کے لیے مصالح کی بنیاد پر آپ ﷺ نے

(۱) لم یز بعدیث یثبت ذالک الا ما رأیت فی انجاح الحاجة علی ابن ماجة حیث قال "والنظر

الیها والظهور منها یحط الخطایا" (ابن ماجة باب الشرب من زمزم) (اصلاح الدین)

(۲) عن ابن عباس قال اذا شربت منها فاستقبل القبلة واذکر اسم الله و تنفس ثلاثا وتصلع منها فاذا

فرغت منها فاحمد الله عز وجل فان رسول الله ﷺ قال ان آية ما بیننا و بین المنافقین انهم لا

یتصلعون من زمزم (ابن ماجة ص ۲۲۶) ابواب المناسک باب الشرب من زمزم (اصلاح الدین)

کھڑے ہو کر پینا منع کر دیا ہے۔ مثلاً علامہ ابن قیمؒ نے کھڑے ہو کر پینے کی بہت سی آفات لکھی ہیں۔ جن میں پیاس کا نہ بھجنا بلا استفادہ کے معدے سے پانی کا گزر جانا (۱) وغیرہ ایک واضح ضرر یہ بھی ہے کہ آدمی بہت زیادہ سیر ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ بوجھل اور سست ہو جاتا ہے۔ بدن میں بے اعتدالی پیدا ہو جاتی ہے۔ لہذا علماء کہتے ہیں کہ عموماً تو ایسا نہیں کرنا چاہیے لیکن زمزم کا پانی اپنی برکتوں اور خصوصیات کی وجہ سے جتنا زیادہ پیا جائے بہتر ہے۔ لہذا اسے کھڑے ہو کر پینا اس لیے افضل ہوگا کہ وہاں تکثیر مضر نہیں مطلوب ہے چنانچہ احادیث میں وارد نہیں ارشاد اور تزیہ پر مبنی ہوگی۔ اور عمل بیان جواز کے لیے ہوگا۔

(۲) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ ثنا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ عَنْ حُسَيْنِ الْمَعْلَمِ

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ

يَشْرَبُ قَائِمًا وَقَاعِدًا (۲)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی

کریم ﷺ کو کھڑے اور بیٹھے دونوں طرح پانی پیتے دیکھا۔

سند عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی تحقیق: واضح رہے کہ عمرو کے والد کا نام شعیب ان کے والد

محمد اور ان کے والد عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ ہیں۔ اب یہاں پر عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ میں ابیہ کی

ضمیر تو بالاتفاق عمرو کو رائج ہے۔ لیکن جدہ کی ضمیر میں دو احتمال ہیں۔ اگر عمرو کو رائج ہو تو جدہ سے مراد محمد بن

عبداللہ بن عمرو ہیں۔ جو تابعی ہیں اور اگر ضمیر ”اب“ یا شعیب کو رائج ہو۔ تو اس سے شعیب کے دادا عبداللہ

بن عمرو مراد ہونگے۔ اول الذکر صورت میں حدیث مرسل ہوگی۔ یعنی صحابی متروک الذکر ہوگا۔ علاوہ ازیں

شعیب کی روایت اپنے والد محمد سے بھی محل نظر ہے۔ کیونکہ اس کا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ اگر جد کو جد اعلیٰ پر

محمول کر کے عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ مراد لئے جائیں تو شعیب کی روایت ان سے ثابت ہے۔ مؤخر الذکر

(۱) شاید مسند احمد کی ایک روایت میں بھی انہی معنرات کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہے لَوْ يَعْلَمُ الَّذِي يَشْرَبُ

وَهُوَ قَائِمٌ مَا فِي بَطْنِهِ لَا اسْتِقَاءَ (مسند احمد ج ۲ ص ۲۸۳) (اصلاح الدین)

(۲) جامع ترمذی ۱۰/۲ کتاب الاشربة باب ما جاء في الرخصة في الشرب قائماً، صحيح مسلم

۷۳/۲ کتاب الاشربة (مختار)

صورت میں حدیث مسند ہوگی۔ لیکن کچھ لوگوں کے ہاں شعیب کی ملاقات عبداللہ سے مخفی ہے۔ اس لیے محکم بن معین سے مروی ہے کہ یہ سند کمزور ہے۔ البتہ اکثر علماء جن میں امام بخاری، امام احمد، اور علی بن المدینی بھی ہیں کے نزدیک مؤخر الذکر صورت میں سند کو متصل قرار دیتے ہیں۔ اور شعیب کی ملاقات اپنے واداعے ثابت کر کے اس سند کو قابل احتجاج مانتے ہیں۔ امام بخاری نے کتاب القدر میں اسی سند سے ایک حدیث کی تخریج کی ہے۔ اور یہی صورت اقویٰ بھی معلوم ہوتی ہے۔

عبداللہ بن عمرو بن العاص: عبداللہ بن عمرو بن العاص کا اصل نام عامر تھا۔ ایک جنازہ کے دوران نبی کریم ﷺ نے آپ کا نام تبدیل کر کے عبداللہ رکھ لیا۔ ابو محمد اور ابو عبدالرحمن کنیت تھی۔ مکہ میں نبی اللہ ﷺ صحابہ میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت آپ سے روایت کرتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے آپ کو حدیث لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ اور اسی وجہ سے حضرت ابو ہریرہ کے بقول آپ کے پاس تمام صحابہ سے زیادہ احادیث موجود تھیں۔ البتہ عمر کا اکثر حصہ مصر اور شام میں گزارنے کے سبب آپ کی روایات بعض دیگر صحابہ کی نسبت کم نقل کی گئیں۔ آپ اپنے والد عمرو بن العاص سے بھی پہلے اسلام لائے تھے۔ ایک روایت کے مطابق آپ اپنے والد سے صرف بارہ برس یا گیارہ برس چھوٹے تھے۔

طویل قد اور سرخ رنگت تھی عمر کے آخری حصے میں نظر سے بھی محروم ہو چکے تھے۔ تورات کے بھی عالم تھے۔ کثرت علم کے علاوہ عبادت کے ایسے شوقین تھے کہ کثرت صوم اور تلاوت کی وجہ سے والد صاحب نے نبی کریم ﷺ سے شکایت کی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے پابندیاں لگا دیں۔ جنگ صفین میں باپ کے حکم سے شریک تو ہوئے مگر قسم کھاتے ہیں کہ تیر، تلوار یا نیزہ کو کبھی استعمال نہیں کیا۔ اور مسلمانوں کے درمیان لڑی جانے والی اس جنگ میں صرف شرکت کی وجہ سے بھی بہت نادم تھے۔ اور ہمیشہ استغفار کیا کرتے تھے۔ نیز فرماتے ”کاش میں اس واقع سے دس برس قبل ہی مر جاتا“ پھر سال کی عمر میں ۶۵ھ کو شام میں اور ایک قول کے مطابق ۶۷ھ کو مکہ میں وفات پائی۔

فانما وقاعداء یعنی کبھی آپ ﷺ کھڑے ہو کر پیتے تھے اور کبھی بیٹھ کر۔ بلکہ اکثر بیٹھ کر پیتے

تھے۔ ان دو طریقوں کے علاوہ دوسرے اوضاع میں پانی پینا نامناسب ہے۔ مثلاً چلتے چلتے، ٹیک لگا کر، لیٹے لیٹے، یا رکوع اور سجدہ کی حالت میں پانی نہیں پینا چاہیے۔

(۳) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ حَجْرٍ ثَنَا ابْنُ الْمُبَارَكِ عَنْ عَاصِمِ الْأَحْوَلِ عَنْ

الشَّعْبِيِّ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَقَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ مِنْ زَمْزَمَ فَشَرِبَ وَهُوَ قَائِمٌ (۱)۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو زحرم کا پانی پلایا تو آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر اسے پیا۔

فشرِبَ وَهُوَ قَائِمٌ باب کی پہلی حدیث کی طرح یہاں بھی کھڑے کھڑے پانی پینا ثابت ہو رہا ہے۔ جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زحرم کی فضیلت اور نبی کریم ﷺ کا اہتمام کے ساتھ پینا بھی یہاں ثابت ہو رہا ہے۔

(۴) حَدَّثَنَا أَبُو كَرِيبٍ مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ وَ مُحَمَّدُ بْنُ طَرِيفٍ

الْكُوفِيُّ ابْنَانَا ابْنُ الْفَضِيلِ عَنْ الْأَعْمَشِ عَنْ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ مَيْسَرَةَ عَنْ

النِّزَالِ عَنْ سَبْرَةَ قَالَ أَتَى عَلِيَّ بْنَ كُوزٍ مِنْ مَاءٍ وَهُوَ فِي الرَّحْبَةِ فَاخَذَ مِنْهُ

كَفًّا فَغَسَلَ يَدَيْهِ وَ مَضْمَضَ وَ اسْتَنْشَقَ وَ مَسَحَ وَجْهَهُ وَ ذَرَا عِيَهُ وَ رَأْسَهُ

ثُمَّ شَرِبَ مِنْهُ وَهُوَ قَائِمٌ ثُمَّ قَالَ هَذَا وَضُوءٌ مِنْ لَمْ يَحْدُثْ هَكَذَا رَأَيْتَ

رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَعَلَ (۲)۔

ترجمہ: نزال بن سبرہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے پاس پانی کا بھرا کوزه لایا گیا۔ جبکہ

آپؐ اس وقت وجہ میں تھے۔ آپ ﷺ نے اس سے ایک چلو پانی لیا۔ جس سے

(۱) صحیح بخاری ۱/۲۲۱ کتاب الحج باب ما جاء في زمزم، صحیح مسلم ۲/۷۳ کتاب

الأشربة باب في الشرب من زمزم قائماً، جامع ترمذی کتاب الأشربة باب ما جاء في الرخصة في

الشرب ۲/۱۰ قائماً (مختار)

(۲) صحیح بخاری ۲/۱۶۷ کتاب الأشربة باب الشرب قائماً، سنن ابی داؤد کتاب الأشربة باب

في الشرب قائماً سنن النسائی کتاب الطهارة باب صفة الوضوء من غير حدث، السنن الكبرى

للبيهقي ۱/۷۵ کتاب الطهارة (مختار)

دونوں ہاتھ دھوئے۔ پھر کلی کی، ناک میں پانی ڈالا، پھر منہ، بازو اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر کھڑے ہو کر کوزے کا پانی پیا اور فرمایا یہ اس شخص کا وضوء ہے جس کا وضوء نہ ٹوٹا ہو۔ ایسا ہی میں نے نبی کریم ﷺ کو کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

بکوز من ماء کوزہ میں یہ پانی وضوء کی غرض سے لایا گیا تھا۔ وہو فی الرحبہ امیر المؤمنین حضرت علیؑ کھلے میدان میں تھے۔ وجہ راء مفتوحہ اور حاء کے فتح اور سکون دونوں کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ دراصل محن اور کھلے میدان کو کہتے ہیں۔ اور اس سے مراد مسجد کوفہ کے ساتھ وہ کشادہ جگہ ہے جہاں حضرت علیؑ بیٹھ کر فیصلے بھی سنایا کرتے تھے۔ اور وعظ و تذکیر بھی فرماتے تھے۔ جبکہ بعض شراح کے نزدیک یہاں وہ چبوترہ مراد ہے جو مسجد کوفہ کے اندر حضرت علیؑ کے وعظ اور قضاء کے لیے بالخصوص بنایا گیا تھا۔

لمضمض الخ یہ اخذ پر عطف ہے۔ غسل پر عطف اس لیے درست نہیں ہوتا کہ ایک بار پانی لینے سے ان تمام کاموں کا کرنا عقلاً مستبعد ہے۔ ایک چلو پانی سے ہاتھ بھی دھوئے جائیں اور پھر اسی سے مضمضہ واستنشاق وغیرہ کے سارے کام بھی سرانجام ہوں۔ لہذا معنی یہ ہوگا کہ ایک چلو پانے لے کر آپ ﷺ نے ہاتھ دھوئے، پھر منہ، ناک دھویا اور مسح کیا۔

مسح وجهہ و ذراعیه آپ نے پانی لے کر منہ، سر اور ہاتھوں کا مسح کیا۔ تو گویا یہ حقیقی وضوء نہیں تھا۔ ورنہ منہ اور ہاتھوں کا مسح تو بالاتفاق وضوء میں کافی نہیں ہوتا۔ لہذا مطلب یہ ہوا کہ تبرید کے لیے یا گرد و غبار صاف کرنے کے لیے آپ ﷺ نے یہ عمل کیا تھا۔ وضوء پہلے سے تھا۔ اور اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ یہاں پاؤں دھونے کا سرے سے ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ پاؤں دھوئے بغیر وضوء نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بھی محتمل ہے کہ آپ ﷺ نے غسل خفیف کیا ہو جس کو راوی نے مسح کہا۔ اور چونکہ مسئلہ تجدید الوضوء علی الوضوء کا تھا۔ اسی لیے بعض اعضاء کے دھونے کا ذکر ہے پاؤں کا ذکر نہیں کیا۔ اور اعضاء کا دھونا بھی خفیف طریقہ سے ہوا۔ مؤخر الذکر احتمال کو شراح نے ترجیح دی ہے۔

ہکذا رايت الخ نبی کریم ﷺ کو یہ دونوں عمل کرتے ہوئے دیکھا تھا کہ تجدید وضوء میں ہلکا سا وضوء کیا اور وضوء کے بعد جو پانی پیا تھا وہ کھڑے ہو کر پیا تھا۔ اس طرح بچے ہوئے پانی پینے کی اباحت

بلکہ استحاب بھی ثابت ہوا۔ علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ وضوء کے بعد بچا ہوا پانی کھڑے ہو کر پینا بعض امراض کا علاج ہے (۱)۔ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ یہ مستحب ہے۔ کیونکہ یہ بھی زمزم کی طرح تبرک پانی ہے۔ اور اگر نبی کریم ﷺ کا عمل صرف بیان جواز کیلئے ہوتا تو حضرت علیؓ اس کا اعادہ نہ فرماتے۔

(۵) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ وَيُوسُفُ بْنُ حَمَادٍ قَالَا حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ

ابن سعيد عن أبي عصام عن أنس بن مالك أن النبي ﷺ كان

يتنفس في الإناء ثلاثاً إذا شرب ويقول هو امرؤ وارضى (۱)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ برتن میں (پانی پیتے ہوئے)

تین مرتبہ سانس لیا کرتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ اس طریقہ سے پینا زیادہ خوشگوار اور

خوب پیاس بجھانے والا ہے۔

پانی کتنے سانسوں میں پینا چاہئے: کان يتنفس الخ اس حدیث میں پانی پینے کا ایک اور ادب

بیان کرنا مقصود ہے کہ ایک سانس میں پانی نہیں پینا چاہیے۔ بلکہ آرام سے پینا چاہیے۔ درمیان میں سانس

لینا چاہیے۔ فی الإناء کا مقصد یہ نہیں کہ برتن کے اندر سانس لینا ہے بلکہ برتن کو دور کر دینا چاہیے۔ کیونکہ

برتن میں سانس لینا مکروہ ہے۔ اس سے دوسری احادیث میں ممانعت آئی ہے (۲)۔ نبی کریم ﷺ سانس

(۱) وفيه حديث إن فيه شفاء من سبعين داء أدناها البهر (دمه) قال الحافظ انه واه وفي شرح هداية

ابن العماد لسيدى عبدالغنى النابلسى و مما جرته أنى اذا اصابنى مرض اقصد الا شفاء يشرب

فضل الوضوء ليحصل لي الشفاء وهذا دأبى اعتماد على أول الصادق عليه السلام في هذا الطب النبوى

الصحيح (رد المحتار ج ۱ ص ۹۶) مطلب في مباحث الشرب قائما (اصلاح الدين)

(۲) صحيح مسلم ۱۷۴/۲ کتاب الأشربة باب الكراهية التنفس في نفس الإناء الخ، سنن ابی

داؤد ۱۶۸/۲ کتاب الأشربة باب فى الساقى منى يشرب، جامع ترمذی ۱۰۷/۲ کتاب الأشربة

باب ما جاء فى التنفس فى الإناء (مختار)

(۳) عن ابی سعيد الخدری أن النبى ﷺ نهى من النفخ فى الشراب فقال رجل القذاة اراها فى الإناء

فقال اهرقها فقال فأتى لا روى من نفس واحدة قال فابن القدح اذا عن فيك. وروى عن ابی قتادة

أن رسول الله ﷺ قال اذا شرب احدكم فلا يتنفس فى الإناء. كلا الحديثين رواهما الترمذی ج ۲

ص ۱۱ وروى الاخير البخارى ۸۴۱/۲ (اصلاح الدين)

لیتے تو برتن کو منہ سے ہٹا دیتے تھے۔ رقی یہ بات کہ اس مقام پر تین مرتبہ سانس لینے کا ذکر ہے۔ آگے حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں مرتین کا ذکر ہے یعنی دو سانسوں کا ذکر ہے۔ اس ظاہری تداخل کا جواب یہ ہے کہ یا تو یہ تعدد واقعات پر محمول ہے کہ بعض اوقات میں دو مرتبہ سانس لیا تھا۔ جبکہ اکثر اوقات میں تین مرتبہ لیا ہے۔ اور یا یہ کہ دو مرتبہ سانس لینا ادنیٰ درجہ کے بیان کے لیے تھا۔ کہ کم از کم دو مرتبہ تو سانس لے لو۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ پینے کے دوران درمیان میں دو مرتبہ سانس لیا ہے۔ اور آخر میں جو سانس لیا جاتا ہے وہ شمار ہو تو تین سانس بنتے ہیں۔

چنانچہ بعض لوگوں نے پینے کے بعد کا سانس بھی شمار کیا ہے۔ اور بعض اسے شمار نہیں کرتے۔ صرف دوران شرب سانس شمار کرتے ہیں جو کہ دو بنتے ہیں۔ ویقول ہوا مروا وادویٰ فرماتے ہیں کہ اس طرح پینا بہت خوش گوار ہوتا ہے۔ ہضم ہونے، سیر ہونے اور ذائقہ کے لحاظ سے یہ طریقہ اچھا ہے۔ امروا خوب ہضم ہونے والی چیز کو کہتے ہیں۔ جو لذیذ ہونے کے ساتھ ساتھ معدہ پر بوجھ نہ بنے۔ اور ادویٰ خوب سیر کرنے والی مشروب کو۔ درمیان میں سانس لینے سے پیاس خوب بجھتی ہے۔ نیز ذاکثروں نے اس بات پر بھی تحقیق کی ہے کہ ایک سانس میں پانی پینا نظام تنفس کو نقصان پہنچاتا ہے۔ معدہ اور اعصابی نظام میں بھی خلل کا سبب بنتا ہے (۱)۔

(۶) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ خَشْرَمٍ أَنَا عِيسَى بْنُ يُونُسَ عَنْ رِشْدِ بْنِ كَرِيبٍ

عَنْ أَبِيهِ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ إِذَا شَرِبَ تَنَفَّسَ مَرَّتَيْنِ (۲)۔

ترجمہ: ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب پانی پیتے تھے۔ تو (درمیان میں) دو دفعہ سانس لیتے تھے۔

اس حدیث میں دو مرتبہ سانس لینے کا ذکر ہے۔ گزشتہ حدیث سے توافق گزر چکا ہے۔

(۱) بلکہ اس بارے میں ایک مرفوع حدیث بھی موجود ہے وقد روی البیهقی وغیرہ اذا شرب احدکم فلیمص

الماء مضاً ولا یبعہ عا فانہ یورث الکباد (کباد جگر کی بیماری کو کہتے ہیں) ۱۳ بیجوری ص ۱۰۴ (مختار)

(۲) جامع ترمذی ۲/ ۴۵۱ کتاب الاشریۃ باب ما ذکر فی الشرب بنفسین، ابن ماجہ ۲۴۴ کتاب

الاشریۃ باب الشرب بخلالة أنفاس (مختار)

(۷) حَدَّثَنَا إِبْنُ أَبِي عُمَرَ ثَنَا سَفِينٌ عَنْ يَزِيدَ بْنِ يَزِيدَ بْنِ جَابِرٍ عَنْ

عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي عَمْرٍة عَنْ جَدِّهِ كَبْشَةَ قَالَتْ دَخَلَ عَلَيَّ رَسُولُ

اللَّهِ ﷺ فَشَرِبَ مِنْ فِي قُرْبَةٍ معلقة فَأَتَمَّا فَقُمْتُ إِلَى فِيهَا فَقَطَعْتُهُ (۱).

ترجمہ: حضرت کبشہ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ میرے ہاں تشریف لائے تو آپ

نے ایک لٹکے ہوئے مشکیزے کے منہ سے کھڑے ہو کر پانی پیا۔ میں اٹھی اور مشکیزے

کے منہ کو کاٹ لیا۔ (تاکہ محفوظ رہے)

کبشہ علامہ مناوی کہتے ہیں کہ یہ حضرت ابو قتادہؓ کی بہو کبشہ بنت کعب بن مالک ہیں۔ جن

سے ملی کے جھوٹے کی طہارت والی حدیث مروی ہے۔ لیکن اکثر شراح نے یہاں مذکور کبشہ کو کبشہ بنت

ثابت بن المنذرؓ پر محمول کیا ہے۔ جو صحابیہ ہیں اور شاعر رسول حضرت حسان بن ثابتؓ کی ہم شیرہ ہیں۔ علامہ

ابن جریر نے اس کا ایک لقب برصاء بھی ذکر کیا ہے۔ نیز اسے کبشہ (تغیر کے ساتھ) بھی کہا جاتا ہے۔

من قربة معلقة پانی سے بھرے مشک کو عام طور پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ جس کا قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ

ایک تو اس پر ہوا لگتی ہے جس سے اس کا پانی ٹھنڈا رہتا ہے۔

دوسری یہ کہ چوٹیوں اور دیگر حشرات سے بھی ایک حد تک محفوظ ہو جاتا ہے بہر حال

آپ ﷺ نے اوپر لٹکے ہوئے مشک سے کھڑے ہو کر پانی پیا۔ چونکہ یہ مجبوری کی حالت تھی یعنی مشکیزہ

اتارنا مشکل تھا۔ اس لیے آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر پانی پیا۔ اور ضرورت کے وقت اس طرح کھڑے ہو کر

پینے کی اجازت ہے۔ جبکہ یہ احتمال بھی ہے کہ آپ ﷺ نے بیان جواز کے لیے ایسا کیا ہو۔ کما سبق

لقطعته یعنی مشکیزہ کے منہ کا وہ حصہ جہاں آپ ﷺ کا مبارک منہ لگا تھا۔ تبرک اور استشفاء کی

خاطر کاٹ لیا تاکہ ضائع ہونے سے محفوظ رہے۔ یا پھر ادباً کاٹ لیا ہوگا۔ یعنی چونکہ دوسروں کے منہ لگنے کا

(۱) جامع ترمذی ۲/۲۵۱ کتاب الأشربة باب ما جاء في الرخصة سنن ابن ماجه ص ۲۴۴ کتاب

الأشربة باب الشرب قائماً شرح السنة للبغوی ۱/۱۷۸ کتاب الأشربة (مختار)

احتمال تھا جس سے سوء ادب کا شائبہ (۱) تھا۔ لہذا کاٹ لیا اوروں کے منہ اس قابل کہاں ۔

ہزار بار یشویم وہن بمشک وکلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

(۸) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ ثنا عبد الرحمن بن مهدي ثنا عذرة بن

ثابت الأنصاري عن ثمامة بن عبد الله قال قال أنس بن مالك يتنفس

في الإناء ثلاثا وزعم أنس أن النبي ﷺ كان يتنفس في الإناء ثلاثا (۲)۔

ترجمہ: ثمامہ بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ برتن سے پانی پیتے ہوئے تین

مرتبہ سانس لیتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ نبی کریم ﷺ برتن سے پانی پیتے ہوئے تین

مرتبہ سانس لیتے تھے۔

وزعم انس یہاں زعم قال کے معنی میں ہے جو احادیث میں کئی جگہ مستعمل ہے۔ حدیث کے

بقیہ حصوں کی تشریح گزشتہ احادیث کی تشریح کی ضمن میں ہو چکی ہے۔

(۹) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ ابْنُ أَبِي عَاصِمٍ عَنْ ابْنِ جُرَيْجٍ

عَنْ عَبْدِ الْكَرِيمِ عَنْ الْبَرَاءِ بْنِ زَيْدٍ ابْنِ ابْنَةِ أَنَسٍ بْنِ مَالِكٍ عَنْ أَنَسِ بْنِ

مَالِكٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَخَلَ عَلَى أُمِّ سَلِيمَ وَ قُرْبَةَ معلقة فشرِبَ مِنْ فَمِ

القُرْبَةِ وَهُوَ قائِمٌ فَقَامَتْ أُمُّ سَلِيمَ إِلَى رَأْسِ الْقُرْبَةِ فَقَطَعَتْهَا (۳)۔

(۱) دوسرا احتمال یہ ہے کہ آپؐ نے تحرک کیلئے اس حصہ کو کاٹ لیا جہاں آنحضرت ﷺ کا دھن مبارک لگا تھا۔ قال

البيجوري قوله فقطعه أي لصيانة عن الابتذال بشرب كل أحلمنه وللتبرك والاستشفاء به

فقطعها فم الربة للوجهين المذكورين كما قال النووي في شرح مسلم (المواهب اللدنية ص ۱۳۵)

(۲) صحيح بخاری ۸۲۰/۲ کتاب الأشربة باب الشرب بنفسين أو ثلاثة، صحيح مسلم ۱۷۴/۲

کتاب الأشربة باب كراهية التنفس في نفس الإناء الخ، جامع ترمذی ۱۰/۲ کتاب الأشربة باب

ما جاء التنفس في الإناء، ابن ماجة کتابها الشربة (مختار)

(۳) شرح السنة للبغوی ۳۷۹/۱۱ کتاب الأشربة، ابوداؤد طیاسی، رقم حدیث ۱۶۵۰، سنن

دارمی ۱۲۰/۲ (مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ (میری والدہ) ام سلیم کے ہاں تشریف لائے۔ وہاں ایک مشکیزہ لٹکا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے کھڑے کھڑے اس مشکیزے کے منہ سے پانی کو نوش فرمایا۔ ام سلیم مشکیزے کے منہ کو کاٹنے کیلئے انھیں اور اسے کتر کر (مخروط) رکھ لیا۔

ام سلیمؓ: ام سلیم بنت ملحان بن خالد انصاریہ حضرت انسؓ کی والدہ ہیں۔ ان کا نام سہلہ، رمیلہ، رمیثہ یا کچھ اور تھا۔ مالک بن نضر سے جاہلیت میں نکاح کی۔ اور حضرت انسؓ کی ولادت ہوئی۔ پھر خاندان کی اجازت کے بغیر ایمان لائیں۔ جس کی وجہ سے مالک ناراض ہو کر شام چلا گیا۔ اور وہیں اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس کے بعد جب ابو طلحہؓ نے آپؐ سے نکاح کی خواہش ظاہر کی تو آپؐ نے کہا کہ میں تم سے مہر بھی نہیں لوں گی۔ لیکن تجھے نکاح سے پہلے مسلمان ہونا پڑے گا۔ وہ راضی ہو گئے تو ان کے اسلام کے بعد ان سے نکاح کر لیا۔ وہ ایک با حوصلہ اور نیک خاتون تھی۔ نبی کریم ﷺ آپؐ پر بہت مہربان تھے بکثرت ان کے ہاں جایا کرتے تھے۔ اور آپؐ بھی کچھ نہ کچھ تیار کر کے ان کا اکرام کرتی تھیں۔ کئی غزوات میں شرکت کی۔ عموماً غزوات میں آپؐ اپنے ایک خنجر سے مسلح رہتی تھی۔

ابن ابیہ انسؓ یہ براء کی دوسری صفت ہے یعنی براء زید کے بیٹے اور حضرت انسؓ کے نواسے تھے۔ من فم القربة اس حدیث اور گزشتہ ایک حدیث میں مشکیزے کے منہ سے پانی پینے کا ذکر ہے۔ اس پر یہ اشکال ہے کہ احادیث میں مشکیزے کے منہ سے منہ لگا کر پینے کی ممانعت آئی ہے (۱)۔ تو آپ ﷺ نے عملاً مخالفت کیوں کی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عمل فی نفسہ خلاف اولیٰ ہے۔ مطلقاً ممنوع بھی نہیں ہے۔ لہذا ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے بیان جواز کے لیے ایسا کیا ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں پر مجبوری کی وجہ سے آپ ﷺ نے یہ عمل کیا ہو۔ کیونکہ مشک کو اتارنا مشکل ہوتا ہے۔ اور چھوٹا برتن اس وقت موجود نہ ہوگا۔ نیز یہ احتمال ہے کہ نبی دوسروں کے لیے ہو خود نبی کریم ﷺ اس سے مستغنی ہوں۔ اور اس کی ایک معقول وجہ بھی ہے وہ یہ کہ دوسرے لوگوں کے جھوٹے سے لوگ نفرت کرتے ہیں۔ بالخصوص مشک کے منہ پر

(۱) نہی النبی ﷺ ان یشرب من فی السقاء (بخاری ج ۲ ص ۸۴۱) (مختار)

منہ لگانے سے کبھی تعفن سا پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن آپ ﷺ کی بات اور ہے آپ ﷺ کے جھوٹے پرتو لوگ مرتے تھے۔ طبعی کراہت، اور تقدیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لوگ آپ ﷺ کے جھوٹے کو سعادت سمجھتے تھے، محبت سے پیتے تھے، آپ ﷺ کے خون کو چاٹا گیا ہے، وضوء کا پانی پیا جا چکا ہے، بلکہ آپ ﷺ کے بول کو بھی پیا گیا ہے (۱)۔ تو دوسروں کے جھوٹے کو نبی کریم ﷺ کے جھوٹے پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ نیز اس مقام پر نبی کے دوسرے وجہ سے بھی کوئی وجہ موجود نہیں تھی۔ لہذا آپ ﷺ نے مشک سے پانی پیا۔

(۱۰) حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ النَّصْرِ النَّيْسَابُورِيُّ ثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ مُحَمَّدٍ

الْفُرَوِيُّ حَدَّثَنَا عُبَيْدَةُ بِنْتُ نَاضِلٍ عَنْ عَائِشَةَ بِنْتِ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ

عَنْ أَبِيهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَشْرَبُ قَائِمًا وَقَالَ أَبُو عَيْسَى وَقَالَ

بَعْضُهُمْ عُبَيْدَةُ بِنْتُ نَاضِلٍ (۲)۔

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ (کبھی کبھی)

کھڑے ہو کر پانی پی لیا کرتے تھے۔

سعد بن ابی وقاصؓ: ان کا نام سعد بن مالکؓ بن اصیب یا وہیب الزہری تھا۔ ابواطن کنیت تھی۔ قدیم الاسلامی صحابی اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ اور ان میں وفات پانے والے آخری صحابی تھے۔ عرب کے چوٹی کے شہسواروں اور تیر اندازوں میں آپؐ کا شمار ہوتا تھا۔ اس لیے آپؐ کو ”فارس الاسلام“ بھی کہا جاتا ہے۔ عراق کی فتح میں سب سے آگے تھے۔ عمرؓ کے زمانہ میں کوفہ کے امیر بھی رہے بلکہ آپؐ ہی دراصل کوفہ کے بانی تھے۔ پھر حضرت عثمانؓ کے زمانے میں دوبارہ کوفہ کے امیر مقرر ہوئے۔ نبی کریم ﷺ نے آپؐ کے مستجاب الدعوات ہونے کے لیے دعا کی تھی۔ اس لیے آپؐ کی کوئی دعا رد نہیں ہوتی تھی۔ عمر ستر (۷۰) سے تجاوز کر گئی تھی۔ اور مشہور قول کے مطابق ۵۶ھ میں وفات پائی۔ اگرچہ تاریخ وفات میں دیگر اقوال بھی ہیں۔

(۱) اقول شربته بركة الحبشية خادمة ام المؤمنين ام حبيبة بنت ابي مفيان كما ذكره ابن حجر في

الاصابة ج ۳ ص ۲۴۹ (اصلاح الدين)

(۲) شرح المعاني الآثار ۲/۳۳۲ باب الشرب قائماً، المعجم الكبير للطبرانی ۱/۴۷۱ (مختار)

اسلام میں سب سے پہلا تیر آپؐ کے کمان سے نکلا۔ ایسے ہی موقع پر آپؐ کو نبی اکرم ﷺ نے ”فداک ابی و اُمی“ کے امتیازی خطاب سے نوازا تھا۔ زہری قبیلہ سے ہونے کی وجہ سے نبی کریم ﷺ آپؐ کو ماموں کہا کرتے تھے۔ بلکہ آپؐ کے ماموں ہونے پر فخر کرتے تھے۔ دین کے معاملہ میں مصلب اور سخت گیر صحابہؓ میں شمار ہوتے تھے۔ صحابہ کے درمیان مشاجرات میں مکمل طور پر غیر جانبدار رہے۔ آپؐ کے مناقب کیلئے مکمل کتاب ہی کافی ہو سکتی ہے۔

کمان بشارت قائما یعنی کبھی کبھی ضرورت کی بنا پر یہ بیان جواز کیلئے کھڑے کھڑے پی لیتے تھے۔ عموماً بیٹھ کر پانی پیا کرتے تھے۔ لہذا ابوداؤد کی روایت ”نہی عن الشرب قائما“ (۱) نیز مسلم شریف کی روایت ”و زجر عن الشرب قائما“ (۲) اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ”لا یشرطن احد منکم قائما فمن نسی فلیستفی“ (۳) اور ترمذی کی روایت کہ ”ان النبی ﷺ نہی عن الشرب قائما“ (۴) ہی اصل حکم ہے۔ اور گویا کھڑے ہو کر پینا صرف اباحت کے درجہ میں بوقت ضرورت ثابت ہے (۵)۔

قال ابو عیسیٰ الخ امام ترمذی عائشہ بنت سعدؓ کی شاگرد عبیدہ کے والد میں محدثین کا اختلاف بیان کرتے ہیں کہ مشہور تو نائل ہمزہ کے ساتھ ہے۔ لیکن بعض محدثین نے اسے نائل باء کے ساتھ بھی بتایا ہے۔

(۱) ابوداؤد کتاب الاشریہ باب فی الشرب قائما، و مسلم ج ۲ ص ۷۳ کتاب الاشریہ

(۲) مسلم ج ۲ ص ۷۳ باب فی الشرب قائما

(۳) ایضاً

(۴) جامع ترمذی ۲/۱۰۰ باب فی النهی عن الشرب قائماً

(۵) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے ای صادر اُلیان الجواز او حمل النهی عنه علی التنزیة اول ضرورة او مخصوصية (جمع الوسائل ۱/۳۰۸) اور کھڑے ہو کر پانی پینے کے مضرات علامہ مناویؒ نے حافظ ابن قیمؒ کے حوالہ سے لکھا ہے و لشراب قائماً آفات منها انه لا یحصل به الری التام فی المعدة حتی یقسمه الکبد علی الاعضاء ویلاقی المعدة فربما یرد حرارتها ویسرع النفوذ الی اسافل البدن بغیر تدریج فیضر ضرراً بئناً (المناوی علی هامش جمع الوسائل ۱/۳۰۷) (مختار)

خلاصہ باب

اس باب میں پانی پینے کے کچھ آداب کا بیان ہے۔ مثلاً اول یہ کہ عموماً بیٹھ کر پانی پیا جائے۔ البتہ کچھ شرعی یا طبی مصلحتوں یا مجبوریوں کی بناء پر بعض اوقات کھڑے کھڑے پینے میں کوئی حرج نہیں۔ دوم یہ کہ پانی تین سانسوں سے پینا مستحب ہے۔ یا کم از کم دو سانسوں سے پینا چاہیے۔ ایک سانس میں پانی پینا شرعی اور طبی مصالح کے منافی ہے۔ سوم یہ کہ بڑے مشکیزے اور اس جیسے برتنوں کے منہ سے کبھی کبھی مجبوری کے تحت تو پانی پیا جاسکتا ہے۔ لیکن حتی الوسع اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

علاوہ ازیں پینے سے قبل بسم اللہ پڑھنا اور آخر میں الحمد للہ پڑھنا وہ آداب ہیں جو گزشتہ ابواب سے ثابت ہیں۔ بلکہ بعض روایات میں ہر سانس سے قبل بسم اللہ اور اس کے بعد حمد کا ذکر آیا ہے۔

۳۳. باب ما جاء في تعطر رسول الله ﷺ

حضور اقدس ﷺ کی خوشبو استعمال کرنے کا بیان

تعطر (۱) عطر سے ہے۔ تعطر الرجل کے معنی ہیں اس آدمی نے خوشبو استعمال کی۔ نبی کریم ﷺ کا بدن مبارک خود بھی معطر تھا۔ پھر بھی آپ ﷺ خوشبو لگانا بہت پسند کرتے تھے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ حُبِّ الی من اللہیا النساء والطیب وجعلت قرۃ عینی فی الصلوۃ (۲) ترجمہ: مجھے دنیا میں عورتوں اور خوشبو سے محبت ہے۔ اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔ مذکورہ تین چیزوں میں خوشبو کا بھی بطور خاص ذکر ہے۔ نبی کریم ﷺ کو خوشبو، صفائی، پاکیزگی، نظافت اور نفاست سے شغف تھا۔ یہی امور فطرت سلیمہ کی ترجمان ہیں۔ اسی لیے اسلام میں مطلوب ہیں۔ اور کئی مواقع پر ان کا حکم دیا گیا ہے۔

حضور اقدس ﷺ کی ذاتی جسمانی خوشبو: خود نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ایسا معطر جسم بخشا تھا کہ جس راستے پر سے آپ ﷺ گزرتے صحابہؓ سمجھ لیتے تھے کہ آپ ﷺ یہاں سے گزرے ہیں۔ سارے راستے میں ایک جہک اور خوشبو پھیلی ہوتی تھی جو دیگر خوشبوؤں سے ممتاز ہوتی تھی۔ کئی روایات میں نبی کریم ﷺ کے سینے کی خوشبو کا بھی ذکر ہے۔ شمائل ہی میں حضرت انسؓ کی حدیث گزری ہے۔ فرماتے ہیں کہ ولا شمعت مسکا ولا عطرأ طیب من عرق رسول اللہ ﷺ (۳) ترجمہ: میں نے نبی کریم ﷺ کے سینے سے زیادہ خوشبودار مشک سوکھی ہے نہ عطر۔

(۱) التعطر استعمال العطر كما أن التطيب استعمال الطيب (جمع الوسائل ۲/۲) عطر بکسر الحین خوشبو کو کہا جاتا ہے۔ عرب زیادہ خوشبو لگانے والے شخص کو رجل معطر کہا کرتے ہیں (جمع الوسائل ۲/۲) تو گویا باب کا مطلب ہے باب بیان الاحادیث الواردہ فی تعطر رسول اللہ ﷺ (المواہب اللدنیہ ص ۷۷) (مختار)

(۲) نسائی ج ۲ ص ۹۴ باب حب النساء (مختار)

(۳) ملا علی قاریؒ نے حضرت انسؓ کی روایت کے الفاظ یوں نقل کئے ہیں ما شمعت ریحاً قط ولا مسکاً ولا عنبراً طیب من ریح رسول اللہ ﷺ (جمع الوسائل ۲/۲) (مختار)

ان کی والدہ ام سلیم آپ ﷺ کے پسینہ سوتے میں جمع کرتی تھیں اور اسے دوسرے تیلوں سے ملاتی تھیں۔ اس جیسا خوشبودار تیل کبھی نہیں ملتا تھا۔ نبی کریم ﷺ کے استفسار پر آپؐ کہتی تھیں۔

هذا عرقك نجعله في طينا و هو من اطيب الطيب (۱)

بائیں ہمہ آپ ﷺ خوشبو کا التزام بھی فرماتے تھے تاکہ مہک دو بالا ہو جائے۔ نیز امت کو یہ تعلیم بھی دیتے رہے کہ خوشبو کا استعمال سنت ہے۔

(۱) حدثنا محمد بن رافع وغير واحد قالوا انا ابو احمد الزبيري

لنا شيبان عن عبد الله بن المختار عن موسى بن انس بن مالك عن

أبيه قال كان لرسول الله ﷺ مسكة بتطيب منها (۲)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک مسکہ تھا جس میں سے

آپ ﷺ خوشبو لگاتے تھے۔

مسکہ بتطيب منها (۳) مسکہ ایک خاص قسم کی سیاہ خوشبو ہے یہ ایک ٹھوس مرکب عطر ہے جس میں

مشک ملائی جاتی ہے۔ پھر اس کی گولیاں بنا کر دھاگے میں پرو لیا جاتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس

کی خوشبو میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جبکہ بعض شارحین علماء کا خیال ہے کہ مسکہ دراصل عطر دان کو کہتے ہیں یعنی

آپ ﷺ کے پاس عطر کی ایسی شیشی یا ڈبیا جیسی چیز تھی جس میں آپ ﷺ عطر رکھتے تھے۔ اور مختلف مواقع

پر اسے استعمال فرماتے تھے۔ ان شراح نے ”من“ کے کلمہ سے استدلال کر کے یہ کہا ہے کہ ”من“ بتدائیہ

ہے۔ اگر مسکہ کوئی خوشبو ہوتی تو پھر بتطیب بھا کہنا چاہیے تھا۔ لیکن اول الذکر شارحین کہتے ہیں کہ ”من“

تبعیضیہ ہے۔ یعنی ”بتطیب ببعضها“

(۱) صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۵۷ باب طیب عرقہ صلی اللہ علیہ وسلم والتبرک بہ (مختار)

(۲) سنن ابی داؤد ۲۵۰/۲۲۰ کتاب الترجل باب ما جاء في استحباب الطيب، شرح السنة

للبيهقي ۸۵/۱۲ کتاب اللباس باب التطيب (مختار)

(۳) یہ جملہ ترکیب کے اعتبار سے یا تو حال ہے اور یا استیناف بیان کیلئے ہے۔ (مختار)

(۲) حدثنا محمد بن بشار ثنا عبد الرحمان بن مهدي ثنا عذرة بن

ثابت عن ثمامة بن عبد الله قال كان انس بن مالك لا يرد الطيب

وقال انس ان النبي ﷺ كان لا يرد الطيب (۱)۔

خوشبودنہ کریں:

ترجمہ: ثمامہ کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ خوشبو کو رد نہیں کرتے تھے اور حضرت انسؓ نے

یہ بھی فرمایا کہ نبی کریم ﷺ بھی خوشبو کو رد نہیں فرماتے تھے۔

لا يرد الطيب الخ حضرت انسؓ خوشبو واپس نہیں فرماتے تھے (۲) محبت سے قبول فرماتے تھے

کیونکہ حضرت انسؓ کے بقول نبی کریم ﷺ خوشبو کو رد نہیں فرماتے تھے۔ ابوداؤد شریف کی ایک حدیث میں

ہے ”من عرض عليه طيب فلا يردده فانه طيب الريح خفيف المحمل

(۳) حدثنا قتيبة بن سعيد ثنا ابن ابی فديك عن عبد الله بن

مسلم بن جندب عن ابيه عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ ثلث

لا ترد الوسائد والدهن والطيب واللبن۔

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تین ہدایا لوٹانے کی

نہیں۔ تکیہ، تیل اور خوشبو۔

الوسائد والدهن والطيب جن تین چیزوں کا اس مقام پر ذکر ہے ان کو واپس نہیں کرنا

چاہیے۔ ان میں سے ایک وسادہ یعنی تکیہ ہے جب کوئی شخص محبت کے طور پر اسے پیش کر دے تو لیکر اس

(۱) صحيح بخاری ۳۵۳/۱ کتاب الہبة باب لا يرد من الہدية، جامع ترمذی ۵۶۷/۲ کتاب

الادب باب ما جاء في كراهية رد الطيب، سنن النسائي ۲۹۳/۲ کتاب الزينة باب الطيب (مختار)

(۲) شمائل کے بعض نسخوں میں الوسائد والدهن والطيب کا ذکر ہے۔ اللبن کا نہیں اور بعض نسخوں میں اللبن کا ذکر

ہے الطيب کا نہیں۔ اس روایت میں اگرچہ بظاہر چار چیزیں ذکر ہیں تو ہو سکتا دھن اور طيب ایک ہو۔ ملا علی قاریؒ نے

لکھا ہے ولعل المراد بالدهن هو الذي له طيب فعبر تارة بالطيب واخرى بالدهن (جمع

الوسائد ۳/۲) علماء نے ان تین اشیاء کے رد نہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کا ایک قاعدہ نکالا ہے۔ چونکہ یہ چیزیں حدیث

دینے والے پر بار نہیں ہوتی اور بسا اوقات واپسی رنج و الم کا سبب بنتا ہے۔ اس لئے اس کے حکم میں وہ چیزیں بھی شامل

ہیں جو دینے والے پر بار نہ ہوتی ہوں تو گویا حقیر سے حقیر ہدیہ کو بھی قبول کرنا چاہئے (مختار)

پر ٹیک لگا دو۔ دوسری چیز تیل اور تیسری خوشبو ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عطر، پھول وغیرہ کوئی پیش کر دے تو اسے قبول کرنا چاہیے۔ کیونکہ ان چیزوں میں ہدیہ دینے والے پر بوجھ اور مشقت بھی کم ہے۔ مفرح اور آرام دہ ہیں۔ اور قبول کرنے میں مہدی کی خاطر داری بھی ہو جاتی ہے۔ لہذا ہدیہ دینے والے کی تطہیب قلب کی غرض سے ان کو قبول کرنا چاہیے۔ واپس کرنا مناسب نہیں ہے۔

یہ حدیث میں نے بچپن میں سنی تھی حضرت شیخ الحدیث والد محترمؒ کے ساتھ میں لاہور گیا تھا۔ جامعہ اشرفیہ کے بانی حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ کے پاس ہم گئے جو حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں سے تھے۔ ان کا ایک پاؤں کٹ چکا تھا۔ بڑے ولی اللہ اور بزرگ شخصیت تھی۔ ان کو بھی حضرت شیخ الحدیثؒ سے محبت تھی۔ کبھی کبھی سالانہ جلسوں میں بلایا کرتے تھے۔ چنانچہ ہم ان کی خدمت میں نیلا گنبد میں اوپر کی منزل میں گئے۔ وہاں بڑے بزرگ لوگ اور صاحب حیثیت حضرات ملاقات کو آتے جاتے تھے۔ اس موقع پر انہوں نے حضرت الشیخ کو اپنے ساتھ چار پائی پر بٹھایا۔ اور محبت کے ساتھ کئی بار تکیہ ان کو پیش فرمایا۔ حضرت الشیخ ادباً اور تواضعاً واپس ان کی طرف رکھ لیتے تھے۔ بالآخر مفتی صاحبؒ نے جلال کے انداز میں فرمایا ”مولوی صاحب وہ حدیث یاد نہیں قلت لا ترد الخ“ اس کے بعد حضرت الشیخ نے اسے قبول کر لیا۔ اس حدیث میں تکیہ، تیل اور خوشبو کا ذکر ہے۔ تیل بھی خوشبو کے ضمن میں آ جاتا ہے۔ اسی لیے تو احرام میں تیل لگانا جائز نہیں ہے۔ جبکہ بعض نسخوں میں لبن ”دودھ“ کا ذکر ہے کہ اسے بھی واپس کرنا جائز نہیں ہے (۱)۔

(۴) حدثنا محمود بن غیلان ثنا ابو داؤد الحفزی عن سفیان عن

الجریری عن ابی نضرۃ عن رجل عن ابی ہریرۃ قال قال

(۱) چنانچہ مصنفؒ نے اس حدیث کو جامع ترمذی میں لایا ہے۔ وہاں الفاظ یہ ہیں ثلاث لا ترد الوسائد والدھن واللبن (ترمذی ج ۲ ص ۱۰۲ باب ما جاء فی کراہیۃ رد الطیب) اور ظاہر ہے کہ وہاں وہن سے مراد تمام خوشبوئیں ہیں۔ علامہ سیوطیؒ نے ایسی سات چیزوں کا ذکر کیا ہے جن کا پیش ہونے کے بعد رد کرنا مناسب نہیں ہے۔ انہوں نے دوشعروں میں ان اشیاء کو جمع کیا ہے اور اسے قبول کرنا سنت کہا ہے۔

اذا ما لبھا قد اتحف المرء خلان

عن المصطفیٰ سبع یمن قبولھا

ورزق لمحتاج وطیب وریحان (مختار)

فحلوا والبان و دھن و سادۃ

رسول الله ﷺ طيب الرجال ما ظهر ريحه و خفى لونه و طيب النساء
ما ظهر لونه و خفى ريحه.

حدثنا علي بن حجر ثنا اسماعيل بن ابراهيم عن الجريدي عن ابي
نضرة عن الطفاوي عن ابي هريرة عن النبي ﷺ مثله بمعناه (۱).

مردانہ اور زنانہ خوشبو میں فرق:

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مردانہ
خوشبو وہ ہے جس میں خوشبو غالب ہو اور رنگ پھیکا ہو۔ اور زنانہ خوشبو وہ ہے جس میں
رنگ غالب اور خوشبو کم ہو۔

عن رجل اس راوی کی تحقیق آگے آرہی ہے۔ طيب الرجال اس حدیث میں اس ارشاد کا ذکر
ہے کہ مردوں کے استعمال میں آنے والی خوشبو ایسی ہو جس کی خوشبو تیز ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس
کی بو سے مستفید ہو سکیں۔ وجہ یہ ہے کہ مرد کے لیے جمعوں، عیدوں اور دیگر مجامع میں حاضر ہونا پڑتا ہے
۔ لہذا اس کے لیے ہلکا اور خوشبو استعمال کرنی چاہیے۔ جیسے مشک، عنبر، کافور اور عرق گلاب وغیرہ لیکن چونکہ
اس کیلئے رنگ دار خوشبو اور خوش رنگ اشیاء سے تزیین ممنوع ہے۔ اس لیے خوشبو کا رنگ مدہم ہونا چاہیے۔
اس کے برعکس عورتوں کی طيب مدہم خوشبو والی ہو۔ جس کا رنگ تیز ہو کیونکہ وہ تہمتن کے طور پر
طيب (خوشبو) کا استعمال صرف اپنے خاوند کے لیے کرتی ہے۔ لہذا ایسی خوشبو استعمال کرے جو خاوند کی نظر
کو بھائے اور اسی تک منحصر رہے۔ تیز بو والی خوشبو اس لیے استعمال نہ کرے تاکہ باہر نکلتے وقت راستے پر
سے گزرنے والے غیر مردوں کو متوجہ کر کے فتنے اور شہوانی وساوس کا سبب نہ بنے۔

البتہ رنگ تیز اور بھڑکیلا ہو مثلاً زعفران اور صندل یا مہندی تو ایسی کوئی خرابی لازم نہیں آتی۔ کیونکہ
باہر نکلتے گی تو وہ پردے میں نکلے گی۔ اور گھر کے اندر اس کا فائدہ خاوند کو پہنچے گا۔ البتہ اگر عورت گھر کے اندر

(۱) سنن ابی داؤد ۳۰۲/۱ کتاب النکاح باب ما جاء يكره من ذكر الرجل الخ، جامع
ترمذی ۵۶۷/۲ کتاب الأدب باب ما جاء في طيب الرجال والنساء، سنن النسائی ۲۸۱/۲ کتاب
الزينة باب الفصل بين طيب الرجال وطيب النساء (مختار)

ہی رہے اور صرف اپنے خاوند کی خاطر تیز خوشبودار چیز استعمال کرے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

حدیثنا علی بن حجر النخ یہاں سے اوپر کی حدیث کے لیے ایک اور سند ذکر کر رہے ہیں۔ اوپر کی سند میں ابو ہریرہؓ سے روایت کرنے والے شخص کو رجل کہا تھا۔ یہاں پر ”طفائی“ سے تعبیر کر رہے ہیں لیکن پھر بھی یہ رجل مجہول ہی ہے۔ نام وغیرہ کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

بائیں ہمہ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے جس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ یہ آدمی تابعی ہے اور تابعین میں اتنی سی مجہولیت قابل برداشت ہے۔ حدیث کے لیے مضرت نہیں ہے۔

(۵) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ خَلِيفَةَ وَ عَمْرُو بْنُ عَلِيٍّ قَالَ ثَنَا يَزِيدُ بْنُ زُرَيْعٍ

ثَنَا حُجَّاجُ الصَّوَّافِ عَنْ حَنَّانٍ عَنْ أَبِي عَثْمَانَ النَّهْدِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ

اللَّهِ ﷺ إِذَا أَعْطَى أَحَدُكُمْ الرِّيحَانَ فَلَا يَرُدُّهُ فَإِنَّهُ خَرَجَ مِنَ الْجَنَّةِ (۱)۔

ترجمہ: حضرت ابو عثمانؓ انہدیؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں

سے کسی کو گل ریحان دیا جائے۔ تو اسے واپس نہ کرے کیونکہ یہ جنت سے نکلا ہے۔

ابو عثمان النہدی: ان کا نام عبدالرحمن بن ملن ہے۔ کنیت سے مشہور ہیں۔ بنو قضاء کی ایک

شاخ نہد کی طرف منسوب ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی حیات ہی میں مسلمان ہو چکے تھے لیکن شرف ملاقات

حاصل نہ ہو سکی۔ ۹۵ھ میں وفات پائی۔ ایک سو تیس برس یا اس سے بھی زیادہ عمر پائی تھی۔ لہذا یہ حدیث

مرسل ہے کیونکہ صحابی محدوف ہیں۔ اذا اوتی احدکم الریحان النخ ریحان پودوں کے اس گروپ کا

نام ہے جس کے پھول، پتے، ٹہنیاں اور تخم سب خوشبودار ہوں۔ یہاں پر ذکر ریحان کے پھول کا ہے۔

لیکن ہر قسم کا خوشبودار پھول مراد ہو سکتا ہے۔ گلاب، جمبیلی وغیرہ جو بھی پھول کوئی پیش کرے۔ فلا یردہ

پس اسے نہیں ٹھکراتا چاہیے۔ یہ نیمی کا صیغہ ہے کیونکہ ایسی چیز کے ٹھکرانے سے آدمی کا لالچی ہونے کی طرف

اشارہ ملتا ہے۔ گویا اپنے عمل سے وہ ہدیہ دینے والے پر یہ واضح کرنا چاہتا ہے۔ کہ یہ بھی کوئی ہدیہ ہے جو تم

پیش کر رہے ہو۔ کوئی اہم چیز ہو تو قبول کر دوں۔ صرف پھول پیش کر کے نہ بہلاؤ۔ اس طرح ہدیہ دینے

(۱) سنن ابی داؤد کتاب المراسیل باب ماجاء فی الریحان، جامع ترمذی ۲/۵۶۷ کتاب الادب

باب ماجاء فی کراہیۃ رد الطیب، شرح السنۃ للبلغوی ۱۲/۸۷ باب التطیب کتاب اللباس (مختار)

والے کا بھی دل ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ پتہ نہیں اس نے کتنی چاہت کے ساتھ پھول لائے ہونگے۔ اور یہاں پر اس کا تحفہ ٹھکرا دیا گیا ہے۔

نعمتوں اور خوشبوؤں کا سرچشمہ جنت: فانہ خرج من الجنة یہ دوسری اور اصل وجہ ہے ٹھکرانے کی عدم مناسبت کی۔ یعنی یہ پھول جنت سے نکلا ہے۔ منزل مقصود کی نشانی اور دار حبیب کی علامت ہے۔ لہذا سر آنکھوں پر رکھ کر قبول کرنا چاہیے۔ صرف پھول نہیں بلکہ رنگ و بو، طہام و لباس اور مناکحہ وغیرہ کی دنیا میں جتنی بھی خوبصورت نعمتیں پائی جاتی ہیں۔ سب کا سرچشمہ جنت ہی ہے۔ یہ نعمتیں جنت میں اضافوں کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی صورت میں موجود ہونگیں (۱)۔

باقی رہی یہ بات کہ یہ جنت سے کیسی نکلی ہے تو اس کی صحیح کیفیت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ ہمارے لیے اس پر ایمان لانا ہی کافی ہے۔

قال ابو عیسیٰ الخ علامہ عبدالرحمان بن ابی حاتم کی مشہور کتاب جس کا نام ”الجرح والتعلیل“ ہے میں لکھا ہے کہ حنان اسدی مسدد کے باب کے چچا ہیں۔ جو کہ ابو عثمان الہندی کے شاگرد ہیں۔ سمعت ابی یقول ذالک۔ یعنی علامہ عبدالرحمن کہتے ہیں کہ حنان اسدی کا مذکورہ تعارف میں نے اپنے والد ابو حاتم سے زبانی سنا تھا۔

(۶) حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ بْنِ مَجَالِدٍ عَنْ مَعْبُدِ بْنِ هَمْدَانَ أَنَّ ابْنَ

عَنْ بِيَانٍ عَنْ قَيْسِ بْنِ أَبِي حَازِمٍ عَنْ جَرِيرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ عَرَضْتُ بَيْنَ

يَدَيَّ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَأَلْقَى جَرِيرٌ رِءَاءَهُ وَ مَشَى فِي أَزَارٍ فَقَالَ لَهُ

خَذِرْ ذَنْكَ فَقَالَ عُمَرُ لِلْقَوْمِ مَا رَأَيْتُ رَجُلًا أَحْسَنَ صُورَةً مِنْ جَرِيرِ

الْأَمَّا بَلَقْنَا مِنْ صُورَةِ يُوسُفَ عَلَيْهِ السَّلَامُ (۲)۔

(۱) قال البيهقريّ وانما خلق الله الطيب في الدنيا ليدكر به العباد طيب الجنة و يرغبون فيها بزيادة الاعمال الصالحة والحاصل ان طيب الدنيا نموذج من طيب الجنة والا فطيبها يور جدريحه من

مسيرة خمس مائة عام كما في الحديث ۱۲ المواهب اللّنية ص ۵۸ (اصلاح الدين)

(۲) تفرّد الامام الترمذی بهذا الحديث

ترجمہ: حضرت جریر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کی خدمت میں (معائنہ) کے لیے پیش ہوا۔ جریرؓ نے (اس موقع پر) اپنی چادر اتار دی اور (صرف) لنگوٹھی میں چلنے لگے (معائنہ کے بعد) حضرت عمرؓ نے اسے حکم دیا کہ اپنی چادر (پہننے کے لیے) لے لو۔ پھر حضرت عمرؓ نے حاضرین سے فرمایا کہ میں نے جریرؓ سے زیادہ خوبصورت آدمی نہیں دیکھا ہے سوائے حضرت یوسفؑ کی صورت کے۔ جیسا کہ ہم تک (ان کے حسن کی بات) پہنچی ہے۔

جریر بن عبد اللہ: جریر بن عبد اللہ بن جابرؓ بخیلہ قبیلہ کے مشہور صحابی ہیں۔ بخیلہ ایک عورت کا نام تھا جس کے نام سے یہ قبیلہ منسوب ہے۔ علامہ ابن عبد البرؒ نے حضرت جریرؓ کی روایت کے مطابق بیان کیا ہے کہ آپؐ نے نبی کریم ﷺ کی وفات سے صرف چالیس دن قبل اسلام قبول کیا تھا لیکن ابن حجرؒ اسے تسلیم کرنے سے کتراتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ صحیحین میں آپؐ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر مجھے حکم دیا ”استصیت الناس“ یعنی لوگوں کو خاموش کر دو۔ واقعہ یہ کہ آپؐ رمضان ۱۰ھ میں اسلام لانے کی غرض سے مدینہ منورہ تشریف لائے تھے۔ بلکہ علامہ ابن حجرؒ نے بعض شواہد کی بنیاد پر دعویٰ کیا ہے کہ آپؐ ۱۰ھ سے بھی پہلے اسلام لائے تھے۔ علامہ ابن عبد البرؒ کے قول کی توجیہ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے کہ آپؐ نے وفات نبوی ﷺ سے چالیس دن قبل اسلام کی تجدید کی ہو۔ آپؐ کے حاضر ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ نے آپؐ کی بہت تکریم کی تھی بلکہ فرمایا ”اذا اتاكم کریم قوم فاکرموه“ آپؐ انتہائی حسین اور لمبے قد کے آدمی تھے۔ کہتے ہیں کہ آپؐ کا قد چھ ذراع یعنی تین گز تھا۔ اونٹ کے کوہان کو کھڑے ہو کر چھو لیتے تھے۔ حضرت عمرؓ انتہائی حسن کی وجہ سے آپؐ کو ”یوسف ہذہ الامۃ“ کہتے تھے۔ جس کا کچھ بیان زیر نظر حدیث میں بھی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے آپؐ کے قدم سے قبل ہی فرمایا تھا کہ تمہارے پاس ایک ایسا شخص آ رہا ہے کہ ”کان علی وجہہ مستحۃ ملک“ گویا فرشتے نے اس کے چہرے پر تحمین کا ہاتھ پھیرا ہے۔ امام ترمذیؒ نے باب ضحک النبی ﷺ میں آپؐ سے روایت کی ہے کہ ”ما حجبنی رسول اللہ ﷺ منذ اسلمت ولا رانی الا تبسم“۔

حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانے میں ان کی طرف سے امیر معاویہؓ کے ہاں سفارت کاری کا فریضہ بھی انجام دیا۔ لیکن بعد میں دونوں سے علیحدگی اختیار کر کے غیر جانبدار رہے۔ پہلے کوفہ اور پھر قرطیہ میں مقیم رہے۔ اور ۵۵ھ میں وفات پائی۔

حضرت عمرؓ کا فوجی معائنہ، پریڈ: عرضت بین یدی اس باب میں خوشبو کا بیان ہو رہا تھا۔ اسی ضمن میں امام ترمذیؒ حضرت جریرؓ کے بارے میں ان ہی کی روایت سے یہ حدیث لائے ہیں۔ اس مقام پر عرض کا مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح آج کل بھی انتظامیہ کے افسران یا فوجی جرنیل اپنے فوجی پلٹنوں کا معائنہ کرتے ہیں۔ اور گارڈ آف آنر اور معائنہ کا رواج ہے۔ کبھی بھرتی ہوتے وقت فوجیوں کا طبی ٹیسٹ کیا جاتا ہے۔ صحت، سینہ، بازو، ٹانگیں اور وزن وغیرہ دیکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح گزشتہ زمانوں میں بھی فوجیوں کو پرکھا جاتا تھا۔

ایسے اکثر امور کی باقاعدہ ابتداء حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہوئی تھی۔ پولیس، فوج اور انتظامیہ کی باقاعدہ تسجیل اور انتظام بھی آپؓ ہی کے زمانہ میں ہوئی۔ جس طرح محاصل مالیہ اور زمین کی پیمائش بھی آپؓ ہی کے زمانہ سے رائج ہوئی تھی۔ بہر حال فوجی انتخاب کے لیے آپؓ کے زمانہ میں باقاعدہ معائنہ ہونے لگا تھا۔ اور اسی غرض سے سپاہیوں کے ضروری ستر سے زائد کپڑے اتر وادیئے جاتے تھے۔ اور انہیں ٹھیلنے کا حکم دے کر دیکھا جاتا کہ چاک و چوبند ہے یا نہیں۔ نیز اس کی صحت کیسی ہے۔ پھر اس کے بعد کس بڑی ہم کے لیے فوجیوں کا انتخاب ہوتا تھا۔

تو حضرت جریرؓ اس موقع پر اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ جب میں حضرت عمرؓ کے سامنے معائنہ کے لیے پیش ہوا تو میں نے اپنی چادر اتار دی اور صرف لنگوٹھی کے ساتھ میدان میں گزرنے لگا۔ معائنہ ختم ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ”خذ داءک“ یعنی اپنی چادر لے کر پہن لو۔

لقال عمر للقوم الخ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے قوم سے تحمین کے انداز میں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جریرؓ کو بہترین صحت و صورت سے نوازا ہے۔ میں نے ایسا خوبصورت آدمی نہیں دیکھا تھا۔ ہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں ہمیں جو معلومات پہنچی ہیں ان کے اعتبار سے شاید یوسفؑ کا حسن اس سے زائد ہو۔

حضرت عمرؓ نے اس مقام پر اپنے مشاہدہ کی بات کی ہے کہ انہوں نے جتنے بھی مرد دیکھے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کے شنیدہ حسن کے علاوہ تمام لوگوں کی نسبت حضرت جریرؓ کا حسن زیادہ ہے۔ لیکن اس کلام سے نبی کریم ﷺ کا استثناء خود بخود ہو جاتا ہے کیونکہ وہ تو بالاتفاق اجمل الخلق ہیں۔ اگرچہ بعض خاص صفات مثلاً صباحت میں حضرت یوسفؑ آپ ﷺ سے زیادہ ہوئے تو حضور اقدس ﷺ ملاحظت میں بے مثال تھے۔ لیکن یہ جزوی فضیلت ہے۔ ویسے نبی کریم ﷺ کا حسن مُسکّنات میں سے ہے۔

باب سے مناسبت: بظاہر اس حدیث کی باب سے مناسبت معلوم نہیں ہوتی کیونکہ باب تعطر کے بارے میں ہے اور اس مقام پر معائنہ اور حسن صورت کا ذکر ہے۔ حضرت جریرؓ کی صحت کی نمائش اور حسن کا بیان ہے۔ اس لیے شراح مناسبت کی تلاش میں تکلف سے کام لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس حدیث میں حسن صورت کا ذکر ہے جس کا خوشبو سے قریبی تعلق ہے۔ دونوں حسن و پاکیزگی کے باب سے ہیں۔ پھر ظاہری حسن، خوشبو اور تعطر پر بھی دال ہیں۔ کیونکہ بد صورت آدمی عموماً طیب و خوشبو کا بھی لحاظ نہیں رکھتا۔ اور خوب صورت آدمی نظافت اور خوشبو سے بھی محبت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے مناسبت غالباً یہی ہے کہ طیب صورت کے ساتھ غالباً طیب ریح بھی ہوتا ہے۔ اور اس حدیث میں طیب صورت کا ذکر ہے۔

لیکن ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ یہاں باب کے الفاظ میں کچھ تغیر ہونا چاہیے۔ اور باب کے الفاظ یہ ہوں ”باب ما جاء في تعطر رسول الله ﷺ و حسن صورة الاصحاب و عرضهم على ابن الخطاب“ اور یوں مطابقت حاصل ہو جائے گی۔ واللہ اعلم بالصواب

خلاصہ باب

اس باب میں نبی کریم ﷺ کی خوشبو سے محبت اور اس کے استعمال کا ذکر ہے باوجود یہ کہ آپ ﷺ کو خوشبو کے استعمال کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ۔ حاجت مشاطہ نیست روئے دل آرام لیکن پھر بھی امت کی تعلیم اور طبعیت سلیمہ کے تقاضے کو اجاگر کرنے کے لیے آپ ﷺ خوشبو کو استعمال بھی کرتے تھے اور کوئی پیش کرنا تو محبت کے ساتھ قبول کرتے تھے۔ نیز قبول کرنے کی ترغیب بھی دیتے تھے۔ البتہ عورتوں کی فتنہ پردازیوں کی پیش بندی کے لیے زنانہ اور مردانہ خوشبوؤں میں فرق کو بھی واضح فرمایا۔